گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

فروری 2019

نگران اعلیٰ

معراج رسول

صفحات 306
قیمت 100 روپے

افشاں آفریدی و سحر ساجد کے دل پزیر ناول.....

فرحی نعیم، طیبہ عضر مغل و سیما رضا کی دلکش تحریریں

نامور شاعرہ و ادیبہ فاطمہ حسن سے خوبصورت گفتگو.....

اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے — مدیرہ 15

سلسلے وار ناول

میرلسارا زنگ اتار دو — افشاں آفریدی 18

نارِ — سحر ساجد 158

ناولٹ

طوافِ آرزو — طیبہ عنصر مغل 68

تیرے ہی آس پاس — عائشہ تنویر 137

مکمل ناول

سایہ اور ثمر — شبینہ گل 192

راکھ — سیما بنتِ عاصم 220

منی ناول

صفر — دُردانہ نوشین خان 112

افسانے

کاغذی رشتے — فرحی نعیم 51

ایک تھی مینا — قرۃ العین سکندر 61

ایڈونچر — فریدہ سیفی 89

سوداگری — سیما رضا ردا 105

سرپرائز — مریم شہزاد 155

سلونی — فائزہ شیخ 189

سب مایا ہے — تحسین گل 217

خصوصی مضامین

شمعِ ہدایت — اختر شجاعت 249

وہ آئے بزم میں — ہما بیگ 255

احوالِ تقریب — آسیہ عامر 261

سروے — شائستہ زریں 267

مستقل عنوانات

دین کی باتیں — ادارہ 16

گوشۂ ظرافت — ادارہ 273

بہنوں کی محفل — مدیرہ 275

پاکیزہ ڈائری — عظمیٰ آفاق سعید 289

میں اکثر گنگناتی ہوں — صغریٰ زیدی 293

منتخب غزلیں — ادارہ 295

خوش ذائقہ — شگفتہ یاسمین 296

بزمِ پاکیزہ — پاکیزہ بہنیں 298

روحانی مشورے — ادارہ 300

ہومیو کلینک 302

URDU TUBE

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O., Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

پبلشر پرنٹر ... مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
... مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Digitized by Google

مجھے کچھ کہنا ہے.....!

عزیز قارئین.....السلام علیکم!

ماہرین سماجیات و نفسیات کہتے ہیں کہ انسان ہر دور میں جدید طور طریقوں اور وقت کے نئے تقاضوں کے حصول میں اپنی تمام عمر گزار دیتا ہے۔ کروڑوں سالوں سے آباد اس دنیا میں ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ آج اگر جدیدیت کی باتیں ہوتی ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ انسان کا مسئلہ دراصل یہ ہے کہ وہ ماضی سے جڑا رہنا چاہتا ہے جس میں اگرچہ کوئی برائی بھی نہیں اس لیے کہ یہ تو وجود کا حصہ ہے مگر دوسری طرف وہ مستقبل کی راہوں پر بھی بہت تیزی سے قدم بڑھانا چاہتا ہے اور اسی عجلت و بے صبری میں ماضی اور مستقبل کے بیچ حال کو بے حال کیے بے اطمینانی، اضطراب، اضمحلال اور پریشانیوں کا شکار بھی ہو جاتا ہے مگر اس سے نجات حاصل کرنے یا اس کے حل کے لیے غور و فکر اور عملی طرز حیات اختیار نہیں کرپاتا یوں اوسطاً ساٹھ ستر سال کی عمر میں بہ مشکل دس سال بھی اطمینان قلب اور سرور کا مرانی و شادمانی کے نہیں گزارتا۔ انسان کی اس طرز زندگی پر بے انتہا تحقیقی کام ہو رہا ہے مگر حتمی نتائج کوئی ماہر نفسیات یا کسی بھی سوشل سائنسز کا ماہر نہیں دے پاتا اور اس کی طبعی عمر تمام ہو جاتی ہے پھر کوئی دوسرا ایک نیا انداز فکر دینے آگے آجاتا ہے۔

آج یہاں یہ باتیں کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہم جو الحمدللہ، اللہ کے پسندیدہ دین، دین اسلام کے پیروکار ہونے کے دعویدار ہیں اور خطہ مشرق کے باشندے ہیں، ہم کیوں اس اضطرابی کیفیت کا شکار ہیں جبکہ ہمارا مقصد حیات تو بہت واضح ہے..... ہماری راہیں تو متعین ہیں بلکہ ہمیں تو تمام عالم کی رہنمائی و رہبری کی نوید دی گئی ہے پھر ہم نے کیوں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل جیسی عظیم نعمت کی باگ ڈور غیروں کو پکڑائی ہوئی ہے کہ لو تم ہمیں ہانکو ہم تو سر جھکائے تمہاری پیروی کریں گے۔ اپنے اصل خالق و مالک کی نہیں۔ اس اندھا دھند تقلید و تعاقب کے کرشمے آج جا بجا نظر آرہے ہیں..... عقل مندوں کے لیے اشارہ کافی ہے۔

جو قومیں اپنے مذہبی و مقدس تہوار، خوب صورت اقدار اور متاثر کن آبائی روایات کو فرسودہ کہہ کر جدیدیت کے چکر میں فضول رسموں اور دنوں کو اپنے معاشرے میں زبردستی شامل کرنے پر فخر محسوس کرتی ہیں وہ بلاشبہ زمین کی کشش سے نکلنے کی سر توڑ کوشش میں اور آسمان چھونے کی لاحاصل سعی میں خلا میں ہی معلق رہ جاتی ہیں اور ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجام سے بچائے۔ الٰہی آمین!

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

مدیرہ

نزہت اصغر

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر "آفیشل پیج" کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

Digitized by Google

اور (وہ وقت یاد کرو) جبکہ وہ لوگ جو کافر ہو گئے تیرے بارے میں تدبیریں کرتے تھے تاکہ تجھے قید کر لیں یا
ھیں قتل کر دیں یا تجھے نکال دیں۔ اور وہ تدبیریں کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ بھی تدبیریں کرتا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ
ترین تدبیر کرنے والا ہے۔ (۳۰) اور جب ان پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں بے شک ہم نے سنا
ہے اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس کے مانند کہہ ڈالیں۔ یہ نہیں ہیں کہ مگر پہلوں کی کہانیاں (۳۱) اور (وہ وقت یاد
کرو) جبکہ انہوں نے کہا، یا اللہ! اگر یہ بات حق ہے، اور تمہاری طرف سے ہے، پھر تو ہم پر آسمان سے پتھر
برسا۔ یا ہم کو کوئی دردناک عذاب دے۔ (۳۲) اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ وہ انہیں عذاب دے، جس
حال میں کہ تم ان میں موجود ہو۔ اور ایسا بھی نہیں کہ وہ لوگ اس سے معافی طلب کریں، اور وہ
ن پر عذاب کرے۔ (۳۳) اور اللہ تعالیٰ انہیں عذاب کیوں نہ دے، جس حال میں کہ وہ
مسجد الحرام سے روکتے ہیں حالانکہ وہ اس کے سرپرست نہیں۔ اس کے سرپرست تو
صرف (خاص) متقین ہی ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر نہیں جانتے ہیں۔ (۳۴) اور ان
کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سوائے سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے کے اور کچھ نہ تھی
اس لیے انہیں کہا جائے گا کہ) پس جو کفر کہ تم کیا کرتے تھے اس کے بدلہ میں
عذاب کا مزہ چکھو۔ (۳۵) یقیناً وہ لوگ جو کافر ہو گئے وہ اپنے مال اس لیے خرچ
کرتے ہیں تاکہ وہ (لوگوں کو) اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکیں۔ پس وہ اسے اب تو
خرچ کریں، پھر وہی ان کے لیے باعثِ حسرت ہو جائے گا۔ پھر وہ مغلوب
ہو جائیں گے۔ اور وہ لوگ جو کافر ہو گئے وہ جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں
گے۔ (۳۶) تاکہ اللہ تعالیٰ ناپاک کو پاک سے الگ کر دے اور ناپاک کو ایک
دوسرے کے اوپر رکھ دے۔ پھر ان سب کا ڈھیر لگا دے۔ پھر اس ڈھیر کو جہنم
میں ڈال دے۔ وہی تو نقصان اٹھانے والے ہیں۔ (۳۷) (اے رسولؐ) کہہ
دو ان لوگوں سے جو کافر ہو گئے، اگر وہ باز آ جائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے وہ ان کو
معاف کر دیا جائے گا۔ اور اگر وہ پھر ویسا ہی کریں گے، تو پہلوں کا طریقہ تو گزر ہی
چکا ہے۔ (۳۸) اور ان سے جنگ کیے جاؤ، تا آنکہ کوئی فتنہ نہ رہ جائے۔ اور
سارے کا سارا دین اللہ تعالیٰ ہی کا ہو جائے۔ پس اگر وہ باز آ جائیں تو جو کچھ وہ کرتے
ہیں یقیناً اللہ تعالیٰ اسے خوب دیکھنے والا ہے۔ (۳۹) اور اگر وہ منہ پھیر لیں تو جان لو کہ
یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارا مالک ہے۔ وہ کیا اچھا مالک اور کیا اچھا مددگار ہے۔ (۴۰) اور تم جان لو
ماسوا اس کے نہیں ہے کہ جو کچھ بھی تم کو کسی چیز سے غنیمت ملے پس یقیناً اس کا خمس ((پانچواں حصہ)
اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور رسول کے لیے۔ اور (رسول کے) قرابتداروں اور یتیموں اور مسکینوں اور
مسافروں کے لیے ہے، اگر تم اللہ تعالیٰ پر اور اس چیز پر ایمان رکھتے ہو تو جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن
نازل کی تھی جس دن دو گروہ (مسلمان اور کافر) باہم مقابل ہوئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری، پوری قدرت
رکھنے والا ہے۔ (۴۱)

(سورۃ انفال ۸، پارہ ۹۔ آیات ۳۰ تا ۴۱)

Digitized by Google

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

سَیِّدُنَا یٰسٓ ﷺ

سید کونین، ختمی مرتبت، رحمۃ العالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام **سیدنا یٰسین** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے۔ جس کے معنی و مفہوم "اے سید و سردار" (واللہ اعلم) کے ہیں۔

ایک اور روایت ہے کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "اے انسان" کے ہیں اور اس سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

حضرت امام جعفر صادقؒ سے مروی ہے کہ یٰس کے معنی "اے سید" کے ہیں۔

1۔ **القرآن:** یٰس (1) قسم ہے قرآن کی جو حکمت سے بھرا ہوا ہے۔ (2) اے محمدؐ بے شک تم پیغمبروں میں سے ہو (3) سورۂ یٰس آیات ۱ تا ۳۔

2۔ **الحدیث:** حضرت اُمِّ کرزؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں ایمان والوں کا سردار یعنی سیدُ المومنین ہوں۔ جب وہ مر کر اٹھیں گے تو میں ان کو لے کر چلوں گا جب وہ ناامید ہوں گے میں ان کو بشارت دینے والا ہوں گا۔ جب میں سفارش کروں گا تو میری شفاعت قبول ہوگی۔ جب میں مانگوں گا تو مجھے عطا ہوگا۔ (دلائل النبوۃ)

4۔ **الوانے:** وہ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے آپ کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ قائدانہ صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس احساس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ کبھی اس کا اظہار کیا اور نہ ہی کبھی دربار سجانے اور عدالت لگانے کی کوشش کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو محسوس تک نہ ہونے دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مافوق البشر یا روحانی صفات کے حامل انسان ہیں۔ (آر۔ وی۔ سی۔ یاڈلے۔ الرسول)

4۔ **الفضائل:** ۱۔ اگر کسی کی کوئی ایسی جائز حاجت ہو تو جو کسی بھی طرح پوری نہ ہوتی ہو تو نصف شب کو ننگے سر ہو کر باوضو حالت میں 41 مرتبہ اس اسم مبارک "**سیدنا یٰسین**" کو پڑھ کر دعا مانگے۔ ان شاء اللہ مراد پوری ہوگی۔

۲۔ جو کوئی کسی امتحان میں کامیابی کا خواہاں ہو تو اسے چاہیے کہ ہر فرض نماز کے بعد 41 مرتبہ اس اسم مبارک کو پڑھ کر دعا مانگے۔ کامیابی نصیب ہوگی اگر کوئی شخص چاہے کہ دشمن اسے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائے تو ہر نماز کے بعد نہایت توجہ کے ساتھ ستر مرتبہ اس اسم مبارک کو پڑھے۔ ان شاء اللہ دشمن اس کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

نوٹ: ہر عمل کے ساتھ اول و آخر درود شریف پڑھنا ضروری ہے۔

(قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس)

زندگی کبھی کبھی انسان کو ایسے کربناک حادثے سے دوچار کر دیتی ہے کہ اس کا اپنی ذات اور اردگرد کے لوگوں پر سے اعتماد متزلزل ہو جاتا ہے۔ اس حادثے کی وجہ بعض اوقات اس کی اپنی توقعات بھی ہوتی ہیں جو وہ کسی بے نام تعلق سے وابستہ کر لیتا ہے۔ وہ جذبے جو رشتوں کے توسط سے دل میں بسیرا کریں ان کی پزیرائی تو مذہب اور معاشرہ دونوں کرتے ہیں، ان کی حق تلفی پر جواب طلبی بھی کی جا سکتی ہے مگر وہ دلی تعلق جنہیں رشتوں کی سند نہ حاصل ہو، انہیں کسی عدالت سے بھی سزا نہیں سنائی جا سکتی، سوائے ضمیر کی عدالت کے۔ جبکہ وہ رشتے جنہیں تعلق کا نام بھی دے دیا جائے کبھی کبھی وہ اپنے جائز حق سے بھی محروم کر دیے جاتے ہیں۔ اور ان کی جوابدہی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ دنیا دارالعمل ہے جہاں انسان کے دو ہی امتحان ہیں، ایک شکر کا دوسرے صبر کا... مگر جب حضرتِ انسان حسد یا ہوس کی خاطر تقدیر سے لڑنے کی ٹھان لے تو پھر اس کے اپنے فیصلے ہی اس کی آزمائش بن جاتے ہیں۔

حادثوں میں گزری ہے راس بس تباہی ہے   زندگی کی چاہت میں زندگی گنوائی ہے

خواب اب نہیں میرے، نیند تک پرائی ہے   عارضی محبت تھی مستقل تنہائی ہے

امیدوں، جذبوں، فیصلوں اور احساسِ جرم پر مبنی کچھ ایسے کرداروں کی کہانی جو دل سے دیکھتے، دل سے سنتے اور دل سے ہی سوچتے ہیں

سلسلے وار ناول

میرا سارا زنگ اتار دو

افشاں آفریدی

قسط 2

URDU TUBE
Digitized by Google

گزشتہ قسط کا خلاصہ

شیرازی ولا میں مقیم مظفر اور سائرہ کی بیٹی ردا کی منگنی اس کی مرضی سے آصف کے ساتھ ہوتی ہے جس میں یو ایس اے سے تین سال بعد واپس آکر مظفر صاحب کا یتیم بھتیجا عکرمہ بھی شریک ہوتا ہے۔ دادی کا ارادہ زوہا کی سعد سے شادی کے بعد ردا کو اس کی شریکِ حیات بنانے کا تھا لیکن ردا کی مرضی نہیں تھی۔ اب عکرمہ واپس آیا تو درِمکنون کو دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے۔ زاویار تنہا سیکیورٹی گارڈ سے لڑتا ہے جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ میں زخم آتا ہے وہ اپنے دوست سرفراز کے سی ویو والے اپارٹمنٹ میں دلقی، ندیم اور مولا بخش کے ساتھ تھا۔ عکرمہ آئی کیپ میں لیکچرر شپ اور icmap میں ایوننگ کلاسز لینے لگتا ہے۔ درِمکنون، سائرہ چچی کی بھانجی تھی جس کی ذمے داری مظفر احمد نے اس کے ماں باپ کے انتقال کے بعد اٹھالی تھی۔ عاصمہ لاج میں عاصمہ اور میران، زاویار کو ایک دن پہلے دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ زاویار جب بھی کراچی سے باہر جانے کا کہتا ہے انہیں لگتا ہے وہ لاہور واپس چلا جائے گا۔ ٹریپ شوٹنگ زاویار کا پیشن تھا وہ کارساز شوٹنگ رینج میں تھا جب شہرین کا میسج اس کے پاس آتا ہے کہ اس کی گاڑی خراب ہوگئی ہے اور وہ اسے پک کرلے۔ شہرین اسے بتاتی ہے کہ وہ تائیکوانڈو سیکھ رہی ہے۔ وہ شہرین کو اس کے گھر چھوڑتا ہے لیکن اس کے اصرار پر بھی اندر نہیں جاتا۔ شہرین، میمونہ بیگم کو زاویار کے متعلق بتاتی ہے تو وہ سوچتی ہیں کہ آغا جان اور شہریار سے بھی اس کا دل صاف ہوجائے گا۔ شہرین فوراً خولہ کو میسج کرنے لگتی ہے۔

اب آگے پڑھیے..........................

پھر تو جیسے روٹین ہی بن گئی۔ ہر سنڈے صبح وہ اپنا ناشتا خود بناتا۔ اس دوران دُرِمکنون دادی کے لیے پورج بنا لاتی تو زبردستی اسے بھی ناشتے میں شریک کرلیتا۔

"ناشتا کریں اور دودھ بھی لیں ساتھ میں۔" وہ کہتا۔

"سیب کاٹیں اور ہاں چھلکے سمیت کھائیں۔ اس کے چھلکوں میں ہی تو زیادہ وٹامنز ہوتے ہیں۔ صبح، صبح خالی پیٹ کام نہیں کرنا چاہیے۔ ذرا ڈٹ کر ناشتا کرلیں۔ آپ کی عمر کے لوگوں کو تو زیادہ کھانا پینا چاہیے۔ ینگسٹرز کو زیادہ کیلوریز چاہیے ہوتی ہیں۔" ناشتے کے ساتھ ساتھ۔ ہدایات بھی جاری رہتیں۔

دُرِمکنون شروع میں تو بہت کنفیوز ہوئی تاہم آہستہ، آہستہ اس نے خود پر کسی حد تک قابو پانا سیکھ لیا۔ البتہ اب بھی آکر عکرمہ اس کو براہ راست پکارتا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی تھیں۔

"کیا ہوا عکرمہ...... کیا سوچ رہے ہو؟"

اس روز عکرمہ کے پکارنے پر وہ جس طرح ہڑبڑائی۔ وہ ایک بار پھر تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا۔ گہری سوچ چہرے سے عیاں تھی۔ دادی نے استفسار کرلیا۔

"آپ کا کیا خیال ہے دادی۔ انسان اس طرح زندگی گزار سکتا ہے جیسے درِمکنون گزار رہی ہیں، بنا مقصد بغیر خواہش کے؟" خاصا گہرا لہجہ تھا۔ دادی گویا آہ بھر کر اسے دیکھنے لگیں۔

"یہ زندگی نہیں...... یہ تو محض ایک سمجھوتا ہے۔ ایک طرح کی بے بسی ہے بیٹا، اللہ تعالیٰ نے جتنی سانسیں بندے کے نصیب میں لکھی ہیں، وہ تو پوری کرنی ہی ہے ناں...... رہ گئی مقصد اور خواہش کی بات...... تو مقصد تو باری تعالیٰ نے طے کردیا، البتہ خواہش خود انسان کے اندر پھوٹنی چاہیے اور درِمکنون کے اندر سوائے اندھیرے کے کچھ نہیں۔" دادی بڑی اداسی سے بولیں۔ کچھ ہی سالوں میں بہت انسیت ہوگئی تھی انہیں اس مظلوم لڑکی سے۔

"مجھے لگتا ہے...... درِمکنون کو کسی سائیکاٹرسٹ (Psychiatrist) کی ضرورت ہے یا پھر کسی کاؤنسلر کی جو اُن کی نفسیاتی الجھنوں کا سرا ڈھونڈ سکے...... کیا آپ نے نوٹ کیا دادی وہ مجھے دیکھ کر اس طرح خوفزدہ ہوجاتی ہیں جیسے میں کوئی درندہ ہوں یا پھر جلاد...... جو ابھی سر قلم کر ڈالے گا۔ اس قدر خوف و سہم ہے ان کے اندر... کسی سے ٹھیک سے بات بھی نہیں کرسکتیں...... کیسے گزاریں گی زندگی۔"

وہ یک دم سنجیدہ اور متفکر نظر آنے لگا تھا۔

"یہی تو سوچ، سوچ کر مظفر میاں اور میری نیندیں حرام ہیں۔ ٹھیک ہے ہمارا خون نہیں ہے وہ...... مگر اب تو اس گھر کا حصہ ہے۔ ہماری زندگیوں میں شامل ہوچکی ہے وہ...... میں کیا کروں بیٹا، بہت سمجھاتی ہوں اسے کہ ماضی کے اندھیرے سے باہر نکل آئے...... آنے والی زندگی کے لیے سوچے...... لیکن اس کا ذہن تو جیسے ایک ہی جگہ رک گیا ہے...... ٹھٹک گیا ہے۔"

"چچا جان نے نفسیاتی علاج کے لیے سوچا یا کوئی کوشش کی کبھی؟"

"تین سال پہلے یہاں آنے سے قبل پورے چار ماہ اسپتال میں علاج ہوا ہے اس کا مگر حادثے کا ایسا اثر ہوا تھا اس کے ذہن پر کہ ساڑھے تین ماہ تک اس کی نفسیاتی تھراپیز ہوتی رہیں۔ تب بھی اسپتال سے جب مظفر میاں اسے یہاں لائے...... کئی ماہ تک تو اس نے یہاں بھی کسی سے بات نہیں کی۔ بس سارا، سارا دن بڑی سی چادر لپیٹے ایک کرسی پر بیٹھی خلاؤں میں تکا کرتی تھی۔" دادی نے بتایا تو اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔

"پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سعد میاں دفتر کی طرف سے چھ ماہ کی ٹریننگ پر جرمنی گئے تو زوہا اِدھر ہی آگئی۔ بڑی جان ماری اس نے بیچاری دُرِمکنون کو نارمل کرنے کے لیے اور یوں دھیرے، دھیرے وہ اپنے خول سے باہر آنے لگی۔ پھر سنی کی پیدائش کے بعد تو زوہا نے گویا سنی اس کی گود میں ہی ڈال دیا اور یوں اس ننھے فرشتے کی خاطر ہی سہی...... درِمکنون زندگی کی طرف لوٹی۔ جیسا تم اسے آج دیکھ رہے ہو ناں بیٹا یہ تو بہت بہتر حالت ہے اس کی...... وگرنہ اس سے پہلے گویا زندہ لاش ہی تھی۔"

دادی سے تفصیل جاننے کے بعد وہ خاصا حیران ہوا۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے دادی، درِمکنون یقیناً پہلے سے بہتر ضرور ہوں گی مگر اب بھی نارمل نہیں...... مجھے لگتا ہے چچا جان کو ان کی تعلیم دوبارہ شروع کرادینی چاہیے۔ ذہین ہیں وہ...... پڑھائی میں بھی یقیناً دلچسپی رہی ہوگی جبھی تو پوزیشن لی...... اگر ان کی تعلیم دوبارہ شروع کرادی جائے تو مجھے قوی امید ہے کہ وہ اپنا کھویا ہوا اعتماد دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔"

"ہوں...... سوچ تو تمہاری ٹھیک ہے بیٹا...... مگر وہ راضی ہو تب ناں۔" دادی قدرے مایوسی سے کہتی کھڑی ہوگئیں اور جاتے جاتے مڑ کر بولیں۔

"یوں بھی ردا کی شادی میں صرف تین مہینے رہ گئے ہیں...... سائرہ اس کو پڑھنے کی اجازت یوں بھی نہیں دیں گی۔"

"ہوں......" وہ ناگواری محسوس کیے بنا نہ رہ سکا تھا تاہم بولا کچھ نہیں۔

......☆......☆

لاؤنج میں خاصی خاموشی تھی، وہ سیف کو زولوجی کا جرنل بنانے میں مدد دے رہا تھا۔ شام ڈھلنے کو تھی کہ مظفر صاحب کی واپسی بھی ہوگئی۔ سیف کتابیں سمیٹ رہا تھا کہ وہ لاؤنج میں داخل ہوئے۔

"السلام علیکم!" دونوں نے بیک وقت سلام کیا۔

"وعلیکم السلام برخوردار...... کیا حال ہیں......؟" تھکے، تھکے سے انداز میں احوال پرسی کرتے مظفر صاحب سامنے فروکش ہوئے تو اس نے بغور اُن کی جانب دیکھا۔

گزرے تین سالوں میں کوئی بھی اتنا نہیں بدلا تھا جتنا تغیر اسے چچا جان میں محسوس ہوا تھا۔ پہلے سے یک دم بوڑھے لگنے لگے تھے وہ۔

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
Digitized by Google

"ایک دم ٹھیک پاپا......" سیف جواب دے کر باہر کی جانب بڑھ گیا۔ آج کرکٹ میچ تھا اس کا دوستوں کے ساتھ۔

"آپ سنائیں چچا جان کیسے ہیں آپ...... کچھ تھکے، تھکے سے لگ رہے ہیں......" اس نے تردد سے سوال کیا تو وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیے۔

"بس بیٹا بوڑھا ہو گیا ہوں...... فکر اور پریشانیوں نے تھکا دیا ہے۔"

"کم آن چچا جان، ایسی بھی کیا پریشانیاں...... ماشاء اللہ سے ردا اپنے گھر جا رہی ہے۔ سیف بھی اسٹڈیز میں اچھا ہے۔ پروفیشنل ڈگری کے حصول کے لیے محنت کر رہا ہے اور مجھے بہت امید ہے اسے ڈی ایم سی میں ایڈمیشن ضرور مل جائے گا...... زوہا اور زارا اپنے گھروں میں خوش ہیں...... ماشاء اللہ...... پھر کیا ٹینشن ہے آپ کو۔"

"ہاں...... کہنا تو تمہارا بجا ہے بیٹا...... ماشاء اللہ ان چاروں کی طرف سے تو سکون ہو گیا ہے مجھے...... بس فکر ہے تو دُرِمکنون کی ہے۔ اس کی طرف سے بہت پریشان ہوں، کیا ہوگا اس کا...... میں بھی کب تک ہوں...... میرے بعد کیا بنے گا اس کا......؟" تفکر اُن کی آنکھوں سے ہویدا تھا۔ عکرمہ کو وہ بہت بکھرے بکھرے لگے۔

"زاہد نے اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا تھا مرتے وقت...... اس کی امانت کو کس کے حوالے کر کے جاؤں...... دن رات اسی فکر نے ادھ موا کر رکھا ہے مجھے۔" وہ بہت ٹوٹے ہوئے لگ رہے تھے۔

عکرمہ فکرمندی سے انہیں دیکھتا اٹھ کر ان کے ساتھ آ بیٹھا۔

"ہر پریشانی کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے چچا جان، انسان کو صرف حوصلہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے...... درمکنون کو بھی ہمت اپنی ہی دلائیں زندگی کسی کے لیے بھی راستے نہیں بدلتی...... ہمیں ہی اس کے ساتھ چلنا ہوتا ہے...... ریت میں سر گھسا لینے سے طوفان نہیں تھمتا...... میرا خیال ہے کہ درمکنون کو مکمل علاج کے ساتھ بہت توجہ کی بھی ضرورت ہے...... آپ ان کی تعلیم دوبارہ شروع کرائیں......" متانت سے کہتے کہتے اس نے صلاح دی۔

"وہ پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہے بیٹا...... میں نے، زوہا نے پہلے بھی کوشش کی تھی......" اس کے دلچسپی لینے پر وہ قدرے خوش ہو گئے تھے جبھی بیچارگی سے کہنے لگے۔

"کب کی بات ہے یہ......؟" سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"پچھلے سال کی...... زوہا ہی لائی تھی اس کے لیے کالج کا داخلہ فارم......" انہوں نے بتایا۔

"پچھلا سال گزرے قریباً دس ماہ ہو چکے ہیں...... دادی بتا رہی تھیں کہ پہلے کے مقابلے میں ان میں کافی بہتری آئی ہے آپ ایک بار پھر ٹرائی کریں۔ کیا پتا اس بار وہ منع نہ کریں اور رہ گیا کالج جانے کا مسئلہ تو میرا خیال ہے وہ گھر سے باہر جانے سے ڈرتی ہیں۔ اگر آپ ان کے لیے گھر پر ہی ٹیوشن کا انتظام کر دیں تو شاید وہ دلچسپی لیں......"

اس نے تجزیاتی انداز بیاں اختیار کیا تو مظفر صاحب جیسے متفق سے ہو گئے پھر یک دم سر اٹھا کر اسے مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا۔

"تم پڑھاؤ گے اسے بیٹا......؟" بڑی آس تھی اُن کی آنکھوں میں۔

"میں......!" وہ بھونچکا سا رہ گیا۔

"ہاں تم...... تم گھر کے فرد ہو...... تم سے شاید وہ پڑھ لے پھر تم اس کی ذہنی کیفیت سے بھی واقف ہو۔ اس کی پریشانی انڈر اسٹینڈ کر سکتے ہو جبکہ باہر کے کسی شخص کے ساتھ وہ شاید کھل نہ سکے، یوں بھی تمہیں تو معلوم ہے کہ لوگوں کو حال سے زیادہ دوسروں کے ماضی سے دلچسپی ہوتی ہے...... دُرِمکنون بہت نروس ہو جاتی ہے پرسنل سوالات کرنے والوں سے، جبھی تو محض کچن کو ہی جائے پناہ بنا رکھا ہے......" وہ بہت امید سے کہنے لگے ساتھ ہی وضاحت بھی کی۔

"مگر مجھے نہیں لگتا وہ مجھ سے پڑھیں گی......" نیم رضامندی کا تاثر دیتے ہوئے وہ بہت پُرامید نہیں تھا۔

"میں بات کروں گا اس سے...... کم از کم پڑھائی ہی مکمل کر لے وہ۔ شادی کے لیے تو ہم نے ابھی تک جتنی بھی کوششیں کیں وہ ناکام ہی گئیں۔" چچا جان سخت کبیدہ خاطر تھے۔

عکرمہ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ کیا کہتا کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس۔ تاہم حیرت ضرور ہوئی کہ چچا جان اس کی شادی کیوں کرانا چاہ رہے ہیں۔ یہ تو پڑھنے کی عمر ہے اس کی۔

مظفر صاحب بھی کسی گہری سوچ میں ڈوب کر خاموش ہو گئے تھے۔ اس دوران دُرِمکنون کچن سے چائے کا کپ لیے حاضر ہوئی۔

"چائے۔" قریب آ کر آہستگی سے کہا تو دونوں ہی چونکے۔

"شکریہ بیٹا...... خوش رہو۔"

عکرمہ کو لگا مظفر صاحب، درمکنون کو دیکھ کر اور بھی آزردہ ہو گئے ہیں۔ اس نے دل پر جیسے کوئی بوجھ سا محسوس کیا۔ بابا کے انتقال کے بعد چچا جان نے اسے کبھی بابا کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ بہت پیار تھا اسے ان سے۔ ان کی فکر اور پریشانی جیسے اس کے لیے ذاتی پریشانی تھی۔

گلابی سادہ سے کاٹن کے سوٹ میں بڑے سے دوپٹے سے سر چھپائے ہوئے درمکنون، مظفر صاحب کی شفقت پر تشکر سی نظر ڈال کر جانے لگی کہ انہوں نے روک لیا۔

"بیٹا...... تم نے عکرمہ سے پوچھا چائے کے لیے......؟"

"جی...... نہیں تو......" اُدھر سادگی کی انتہا تھی۔

"تو بیٹا...... اب پوچھ لو......"

انہوں نے شفیق لہجے میں کہا تو درمکنون کی سوالیہ نظریں اس تک آ کر ٹھہر گئیں اور کچھ لمحے ٹکی ہی رہیں...... مگر جب اس نے ہی کوئی جواب نہیں دیا تو وہ ٹپٹا گئی۔

عکرمہ کی جانچتی ہوئی سادہ نگاہیں کسی توقع کے باعث اس کا حصار کیے ہوئے تھیں۔

بالآخر درمکنون کو ہی خیال آیا کہ اسے ہی سوال کرنا چاہیے۔

"آپ چائے لیں گے......؟"

عکرمہ زیر لب مسکرا دیا۔

"نہیں...... شکریہ...... ابھی موڈ نہیں ہے......"

جواب دے کر وہ قصداً ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

درمکنون جواب پاتے ہی وہاں سے چلی گئی تھی۔

"جو لڑکی اس کے سامنے چند ثانیے نہیں رکتی وہ اس سے بھلا کیا پڑھے گی۔" وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"بیٹا، تم فکر مت کرو...... ابھی تم سے مانوس نہیں ہے...... شروع، شروع میں مجھ سے، سعد سے حتیٰ کہ سیف تک سے بہت دور، دور رہتی تھی...... ہم اگر پکار لیتے تو ہاتھوں سے چیزیں چھوٹ جاتی تھیں اس کے...... مگر ڈاکٹر نے کہا کہ ہمیں صبر سے کام لینا ہوگا...... دھیرے، دھیرے وہ اپنے خوف پر قابو پا لے گی اور یہی ہوا...... تمہیں بھی آہستہ، آہستہ قبول کر لے گا اس کا ذہن......" چچا جان کی زیرک نظروں سے اس کی تشویش چھپی نہ رہ سکی تھی۔

"ایسی کوئی ٹینشن نہیں چچا جان...... میں تو بس اس لیے فکرمند ہوں کہ آپ کی امیدوں پر پورا اتر بھی سکوں گا یا نہیں۔" جبراً مسکراتے ہوئے اس نے انہیں گویا یقین دلایا کہ وہ ان کی مدد ضرور کرے گا۔

"مجھے تم پر پورا یقین ہے بیٹا کہ اپنی طرف سے تم کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھو گے باقی رہ گیا نصیب تو اللہ

URDU TUBE
HOME OF ENTERTAINMENT
Digitized by Google

اس کا نصیب بہت اچھا کرے۔" اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے انہوں نے دعائیہ انداز میں کہا تو کمرے سے باہر آتی سائرہ بیگم متجسس سی ان کے پاس چلی آئیں۔

"یہ کس کے لیے اس قدر خلوص سے دعائیں کی جارہی ہیں..... کچھ ہم بھی تو سنیں۔"

مظفر صاحب کے عین سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ گویا ہوئی تھیں۔

"بس ہم دُرِ مکنون کے بارے میں بات کررہے تھے۔" مظفر صاحب نے دبے دبے جوش سے ذکر کرتے ہوئے کہا۔

اس نے دیکھا سائرہ بیگم کی مسکراہٹ یک دم تلخ تاثرات میں تبدیل ہوگئی۔

"میں نے عکرمہ سے کہا ہے کہ یہ درمکنون کو گھر پر ہی ٹیوشن دے دیا کرے تاکہ وہ کم از کم گریجویشن ہی کرلے اس طرح اور کچھ نہ سہی اپنے پیروں پر کھڑی تو ہوسکے گی....."

جانے انہیں اپنی نصف بہتر کے تاثرات دکھائی نہیں دے رہے تھے یا انہوں نے قصداً نظر انداز کیا تھا انہیں۔

سائرہ بیگم نے یک دم بھویں اچکا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"ارے بیٹا انہیں تو عادت ہے جاگتے ہوئے خواب دیکھنے کی مگر کیا تم نے بھی ہامی بھرلی ہے..... تم نے حالت دیکھی ہے اس کی..... ذہنی طور پر تو وہ ٹھیک ہے نہیں، پڑھے گی کیسے.....؟ ناحق تمہارا وقت بھی ضائع کرے گی۔"

عجیب کٹیلا سا انداز ہوتا تھا ان کا درمکنون کے بارے میں بات کرتے ہوئے۔ عکرمہ بہ مشکل اپنی بیزاری چھپا سکا۔

"ایسی بات نہیں چچی جان..... پڑھانا میرا شوق ہے..... اور میری کلاس میں بھی کئی ایسے اسٹوڈنٹس ہیں جن میں "اعتماد" کی کمی ہے مگر پڑھائی میں بہت اچھے ہیں وہ..... کچھ لوگ دوسرے لوگوں کے ساتھ ٹھیک سے کمیونی کیٹ (communicate) نہیں کرپاتے مگر ان کا انٹرسٹ ہوتا ہے اسٹڈیز میں....."

مدلل انداز تھا اس کا..... ساتھ میں تجربے کا یقین بھی۔

"ہاں مگر ہر انسان اس حادثے سے نہیں گزرا جس سے یہ لڑکی گزری ہے۔ جو لڑکی ٹھیک سے بول نہیں پاتی..... کسی سے نظر ملا کر بات نہیں کرسکتی..... وہ بھلا کیا پڑھے گی....."

وہ اختلاف کرتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں بولیں تو مظفر صاحب کا ضبط جواب دے گیا۔

"نہ پڑھے..... کم از کم ایک کوشش تو کرسکتی ہے وہ اور پھر تم اس قدر یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ کچھ نہیں کرسکتی۔ کیا گزرے سالوں میں تم نے ایک بار بھی اس کو پیار سے پاس بٹھا کر وہ سب کچھ سمجھانے کی کوشش کی جو ایک ماں کا فرض ہوتا ہے۔"

وہ تلخ ہونے سے خود کو نہ بچا سکے تھے۔

"نہ میں اس کی ماں ہوں..... نہ وہ میری بیٹی ہے مظفر صاحب، مائنڈ اٹ..... رہ گئی سمجھانے کی بات تو آپ اور زوہا کے ہوتے اسے دوسرے ناصح کی ضرورت نہیں ہے یوں بھی میں تو جو کہوں وہ غلط ہی ہوگا تو ٹھیک ہے وہی کریں جو آپ کا دل چاہتا ہے مگر یاد رکھیں اس کا ذہن جس قدر کمزور ہوچکا ہے اس پر پڑھائی کا بوجھ ڈالنا ایک طرح سے زیادتی ہی ہوگی اس کے ساتھ..... گھر کا کام تو وہ اپنی خوشی سے کرتی ہے مگر پڑھنے لکھنے سے اب اچاٹ ہوچکا ہے اس کا دل....." تنے، تنے چہرے اور دبے، دبے غصے سے کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"آپ جبر نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔" جاتے، جاتے وہ کہہ گئی تھیں۔

مظفر صاحب ان کی بات پر برک دم افسردہ سے ہوگئے۔ کسی گہری سوچ کے باعث ان کے ماتھے کی شکنیں دُگنی

Digitized by Google

ہوگئی تھیں۔

"پلیز چچا جان آپ پریشان نہ ہوں..... چچی جان کا کہنا بھی غلط نہیں مگر اس طرح درمکنون کو ان کے حال پر چھوڑا بھی نہیں جاسکتا..... ایک کوشش تو ہمیں کرنی ہی ہوگی....." وہ حتمی لہجے میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا ساتھ ہی انہیں تسلی بھی دی۔

"صحیح کہتے ہو بیٹا....." اس کی بات پر مظفر صاحب دھیمے سے مسکرادیے۔ امید کا ننھا سا جگنو ہاتھ آیا تھا گویا۔

.....☆.....☆.....

"کل شام تک واپسی ہوجائے گی تمہاری.....؟" ناشتے کی ٹیبل پر آغا جان، شہریار صاحب سے مخاطب تھے۔

"نہیں آغا جان..... اسلام آباد سے واپسی پر مجھے پنڈی ہوتے ہوئے آنا ہے۔ کلائنٹ سے میٹنگ طے ہے وہاں بھی..... مجھے رات ہوجائے گی آتے، آتے....." شہریار صاحب کی نگاہ گھڑی پر تھی..... انہیں اگلے دس منٹ میں گھر سے نکلنا تھا..... ورنہ میٹنگ میں پہنچتے، پہنچتے دیر ہوجاتی۔

"ہوں....." جواباً جلال انصاری جنہیں گھر و خاندان کے سبھی افراد آغا جان پکارتے تھے، "ہوں" کہہ کر کچھ سوچنے لگے تھے۔

آج اگر زاویار اپنے فیملی بزنس کو سنبھالنے میں اپنے والد شہریار کا ساتھ دے رہا ہوتا تو وہ سب کتنے خوش و مطمئن ہوتے..... مگر وہ تو ان سب سے ناراض ہوکر دور جا بیٹھا تھا.....

"ڈونٹ وری آغا جان..... میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔"

چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے شہریار صاحب نے والد کے چہرے پر گہری سوچ کا عکس دیکھ کر انہیں گویا تسلی دی۔

"اچھی بات ہے....." وہ اپنے خیال سے باہر آتے ہوئے بولے تھے پھر سوالیہ نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"تم نے زاویار کو کال کی تھی؟"

"نہیں....." زاویار کے ذکر پر شہریار صاحب کے ماتھے پر شکنوں کا جال بن گیا تھا۔ "وہ نمبر دیکھ کر کال ریسیو ہی نہیں کرتا..... آغا جان پہلے بھی کئی بار آپ کے کہنے پر اس ناہنجار کو فون کیا میں نے..... مگر اس کا دماغ تو ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا ہے۔" وہ بولے تو لہجے میں باپ کا لحاظ مگر بیٹے کے لیے سخت ناراضی تھی۔

"جانتا ہوں مگر بیٹا ہے وہ تمہارا..... جذباتی اور غصیلا ہے، جوان ہے، خفا ہے ہم سے اس لیے ضد کررہا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بھی اس سے روٹھ کر بیٹھ جائیں....."

"وہ ہاتھ سے نکل چکا ہے آغا جان..... گزرے سالوں میں اس نے ایک بار بھی پلٹ کر کسی کی خبر نہ لی۔ ایسے رشتہ توڑا ہے اس نے جیسے ہمیں جانتا ہی نہ ہو۔" شہریار صاحب سخت کبیدہ خاطر تھے۔

"صحیح کہا تم نے..... مگر ہمیں اس سے تعلق نہیں توڑنا ہے شہریار..... وہ ہمارے خاندان کا اکلوتا چشم و چراغ ہے۔ اسی سے تمہاری، میری نسل آگے چلے گی۔ تم تینوں بھائیوں میں سے ایک تمہاری ہی تو نرینہ اولاد ہے۔ زاویار..... ہم اسے کھو نہیں سکتے۔" جلال صاحب نے قدرے خفگی سے بیٹے کو سمجھایا تھا۔

شہریار انصاری جانتے تھے کہ زاویار کے معاملے میں جلال صاحب کی محبت اور سوچ بہت مرتکز ہے اور انہیں اپنے مرکز سے ہٹانا اُن میں سے کسی کے لیے ممکن نہیں۔

اس لیے لب بھینچ کر انہیں دیکھنے لگے۔

"میمونہ نے فون کیا تھا کل مجھے..... وہ بتا رہی تھی کہ شہرین کی ایک آدھ بار ملاقات ہوئی ہے..... زاویار سے..... اور اب کبھی، کبھی فون پر بھی بات کرلیتے ہیں دونوں....."

جلال صاحب کے لہجے میں مسرت کا رنگ نمایاں تھا..... شہریار صاحب بھی متاثر ہوئے..... پھر بولے۔

"کیونکہ زاویار کی ناراضی شہرین سے نہیں ہے..... جبکہ آپ کا اور میرا معاملہ اس کے برعکس ہے آغا جان..... وہ ہم دونوں سے خفا ہے۔ اس کی ہر جا بے جا ضد ماننے کا نتیجہ ہے کہ وہ خود سر ہو گیا ہے..... انکار سننے کا عادی ہی نہیں رہا ہے وہ..... اس کی یہ ضد اور انا آج ہم بھگت رہے ہیں....."

شہریار انصاری کو بیٹے کے آگے جھکنا گوارا نہیں تھا..... مگر ساتھ، ساتھ باپ کی حکم عدولی بھی نہیں کر سکتے تھے وہ۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے کہنے پر اس کے کراچی جانے کے کئی ماہ بعد انہوں نے اس سے رابطہ کیا تھا۔ جس کے جواب میں وہ بہت درشت طریقے سے پیش آیا تھا۔ اس کے اسی رویے نے شہریار صاحب کو اس سے اور بھی دور کر دیا تھا۔

"وہ تمہارا ہی خون ہے برخوردار، ضد بھی تم سے ہی ورثے میں پائی ہے۔" آغا جان کے چہرے کی مسکراہٹ میں طنز کا عنصر غالب تھا۔ "کل تمہارا دور تھا آج اس کا دور ہے۔ دروازے چھوٹے ہوں تو سر جھکا کر گزرنا پڑتا ہے۔ وقت اور حالات کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اس کی طرف قدم بڑھائیں۔ وہ بیٹا ہے ہمارا۔ آخر کب تک مزاحمت کرے گا، ایک نہ ایک دن اپنے اصل کی طرف لوٹ کر آنا ہی ہوگا اسے۔" جلال انصاری کی آواز میں اعتماد جھلک رہا تھا۔ شہریار صاحب ان سے اختلاف نہیں کر سکے۔

.....☆.....☆.....

"مجھ سے نہیں ہوگا یہ سب زوہا باجی..... پلیز آپ انکل سے کہیے ناں....." دوسرے دن دوپہر میں زوہا گھر آئی تو سیدھی کچن میں دُرِ مکنون کے پاس چلی آئی۔ ایکسائٹمنٹ سی تھی۔ پاپا نے کہا تھا کہ وہ درمکنون سے بات کرے لہٰذا اس نے آتے ہی سیدھے سبھاؤ سوال کر لیا تھا۔

درمکنون تو جیسے تیار ہی بیٹھی تھی۔ ایک ہی سانس میں بول گئی جو بولنا تھا۔

"وجہ.....؟" درمکنون کے ہاتھ سے مٹر کی تھالی لیتے ہوئے زوہا نے سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر استفسار کیا۔

جواباً وہ پلکیں جھپک، جھپک کر آنکھوں میں اترتی نمی سے لڑنے لگی۔

"میرا دل نہیں چاہتا..... بس....."

بے بسی اور بیچارگی سے کہتی درمکنون پر زوہا کو یک دم ترس آ گیا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سامنے والی کرسی پر لا بٹھایا۔

"دل کی آخر کب تک سنو گی دُرِ مکنون..... دل تو تمہارا یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم شیرازی ولا میں رہو۔ دل تو تمہیں اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ تم اپنے والدین کے بغیر جیو..... دل تو تمہارا یہ خواہش بھی نہیں رکھتا کہ میمی کے تلخ و ترش، طعنے اور طنز تمہیں سننے کو ملیں..... مگر دل کے نہ چاہنے پر بھی یہ سب تم برداشت کر رہی ہو ناں....." ہمدردی اور دلگیری سے کہتی زوہا نے ایسی تلخ حقیقت بیان کی تھی کہ وہ تردید بھی نہیں کر سکی تھی۔ بے دردی سے لب کچلتے ہوئے چپ سی ہو گئی۔

"تو پھر یہ طے ہوا دری کہ محض جذبات کے سہارے زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ پہلے ہی تمہارے تین سال ضائع ہو چکے ہیں کیوں اپنا ٹیلنٹ ضائع کر رہی ہو بہت ذہین ہو تم، بہت آگے جا سکتی ہو۔ دیکھو ہمارے بڑے سدا ہمارے ساتھ نہیں رہتے۔ ہمیں اپنے پیروں پر اس لیے کھڑا ہونا پڑتا ہے کہ جب ہمارے بڑے ہم سے بچھڑ جائیں تو ہم اس وقت تک جینے کا ڈھنگ سیکھ چکے ہوں....." اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے ہاتھ تھام کر بہت پیار اور محبت سے زوہا اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ زوہا کا انداز مدلل اور پُرزور تھا۔

"عکرمہ گھر کا فرد ہے..... تمہیں بھی اس سے کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔ بلیو می وہ بہت نائس اور نرم خو بندہ ہے.....

Digitized by Google

بہت ذہین ہے وہ، تمہیں بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا اس سے...... وہ بہت لائق ہے۔ تمہیں پڑھانے کی ذمّے داری لی ہے اس نے تو دیکھنا تمہیں کچھ نہ کچھ بنا کر ہی چھوڑے گا۔ گھر سے باہر جانا بھی نہیں ہوگا تمہیں کہ تمہیں ٹینشن ہو لہٰذا اب تم عکرمہ سے بکس ڈسکس کرلو۔ بی کام پارٹ ون کے ایڈمشن شروع ہونے والے ہیں۔ تم پرائیویٹ کرلو گریجویشن......" زوہا نے تفصیل سے کہتے، کہتے گویا یک دم حتمی انداز اختیار کیا تو دُرِمکنون سٹپٹا کر اس کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔

"مگر...... میں......"

"اگر مگر کچھ نہیں......" اس نے کچھ کہنا چاہا تو زوہا نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"دیکھو ساری زندگی تم کچن میں نہیں گزار سکتیں...... یہ ایک عارضی پناہ گاہ ہے...... زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالو اور سمجھنے کی کوشش کرو کہ آخر ہم تمہیں کیوں فورس کر رہے ہیں۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے...... مگر اب میرا ذہن بھی میرے قابو میں نہیں...... اور پڑھنے کے لیے اگر رجحان ہی نہ ہو تو بھلا کس طرح اسٹڈی ہوسکتی ہے۔" وہ اپنے اوپر جیسے سارے اختیار کھو چکی تھی۔ لاچاری سے کہنے لگی۔

"تو پھر تو ایک ہی حل ہے اس مسئلے کا......" اس کی بات پر گہری سانس بھرتے ہوئے قدرے توقف سے زوہا نے کہا تو وہ چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"تم شادی کرلو......" یہی ایک آخری تیر بچا تھا اس کے پاس...... بالآخر اسی کو آزمانے کا ارادہ کیا۔

دُرمکنون کا تو لفظ 'شادی'...... سن کر جیسے سارا خون ہی نچڑ گیا تھا یکلخت۔

"پلیز...... زوہا باجی...... ایسا تو کبھی سوچیے گا بھی نہیں......" اس کی کرب میں ڈوبی آواز جیسے گہرے کنویں سے آئی تھی۔ نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی جیسے کوئی انتہائی اذیت ناک منظر دیکھ رہی تھیں۔

"تو پھر تعلیم شروع کردو......" زوہا نے لوہا گرم دیکھ کر ضرب لگائی تو دُرمکنون نے گلہ آمیز نظریں اس پر جمادیں۔

"دیکھو...... پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی...... تمہاری فکر میں روز بروز اور بھی کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے پاس دو ہی آپشنز ہیں...... یا تو تمہاری شادی کرادیں یا پھر اگر تم اس کے لیے تیار نہیں ہو تو تمہیں تمہارے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے تمہاری تعلیم مکمل کرائیں۔ اب تم ہی بتاؤ تمہیں کون سا آپشن منظور ہے......"

وہ متذبذب سی اس پر نظر جمائے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گلہ بھی تھا اور امید بھی کہ شاید زوہا کا ووٹ اس کے حق میں ہوجائے......

زوہا نے اپنائیت سے ہلکی سے ڈانٹ کے ساتھ سمجھایا اور پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔

"بس اب زیادہ بوجھ مت ڈالو اپنے ذہن پر...... میں پاپا کو بتانے لگی ہوں کہ تم راضی ہو، عکرمہ تمہارے لیے بی کام پارٹ ون پرائیویٹ کا فارم لے آئے گا، تم فل کرلینا...... اوکے...... چلو شاباش اب اس خوشی میں اچھی سی چائے بنا کر پلاؤ۔" اسے گہری سوچ سے نکالنے کے لیے زوہا نے ہلکا پھلکا انداز اپنایا اور اسی وقت موبائل سے مظفر صاحب کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

دُرمکنون کے اندر خاموشی کی چادر سی بچھ گئی تھی۔

"چلو جو ہو رہا ہے اسے ہونے دیتے ہیں، پہلے بھی جو ہوا اس میں میری رضا شامل نہ تھی...... لہٰذا اگر اب بھی میری خواہش کے خلاف کچھ ہو رہا ہے تو اس میں کون سا حرج ہے...... کم از کم اس سے میرے محسن تو خوش ہوں گے...... آخر انہیں بھی تو خوشی دینی ہے مجھے...... جنہوں نے میری خاطر یہ 'دکھ' مول لیا ہے۔" چائے کی کیتلی برنر پر رکھتے ہوئے وہ خود کو سمجھا رہی تھی اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی تھی۔

زوہا اس کی خاموشی سے رضامندی کا عندیہ پا گئی تھی جبھی خوش، خوش باہر نکل گئی۔

Digitized by Google

"خیریت، زوہا کو کیا ہوا ہے...... بڑی خوش لگ رہی تھی۔" سائرہ بیگم ڈرائیور کو ہدایات دے کر اندر آئیں تو اوپر جاتی زوہا کے چہرے پر نظر پڑی۔

سامنے کھڑی ردا کے چہرے پر بھی مسرت کا تاثر تھا۔

"ان فیکٹ زوہا نے 'دُرِمکنون' کو آگے پڑھنے کے لیے کنونس کرلیا ہے اس لیے بہت خوش ہے وہ......" ہلکی سی مسکراہٹ سمیت اس نے ماں کے سوال کا جواب دیا تو حسبِ سابق ان کی بھویں تن سی گئیں۔

"پتا نہیں...... باپ بیٹی کو کیوں اس قدر خوش فہمی ہے کہ وہ لڑکی پڑھ ہی لے گی، ٹھیک ہے کبھی پوزیشن ہولڈر رہی ہے وہ مگر اس وقت جو اس کی ذہنی حالت ہے وہ بھلا کسی سے چھپی ہے۔ ارے اس کا دل مردہ ہوچکا ہے...... جس کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہوجائے، وہ جیتے جی مر جاتا ہے...... بھلا مُردوں میں بھی جان ڈالی جاسکتی ہے۔" انتہائی بے حسی سے وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

ردا خاموشی سے سیب کھانے میں مشغول رہی کہ ماں سے اختلاف کرنے کی اسے عادت تھی، نہ وہ ایسا کرنا پسند کرتی تھی۔

"اب یہ لوگ زبردستی اسے پڑھانے چلے ہیں اس لڑکی کو جسے آئے دن فٹس پڑتے ہوں، جسے اعصابی دوائیں دی جا رہی ہوں...... بلاوجہ کا خرچہ کر رہے ہیں اس پر...... تمہارے باوا اور یہ ان کی لاڈلی......"

وہ زوہا سے بھی سخت کبیدہ تھیں۔ جبھی ردا بہن کی طرفداری کرنے آگے بڑھی۔

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے ممی...... ہوسکتا ہے کہ واقعی 'دُرِمکنون' کی لائف سیٹل ہوجائے کہتے ہیں خالی دماغ شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے...... سارا دن فارغ بیٹھی رہے گی تو کبھی، کبھی یادوں سے چھٹکارا نہیں پاسکے گی۔ یوں بھی آپ اس بات کو پازیٹولی دیکھیں ممی وہ پڑھ لکھ لے گی...... اپنے پیروں پر کھڑی ہوجائے گی تو ایک طرح سے پاپا کی ذمّے داری کم ہی ہوگی ناں......"

ماں کی کسی حد تک نبض شناس تھی وہ...... مگر اس وقت ان کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

"رہ گیا خرچے کا مسئلہ...... تو پاپا نے 'دُرِمکنون' کا لاہور والا گھر رینٹ (کرایے) پر دیا تو ہے...... وہاں سے کچھ نہ کچھ تو آتا ہی ہوگا۔"

دروازے سے اندر آتے عکرمہ کے قدم ماں بیٹی کی باتیں سن کر ٹھٹک سے گئے تھے۔ ساتھ ہی ان کی گفتگو سے یہ بھی پتا چلا کہ 'دُرِمکنون' نے آگے پڑھنے کا فیصلہ کرلیا ہے...... جبکہ وہ دونوں اس کی آمد سے بے خبر باتوں میں مگن تھیں۔

تاہم چچی جان کو دُرمکنون سے خدا واسطے کا بیر ہے...... اس کے بارے میں جان کر سخت متاسف ہوا تھا وہ۔

آج خلافِ توقع سب گھر پر تھے۔ شاپنگ کا پروگرام شام کو بنایا گیا تھا تاکہ زوہا کو بھی ساتھ لیا جاسکے۔

"ہاں تو تمہارا کیا خیال ہے...... کچھ بچتا بھی ہوگا اس میں سے؟ اس کی دوائیں اور ضروریات کی دیگر چیزیں بازار سے ہی آتی ہیں...... خاص طور پر ڈاکٹروں کی فیسیں اچھی خاصی بھاری ہیں۔ تمہارے پاپا بھی بڑے سے بڑے سائیکاٹرسٹ کے پاس لے کر جاتے ہیں اسے......" بیٹی کی بات پر وہ خاصا برا مان کر بولی تھیں۔

ردا نے کان دبا کر وہاں سے جانے میں ہی عافیت جانی...... وہ "دوسروں" کے لیے اپنی "ماں" کو ناراض کرنا افورڈ نہیں کرسکتی تھی۔

عکرمہ اس دوران خاموشی سے اوپر کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

......☆......☆......

اس کی روٹین کافی حد تک سیٹ ہوگئی تھی۔ اس روز ڈرائیونگ کلاسز سے واپسی پر اسے خاصی دیر ہوگئی تھی۔ اس پر ولی، اطہر اور منصور بھی مل گئے تو ڈنر باہر کرنے کا اچانک ہی پروگرام بن گیا۔ کال کر کے دادی کو اس نے اطلاع دے دی تھی۔

اپنے فیورٹ ڈھابا ہوٹل کا روایتی کھانا کھا کر وہ چاروں کافی دیر اپنا پرانا وقت ڈسکس کرتے اور خود پر ہنستے رہے۔

"کیا خوب صورت دن تھے یار وہ بھی۔" منصور نے گہری سانس بھر کر کہا۔

"خوب صورت تو اب بھی ہیں...... بس ہمارے زاویے بدل گئے ہیں۔ اب بیوی بچوں کے لیے سوچنا پڑتا ہے...... پہلے صرف اپنے لیے جیتے تھے۔" اطہر نے فلسفیانہ انداز میں سر جھٹکا تھا۔

"سو تو ہے...... ویسے تم دونوں کب سہرا باندھ رہے ہو؟" منصور نے سر ہلا کر اتفاق رائے کرتے ہی ولی اور عکرمہ کو مخاطب کیا۔

"کیوں، تمہیں ہماری آزادی سے جیلسی ہو رہی ہے......؟" ولی قہقہہ لگا کر ہنسا تو عکرمہ بھی مسکرا دیا۔

"بکو مت، ہم سنجیدہ ہیں۔ کیا پچاس سال میں جب سر گنجا اور منہ دانتوں سے خالی ہونے لگے گا تب لڑکی ڈھونڈنے نکلو گے۔" اطہر کافی فکرمند نظر آ رہا تھا۔ ڈپٹ کر بولا تو ولی پھر ہنس دیا۔

"میری منگنی تقریباً طے ہے۔ اس لیے امید ہے میں تو اگلے سال ہی فارغ ہو جاؤں گا...... تم اس عکرمہ کی فکر کرو جو اب تک چھڑا چھانٹ گھوم رہا ہے۔"

اب تو ولی کا رخ بھی اس کی طرف ہو گیا تھا۔ وہ خوشگوار انداز میں مسکرا دیا۔

"میرے یارو! میرے لیے فکرمند نہ ہو۔ میری دادی آج کل اسی مہم کو سر کرنے میں لگی ہوئی ہیں...... میری کزن کی شادی پر دور قریب کے سارے عزیزوں کو بلا رہی ہیں۔ ان ہی میں سے کسی نہ کسی کو چننے کا ارادہ ہے ان کا۔"

"گویا انتخاب وہ ہی کریں گی...... تمہارا کوئی رول نہیں ہوگا اس سوئمبر میں۔" منصور کو گویا شدید افسوس ہوا تھا۔ فکرمندی سے پوچھا۔

"دادی میرے مزاج کو سمجھتی ہیں...... اور مجھے ان پر پورا بھروسا ہے۔" اب کے وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

"اور اگر اُن کی پسند...... ان کا انتخاب تمہیں سمجھ نہ آ سکا پھر؟" اطہر نے سوال داغا۔

"پھر کیا...... میرا ایمان ہے، ہمارے بزرگ ہمارا بھلا ہی سوچتے ہیں۔ لہٰذا جیسے میرے والدین نے ارینج میرج کو نبھایا...... میں بھی نبھاؤں گا۔"

اس کا مطمح نظر قطعی طور پر واضح تھا۔

"سمجھوتا کرنے سے اچھا نہیں کہ تم اپنا فیصلہ اپنے ہاتھ میں لو......" ولی کا موقف بھی بڑا دوٹوک تھا۔

"نہیں یار...... دادی نے بابا اور ماما جان کے انتقال کے بعد میرے لیے بہت کچھ کیا ہے اور آج جب میں انہیں کچھ دے سکتا ہوں تو پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ یوں بھی ایک بار دادی کو انکار کیا تھا۔ آج تک انہیں ردا کے باہر بیاہنے کا قلق ہے...... اب میں مزید انہیں مایوس نہیں کر سکتا۔" وہ محبت اور سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ وہ تینوں چپ ہو گئے کہ اسے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ دادی کے معاملے میں انہیں پتا تھا وہ ایسا ہی ہے۔

اس کی واپسی خاصی دیر سے ہوئی۔ واچ مین نے گیٹ کھولا تو پورچ سے گاڑی غائب دیکھ کر اسے اندازہ ہوا چچا جان گھر پر موجود نہیں۔

"اتنی رات گئے کہاں جا سکتے ہیں؟" وہ سوچتا ہوا اندر آیا تھا۔

لاؤنج خالی پڑا تھا اور گھر میں مکمل اندھیرا تھا۔ ابھی وہ سیڑھیاں چڑھنے کا قصد ہی کر رہا تھا کہ گھٹی، گھٹی سی

Digitized by Google

سسکیاں اس کی سماعتوں سے ٹکرائیں۔

کچن کی طرف سے آواز آ رہی تھی۔ وہ اوپر جاتے، جاتے رک گیا۔

"چھوڑ دو مجھے...... دیکھو میرے پاس مت آنا......" یہ نسوانی آواز خوف اور دہشت سے بھرپور تھی۔ عکرمہ کا پورا وجود جیسے تھرا اٹھا۔ برق کی سی تیزی سے وہ کچن کی طرف لپکا۔

"پلیز میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں...... مجھے جانے دو...... میرے پاس مت آنا...... مجھے چھونا مت...... چھوڑ دو مجھے...... چھوڑ دو۔"

ایسی دلخراش چیخ تھی کہ عکرمہ جیسے آہنی اعصاب والے انسان کے دل کی دھڑکن بھی جیسے تھم سی گئی۔ کچن میں کوئی نہیں تھا۔ یہ چیخ کچن کے ساتھ والے کمرے سے آئی تھی۔ عکرمہ بہ سرعت کمرے کی طرف آیا۔

ادھ کھلے دروازے سے زیرو پاور کے بلب کی روشنی باہر آ رہی تھی۔ اس نے غضبناک تیوروں سمیت دروازہ پیچھے کی طرف دھکیلا تھا۔

مگر یہ کیا؟ کمرا تو خالی تھا۔ صرف دُرِ مکنون وہاں تھی۔

سامنے بیڈ پر کمبل کندھوں تک کھینچے ہوئے وہ سراسیمہ سی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ خوف سے تھر، تھر کانپتی وہ یقیناً کسی بھیانک خواب سے جاگی تھی۔

عکرمہ جو دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ جیسے اچھل ہی پڑی۔

"کک...... کون ہو تم......؟ پھر آ گئے تم، مت آنا میرے پاس...... پلیز چلے جاؤ یہاں سے...... چلے جاؤ...... رحم کرو مجھ پر......"

کمبل اپنے گرد لپیٹنے کی کوشش میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارتی...... وہ اب بلک، بلک کر رو رہی تھی۔

عکرمہ کے اعصاب جھنجنا اٹھے۔ تیزی سے بائیں جانب لگے بٹن کو پش کیا تو پورا کمرا روشنی میں نہا گیا۔

درمکنون اب بستر سے اتر کر پیچھے سرکتے، سرکتے دیوار سے لگ چکی تھی۔ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ بری طرح گڑگڑا رہی تھی۔ اس نے آنکھیں خوف اور دہشت کے باعث بند کر رکھی تھیں۔

عکرمہ پریشان سا اس کی جانب لپکا۔

"دیکھو، میں مر چکی ہوں اندر سے...... کچھ نہیں بچا میرے اندر...... پلیز مجھے میرے ماما بابا کے پاس جانے دو۔ مُردار تو حرام ہوتا ہے...... میں بھی ایک مردہ ہوں...... آخر کب تک مجھے قید رکھو گے...... پلیز جانے دو اب......"

"دُرِ مکنون...... درمکنون...... ہوش کریں......"

عکرمہ نے قریب آ کر پکارا...... مگر وہ تو جیسے ہوش کھو بیٹھی تھی۔ اسی طرح بلکتی رہی حتیٰ کہ نڈھال ہو کر ایک جانب ڈھلک گئی۔

"مائی گاڈ......"

عکرمہ کے تو اوسان خطا ہو گئے، بھاگ کر اوپر آیا...... اُدھر دادی بھی سو چکی تھیں۔ انہیں بادلِ ناخواستہ جگایا۔

"کک...... کیا ہوا بیٹا...... سب خیریت تو ہے؟"

عکرمہ کے چہرے سے جھلکتی تشویش اور پریشانی دادی کو سہما سا گئی۔

"پتا نہیں...... درمکنون کی طبیعت خراب ہو گئی ہے غالباً...... آپ پلیز نیچے چلیں، چچا جان لوگ بھی گھر پر نہیں ہیں......" وہ حد درجے سنجیدگی سے بولا تو دادی متردد سی نیچے چلی آئیں۔

کچن سے ملحقہ یہ کمرا کبھی اسٹور ہوا کرتا تھا۔

آج درمکنون کو اس تنگ کمرے میں اس حالت میں دیکھ کر اسے غایت درجے کے جلال اور شدید افسوس نے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

''دُرِی...... بیٹا دری...... ہوش کرو بچے......'' دادی اسے بے ہوش دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔ دادی نے اس کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی ہتھیلیاں مسلیں اور گھبرا کر مڑیں۔

''عکرمہ بیٹا...... جلدی سے پانی لے کر آؤ...... اور ہاں میری سائڈ ٹیبل کی دراز میں ایک ٹیبلٹ پڑی ہے وہ بھی لاؤ...... جلدی کرو۔''

عکرمہ متردد سا دونوں چیزیں لے کر کمرے میں آیا تو دادی آنکھوں سے بہتی نمی صاف کرتے ہوئے بہت دکھی لگ رہی تھیں۔

اس نے خاموشی سے پانی دیا تو انہوں نے درمکنون کے چہرے پر چھڑکا۔ ذرا دیر کی کوشش سے وہ کسمسانے لگی۔ تب بھی بڑبڑاہٹ جاری رہی۔

''مجھے چھوڑ دو...... ظالم درندے...... یا اللہ مجھے بچا...... یا میرے مالک...... مجھے اس درندے سے نجات دلا دے۔''

''درمکنون...... بیٹا آنکھیں کھولو...... دیکھو تو میں ہوں تمہارے پاس۔'' دادی نے روتے ہوئے اسے سینے میں بھینچ لیا تھا۔

عکرمہ نے انگوٹھے سے پیشانی مسلتے ہوئے نیم بے ہوش درمکنون کی طرف دیکھا۔ آج کچھ، کچھ اندازہ ہوا کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ ہوا تھا۔ آج سمجھ میں آیا کہ وہ ''مردوں'' سے اس قدر خوفزدہ کیوں تھی...... کیوں اس کی خود اعتمادی صفر ہو چکی تھی۔ کیوں تمام گھر والے اس ''حادثے'' کے بارے میں بات کرنے سے کتراتے تھے۔ کیسی اذیت سے گزری تھی وہ لڑکی۔ اس کا خون جیسے کنپٹی کی شریانوں میں ٹھوکریں مار رہا تھا۔

''درمکنون...... بیٹا دیکھو، دادی ہے تمہارے پاس۔''

دادی نے اس کے پسینے سے بھیگے حسین چہرے سے ڈارک براؤن بالوں کی لٹیں ہٹاتے ہوئے کچھ ایسی محبت اور اپنائیت سے کہا کہ ایک لمحے کے لیے عکرمہ بھی حیران رہ گیا۔ ایسا محبت اور شفقت سے لبریز لہجہ اس نے ہمیشہ صرف اپنے لیے سنا تھا۔

درمکنون نے بالآخر نمکین پانی سے لبریز آنکھیں بہ مشکل کھولیں۔

''دادی...... دادی...... آپ......'' وحشت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس نے جو دادی کو پاس پایا تو...... بے ساختہ ان سے لپٹ گئی۔

''مجھے بچالیں دادی...... مجھے بچالیں دادی...... یہ دیکھیں میرے بازو......'' یک دم اس نے روتے، روتے ان سے خود کو الگ کرتے ہوئے اپنے بازو ان کے سامنے کیے اور پھر جیسے خود ہی چونک گئی۔

''وہ نشان...... وہ نشان کہاں گئے؟'' سوالیہ نظریں دادی کی طرف اٹھائیں تو جیسے آہستہ، آہستہ وہ ماضی سے نکل کر ''حال'' میں لوٹی اور پھر ایک دم دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

''بھول جاؤ سب...... میری بچی...... اب ہم سب ہیں ناں تمہارے ساتھ۔'' دادی بھرائی ہوئی آواز میں اسے دلاسا دینے لگی تھیں۔

''میں برباد ہو گئی دادی...... مجھے کیوں زندہ رکھا ہے اللہ نے...... وہ مجھے بلا کیوں نہیں لیتا اپنے پاس...... جیسے میرے ماما، بابا کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا تھا اس نے...... میرے اس ناپاک وجود سے اس دنیا کو پاک

کیوں نہیں کر دیتا میرا رب دادی...... کیوں نہیں آخر کیوں نہیں......؟ بھلا مجھ جیسی لڑکی کو زندہ رہنے کا کیا حق...... کیا ضرورت ہے میری اس دنیا کو......'' اس کی ہچکیاں دھیرے، دھیرے گھٹی، گھٹی چیخوں میں بدلنے لگی تھیں۔

دادی نے ڈبڈبائی نظروں سے عکرمہ کو دیکھا جو اس تکلیف دہ صورتِ حال پر لب بھینچے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اتنے کشیدہ تھے کہ دادی ایک نظر سے زیادہ اسے دیکھ نہ سکیں۔

''بیٹا دوا لے لو......'' وہ دُرِمکنون کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے بولیں۔

عکرمہ نے ان کے کہتے ہی کسی معمول کی طرح ٹیبلٹ نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھی۔

درمکنون اس دوران بس تڑپ، تڑپ کر روتی رہی۔ اس سے پہلے کہ وہ عکرمہ کی موجودگی سے آگاہ ہوتی وہ تکلیف دہ سوچوں سمیت باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد دادی کمرے سے باہر نکلیں تو اسے جینز کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے پایا۔

''کیا حال ہے اب......؟'' وہ لپک کر ان کے پاس آیا اور بے حد تشویش اور تفکر سے پوچھا۔

''پتا نہیں...... شاید روتے، روتے نڈھال ہو گئی ہے...... اس لیے چپ چاپ دوا کھا کر لیٹ گئی۔''

''تو آپ انہیں وہاں چھوڑ کیوں آئیں۔ اپنے کمرے میں لے چلیں...... یہاں نیچے اکیلے چھوڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ پتا نہیں چچا جان لوگ کہاں گئے ہیں۔'' وہ بہت فکرمند ہو رہا تھا۔

''ردا کی سسرال میں کوئی فنکشن ہے...... وہیں گئے ہیں۔''

''تو انہیں اکیلا کیوں چھوڑ گئے؟'' وہ سخت کبیدہ خاطر ہو رہا تھا۔

''بس بیٹا...... وہ خود بھی تو جانا نہیں چاہتی ناں...... لوگوں سے دور بھاگتی ہے......''

''ہر بیمار انسان دوا سے بدکتا ہے تو کیا معالج علاج کرنا چھوڑ دے؟ درمکنون کو انسانوں اور ان کے اچھے رویّوں کی ضرورت ہے، محبت کی ضرورت ہے۔ یہ تنہائی...... یہ اکیلا پن تو انہیں اور بھی زندگی سے دور کر دے گا......'' وہ جھلا کر بولا پر لہجہ جلال سے بھرپور تھا۔

دادی گم صم سی درمکنون کے پاس پلٹ گئیں اور چند ثانیے بعد اسے باہر لا کر اوپر جاتی نظر آئیں تو وہ خود بھی اوپر آ گیا۔

''شاباش بیٹا...... اب آرام سے سو جاؤ...... میں ہوں ناں تمہارے پاس۔''

آیت الکرسی اور معوذتین پڑھ کر اس پر دم کیا اور اپنے قریب ہی بستر پر لٹاتے ہوئے انہوں نے بہت پیار سے کہا تھا۔

کچھ تھا ان کے لمس میں اور کچھ دوا کا بھی اثر تھا۔ اگلے دس منٹ میں وہ گہری نیند سو چکی تھی۔

عکرمہ کے موڈ کے باعث دادی کو اس کی بڑی فکر تھی...... درمکنون کے سوتے ہی وہ باہر آئی تھیں۔

''وہ اب ٹھیک ہے بیٹا...... لہٰذا تم بھی اب جا کر سو جاؤ، رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔ جاؤ جا کر آرام کرو...... صبح کے تھکے ہارے اب گھر آئے ہو۔''

''اتنی رات ہو گئی، چچا جان اب تک واپس نہیں آئے......؟''

''شادیوں میں آج کل اتنی دیر تو ہونے لگی ہے بیٹا...... شہر کے حالات اس قدر خراب ہونے پر بھی لوگوں کی یہ روٹین ہے۔''

''لوگ تو بے حس اور عاقبت نا اندیش ہو گئے ہیں دادی...... کسی کو احساس ہی نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے۔'' سلگتے ہوئے لہجے میں کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

Digitized by Google

"شب بخیر..... آپ سو جائیں جا کر..... اگر رات میں کوئی مسئلہ ہوا تو مجھے بلا جھجک اٹھا لیجیے گا۔"

"اچھا بیٹا....."

دادی جانتی تھیں وہ اندر سے کس قدر حساس اور نرم دل ہے۔ ماں باپ کی بے وقت موت نے اسے بہت حساس بنا دیا تھا۔ کسی کے بھی دکھ اور تکلیف پر وہ ایسے ہی بے چین ہو جاتا تھا۔ لہٰذا اس وقت اس سنگین صورت حال پر اس کے دل و دماغ کی کیا حالت ہوگی۔ دادی اس سے بخوبی واقف تھیں۔

ابھی چند گھنٹے پہلے دوستوں کی سنگت میں اس نے جو لطف کشید کیا تھا وہ اس وقت سخت بے چینی اور غصے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ کپڑے تبدیل کر کے بیڈ پر آتے، آتے اس کا ذہن مسلسل سوچتا رہا تھا۔ درمکنون کے لبوں سے نکلا لفظ، لفظ جیسے اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ اس کا اذیت سے چُور لہجہ اور درد سے بوجھل وجود ابھی تک دل و دماغ میں دھماکے کر رہا تھا۔

کس قدر حسین اور خوب صورت لڑکی کی کس قدر بدصورت قسمت تھی۔ عکرمہ کی آنکھ یہ مشکل لگی کہ ذہن ایسی ناگوار صورت حال کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔

غالباً صبح ہونے کو تھی۔ دادی نے کچھ پڑھ کر اس پر دم کیا تھا کہ اچانک وہ نیند سے جاگ گیا۔ بہت ہوشیار نیند تھی اس کی آج۔

"دادی آپ..... سب ٹھیک تو ہے.....؟" نیند کے خمار سے سرخ ہوتی آنکھیں یک دم فکر سے بھر گئیں۔

"سب ٹھیک ہے بیٹا..... درمکنون سو رہی ہے آرام سے....."

دادی کے بتانے پر وہ کسلمندی سے اٹھ بیٹھا اور بیڈ کراؤن سے تکیہ لگا کر پشت اس پر ٹکا دی۔

"آپ کیا ابھی جاگی ہیں.....؟"

"بس سوتی جاگتی ہی رہی..... دُرِ مکنون نیند میں بھی مسلسل کچھ نہ کچھ بڑبڑا رہی تھی..... اس لیے آنکھ کئی بار کھلی..... بہر حال رات کتنی ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو..... بالآخر صبح تو ہونا ہی ہوتی ہے ناں بچے..... فجر کا وقت ہوا تو میں بھی بستر سے اٹھ گئی۔" انہوں نے بتایا تو وہ خاموشی سے انہیں دیکھنے لگا۔

"تم سو جاؤ بیٹا..... آج تو اتوار کا دن ہے چھٹی ہے تمہاری..... سکون سے نیند پوری کروا اپنی۔ وہاں نیچے بھی سب رات دو بجے کے بعد گھر آئے ہیں۔ سبھی دس، گیارہ سے پہلے نہیں اٹھیں گے۔ درمکنون بھی دوا کھا کر سوئی تھی..... اچھا ہے نیند پوری کرنے کا موقع مل جائے گا اسے بھی....."

کچھ تھا اس کے چہرے پر درج جسے دادی نظر انداز کرتے ہوئے کہہ گئیں۔

"کل رات آپ نے درمکنون کو کون سی دوا دی تھی دادی.....؟" وہ سوالیہ ہوا۔

"وہ ٹیبلٹ..... اعصاب پُرسکون کرنے کی دوا ہے بیٹا..... درمکنون کو سائیکاٹرسٹ نے دی تھی۔ شروع میں اس کو ایسے ہی فٹس اکثر پڑتے تھے پھر دھیرے، دھیرے ان کے درمیان وقفہ بڑھتا چلا گیا۔ اور اب اللہ کا شکر ہے کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا ہے۔ کل رات کو وہ نیچے گھر میں اکیلی تھی..... اس لیے خوف اور دہشت کے باعث کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہوگا..... جبھی یہ کیفیت ہوئی۔" وہ بڑی دردمندی سے بتا رہی تھیں۔

"تو کیا اب انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے بجائے صرف یہ ٹیبلٹ ہی دے دی جاتی ہے یا ہر دو تین ماہ میں follow up کے لیے لے جایا جاتا ہے؟"

"یہ تو مجھے پتا نہیں بیٹا..... یہ سب زوہا ہی سنبھالتی ہے۔ تم اسی سے پوچھ لینا۔ مجھے اسی نے بتایا تھا کہ کبھی ایسی صورت حال ہو تو اسے یہ دوا دے دوں۔" دادی سادگی سے بتانے لگیں۔

"ایسی دواؤں کا استعمال چند ماہ سے زیادہ نہیں کرنا چاہیے..... اپنی ویز میں زوہا سے بات کر لوں گا..... البتہ کل کے واقعے کے بعد مجھے مکمل یقین ہو گیا ہے کہ دُرِ مکنون کو ایک بار پھر تھراپی کی ضرورت ہے۔ وہ گھر کے کام کاج کرنے لگی ہیں، کھانا اچھا بنا لیتی ہیں۔ سب امور بہتر طور پر مینج manage کر رہی ہیں..... اس کا مطلب یہ نہیں کہ ذہن میں جو گتھیاں الجھ گئی ہیں وہ بھی سلجھ چکی ہیں۔" اس نے تجزیاتی انداز میں کہا تو دادی پیار سے اسے دیکھنے لگیں۔

کس قدر ہمدرد اور حساس دل تھا اس کا..... انہیں اسے اس طرح متفکر دیکھ کر اپنی تربیت صحیح ٹھکانے پر لگتی محسوس ہوئی۔

"صحیح کہہ رہے ہو بیٹا..... ہم نے تو ایسا سوچا ہی نہیں تھا۔"

"ویسے میرا خیال ہے ان کا اصل مسئلہ تنہائی اور اپنے قریبی رشتوں سے محروم ہو جانا ہے..... اگر انہیں محبت کے ساتھ زندگی کی طرف لایا جائے تو مجھے امید ہے کہ وہ ماضی کے تاریک غاروں میں بھٹکنے کے بجائے حال اور مستقبل کے بارے میں سوچنے لگیں گی۔"

وہ بہت ہمدردی سے کہہ رہا تھا۔ دادی بغور اسے دیکھنے لگیں۔

"تمہاری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے بیٹا..... مگر تمہیں سمجھ تو آ ہی گیا ہوگا کہ آخر اس کے ساتھ کیا ہوا..... ایک لڑکی کے لیے اس کی عصمت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا..... اور جب کوئی درندہ صفت انسان اس کے سر سے چادر کھینچ لے تو وہ خاک سے بھی زیادہ بے مول ہو جاتی ہے..... ماں، بیٹی کے غم میں ایسی سوئی کہ پھر اٹھ ہی نہ سکی۔ اکلوتی کم سن بیٹی کسی خزانے سے کم نہیں ہوتی..... صوفیہ برداشت نہ کر سکی اور برین ہیمرج اس کی جان لے کر ٹلا۔ ڈھائی ماہ تک زاہد میاں در در بھٹکے..... کئی اثر رسوخ والے لوگوں کو بیچ میں ڈالا..... تب کہیں جا کر اس زمیندار کے یہاں سے اسے بازیاب کرایا گیا..... مگر جب وہ ملی تو سترہ سال کی الہڑ سی درمکنون نہیں ستر سالہ بوڑھی سے بھی بدتر حالت میں تھی۔ زاہد میاں تو صوفیہ کے غم اور بیٹی کے اغوا سے ویسے ہی نڈھال تھے..... اسے یوں تباہ و برباد دیکھ کر خود پر قابو نہ رکھ سکے۔ ایسے تکلیف دہ حالات میں ایک دن درمکنون کو ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے تھے کہ ایکسیڈنٹ میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔"

دادی بتاتے، بتاتے رونے لگی تھیں..... عکرمہ نہایت مضبوط اعصاب کا مالک ہونے کے باوجود اس وقت ذہن کو منتشر محسوس کر رہا تھا۔

"اس روز درمکنون کا سکتہ ٹوٹا تھا جب اس نے اپنے باپ کو کفن میں لپٹا دیکھا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن..... اس کے آنسو نہیں رکتے..... اپنی بربادی اور ماں باپ کی موت نے اسے اس قدر کمزور بنا دیا ہے کہ اس کی شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ ایسے میں تم ہی بتاؤ بیٹا اس کا کیا بنے گا؟" وہ سرد آہ بھر کر بولیں۔

"مایوسی کفر ہے دادی..... اللہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے....." اس نے حوصلہ دینے والے انداز میں کہا۔

"میں مایوس نہیں بیٹا..... مگر گزرے سالوں میں، میں نے زوہا اور مظفر میاں کے ساتھ مل کر اسے زندگی کی طرف لانے کے بہت جتن کیے مگر درمکنون کو اس اذیت سے نجات نہیں دلا سکے ہم۔ سچ کہوں تو کبھی، کبھی بہت فکر مند ہوتی ہوں میں کہ آخر اس کی زندگی کیسے گزرے گی..... کیسا سنہرا وجود ہے اور کیسے سیاہ نصیب....."

دوپٹے کے پلو سے آنسو خشک کرتے ہوئے دادی کسی ماں کی طرح پریشان ہو رہی تھیں۔ عکرمہ نے تسلی دیتی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"آپ فکر مت کریں دادی، اللہ تعالیٰ سب بہتر کرے گا..... سب سے اہم ان کی صحت ہے..... میرا خیال

Digitized by Google

ہے کہ زوہا کو دوبارہ ڈاکٹر کے ساتھ درمکنون کی سٹنگز (Sittings) کرا دینی چاہئیں۔"

"ہوں..... میں اسے فون کرتی ہوں آج....." پُرخیال لہجے میں کہتی ..... وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "تم چاہو تو سو جاؤ بیٹا....."

"نہیں دادی..... نیند نہیں آ رہی اب..... آپ چلیں میں فجر پڑھ کر آتا ہوں۔"

اتنا کچھ جان کر نیند کیسے آنی تھی۔ وہ ذہن پر بوجھ سا لے کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ صرف سن کر ہی اس کی نیند اُڑ گئی تھی تو جس پر بیتی تھی اس کی حالت کیا ہوگی وہ سوچ کر ہی متاسف ہو گیا تھا۔ کسلمندی سے کُرتے کی آستینیں فولڈ کرتا وہ واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"اماں آج ناشتا آپ کیوں بنا رہی ہیں..... دُرِمکنون کہاں ہے؟"

سائرہ ناشتے کے لیے کچن میں آئیں تو اماں کو کچن میں مصروف پایا۔

"اس کی طبیعت رات اچانک خراب ہو گئی تھی..... سو رہی ہے..... تمہیں تو معلوم ہے اس دوا سے نیند بہت آتی ہے..... کل بہ مشکل سنبھالا تھا میں نے....."

"ہوا کیا تھا.....؟" بیزاری کا عنصر غالب تھا آواز میں۔ ان کی سنگدلی پر کڑھتے ہوئے انہوں نے رات کی تفصیل بتا ڈالی۔

"کمال ہے کچھ دنوں سے تو ٹھیک چل رہی تھی..... اب اچانک کیا ہو گیا۔ اس لڑکی کو بھی لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بلاوجہ ٹینشن دینے کی عادت پڑ گئی ہے....." بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے ناشتے کے لیے اُن کی مدد کرانی شروع کی۔ کیونکہ کچن ہیلپر صبح صبح نہیں آتی تھی۔ اس دوران سب ناشتے کی میز پر آ گئے تھے۔

سیف کے بلانے پر وہ بھی چلا آیا مگر تیور خاصے کشیدہ تھے۔

"اماں رات آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں..... کچھ ایسا ضروری فنکشن بھی نہ تھا کہ میں چھوڑ کر واپس نہیں آ سکتا تھا....."

ناشتے کی ٹیبل پر چچا جان نے دُرِمکنون کی غیر موجودگی پر استفسار کیا تو ساری تفصیل سننے کو ملی..... جو ابا وہ بہت بے چین ہو گئے تھے۔

"میں نے سنبھال لیا تھا بیٹا..... عکرمہ بھی تھا گھر پر..... اس لیے تمہیں ڈسٹرب کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی..... اگر خدانخواستہ کچھ زیادہ ہوتا تو میں تمہیں اطلاع کرتی مگر وہ جلد سنبھل گئی تھی....."

"اب کیسی ہے وہ..... سو رہی ہے کیا.....؟" مظفر صاحب اس کے لیے یک دم فکرمند ہو گئے تھے۔ ناشتا چھوڑ کر اٹھنے لگے۔

"ہاں سو رہی ہے..... جبھی تو سائرہ اور میں نے ناشتا بنایا ہے..... تم اطمینان سے بیٹھ کر ناشتا کرو..... میں زوہا کو فون کروں گی کہ وہ ڈاکٹر کے پاس لے جائے..... ویسے اب وہ ٹھیک ہے بیٹا۔" دادی نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"جب ٹھیک ہے تو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ نفسیاتی امراض ٹھیک نہیں ہوتے۔ بس ڈاکٹروں کی جیبوں میں فیسیں بھرتی رہتی ہیں۔" چائے کا سپ لیتے ہوئے سائرہ بیگم یکدم تڑخ کر بولیں۔

سیف اور رداچپ چاپ ناشتا کر رہے تھے۔ عکرمہ کا سارا دھیان تینوں بڑوں کی طرف تھا۔ ناشتے کو مطلق دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو سائرہ..... ارے وہ بھی سارا دن تمہاری خدمت کرتی ہے..... کم از کم اس کا معاوضہ سمجھ

کر ہی کبھی ہمدردی کر لیا کرو اس کے ساتھ....." چچا جان جیسے تڑپ سے گئے تھے۔

"لو تو میں نے کون سا بھالا دے مارا ہے اسے..... ایک صحیح بات ہی تو کی ہے۔ آپ تو مجھ پر یوں برسنے لگتے ہیں جیسے درمکنون کے ساتھ ہونے والے ہر حادثے کی ذمے دار میں ہی ہوں ہونہہ....." چچی جان نے چراغ پا ہونے میں ذرا دیر نہیں کی تھی۔

ایک تو پہلے ہی صبح، صبح خالی پیٹ ناشتا بنانا پڑا..... ساس کچن میں موجود تھیں اس لیے مردت کے تقاضے تو نبھانے ہی تھے۔ اس پر شوہر کی اس متنازعہ لڑکی کے لیے ہمدردی بھری حمایت۔ ان کا غضبناک ہونا کچھ ایسا بعید از قیاس بھی نہ تھا۔

"حادثے کی نہیں..... مگر اب اس بچی کی ذمے دار تو ہو ناں تم..... اس کی صحت..... اس کی زندگی سے جڑے ہر معاملے کی ذمے داری تمہیں ہی سونپی ہے میں نے۔"

صبح، صبح یہ معاملہ طول نہ پکڑے اس لیے مظفر صاحب نے حسبِ معمول دھیمی آواز میں سمجھانے کی کوشش کی۔

"ذمے داری سونپی ہے تو اب مجھے ہی اسے نبھانے بھی دیں..... کیا کرنا ہے، کیسے کرنا ہے..... میں آپ سے بہتر سمجھتی ہوں....." جو ابا وہ مزید تڑخ کر بولیں تو عکرمہ سے مزید برداشت نہ ہو سکا۔

"لیکن اس طرح درمکنون کے علاج سے صرفِ نگاہ کرنا خود گھر کے ماحول کے لیے ٹھیک نہیں..... کچھ دنوں میں یہاں شادی ہے..... میرا خیال ہے ایسے میں درمکنون کو مکمل طور پر ٹھیک ہونا چاہیے۔" لہجے کو حتی الامکان دھیما رکھتے ہوئے اس نے یہ مشکل اپنا غصہ ضبط کیا تھا۔ با ادب نہ ہوتا تو شاید ابھی چچی جان سے اس کی بحث ہو جاتی۔

بات ہی کچھ ایسی کہی تھی کہ سائرہ بیگم بے اختیار اس کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔ درحقیقت اس بارے میں تو انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ عکرمہ کا جملہ سوچ کا نیا در وا کر گیا۔

"ٹھیک کہتے ہو بیٹا تم..... میں آج ہی اس کے لیے اپائنٹمنٹ لیتا ہوں۔"

عکرمہ سے متفق ہوتے ہوئے مظفر صاحب نے کہا تو سائرہ بددلی سے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا کر کچھ سوچنے لگیں۔

.....☆.....☆.....

کوئی ساتویں بار زاویار کے سیل فون پر بیل بجی تھی جو وہ جم جاتے ہوئے اتفاقاً لاؤنج میں ہی بھول گیا تھا..... ایک بار پھر بیل بجنا شروع ہوئی تو عاصمہ کو بالآخر کمرے سے باہر آنا پڑا۔

نہ جانے کون تھا جو اس قدر بے تابی سے لگاتار کال کیے جا رہا تھا۔

سیل فون تک پہنچتے، پہنچتے ایک بار پھر کال ڈراپ ہو گئی..... انہوں نے فون اٹھا کر دیکھا آٹھ مسڈ کالز تھیں..... ڈسپلے پر شہرین کا نام جگمگا رہا تھا..... اگلے ہی سیکنڈ اسکرین پر شہرین کے نام سے ایک پیغام ابھرا۔

"تم کہاں ہو زوی..... پلیز کال ریسیو کرو....."

عاصمہ کے حافظے میں یہ نام کہیں محفوظ تھا..... ابھی وہ کچھ سوچ ہی رہی تھیں کہ ایک بار پھر سے فون بجا..... یہ کال شہرین ہی کی تھی..... انہوں نے رابطہ بحال کر کے سیل فون کان سے لگایا۔

"اُف..... زوی کہاں ہو تم..... کب سے کال کر رہی ہوں..... کیا دن میں بھی سونے لگے ہو.....؟"

اس سے پہلے کہ وہ سلام کرتیں دوسری جانب سے شہرین نے بنا سلام کیے ہی سوال داغ دیا تھا.....

"السلام علیکم بیٹا..... ! سوری زوی تو گھر پر نہیں جم گیا ہوا ہے..... آپ کون.....؟"

شہرین کا نام اور زاویار کو اس قدر بے تکلفی اور اپنائیت سے زوی کہنا عاصمہ کو یقین دلا گیا تھا کہ کال لاہور

Digitized by Google

سے کی گئی ہے۔ تاہم ازلی نرم خوئی سے سلام کر کے جواب دیا...... شہرین ایک لمحے کے لیے ٹھٹک سی گئی...... پھر یک دم جوش سے بولی۔

''وعلیکم السلام عاصمہ مامی...... میں شہری ہوں...... کیسی ہیں آپ......؟''

عاصمہ مامی کے الفاظ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلے تھے۔

''شہرین کی مامی......'' ہونے کا ٹائٹل عرصہ ہوا وہ ٹھکرا کر نئی دنیا بسا چکی تھیں...... اس تلخ حقیقت کا خیال یک دم دونوں کو خاموش کر گیا۔

''سوری...... مجھے بالکل خیال نہیں رہا......'' شہرین نے ہونٹ دانتوں تلے دبائے...... ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ وہ شرمندہ ہو مگر اس وقت اسے درحقیقت پشیمانی ہوئی تھی۔

''اٹس اوکے......'' عاصمہ بیگم نے بردباری سے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

''تم سناؤ...... تم کیسی ہو شہری...... سب خیریت تو ہے ناں......؟'' ان کا اشارہ اس کے بے صبرے پن سے فون کرنے کی طرف تھا۔

''جی... جی...... الحمدللہ سب ٹھیک ہے...... زوی کال پر رسپانس نہیں کر رہا تھا تو میں تھوڑا پریشان ہو گئی تھی...... اِن فیکٹ مما، زوی سے ملنا چاہ رہی ہیں...... میں دراصل اسے اسی لیے کال کر رہی تھی......''

''تو تم لوگ کراچی میں ہو آج کل......!''

''جی سوا سال ہوا...... پاپا کی پوسٹنگ ہو گئی ہے یہاں...... زوی نے بتایا نہیں آپ کو......؟'' اس نے سوال کر لیا تھا پھر اُن کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی بول پڑی۔

''خیر اس نے کہاں بتانا تھا آپ کو...... مسٹر زیرو، زیرو سیون تو خود ایک مسٹری ہیں...... سمجھنے کے نہ سمجھانے کے......'' شوخی سے کہتی شہرین انہیں بھی مسکرانے پر مجبور کر گئی۔

''اینی وے...... میں خود اپنا تعارف کراتی ہوں...... پتا نہیں آپ کو یاد بھی ہوں گی یا نہیں...... میں شہرین ہوں...... میمونہ صاحبہ کی بیٹی اور آغا جان کی نواسی......''

''ہوں...... مجھے یاد ہو تم...... تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں...... جب تم چھٹیوں میں لاہور، انصاری ہاؤس آیا کرتی تھیں...... تو دن بھر آغا جان سے چھپ کر زوی کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں...... اور بعد میں جب تم مستقل وہاں رہنے لگیں تو زاویار سے پکی دوستی ہو گئی تھی تمہاری......''

''ہوں...... کتنے پیارے دن تھے ناں وہ مامی...... ہم ساتھ ہنسا کرتے تھے...... کھیلا کرتے تھے، خوش رہتے تھے...... اور اب......''

گہری سانس بھر کر شہرین نے افسردگی سے کہا...... اس بار بڑے آرام سے انہیں مامی پکارا تھا۔

''اب یہ حال ہے کہ زوی کتنے سالوں سے ہم سے ملا تک نہیں...... آپ کو معلوم ہے پورے تین سال گزر چکے ہیں اسے انصاری ہاؤس سے گئے...... اور اس تمام عرصے میں اس نے مڑ کر نہ خود کسی سے کانٹیکٹ کیا نہ ہی کسی کو کرنے دیا۔''

''ہوں، جانتی ہوں......'' عاصمہ کے لہجے میں پشیمانی سی تھی...... جیسے زاویار کی اس بے رخی کی وجہ وہ خود ہوں۔

''وہ تو تین مہینے پہلے اتفاقاً مجھے پی سی میں نظر آ گیا وہ...... اپنے کولیگز کے ساتھ تھا...... اس لیے شرافت سے اپنا سیل نمبر دے دیا مجھے...... ورنہ آج بھی کہاں ہو سکتی تھی آپ سے بات......'' شہرین کے لہجے سے خوشی عیاں تھی۔

''آپ سے تو خیر کیا، وہ تو مجھ سے بھی بات نہیں کرتا تھا، بڑی مشکل سے سفارتی تعلقات بحال ہوئے ہیں ہمارے۔''

''اچھا!'' عاصمہ کے لیے یہ ساری خبریں نئی تھیں۔

''اچھا خیر، آپ سنائیں...... آپ کہاں رہتی ہیں...... گھر میں کون، کون ہے...... آپ کیا کرتی ہیں وغیرہ، وغیرہ......''

طویل عرصے بعد بات ہو رہی تھی اس کی عاصمہ سے مگر انداز ایسا بے تکلفی بھرا تھا جیسے بچپن سے ان کے ساتھ رہتی آئی ہو۔

''میں یہیں بہادر آباد میں رہتی ہوں...... گھر میں میرے اور زوی کے علاوہ مہران ہے...... مومنہ کی شادی کر دی ہے اور عثمان اب اس دنیا میں نہیں ہیں......'' اس کے استفسار پر عاصمہ نے مختصر جواب دیا تھا۔

''اوہ، آئی ایم سوری...... اللہ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔''

''آمین......'' عاصمہ نے صدقِ دل سے کہا تھا۔

''اور مہران کیا کرتا ہے...... مومنہ کے کتنے بچے ہیں...... آپ کیسی لگتی ہیں اب......؟''

اب وہ اسٹارٹ لے چکی تھی...... اور پھر اس کال پر اس نے بہت کچھ جانا بہت کچھ بتایا...... عاصمہ بیگم اسے بچپن سے پسند تھیں...... سادہ سی...... نرم خو اور مہربان ''عاصمہ مامی''......

ان کے شہریار ماموں سے طلاق لینے کے بعد انصاری ہاؤس میں زاویار کے علاوہ اگر کوئی انہیں بھول نہیں سکا تھا تو وہ شہرین تھی...... اور آج اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی اسے ان کے اور اپنے مابین کوئی فاصلہ محسوس نہیں ہوا تھا۔

''نہ جانے کتنا بدل چکی ہوں گی آپ...... پتا نہیں اب میں آپ کو پہچان بھی پاؤں گی یا نہیں......؟''

''ضرور پہچان لو گی۔ آؤ میری طرف کسی دن۔'' اس کی بات پر انہوں نے کھلے دل سے پیشکش کی۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں کے مصداق اس کی تو جیسے دلی مراد بر آئی تھی۔

''سچ مامی کیا واقعی میں آپ کو ملنے آ سکتی ہوں؟'' بے یقینی سے سوال کرتی شہرین انہیں مسکرانے پر مجبور کر گئی۔

''ہاں بالکل۔''

''ویل...... یہ تو بہت ہی زبردست رہے گا......''

عاصمہ کی پیشکش پر وہ خوشی سے پھولے نہ سمائی تھی...... وہ زیرِ لب مسکرا دیں۔

''ہوں، تم ضرور آؤ......''

''شیور...... ایڈریس بتائیں اپنا......''

اور اگلے لمحے اس کی انگلیاں ان کا پتا لکھ رہی تھیں۔

......☆......☆......

اگلے روز جس وقت وہ گھر آیا۔ چچی جان، ردا کے ساتھ شاپنگ پر گئی ہوئی تھیں۔ سیف کالج سے لوٹا نہیں تھا اور چچا جان کی واپسی تو ہوتی ہی شام کو تھی۔

اوپر جانے کے خیال سے وہ سیڑھیوں کی طرف آیا تھا کہ اچانک سیڑھیوں پر بیٹھی وُرِ مکنون کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بڑے سے تولیے نما کپڑے سے سیڑھیوں کا پوچا لگا رہی تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہیں آپ......؟'' وہ اس کے سر پر جا کر بڑی حیرت سے بولا تھا۔

ورِ مکنون ویسے ہی اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کی اچانک آمد اور آواز پر بری طرح چونک کر کھڑی ہوئی۔

''جی...... وہ میں...... صفائی......''

''کس نے کہا ہے آپ سے......؟ یہ سب کرنے کے لیے...... تو میڈ آتی ہے ناں......''

URDU TUBE
Digitized by Google

درکمنون کے زرد پڑتے حسین چہرے پر نظر پڑی تو اس کا لہجہ آپ ہی آپ دھیما اور نرم ہو گیا۔

"جی..... مگر آج اس کی طبیعت خراب تھی....." اس نے چھٹی کر لی....." سر جھکا کر مجرموں کی طرح اس نے کچھ ایسے انداز سے کہا جیسے اس میں سارا قصور خود اس کا ہو۔

عکرمہ نے تاسف سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"اور آپ کی طبیعت کیا بہت اچھی ہے.....؟ غالباً کل پورا دن آپ کو بھی بخار رہا تھا۔ خود کو اہمیت دینا سیکھیے..... اگر آپ اسی طرح اپنا آپ لوگوں کے لیے نظر انداز کرتی رہیں تو ایک دن لوگوں کے دلوں سے آپ کی اہمیت ختم ہو جائے گی..... اس گھر میں اور بھی لوگ رہتے ہیں۔ اگر کام والی نہیں آئی ہے تو اس کی جگہ ضروری نہیں کہ آپ ہی تمام امور انجام دیں۔ جائیں جا کر آرام کریں اور آئندہ مجھے آپ کچن کے علاوہ کسی اور کام میں مصروف نظر نہ آئیں۔" حلاوت سے کہتے، کہتے اس نے اچانک ہی حکمیہ انداز اختیار کر لیا تھا۔

درکمنون جیسے کسی خیال سے نکل کر چونکی تھی..... سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"آج میں چچا جان سے بات کروں گا..... کل سے آپ پڑھائی شروع کریں گی۔ اسٹڈیز continue کریں اپنی اور اپنا پروفیشنل کسی کار آمد کام میں بھی لگائیں۔"

وہ تو اس سے یوں مخاطب تھا جیسے ان کے درمیان اول روز سے ہی ٹیچر اسٹوڈنٹ کا رشتہ رہا ہو۔ وہ کیا چاہتی ہے، کیا نہیں اس سے قطع نظر وہ اپنا فیصلہ سنا کر متانت سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر چلا گیا تھا۔

درکمنون کتنے ہی لمحے جیسے ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔

زوہا کے بعد یہ عکرمہ ہی تھا جس نے اس طرح بات کی تھی اس سے..... دوٹوک، انکار، اعتراض کی گنجائش چھوڑے بغیر.....

وہ سست قدموں سے چلتی کچن میں آ بیٹھی۔

عکرمہ کی نصیحت نے اس احساس کو کچھ اور مہمیز کیا کہ وہ "اب" کسی لائق نہیں رہی۔ تعلیم جاری رکھنا تو درکنار اس کے لیے اب کوئی بھی "ذہنی مشق" کرنا دشوار تھا۔

لگتا ہی نہیں تھا کہ کبھی وہ اس قدر ذہین بھی ہوا کرتی تھی۔ سی اے کرنا اس کا خواب تھا۔ بابا اور ماما نے اس کے ذہنی رجحان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی تعلیم پر بہت توجہ دی تھی۔ جب آئی کام میں اس کی دوسری پوزیشن آئی تھی تو کیسا زبردست فنکشن منعقد کرایا تھا بابا نے۔ دور قریب کے سب رشتے داروں کو بلایا تھا۔ حالانکہ ماما نے کتنا منع کیا تھا کہ ابھی اس قدر ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی اسے CA تو کرنے دیں مگر بابا کا تو فخر سے سر اس قدر اونچا کیا تھا اس نے کہ وہ کسی کی کچھ سننے کو تیار ہی نہ تھے۔

"سی اے بھی کر لے گی میری بیٹی..... ان شاء اللہ! ارے صوفی بیگم بہت ذہین ہے ماشاء اللہ میری لاڈلی..... دیکھنا بہت محنت سے پڑھے گی میری دری....."

بابا کا لہجہ خوشی اور تفاخر سے چور تھا۔ یقین کی روشنی سے معمور تھا۔

"ماشاء اللہ..... نظر نہ لگے کسی کی....." بابا کی بات پر ماما نے شفقت سے لپٹا لیا تھا اسے۔

"آہ مگر نظر تو لگ گئی ماما..... ہم سب کی خوشیوں کو کسی کی بدنظر کھا گئی ماما..... میں برباد ہو گئی ماما..... میں لٹ گئی۔"

ماضی کا سفر کرتے، کرتے اچانک حال میں واپس آنا اس قدر کربناک تھا کہ وہ تڑپ، تڑپ کر رو دی..... اور نہ جانے کتنی ہی دیر روتی رہی۔ ڈائننگ ٹیبل کی چکنی سطح پر ڈارک براؤن گھنے بالوں والا سر ٹکائے وہ اس بری طرح رو رہی تھی کہ اندر آتے عکرمہ کے قدم دروازے کی دہلیز پر ہی ٹھٹک گئے۔

اب جانے یہ اس کی نظروں کا ارتکاز تھا یا شاید وہ خود ہی روبرو کر تھک چکی تھی کہ اچانک اس نے سر اٹھایا۔ حسین گلابی مکھڑا آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ ڈبڈبائی نظریں سامنے اٹھیں تو اسے دروازے میں کھڑا دیکھ کر وہ یک دم سٹپٹا گئی۔ گلابی دوپٹے سے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ بلا ارادہ اس کی طرف سے رخ موڑ گئی۔

عکرمہ چند لمحوں کے توقف سے اندر چلا آیا۔

"دادی پوچھ رہی ہیں آپ نے کھانا کھا لیا ہے یا ابھی کھائیں گی؟"

اس صورت حال پر وہ جتنی شرمندہ ہو رہی تھی اتنا ہی رسانیت سے بھرپور انداز تھا عکرمہ کا۔

اسے لگا جیسے ابھی اسے روتے ہوئے نہیں بلکہ روزمرہ کے کام نبٹاتے ہوئے دیکھا ہے اس نے۔ کسی قدر حیرت سے مڑ کر عکرمہ کو دیکھتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"معاف کیجیے گا محترمہ..... میں سائن لینگویج سمجھنے میں خاصا نالائق واقع ہوا ہوں..... براہ مہربانی بول کر بتائیں کہ یہ نفی کا جواب میرے سوال کے پہلے حصے کے لیے ہے یا دوسرے حصے کے لیے.....؟"

کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے وہ یوں سوالیہ ہوا کہ آنسو صاف کرتی درکمنون نروس سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"انسان اگر اپنی کسی صلاحیت کا استعمال ترک کر دے تو سمجھ لیجیے اس کی اس صلاحیت کو زنگ لگ جاتا ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں آپ کو بولنا آتا ہے تو پھر بولا کریں..... کہہ دینے سے دل و دماغ پر چھایا غبار صاف ہو جاتا ہے تو پھر سامنے کا منظر اور بھی واضح اور صاف دکھائی دینے لگتا ہے۔ یوں بھی جب انسان بولتا ہے تو دماغ میں خیالات اور الفاظ کا دریا رواں ہونے لگتا ہے۔ خاموشی سوائے جمود کے کچھ اور نہیں دیتی انسان کو....."

درکمنون کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ بس ایک ٹک وہ اسے دیکھے جا رہی تھی۔ نصیحتیں کرنے کی غالباً اسے عادت تھی، کچھ پروفیشن کا بھی حصہ تھا۔

مگر اس وقت وہ جس اسٹیٹ آف مائنڈ میں تھی، اس کے لیے عکرمہ کی بات اور اس کا پس منظر سمجھنا محال تھا۔ اس کی تمام گفتگو جیسے سر پر سے گزر گئی تھی۔

عکرمہ نے اس کے سپاٹ چہرے کو دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ اس وقت وہ سوئی جاگی برابر ہے۔ جبھی اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اپنی وے آپ کھانا لگائیں..... دادی آ رہی ہیں۔"

یہ بات آسان تھی جبھی وہ سمجھ کر سر ہلا گئی۔ اوون کی طرف مڑنے لگی تھی کہ عکرمہ نے پھر سوال کر لیا۔

"آپ نے پوچھا نہیں کہ کھانا کتنے لوگوں کے لیے لگانا ہے؟"

"جی.....؟"

"مطلب یہ کہ دادی اور آپ کے علاوہ میں بھی تو ہوں آج لنچ ٹائم پر گھر میں۔" سینے پر بازو لپیٹے ہوئے وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"جی..... آپ بھی کھائیں گے.....؟"

بالآخر درکمنون نے ذہن کو حاضر کرتے ہوئے سوال کر ہی لیا تو ایک بے اختیار سی مسکراہٹ اس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں کا حصار کر گئی۔

"نہیں..... کھا کر آیا ہوں....." جواباً اس نے کہا تو وہ متحیر سی اسے دیکھنے لگی (کھا لیا تھا تو بھلا ایسے بولنے پر کیوں مجبور کیا)

مگر وہ اطمینان سے کہہ کر چلتا بنا تھا۔

Digitized by Google

.....☆.....☆.....

سائرہ بیگم، ردا اور زوہا حسبِ معمول آج بھی شاپنگ سے شام ڈھلے ہی واپس آئی تھیں اور کافی دیر لاؤنج میں ہلا گلا مچانے کے بعد سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے تھے۔

ڈنر کے بعد اس نے بھی کچن صاف کیا اور اپنے بستر میں چلی آئی۔

آج صبح سے کچھ زیادہ ہی کام تھا کچن میں، مظفر صاحب کے ایک دوست اپنی فیملی سمیت لنچ پر انوائیٹڈ تھے اور ان کے لیے سائرہ بیگم نے بالخصوص پکوان بنوائے تھے۔ وہ تھکی ہوئی تھی آرام کی غرض سے لیٹ گئی۔

''کون سے مضامین کا انتخاب کیا جائے؟''

آج کل یہ سوال پریشان کر رہا تھا۔

اب بھی اسی کے متعلق سوچ رہی تھی کہ سیف اس کے لیے دادی کا پیغام لیے چلا آیا۔

''آپ کو دادی بلا رہی ہیں.....''

''اچھا، میں آتی ہوں.....''

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

''ہوسکتا ہے انہیں کوئی کام ہو مجھ سے.....''

وہ قیاس لگاتی اوپر آئی تو لاؤنج میں عکرمہ ٹی وی کے آگے بیٹھا اپنے laptop پر مصروف نظر آیا..... نظروں کے تصادم پر سلام کرتے ہوئے وہ دادی کے کمرے میں داخل ہوگئی۔

''جی دادی..... آپ نے بلایا تھا.....''

''ہاں بیٹا..... میں نے ہی بلایا تھا.....''

ہیئر آئل کی شیشی الماری سے نکال کر دادی اس کے سامنے آبیٹھی تھیں۔

''سوچا تمہارے سر میں تیل کا مساج کر دوں..... بہت تھک گئی ہوگی ناں آج تم.....''

''نہیں دادی، پلیز اس کی ضرورت نہیں.....''

''پوچھا نہیں میں نے تم سے..... حکم دیا ہے تمہیں..... چلو بیٹھو.....''

دادی کے آگے اس کی ایک نہ چلی..... انہوں نے پیار سے ڈپٹا تو اسے خاموشی سے مساج کراتے ہی بنی۔

نرم، نرم انگلیوں کی گردش سے جیسے نیند سی آنے لگی۔

''آپ بہت اچھی ہیں دادی.....''

اس نے مڑ کر اُن کے ہاتھ تھامے اور لبوں سے لگا لیے۔

''جو خود اچھا ہوتا ہے اسے سب اچھے لگتے ہیں..... اچھائی سامنے والے سے زیادہ خود ہمارے اندر ہوتی ہے..... جبھی تو ہمیں سب بھلا لگتا ہے۔''

دادی نے محبت سے کہا تو ان کی کسرِ نفسی پر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دھیرے سے مسکرا دی..... ان کا دل رکھنے کی خاطر..... اسے دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے دادی نے اسے گلے سے لگا لیا..... وہ بھی آنسو چھپانے کی کوشش میں تھی..... ان کے کندھے سے لگ گئی۔

''میں اندر آسکتا ہوں دادی.....''

ہلکی سی دستک کے ساتھ ہی عکرمہ نے اجازت طلب کی تو وہ دونوں اپنے، اپنے آنسو ایک دوسرے سے چھپاتے ہوئے الگ ہوگئیں۔

Digitized by Google

''آجاؤ عکرمہ......''

دادی کے اجازت دینے پر وہ اندر چلا آیا تھا...... ہاتھ میں ایک فائل تھی۔

''سب ٹھیک ہے......؟'' آنکھوں ہی آنکھوں میں دادی سے سوال کیا۔

''ہوں...... تم بیٹھو......'' انہوں نے سر کے اشارے سے جواب دے کر بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ ان کے بیڈ کے سامنے ذرا فاصلے پر رکھی کین کی راکنگ چیئر پر بیٹھ گیا۔

''اور سنائیں دُرِ مکنون......''

دادی سے اِدھر اُدھر کی ایک دو باتوں کے بعد وہ ڈائریکٹ اس سے مخاطب ہوا تو وہ سنبھل کر متوجہ ہوگئی۔

''پھر کیا سوچا آپ نے اسٹڈیز کے بارے میں؟ سبجیکٹس کا انتخاب کرلیا آپ نے......؟''

سوال ہی ایسا تھا کہ وہ سٹپٹا گئی۔

آگے پڑھنا ہے یہ فیصلہ مظفر انکل کی خوشی کے لیے کر تو لیا تھا مگر کیا پڑھنا ہے اس بارے میں فیصلے کے لیے وقت ہی نہیں مل سکا تھا۔

''جی...... وہ......'' حسبِ معمول وہ اٹک سی گئی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ آپ نے آئی کام میں پوزیشن لی تھی...... اس لحاظ سے آپ کو کامرس ہی چننا چاہیے...... تاہم آپ کا aptitude اگر آرٹس کے لیے ہے...... تو ایز یو وِش۔''

اس نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا تو وہ ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گئی۔

''جی...... میں بی اے میں ایڈمشن لینا چاہ رہی تھی......'' کچھ دیر بعد وہ بولی۔

''چلیں یہ تو اچھی بات ہے کہ آپ نے ڈیسائڈ کرلیا...... اب کون سے سبجیکٹس لینے ہیں...... اس بارے میں کچھ سوچا......؟''

اس کے استفسار پر ایک لمحے کے توقف سے درِ مکنون نے جب سادگی سے نفی میں سر ہلایا تو وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

''تو اب سوچ لیجیے...... یہ میں آرٹس کے سبجیکٹس کی لسٹ لایا ہوں......'' اس کی طرف فائل بڑھاتے ہوئے عکرمہ نے کہا...... جسے تھامتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کی ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا تھا۔

کچھ لوگ ہنستے مسکراتے کتنے اچھے لگتے ہیں...... کتنی مکمل ہوتی ہے ان کی مسکراہٹ...... ان کے چہروں کا حسن بڑھانے والی بھرپور خوب صورت مسکراہٹ وہ کسی گہری سوچ میں چلی گئی۔

''آپ ان میں سے تین آپشنل سبجیکٹس منتخب کرلیں...... ویسے میں نے یہ تین سبجیکٹس چنے ہیں آپ کے لیے جن پر ریڈ مارک کیا ہوا ہے......''

وہ کہہ رہا تھا...... دادی نے دیکھا وہ کہیں گم ہو چکی تھی حسبِ معمول۔

''یہ لسٹ سنبھال لو بیٹا...... ابھی شاید تمہیں نیند آرہی ہے...... کل اطمینان سے بیٹھ کر سوچ لینا......''

اس کے کندھے کو انہوں نے نرمی سے چھوا تو وہ جیسے خود میں لوٹی۔

''آپ کہیں تو کل بتا دوں آپ کو......؟''

''آف کورس...... ! مجھے کوئی جلدی نہیں...... آپ اطمینان سے سوچ لیں...... ابھی ایک ہفتہ ہے لاسٹ ڈیٹ میں۔''

وہ اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا...... جواباً وہ سر ہلا کر دادی کی طرف مڑی۔

''تو میں چلوں دادی......؟''

Digitized by Google

"آج میرے پاس ہی سو جاؤ بیٹا....." عکرمہ کے جانے کے بعد انہوں نے اسے مخاطب کیا اور الماری سے تکیہ اور کمبل نکال کر دیا تو وہ چپ چاپ بستر پر لیٹ گئی اور تکیے پر سر رکھتے ہی آنکھیں موند لیں۔

تھکن کے علاوہ اس بات کا اطمینان کہ وہ کمرے میں اکیلی نہیں ہے اسے سیکنڈوں میں نیند کی وادی میں پہنچا گیا تھا۔

وادی واش روم سے باہر نکلیں تو دیکھا تکیے پر سر رکھے وہ کسی معصوم بچے کی طرح سو رہی تھی۔ اس کا خوب صورت کم سن چہرہ سوتے میں اور بھی معصوم لگ رہا تھا۔

"ماشاء اللہ..... کس قدر نور ہے اس بچی کے چہرے پر..... اے میرے رب اور کتنا اندھیرا ہے اس کی زندگی میں..... اسے کوئی ایسا چاہنے والا، پُرخلوص شریکِ سفر عطا فرما میرے مالک کہ یہ اپنی زندگی کے اس بدترین دور کو ہمیشہ کے لیے بھول جائے..... آمین ثم آمین!"

ان کے جھریوں زدہ گالوں پر خلوص کے آنسو پھسل، پھسل کر ان کے سفید دوپٹے میں جذب ہونے لگے..... اور دعائیں دل سے نکلنے لگیں۔ وہ لائٹ آف کر کے اپنی جگہ پر آلیٹیں اور نیند آنے تک ان کی نظریں درمکنون کے چہرے پر ہی بھٹکتی رہیں۔

.....☆.....☆.....

عاصمہ لاج کے گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بعد اچانک اسے گھبراہٹ نے آن گھیرا تھا۔

"نہ جانے عاصمہ مامی کس طرح ملیں مجھ سے..... اور وہ جنگلی بلا زوی..... اسے پتا چلا تو پتا نہیں کیسے ری ایکٹ کرے..... شاید مجھے ماما اور خولہ سے مشورہ کرنا چاہیے تھا....."

ملازمہ کی تقلید میں اندرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا..... اور پھر سر جھٹک کر رہ گئی کہ اب پیچھے ہٹنے کا وقت نہیں رہا تھا۔

ملازمہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر دروازے کی اس جانب غائب ہو گئی تو وہ دیوار پر لگی پینٹنگ کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں عاصمہ مامی کے ممکنہ ردِعمل کے بارے میں سوچنے لگی۔

مگر ابھی ٹھیک سے کچھ سوچ نہیں پائی تھی کہ کمرے میں وہ داخل ہوئیں.....

"السلام علیکم.....!" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"وعلیکم السلام.....! آپ.....؟" عاصمہ کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔

"جی..... وہ..... میں....."

"تم شہرین ہو بیٹا.....؟" اس سے پہلے کہ وہ اپنا تعارف کراتی عاصمہ اسے پہچان گئی تھیں۔

"جی..... میں شیری ہوں....." ان کے پہچاننے سے زیادہ ان کے مشفق لہجے نے اس کا دل خوش کر دیا تھا..... وہ کھل کر مسکرائی تھی۔

"ماشاء اللہ..... کتنی بڑی ہو گئی ہو تم....." عاصمہ نے نزدیک آ کر اسے خود سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

اس نے دیکھا وہ پرانی پتلی دبلی سی عاصمہ مامی اب ایک پُروقار شخصیت کا روپ دھار چکی تھیں..... بالوں کی لمبی چٹیا کی جگہ جوڑے نے لے لی تھی اور آنکھوں پر چشمہ لگ چکا تھا جو انہیں مزید وقار بخش رہا تھا۔

"اور خوب صورت بھی....." الگ ہوتے ہوئے انہوں تعریفی جملہ مکمل کیا تو وہ باقاعدہ ہنس پڑی.....

"تھینکس..... مگر آپ بالکل نہیں بدلیں..... ویسی ہی مشفق اور پیار کرنے والی ہیں اب تک..... ورنہ جو کچھ انصاری فیملی نے آپ کے ساتھ کیا..... آپ کو تو مجھے کھڑے، کھڑے گھر سے نکال دینا چاہیے تھا....."

شہرین بہت متاثر ہوئی تھی مگر سوچ سمجھ کر بولنے کی عادت ہی نہیں تھی اسے..... عاصمہ جھینپ گئیں۔

"ایسی کوئی بات نہیں بیٹا..... اور پھر مہمان تو مہمان ہوتا ہے ناں....."

"یہ مہمان بلائے جان بھی ہو سکتا ہے آپ کے لیے کراچی میں ایسا کوئی خاص سرکل نہیں بنا سکی میں اب تک گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ملے تو کچھ کرے انسان..... آج بھی فرنچ کی کلاس بنک کر کے آپ سے ملنے آئی ہوں..... لہٰذا آپ مائنڈ میک اپ کر لیں میں اکثر آیا کروں گی آپ کو تنگ کرنے....." اس نے بے تکلفی سے کہتے ہوئے ملازمہ کے لائے ہوئے ڈرنک بھرے گلاس کو اٹھا کر گھونٹ بھرا تو عاصمہ نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔

درمیانہ قد اور متناسب سراپا دلکش چہرے نے اس کی شخصیت کو قابلِ توجہ بنایا ہوا تھا۔

البتہ انداز میں جو لاابالی پن تھا اس نے انہیں مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"میں نہیں تنگ ہوتی مہمانوں سے..... اچھا ہی ہے تمہاری وجہ سے زوی کو بھی کمپنی مل جائے گی....."

"اس فضول انسان کو تو آپ رہنے ہی دیں..... اتنے سالوں بعد ملا تب بھی ویسا ہی سڑیل کا سڑیل تھا۔ مجال ہے جو اس نے خوش ہو کر بات کی ہو مجھ سے..... بالکل آغا جان پر گیا ہے..... بلکہ....."

یک دم اسے کچھ احساس ہوا تو زبان تالو سے لگا لی اور شرمندگی سے عاصمہ کی طرف دیکھا..... جو اس کی بات پر چپ ہو گئی تھیں۔

"اپنی وے..... آپ سنائیں آپ کیا کرتی ہیں.....؟"

"اسکول ہے میرا چھوٹا سا..... وہی چلاتی ہوں....." انہوں نے بتایا۔

"کیسا چل رہا ہے.....؟"

"اچھا ہے ماشاء اللہ سے..... مگر میں ریگولر نہیں جاتی وہاں..... بس ہفتے میں دو تین بار چکر لگا آتی ہوں..... ڈسپلن کنٹرول کرنے کے لیے....."

"ہوں..... گڈ..... کون سے گریڈ تک ہے آپ کا اسکول....."

"بس پرائمری تک..... اور تم سناؤ..... تمہاری کوالیفکیشن کیا ہے..... ہابیز کیا ہیں.....؟"

"میں نے BSc آنرز کے بعد ابھی ماسٹرز کا سوچا ہی تھا کہ ہم یہاں کراچی آ گئے تو پھر پڑھائی چھوڑ دی..... آج کل فرنچ سیکھ رہی ہوں..... اور تاتیکوانڈو کے لیے مما کو کنونس کرنے کی کوشش....."

"کیوں میمونہ کو پسند نہیں تمہارا تائیکوانڈو سیکھنا....." عاصمہ کو اس کے دلچسپ انداز نے متوجہ کر لیا تھا۔

"نہیں..... مسئلہ مما کا نہیں مگر جب تک جی ایچ کیو سے این او سی جاری نہیں ہو گی، اجازت نہیں ملنے کی....." اس نے لاابالی پن سے منہ بنا کر کہا تو عاصمہ کے چہرے پر حیرت در آئی۔

"کیا مطلب.....؟"

"ارے آپ کو نہیں پتا "جی ایچ کیو" یعنی انصاری ہاؤس کا..... وہیں سے پروانے جاری کرتے ہیں ہمارے آغا جان....." اب کے وہ ہنس دی تھی۔

"ہوں....." عاصمہ نے اس موضوع پر بات کرنا مناسب نہ سمجھا..... کئی سال انصاری ہاؤس کا حصہ بنے رہ کر اتنا تو وہ بھی جان گئی تھیں کہ انصاری فیملی کے لوگوں سے متعلق ہر فیصلہ کرنے کا اختیار صرف آغا جان کے ہاتھ میں تھا۔

"اچھا..... تم یہ کوکیز تو لو..... مومنہ نے خود بیک کیے ہیں....." عاصمہ نے اخلاقِ میزبانی کا مظاہرہ کرتے

Digitized by Google

ہوئے بیٹی کا ذکر کیا تو اس نے ایک کوکی اٹھا کر چکھی۔

''واؤ..... بہت ٹیسٹی ہے.....'' اسے واقعی پسند آئی تھی۔

''اور سناؤ..... گھر میں سب ٹھیک ہیں.....'' تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی جسے عاصمہ نے توڑا تھا۔

''جی الحمدللہ..... پاپا کی طرح طارق بھائی نے بھی آرمی جوائن کرلی ہے..... وہ آج کل کھاریاں میں ہوتے ہیں..... پاپا بھی تو اب ریٹائرڈ کرتل ہیں مگر ڈی ایچ اے کو ایز این انجینئر جوائن کر رکھا ہے..... اسی لیے ہم کراچی آگئے..... مما کا وہ ہی روٹین ہے..... سارا دن مجھے ڈانٹنا اور آغا جان اور پاپا سے میری شکایتیں کرنا..... بس ایک صنوبر خالہ ہیں جن کو میری فکر رہتی ہے.....''

''صنوبر کیسی ہے.....؟''

صنوبر کے ذکر پر عاصمہ کو بہت کچھ یاد آگیا تھا۔

''بہت سوئٹ ہیں وہ..... آغا جان کی تو بیٹی لگتی ہی نہیں مجھے.....'' پٹ نکلا تھا منہ سے..... عاصمہ کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آئی تھی..... جسے بہ مشکل ضبط کیا۔

''کہاں ہوتی ہے آج کل.....؟''

''پنڈی میں..... بہت اکیلی ہوگئی ہیں بیچاری..... ان فیکٹ دس سال ہوئے انکل نے بچے نہ ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کرلی تو وہ انصاری ہاؤس آگئیں ہمارے پاس..... مگر جب تین سال پہلے زوی بھی لاہور سے کراچی آگیا تو وہ واپس پنڈی چلی گئیں اور اب تو انصاری ہاؤس بھی بہت کم آتی ہیں.....''

عاصمہ کو دکھ ہوا یہ سب جان کر..... کالج کے زمانے سے ہی صنوبر کے ساتھ بہت اچھی دوستی رہی تھی ان کی..... اور یہی دوستی وجہ بنی ان کی اور شہریار صاحب کی شادی کی..... تند بن کر بھی صنوبر کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی..... اور جب شہریار صاحب نے دوسری شادی کرکے عاصمہ کو دھچکا دیا اور وہ انصاری ہاؤس چھوڑ کر جانے لگیں تو زاویار کے بعد جو شخص سب سے زیادہ دکھی تھا وہ صنوبر ہی تھیں۔

''اللہ اسے آسانی دے.....''

لبوں سے نہیں اُن کے دل سے نکلی تھی دعا.....

شہرین نے متاثر ہو کر ان کی طرف دیکھا تو وہ بجھے دل سے مسکرا دیں..... پھر ان دونوں کے مابین کافی دیر گفتگو چلتی رہی..... حتیٰ کہ شہرین کی نظر گھڑی پر گئی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی.....

''تم کھانا کھا کر جانا شیری..... بس تیار ہی ہے.....''

''سوری مامی..... مشکل ہے..... مما میرا کھانے پر ویٹ کر رہی ہوں گی..... اس لیے آج رک نہیں سکتی..... میں ان شاءاللہ پھر آؤں گی.....'' ان کے محبت بھرے انداز پر اس نے مروت سے انکار کیا..... اور اللہ حافظ کہہ کر باہر نکلی تو عاصمہ بھی باہر آئیں۔

''آپ زوی سے فی الحال ذکر مت کیجیے گا کہ میں آئی تھی..... الٹی کھوپڑی ہے اس کی..... کسی دن سرپرائز دوں گی اسے.....''

تاکید کرکے آئندہ آنے کا عندیہ دیتی، مسکراتی وہ زن سے کار نکال لے گئی تھی۔

عاصمہ مسکرا کر کار کے نظروں سے اوجھل ہونے تک یونہی پورٹیکو میں کھڑی رہیں..... اور زاویار کے ممکنہ ردِعمل کا سوچتی رہیں۔

(جاری ہے)

کاغذی رشتے

فرحی نعیم

''سارہ یہ..... یہ ہیں تمہارے زاہد چچا؟''

میں نے ناقابلِ یقین نظروں سے ایک دفعہ پھر انہیں دیکھا۔

''ہوں.....'' سارہ نے ایک گہری سانس لی تھی۔

چند لمحوں کے بعد وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔ ''چلو باہر چلتے ہیں۔'' اس نے دروازے کا رخ کیا۔

''اُں..... لیکن.....'' میں پھر ہکلائی، مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا بولوں۔

''آجاؤ ناں.....'' سارہ نے نظریں چرائیں اور باہر نکل گئی میں نے ایک دفعہ پھر ڈبڈبائی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھا جو ان چند ماہ میں اچانک کیا سے کیا ہو گئے تھے۔ اپنی عمر سے کہیں زیادہ، آس پاس کے ماحول سے بے پروا کسی سوچ میں گم، جھریوں اور سوچوں کا جال ان کے چہرے پر جیسے بن سا گیا تھا۔

☆☆☆

سسٹر دردانہ نے ایک نظر دیوار گیر گھڑی پر ڈالی..... ایک تو کب کا بج چکا تھا، کلینک کا ٹائم ختم ہو چکا تھا

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutube.com
Digitized by Google

لیکن انتظار گاہ میں اب بھی کئی مریض بیٹھے تھے، ڈاکٹر زاہد بڑی تندہی سے مریضوں کو دیکھ رہے تھے، اکثر یہی ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کلینک کے اوقات ختم ہونے کے باوجود بیٹھے رہتے اور مریض آتے رہتے۔ اس پورے علاقے میں ڈاکٹر زاہد اپنی قابلیت اور میٹھے لہجے کی وجہ سے مشہور تھے۔ پھر اللہ کے فضل سے شفا بھی تو اُن کے ہاتھ میں تھی۔

☆☆☆

میں، سارہ کے پیچھے کمرے سے باہر تو آ گئی تھی لیکن میرا دل و دماغ جیسے اسی کمرے میں رہ گیا تھا۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سارہ کے وہی چچا ہیں جنہیں میں بچپن میں دیکھتی تھی۔ لمبے، خوب صورت' پڑھے لکھے، قابل اور ہینڈسم..... بچپن میں جب میں سارہ کے گھر کھیلنے آتی تھی تو ہم بچوں کی شرارتوں پر وہ ہنستے اور کبھی، کبھی ہلکی پھلکی سرزنش کرتے۔ سارہ اور اس کے بہن، بھائی انہیں بھی اپنے ساتھ کھیل میں شرکت کی دعوت دیتے جسے کبھی تو وہ قبول کر لیتے اور کبھی رد..... وہ زیادہ تر اپنی پڑھائی میں مصروف رہتے، وہ ڈاکٹر بن رہے تھے، تعلیمی میدان میں ان کا ریکارڈ شاندار تھا۔ ہمیشہ اسکالر شپ لینے والے..... انہوں نے ڈاکٹری کا امتحان دیا تو اس میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی پھر انہوں نے یہیں اپنی پریکٹس شروع کر دی تھی۔ ان کا کلینک ان کے نرم رویے، مناسب فیس اور خوش اخلاقی کی وجہ سے خوب چلتا..... ایک سال کے اندر ہی انہوں نے اپنے آس پاس کے علاقے میں ایسی مقبولیت حاصل کر لی تھی جو وہاں سالہا سال سے موجود ڈاکٹر نہ حاصل کر سکے تھے۔ ہاتھ میں شفا تھی لہٰذا مریض کلینک کا ٹائم ختم ہونے کے باوجود چلے آتے اور ڈاکٹر صاحب بغیر تیوری پر بل ڈالے انہیں پوری توجہ سے دیکھتے۔

☆☆☆

ڈاکٹر زاہد جب کلینک سے نکلے تو ڈھائی بجنے والے تھے، کلینک کا عملہ جلدی، جلدی سامان سیٹ کر رہا تھا۔ انہوں نے عملے کو چند ہدایات دیں اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گھر پہنچے تو سب کھانے پر ان کا انتظار کر رہے تھے، کھانے سے فارغ ہو کر وہ کچھ دیر آرام کر کے پھر شام کو ایک پرائیویٹ اسپتال میں بیٹھتے تھے۔ دن اسی طرح بڑے مصروف گزر رہے تھے، گھر میں والدین، بھائی، بھابی اور ان کی فیملی تھے۔ زاہد اپنے پیشے سے مخلص اور دیانت دار تھے، وہ اپنی جاب سے مطمئن تو تھے لیکن ان کا مطمع نظر صرف یہی نہ تھا۔ وہ زندگی میں کچھ کرنا اور آگے بڑھنا بھی چاہتے تھے۔

☆☆☆

''ارے کہاں ہو یار، دو دن سے تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن گھر میں تم ملتے نہیں اور کلینک کا فون ہر وقت انگیج رہتا ہے۔'' ڈاکٹر ایاز شکایتی انداز میں کہتے ہوئے ان کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''بس کیا کروں، مصروفیت تمہارے سامنے ہی ہے۔'' ڈاکٹر زاہد نے کندھے اچکائے۔ ''ویسے تم کو کیا کام پڑ گیا۔''

''تمہیں ایک زبردست نیوز سنانی تھی۔''

''اچھا تم دس منٹ انتظار کرو، یہ تین چار مریض رہ گئے ہیں ان کو فارغ کر لوں پھر اطمینان سے گپ شپ کریں گے۔'' ڈاکٹر زاہد نے کہا اور اپنے مریضوں کی طرف متوجہ ہو گئے، تقریباً پندرہ منٹ بعد انہوں نے آخری مریض کو بھی تسلی تشفی کے ساتھ رخصت کیا اور ملگجے سے اسٹیتھ اسکوپ اتار کر ریلیکس ہو کر بیٹھ گئے۔

''ہاں اب کہو، پہلے یہ بتاؤ تمہارے لیے کیا منگواؤں، جوس یا چائے؟''

''میں جو خبر تم کو سنانے آیا ہوں اس کے بعد تو مٹھائی کھلانی پڑے گی۔'' ڈاکٹر ایاز نے کہا تو ڈاکٹر زاہد کچھ چونک کر بغور انہیں دیکھنے لگے۔

'اب کہہ بھی دو جو کہنے آئے ہو، زیادہ سسپنس کری ایٹ نہ کرو۔''

''تمہیں پتا ہے ناں میرے بڑے بہنوئی جو امریکا میں تقریباً بیس سال سے پریکٹس کر رہے ہیں۔'' ایاز نے کہنا شروع کیا۔ ''پانچ سال پہلے انہوں نے میرے بڑے بھائی کو بھی اسپانسر کیا تھا اور آج وہ اس اسپتال میں ایک کامیاب اور مصروف ڈاکٹر ہیں، بہنوئی تو مجھے بھی کب سے کہہ رہے تھے لیکن امی، ابا راضی نہیں تھے کہ ایک بیٹی، بیٹا تو پہلے ہی دور ہیں اب تم بھی چلے جاؤ گے لیکن ایک ہفتے پہلے جب میری بہن نے فون پر امی، ابا پر

زور دیا کہ آپ ایاز کو یہیں بھیج دیں تو اس کی زندگی بن جائے گی پھر کچھ میری ضد اور میری منگیتر..... وہ بھی مجھے فورس کر رہی ہے کہ میں بھائی جان کے پاس چلا جاؤں کیونکہ پھر اسی طرح اس کا بھی تو چانس بن جائے گا۔'' ایاز چند لمحوں کے لیے رکا، زاہد ڈھیلے ڈھالے انداز میں اس کی یہ پوری رام کہانی بغیر کسی تاثر کے سن رہا تھا۔

''تو یوں کہو کہ تم باہر جانے کے لیے پر تول رہے ہو، چل یار تو پھر بیسٹ آف لک.....''

''ارے ایسے کیسے بیسٹ آف لک، تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔'' ایاز نے منہ بنایا۔

''تو کیا پھر جھٹ پٹ شادی کر کے بھابی کو لے جانے کا پروگرام بنا رہے ہو۔'' زاہد ہنسا۔

''ارے گدھے تمہیں لے جانے کا پروگرام ہے، یاد ہے کالج میں ہم نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔'' ایاز نے میڈیکل کالج میں گزارے یادگار زمانے کو یاد کیا۔ اور زاہد نے اس بات پر کھل کر قہقہہ لگایا۔ پھر قہقہے کو بریک لگا کر ایک دم اس کے جملے کے پہلے حصے کو یاد کیا۔

''کیا کہا تم نے، مجھے لے جانے کا پروگرام؟'' وہ کچھ حیرانی سے بولا۔

''ہاں یار..... میری بات تو تم نے پوری سنی نہیں اور اپنی کہنے لگے، امی، ابا مجھے بھی بھیجنے پر راضی ہو گئے ہیں، میرے بہنوئی نے کہا ہے کہ میں جلد سے جلد اپنے کاغذات انہیں بھجوا دوں..... ان کے اسپتال میں بھی کئی ڈاکٹرز کی ضرورت ہے، ویسے بھی وہ اتنے لمبے عرصے سے وہاں ہیں اُن کے بہت زیادہ تعلقات ہر شعبے کے لوگوں سے ہیں، میں نے بھی صاف کہہ دیا کہ صرف میں نہیں میرا دوست زاہد بھی میرے ساتھ آئے گا۔ بس یار، اب تم بھی تیاری کرو اور مجھے ایک دو دن کے اندر اپنے تمام کاغذات دے دو اور ساتھ پاسپورٹ بھی بنواؤ.....'' ایاز سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''کیا یہ اتنا ہی آسان ہے جتنا تم کہہ رہے ہو۔'' زاہد نے اسے بغور دیکھا۔

''جب نیت صاف ہو تو منزل آسان ہو ہی جاتی ہے۔'' ایاز کے لہجے میں یقین بھی تھا اور پختگی بھی.....

''ہوں۔'' زاہد نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''چلو دیکھتے ہیں ویسے تو میں کبھی صرف کنویں کا مینڈک نہیں بننا چاہتا۔ میری مستقبل کی پلاننگ میں بھی بہت کچھ ہے لیکن مجھے مواقع نہیں مل رہے تھے۔''

''تو یار، یہ ہم کو گولڈن چانس مل تو رہا ہے اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا تو سمجھو یہ ناشکری ہو گی۔'' ایاز نے زاہد کی بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو، گھر والے جانتے ہیں میں آگے بڑھنا چاہتا ہوں لہٰذا اُن کی طرف سے تو میرے خیال سے کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی۔'' زاہد نے پاس پڑے پین ہولڈر کو میز پر گھمایا۔ ''ٹھیک ہے میں گھر جا کر بات کرتا ہوں پھر فون پر شام کو بات کرتے ہیں۔''

''اوکے، میں چلتا ہوں۔'' ایاز نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پوری امید ہے کہ ہم کامیاب ہو جائیں گے۔''

☆☆☆

زاہد یہ سمجھ رہا تھا کہ گھر والے اس کے باہر جانے پر معترض نہ ہوں گے لیکن اس نے جب امی، ابو کو ایاز کی طرف سے سنہری پیشکش کا بتایا تھا تو جہاں ابو حیران و پریشان ہوئے وہیں امی کا چہرہ بھی سفید پڑ گیا۔ اور انہوں نے فوراً ہی آنکھوں میں آنسو بھر کر اسے جانے سے روک دیا۔

''نہیں بیٹا نہیں، اتنی دور، بیٹا تم یہیں کوشش کرو، کسی بڑے اسپتال میں کوئی اچھی پوسٹ، ایاز جاتا ہے جائے، تم تمہیں اپنی نظروں سے دور نہیں کر سکتی.....'' امی قطعی انداز میں بھرائے لہجے میں بولیں۔

''امی..... امی، لوگ تو باہر جانے کے لیے اور وہ بھی امریکا، تڑپتے ہیں، سفارشیں لگواتے ہیں، قرضے لیتے ہیں، اپنا اثاثہ تک بیچ دیتے ہیں اور مجھے تو بیٹھے بٹھائے ایاز کے توسط سے ایک شاندار آفر مل رہی ہے۔ یہ تو سراسر بیوقوفی ہو گی اگر میں اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاؤں۔'' زاہد جھنجلا کر بولے۔

''بیٹا، یہ امریکا کا ٹکٹ ہے، کوئی جنت کا ٹکٹ نہیں اور مواقع تو تم کو یہاں بھی مل جائیں گے، کیوں والدین کو دکھ دے رہے ہو، ہم تمہاری جدائی نہ سہہ پائیں گے۔'' ابو کچھ منت سے بولے۔

''ابو پلیز، یہ میرے مستقبل کا سوال ہے، یہاں

Digitized by Google

زیادہ سے زیادہ مجھے کیا مل جائے گا جبکہ وہاں..... وہاں ایک شاندار کیریئر میرا منتظر ہے۔'' زاہد کی آنکھوں میں سہانے خواب لو دے رہے تھے۔

''بیٹے دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں، امریکا بہت دور ہے، تم جب چلے جاؤ گے تو پھر واپس یہاں آنا کوئی آسان نہیں ہے۔''

''کیوں.....؟ کیا مشکل ہے، میں ہر سال، دو سال میں آجاؤں گا.....'' وہ اطمینان سے بولے۔

''کیا تمہارا شوق ہم سے بڑھ کر ہے، تم والدین کو اس طرح اکیلا چھوڑ کے.....'' امی کا لہجہ کپکپا کر رہ گیا۔

''اکیلے کیوں..... بھائی جان، بھابی، بچے سب ہیں تو..... بھرا پُرا گھر ہے امی، پلیز امی.....''

''تم، تم ہو بیٹا.....'' امی کا دل اس کے باہر جانے کا سوچ کر ہی ٹکڑے، ٹکڑے ہو رہا تھا۔

''تم چلے جاؤ گے تو پھر نہ جانے کتنے برس بعد آؤ۔''

''اوہ امی پلیز، آپ تو مایوسی کی باتیں کرنے لگیں۔'' زاہد اب کچھ اکتانے لگے تھے اور پھر کتنی ہی دیر تک تینوں میں بحث ہوتی رہی اور بے نتیجہ ہی رہی۔

اگلے دن ایاز نے فون کر کے جب زاہد سے بات کی اور زاہد نے والدین کے اجازت نہ دینے کا ذکر کیا تو ایاز نے ہنس کر جیسے اس کا مذاق اڑایا۔

''ارے بھائی اب تم چھوٹے بچے نہیں ہو جو کہیں گم ہو جاؤ گے، یار اپنے والدین کو سمجھاؤ، ایسا موقع زندگی میں ایک بار ہی ملتا ہے، آج بھی بھائی جان کا فون آیا تھا، میں نے تو تمہارا بھی کہہ دیا ہے، بھائی جان کہہ رہے تھے کہ ہم دونوں کا ہی انشاء اللہ ہو جائے گا۔ بس جلد سے جلد کاغذات مکمل کر کے بھجوائیں۔'' ایاز کی ان باتوں نے جیسے زاہد کو بھیجو دی اور وہ جو والدین کے سامنے ہار ماننے لگا تھا ایک دفعہ پھر ان کو قائل کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس دفعہ والدین کے ساتھ زاہد کے بڑے بھائی بھی اسے جیسے باز رکھنے کے لیے ماں، باپ کا ساتھ دے رہے تھے لیکن زاہد کے پاس بہت سے دلائل تھے، کتنی ہی دیر تک وہ چاروں ایک دوسرے کو کنونس کرتے رہے..... اور پھر.....

☆☆☆

زاہد نے وہ ساری دستاویزات جو ایاز کے بہنوئی نے مانگی تھیں، وہ بھجوا دی تھیں اسے اپنی قابلیت اور اہلیت پر پورا بھروسا تھا اور قسمت نے ایک دفعہ پھر اسے مایوس نہیں کیا تھا، وہ دن بھی بہت جلد آ گیا تھا جب امریکا کے شہر ٹیکساس کے جہاز ٹکٹ اس کے ہاتھ میں تھے۔

والدین اس کی محبت اور ضد سے مجبوری ہو گئے تھے اور نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے اسے اجازت دے دی تھی۔ زاہد نے اپنے جوش، خوشی اور باہر جانے کے اشتیاق میں والدین کے بجھے چہروں اور افسردگی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ ایاز کا یہ جملہ کہ ''ایسے موقع زندگی میں صرف ایک بار ہی ملتے ہیں۔'' جیسے اس کے دل و دماغ میں چپک گیا تھا اور وہ ہر صورت اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پاسپورٹ، ویزا، انٹرویو سارے مراحل طے ہوتے چلے گئے اور ایک دن وہ بھی آیا جب ہینڈ بیگ لیے وہ والدین، بھائی اور بچوں سے گلے مل رہا تھا۔ اس دن صبح سے امی کے آنسو ہی نہ تھم رہے تھے، ابو بھی چھپ، چھپ کر آنکھیں پونچھ رہے تھے۔ زاہد بھی اگرچہ والدین سے دور ہونے پر اداس تھا لیکن امریکا کی کشش اس اداسی کو غالب نہ آنے دے رہی تھی۔

☆☆☆

''السلام علیکم امی..... جی میں خیریت سے پہنچ گیا۔ جی، جی سب ٹھیک ٹھاک، سردی کافی ہے یہاں۔'' زاہد نے ایاز کی بہن کے گھر پہنچ کر پہلا کام فون کر کے والدین کو اپنی خیریت کا بتایا تھا۔ پھر سامان رکھ کر فریش ہو کر کافی پی۔ کھانا وہ جہاز میں کھا چکے تھے اور پھر ان دونوں نے بستر پکڑا تھا۔ اتنی لمبی فلائٹ کے بعد تھکن سے دونوں کا برا حال تھا۔

کچھ دن لگے تھے ان دونوں کو وہاں سیٹ ہونے میں لیکن پھر ایاز کے بہن، بہنوئی اور بڑے بھائی کا قدم، قدم پر ساتھ اور رہنمائی نے ان دونوں کی مشکلات کو آسان کرنے میں بڑی حد تک ساتھ دیا تھا۔

☆☆☆

لمحے، گھنٹوں میں اور گھنٹے، دن میں بدلنے لگے تھے..... شروع، شروع میں تو زاہد ہر روز ہی گھر فون کرتے پھر ہر دوسرے دن اور اس کے بعد جیسے، جیسے وہ اس ماحول میں ڈھل رہے تھے، مصروفیات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسی طرح فون کرنے کا وقفہ بھی طویل ہوتا

جا رہا تھا، اب وہ ہر ہفتے صرف اتوار کو ہی گھر فون کر کے اپنی خیر خیریت دے دیتے۔ امی، ابو شکوہ کرتے تو ان کے پاس ہزار جواز موجود ہوتے۔

''کیا کروں امی، یہاں کام کے معاملے میں کوئی سمجھوتا نہیں، صبح سے شام تک کام، کام اور صرف کام، شام کے بعد تو میں کہیں جا کر فارغ ہوتا ہوں۔ پھر کچھ دیر آرام کر کے ایاز اور میں کبھی باہر نکل جاتے ہیں، تھوڑا گھوم پھر کر آجاتے ہیں۔ بڑی ٹف لائف ہے یہاں۔'' وہ اپنی بیچارگی کی داستان سناتے۔ ''اور گھر کے بھی بہت سے کام خود کرتے ہیں۔''

''تو بیٹا کیوں اپنے آپ کو جان جوکھم میں ڈال دیا، اپنوں سے دور..... تم تو سب سے کٹ کر رہ گئے، واپس آجا میرا بیٹا.....'' امی جیسے پیار سے انہیں واپس آنے پر آمادہ کرتیں۔

''ارے امی..... اب ایسی بات بھی نہیں۔'' ان کی نظروں میں یہاں کی آزادی اور عیش گھوم جاتے جو اپنے ملک میں کہاں..... ''ابھی تو کیریئر کی شروعات ہے کم از کم پانچ چھ سال یہاں رہنے دیں، تکلیف اٹھاؤں گا تو راحت ملے گی ناں.....

''تو کیا تم..... تم پانچ سال سے پہلے بالکل نہیں آؤ گے.....؟'' امی کی سانسیں بے ترتیب ہوئیں۔

''نہیں، نہیں میں آؤں گا، بہت جلد آؤں گا، اچھا امی پھر بات کریں گے، خدا حافظ.....'' اور وہ جلدی سے فون بند کر دیتے مبادا امی کا لہجہ، ان کے الفاظ، ان کے ارادے کو متزلزل کر دے تو..... دوسری طرف امی، ابو کی اس آدھی ادھوری بات چیت سے پیاس اور بڑھ جاتی، کیسے اتوار کے انتظار میں وہ گھڑیاں گنتی تھیں۔

☆☆☆

زاہد شروع میں تو ایاز کے ساتھ اس کے بھائی کے گھر میں ہی رہے لیکن آہستہ، آہستہ جب وہ وہاں کسی حد تک سیٹ ہو گئے تو انہوں نے اپنے ہی اسپتال کے ایک اور ڈاکٹر کے ساتھ کراشیئر کر لیا، ڈاکٹر چنگ ہی بھی غیر ملکی تھے وہ کورین تھے اور پچھلے آٹھ سال سے اس اسپتال میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے، زاہد کا اس طرح جانا ایاز کو اچھا تو نہیں لگا لیکن ایاز کے بھائی کی فیملی کے ساتھ رہنا زاہد کو بھی مناسب نہیں لگتا تھا۔ ان کی فیملی کے درمیان وہ اپنے آپ کو مس فٹ سمجھتا..... یوں تقریباً سال بھر بعد اس نے بھائی جان اور ایاز کی اجازت سے ڈاکٹر چنگ ہی کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔

وقت تو مٹھی میں بند ریت کے مانند ہے جو تیزی سے پھسلتا چلا جاتا ہے۔ زاہد کو بھی یہاں آ کر احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ تو امی، ابو ہی اسے احساس دلاتے رہتے کہ تم کو گئے کتنا عرصہ بیت گیا ہے، آج بھی فون بند کر کے زاہد نے میز پر رکھے کیلینڈر کو دیکھا کتنا وقت..... گزر گیا۔ تین سال کا عرصہ کیسے پلک جھپکتے گزر گیا تھا۔ آج بھی اس نے فون بند کرنے سے پہلے والدین کو تسلی و تشفی دی تھی۔ اس نے فون بند کیا ہی تھا کہ نزا کی کال آ گئی تھی۔

''آج کی پارٹی یاد ہے ناں؟ ٹھیک آٹھ بجے پہنچ جانا۔'' اس نے یاد دہانی کا فون کیا تھا۔

''ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' وہ مسکرائے۔

''ٹھیک ہے میں انتظار کروں گی۔'' اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تھا۔ اور زاہد کے لب خود بخود ہی مسکراہٹ میں ڈھل گئے تھے۔ آج سے تقریباً سال بھر پہلے نزا سے ان کی ملاقات اسپتال کی انتظار گاہ میں ہوئی تھی۔ اس کے والد کی طبیعت خراب تھی اور وہ ان کو لے کر آئی تھی۔ ڈاکٹر جوزف کے پاس اچانک ہی ایمرجنسی آ گئی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے ڈاکٹر زاہد کو بلا لیا تھا۔ اب ڈاکٹر جوزف کے پیشنٹ وہی دیکھ رہے تھے۔ اور یہیں ان کا تعارف سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی نزا سے ہوا تھا۔ اگرچہ یہ ایک معمولی کی ملاقات تھی جو ڈاکٹر اور مریض کی ہوتی ہے لیکن چونکہ نزا کے والد کو ان کی طبیعت خرابی کی وجہ سے ایڈمٹ کر لیا گیا تھا اور نزا ان سے ملنے روز آتی تھی لہٰذا اکثر ہی اس کا ٹکراؤ ڈاکٹر زاہد سے ہو جاتا اور جس دن نزا کے والد ڈسچارج ہو رہے تھے اس دن چلتے، چلتے آزاد ماحول کی پروردہ نزا نے ڈاکٹر زاہد سے اپنی پسندیدگی کا اظہار برملا کر کے ان سے دوستی کا تعلق قائم رکھنے میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔ ایک حسین لڑکی خود ہی دوستی کی پیشکش کرے تو بھلا کسی مرد کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے، یوں فون نمبرز کے تبادلے کے بعد اکثر ان دونوں کی فون پر بات چیت رہتی اور پھر باہر گھومنے پھرنے، آؤٹنگ، ہوٹلنگ، شاپنگ، فلم

Digitized by Google

دیکھنا، تھیٹر جانا، فٹ بال میچ ساتھ دیکھنا، سب ہی کچھ ساتھ، ساتھ ہونے لگا تھا۔ بقول لزا کے اس کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں تھا۔ بس دو، تین سہیلیاں تھیں ان ہی کے ساتھ وہ وقت گزارتی تھی۔ چند دوست بھی تھے لیکن کالج اور پڑھائی کی حد تک ہی دوستی محدود تھی۔ اگر کبھی گھومنے یا تفریح کرنے جاتے تو پورا گروپ بھی ساتھ جاتا تھا۔ حال ہی میں اس کی پڑھائی مکمل ہوئی تھی اور آج کل وہ ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں جاب کررہی تھی۔ لیکن ڈاکٹر زاہد کو اس طرح اس کا جاب کرنا پسند نہیں تھا۔

''تو پھر میں پورا دن کیا کروں؟ میں تو بور ہوجاتی ہوں، ڈیڈی اپنے آفس چلے جاتے ہیں اور میں اکیلی گھر میں.....'' وہ زاہد کے اس فیصلے پر ناک چڑھا کر بولی۔

''تم میرے پاس اسپتال آجایا کرو.....'' زاہد نے فوراً آفر کی۔

''اسپتال.....'' وہ تعجب سے بولی۔ ''وہاں کیا میں نرسنگ کروں گی؟'' اتنا کہہ کر وہ خود ہی ہنسی۔

''کوئی نہ کوئی جاب تو مل جائے گی۔''

''نہ بابا، میں وہیں ٹھیک ہوں۔''

لزا کے والدین میں کئی سال قبل علیحدگی ہوچکی تھی۔ اس کی والدہ اور ایک بہن دوسرے شہر میں رہتے تھے، ماں نے دوسری شادی کرلی تھی۔ لزا کبھی، کبھی ماں سے ملنے بھی ان کے پاس چلی جاتی تھی۔ ورنہ وہ باپ کے ساتھ ہی رہتی تھی۔

ڈاکٹر زاہد اب سنجیدگی سے اس سے شادی کا سوچ رہے تھے، لزا بھی تیار تھی اب ان کی شادی میں صرف ایک ہی رکاوٹ تھی اور وہ تھا لزا کا غیر مذہب ہونا..... لیکن لزا نے باتوں، باتوں میں اسلام قبول کرنے کا بھی عندیہ دے دیا تھا۔ اب بس اس بات کا امی، ابو سے تذکرہ کرنا تھا اور ڈاکٹر زاہد کو یقین تھا کہ وہ اتنی آسانی سے اس شادی پر راضی نہ ہوں گے اور پھر یہی ہوا۔ انہوں نے ایاز کے بھائی، بہن سے کہہ کر شادی کے سارے انتظامات مکمل کرلیے تھے، لزا نے بھی اپنے والد کو زاہد کے بارے میں بتادیا تھا اور وہ ان سے مل بھی چکے تھے۔ لزا کے والد کو بھی اگرچہ بیٹی کا فیصلہ پسند نہیں آیا تھا لیکن وہ یہاں کے ماحول اور حالات کی وجہ سے راضی ہوگئے تھے۔ بہرصورت دیگر لزا نے پھر بھی شادی تو کر ہی لینی تھی۔ چاہے وہ اس فیصلے کو قبول کرتے یا نہیں.....

ڈاکٹر زاہد نے آج اسی سلسلے میں گھر فون کیا تھا کہ والدین کو اپنی شادی کے بارے میں مطلع کردیں۔ سلام اور خیر و عافیت کے بعد انہوں نے کچھ جھجکتے ہوئے ماں سے کہا تھا۔

''امی، میں، میں یہاں شادی کررہا ہوں، آپ کی اجازت درکار ہے۔''

''ہائیں.....؟'' یہ امی کو لگنے والا ایک اور شاک تھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو بیٹا.....؟ شادی.....؟ لیکن کس سے.....؟ اور اس طرح اچانک.....'' امی کا لہجہ لرزا۔

''جی وہ.....یہیں ہوتی ہے، لزا نام ہے۔''

''لزا.....؟'' کیا انگریز ہے؟ تمہارے ساتھ اسپتال میں ہوتی ہے؟ ڈاکٹر.....؟'' امی نے اوپر تلے کئی سوال کردیے تھے۔

''ڈاکٹر تو نہیں ہے لیکن انگریز ہے.....'' وہ کچھ اٹکے۔ ''لیکن امی وہ مسلمان ہوجائے گی۔'' وہ جلدی سے بولے لیکن اب دوسری طرف سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ ''ہیلو.....ہیلو امی.....''

''ہاں.....میاں، اب کیا خبر سنا رہے ہو اپنی ماں کو.....'' ریسیور سے ابو کی آواز ابھری تھی۔ امی کو اس کی شادی کا سن کر زبردست جھٹکا لگا تھا اور صدمے سے اب ان سے بات بھی نہیں کی جارہی تھی چنانچہ انہوں نے فون میاں کے حوالے کردیا تھا اور مختصراً شادی کا کہہ دیا تھا۔

''کیا والدین کا تم نے اتنا بھی حق نہیں رکھا کہ وہ تمہاری شادی کے فیصلے میں شریک ہوتے۔ تمہاری ماں نے تو تمہاری شادی کے لیے کتنے ہی ارمان دل میں پالے تھے۔'' ان کے لہجے میں کیا نہیں تھا صدمہ، دکھ ان کا لہجہ اور انداز بہت کچھ ٹوٹ گیا تھا۔

''ابو.....وہ لزا بہت اچھی ہے، ایاز کے بھائی، بہن، بہنوئی یہ لوگ ہیں ناں تو.....''

''اچھا تو لڑکی عیسائی ہے.....! کیا کوئی مسلمان فیملی نہ ملی تم کو۔'' آواز میں غصہ اور ناگواری تھی۔ ''اور کیا ایاز کے بھائی، بہن، تمہارے لیے والدین سے بڑھ کر ہوگئے، کم از کم اس شادی کی تو ہم تمہیں خوشی سے اجازت نہیں دے سکتے، باقی تم خود مختار ہوچکے، جو چاہے کرو۔'' ابو یہ کہہ کر

خاموش ہوگئے تھے پھر زاہد نے ان کو منانے کی کچھ ٹوٹی پھوٹی کوشش کی لیکن ابو نے فون بند کردیا تھا۔ زاہد تو فیصلہ کرچکے تھے انہوں نے کندھے جھٹک کر ریسیور رکھ دیا۔

لزا نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ یوں چند دوستوں کی موجودگی میں انہوں نے نکاح کرلیا۔

ڈاکٹر زاہد نے الگ فلیٹ لے لیا تھا اور اب وہ لزا کے ساتھ وہاں شفٹ ہوگئے تھے۔ گھر فون کرکے شرمندہ، شرمندہ لہجے اور معذرت خواہانہ انداز میں انہوں نے امی، ابو کو اپنی شادی کا بتادیا تھا۔ وہاں سے بجھے انداز میں مبارک باد دی گئی تھی۔ ڈاکٹر زاہد نے مبارک باد قبول کرکے اور بھائی و والدین کو جلد آنے کا دلاسا دے کر فون بند کردیا تھا۔

☆☆☆

یہاں زندگی مصروف بھی تھی اور تیز بھی، دن، مہینوں میں اور مہینے، سالوں میں بدل رہے تھے۔ مسلسل محنت اور سخت کام ڈاکٹر زاہد بڑی تیزی سے کامیابی کی سیڑھیاں طے کررہے تھے۔ یہاں انہوں نے اپنا ایک نام اور مقام بنالیا تھا۔ اس دوران وہ اولاد کی نعمت سے بھی سرفراز ہوگئے تھے۔ ایک بیٹا نعمان اور بیٹی ارفع، وہ اپنی زندگی میں مطمئن تھے۔ گھر، والدین، بھائی سب بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ کبھی، کبھی گھر سے فون آجاتا تو وہ بات کرلیتے ورنہ ان کے پاس وقت کہاں.....اس دوران وہ ایک دفعہ بھی واپس ملک نہیں جاسکے تھے، کئی دفعہ ارادہ کیا کہ ایک دفعہ بیوی، بچوں کو اپنے ملک بھی لے جاؤں، والدین سے ملوادوں لیکن یہ ارادہ کبھی عملی جامہ نہ پہن سکا۔ یوں اٹھارہ سال بیت گئے۔

☆☆☆

''کیسے ہو زاہد.....؟'' پاکستان سے بھائی جان کا فون تھا، آواز بہت بھاری تھی۔

''ٹھیک ٹھاک.....! آپ سنائیں بھائی جان، گھر میں سب خیریت ہے ناں، بھابی، بچے، امی، ابو، کئی دن بعد آپ سے بات ہوئی۔''

''کئی دن بعد نہیں بلکہ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد.....'' وہ کچھ طنزیہ بولے تھے۔

''اوہ اچھا، پتا ہی نہیں چلا.....'' وہ کچھ شرمندہ ہوئے تھے۔

''بس میں نے تمہیں اس لیے فون کیا تھا کہ امی، ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں چل رہی، خاص طور پر امی، ان کے گردے تو کافی عرصے سے خراب تھے لیکن اب تو..... اب تو ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے، میں تمہیں اب بھی فون نہ کرتا لیکن مجھ سے امی کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ وہ شاید تمہیں دیکھنے کی آس میں ہی جی رہی ہیں.....وہ کہتی ہیں.....'' بھائی جان نے حلق میں پھنسے گولے کو نگلا.....''کہ مرنے سے پہلے میں زاہد کو ایک دفعہ جی بھر کر دیکھنا چاہتی ہوں.....اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو ایک دفعہ امی، ابو سے آکر مل جاؤ.....'' بھائی جان سیدھے سپاٹ لہجے میں کہہ رہے تھے تو دوسری طرف زاہد یہ سب سن کر سُن ہی رہ گئے تھے۔ کیونکہ عرصہ ہوا تھا کہ گھر والوں نے ان سے واپسی کا مطالبہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔

''بھائی جان یہ آپ.....امی.....'' زاہد کی آواز لڑکھڑا گئی تھی۔ ماں کی حالت نازک تھی اور وہ.....وہ کتنے خودغرض تھے.....''میں.....میں آتا ہوں، بہت جلد.....امی سے کہیے گا ان کا زاہد ان کے پاس آرہا ہے۔'' اتنا کہہ کر انہوں نے فون بند کردیا تھا اور بات ہی نہیں کی جارہی تھی.....انہوں نے بے بسی سے اپنا سر ہاتھوں میں گرالیا تھا۔ والدین کی محبت جو دل کے کسی کونے میں دبی تھی اچانک ہی عود کر آئی تھی۔ پچھلے اٹھارہ سال ایک فلم کی طرح ان کی نظروں میں گھوم گئے تھے، کس تیزی سے یہ وقت گزرا تھا کہ احساس ہی نہیں ہوسکا تھا۔ کلینک میں اب ان سے مزید نہ بیٹھا گیا وہ فوراً ہی گھر روانہ ہوگئے تھے۔

☆☆☆

''ارے آپ، اس وقت کیا بات ہے پریشان لگ رہے ہیں۔'' لزا جو گھر کا کام کررہی تھی۔ زاہد کو بے وقت گھر میں..... دیکھ کر کچھ تعجب سے بولی۔ زاہد جو گھر آنے کے بعد ڈھیلے، ڈھالے انداز میں صوفے پر آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔ ''ہوں'' کرکے رہ گئے، کتنے ہی لمحے چپ چاپ سرک گئے۔

''پاکستان سے بھائی جان کا فون آیا تھا، امی، ابو کی طبیعت بہت خراب ہے، مجھے بلایا ہے۔''

Digitized by Google

"اوہ..... اچھا....." وہ سرسری بولی اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی، جیسے کوئی بات ہی نہیں ہو۔

"لزا، میں ٹکٹ کروا رہا ہوں، تم تیاری کرلو..... ہم پرسوں ہی نکلتے ہیں۔"

"ہم.....؟" کیا مطلب ہم.....؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"بھئی میں، تم، بچے، کیا تم نہیں چلوگی.....؟" اب حیران ہونے کی باری ان کی تھی۔

"آپ کے والدین ہیں، آپ جائیں، میں اور بچے کیوں.....؟ اور ویسے بھی بچوں کی پڑھائیاں چل رہی ہیں، وہ ایسے کیسے جاسکتے ہیں اور وہ بھی ان دادا، دادی کے لیے جن سے کبھی ملے نہیں، بس کبھی، کبھی بات ہوجاتی ہے۔" وہ اکتا کر بولی۔

یہ اسکائپ اور ویڈیو کال سے پہلے کا دور تھا۔

"اگر پہلے نہیں ملے تو اب مل لیں گے، آج مجھے رہ، رہ کر احساس ہو رہا ہے کہ اتنے برس میں نے کیوں ان سے ملے بغیر گزار دیے۔" وہ متاسف تھے۔

"اچھا چھوڑیں، جانا ہے جائیں، ہمیں پریشان نہ کریں، کھانا لگاؤں؟" وہ عام سے لہجے میں بولی۔

"ابھی موڈ نہیں، میری تو بھوک ہی مرگئی، بچوں سے پوچھ لیتا ہوں، وہ شاید چل چلیں۔"

انہیں کچھ امید ہوئی لیکن بچوں نے بھی صاف انکار کردیا تھا، انہیں نہ اپنے ددھیال سے دلچسپی تھی اور نہ اس ملک سے۔ تب زاہد نے اپنا ٹکٹ کرالیا۔ اگلے دن رات کی فلائٹ سے انہیں ارجنٹ سیٹ مل گئی تھی۔

☆☆☆

ائرپورٹ پر بھائی اور ان کے بیٹے لینے آئے تھے۔ تو وہ کتنی ہی دیر بھائی کے سینے سے لگے رہے۔ کیسا اپنائیت کا احساس تھا۔ بچوں سے مل کر وہ سیدھا اسپتال ماں سے ملنے گئے تھے، والدین کو اتنے لمبے عرصے بعد دیکھ کر وہ اپنے اوپر سے قابو کھو بیٹھے تھے، ماں کا ہاتھ آنکھوں سے لگائے وہ کتنی ہی دیر سسکتے رہے۔ باپ کا نحیف وجود اُن کے سینے میں سما گیا تھا۔ شرمندگی، پشیمانی، پچھتاوا کیا کچھ نہ تھا ان آنسوؤں میں، بھائی جان نے انہیں حوصلہ دیا، سب نے پچھلا بھلا کر ان کے لیے دل وا کرلیے تھے۔ امی کے کمزور جسم میں جیسے ایک دفعہ پھر زندگی کی رمق آگئی تھی۔ کتنی ہی دیر تک وہ بیٹے کی پیشانی اور ہاتھ چومتی رہی تھیں۔

"زاہد، میں تو ترس گئی تھی تمہارے لیے، ایسا لگتا تھا تمہیں دیکھے بغیر ہی مرجاؤں گی۔" وہ حسرت سے بولیں۔

"ایسے نہ کہیں امی، آپ کو میری عمر لگے....." زاہد بھیگی آنکھوں سے بولے اور امی دکھے دل سے مسکرا دیں پھر بھائی کے لاکھ کہنے کے باوجود وہ اسپتال سے گھر نہ گئے۔

"بھائی جان پلیز میں یہیں رہوں گا، مجھے امی کے پاس ہی رہنے دیں ابھی تو میں نے انہیں ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں۔"

"تم تھکے ہوئے ہو، اتنا لمبا سفر کرکے آئے ہو، کچھ دیر آرام کرلو پھر آجانا....." بھائی جان نرمی سے بولے۔ جانتے تھے زاہد اتنی آسانی سے کہاں مانے گا۔

"کمرے میں یہ صوفہ ہے ناں یہاں لیٹ جاؤں گا، بس آپ مجھے امی کے پاس رہنے دیں۔" وہ کچھ ایسے ملتجی لہجے میں بولے کہ بھائی جان سر ہلا کر رہ گئے پھر وہ امی کے پاس ہی رات، دن اسپتال میں رہے تھوڑی دیر کے لیے گھر جاتے نہا دھو کر کھانا کھا کر واپس اسپتال آجاتے، ایسا لگتا تھا کہ اٹھارہ سال کی جدائی اور والدین کے شکوے اور شکایتوں کا احساس انہیں اندر ہی اندر تڑپا رہا ہے جس کا مداوا ان مختصر دنوں میں کرنا چاہ رہے تھے۔ کتنی باتیں تھیں جو وہ والدین سے کرتے تھے ایسا محسوس ہوتا کہ باتیں ختم ہی نہیں ہوں گی۔ اس دوران انہوں نے گھر بھی دو چار فون کیے لیکن وہاں لزا اور بچوں کی عدم توجہی نے انہیں بہت مایوس کیا تھا پھر امی جن کی طرف سے ڈاکٹر مایوس تھے اس کے آنے کے ایک ماہ بعد اپنی حقیقی منزل کی طرف روانہ ہوگئیں۔ یہ ایک مہینہ انہوں نے ماں کی پٹی سے ہی لگ کر گزارہ تھا، ماں سے اتنے عرصے بعد ملن اور پھر ہمیشہ کی جدائی، زاہد خود اپنی نظروں میں شرمندہ تھا، والدہ کی موت کا صدمہ جہاں سب گھر والوں کا تھا وہاں ابو کے لیے جو پہلے ہی بیمار اور بوڑھے تھے، ناقابلِ برداشت تھا اس عمر میں بیوی کی جدائی، رفیقِ حیات سے دوری ان سے سہی نہیں جاتی تھی۔ وہ جو پہلے ہی بیمار تھے اب تو بستر سے ہی لگ گئے تھے، زاہد کے

لیے ماں کا صدمہ کیا کم تھا جو باپ بھی بستر سے جا لگا۔ وہ ان کے لیے سر توڑ کوشش کررہے تھے، بڑے، بڑے ڈاکٹر سے میٹنگ کرتے لیکن ڈاکٹرز بھی کیا کرتے وہ زاہد کا کندھا تھپک کر انہیں حقیقت کا سامنا کرنے کا کہتے۔

"آپ کے والد صاحب بزرگ بھی ہیں اور بیمار بھی پھر حال ہی میں انہوں نے ایک صدمہ بھی برداشت کیا۔ ہم اپنی ممکن کوشش کررہے ہیں لیکن امید بہت کم ہے، آپ تو خود ڈاکٹر ہیں، آپ بھی سب دیکھ رہے ہیں ایسے حالات میں صرف دعا ہی کی جاسکتی ہے اور اسی پر بھروسا ہوتا ہے۔" ایک سینئر ڈاکٹر نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا تھا اور زاہد سر جھکا کر رہ گئے۔ ماں کے بعد اب ڈاکٹر زاہد باپ کی خدمت اور تیمارداری میں لگ گئے تھے۔ ان کی دوا، غذا، دلجوئی میں وہ اپنا آپ بھول چکے تھے تو بیوی، بچے تو بہت دور بیٹھے تھے۔

حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ لزا اور بچوں نے دو دفعہ کے بعد تیسری مرتبہ فون نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر زاہد کی بھی اس وقت پوری توجہ والد کی طرف تھی۔ حد تو یہ کہ انہیں یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ ان وہ یہاں صرف دو ماہ کے لیے آئے تھے اور اب دو ماہ سے اوپر ہو چکے ہیں۔

"بھئی تمہاری واپسی کے ٹکٹ کا کیا ہوگا؟" بھائی نے ایک دو مرتبہ پوچھا تو زاہد نے بھائی کو کہہ دیا کہ "وہ میں دیکھ لوں گا ٹکٹ کینسل ہوجائے گا۔" لیکن پھر باپ کی طبیعت زیادہ بگڑی انہیں ICU شفٹ کرنا پڑا۔ زاہد سارا دن ICU کے باہر ویٹنگ لاؤنج میں بیٹھے باپ کی زندگی کے لیے دعا گو رہتے، بھائی جان زبردستی گھر بھیج دیتے تو وہ جاتے ورنہ وہیں رہتے اور شیشے کے پیچھے باپ کا چہرہ تکتے رہتے کہ اب انہیں بھی دور چلے جانا تھا اور پھر دس دن موت و زیست کی کشمکش میں رہ کر ابو بھی منوں مٹی کی چادر اوڑھ گئے۔ ماں کا غم کیا کم تھا کہ یہ دوسرا غم کا پہاڑ اور وہ بھی اتنے جلدی ان پر ٹوٹ پڑا تھا۔ باپ کی موت کے اس دوسرے صدمے نے تو جیسے انہیں ذہنی و جسمانی طور پر توڑ کر رکھ دیا تھا۔ والدین کو ناراض کرکے اتنا طویل عرصہ انہوں نے کیسے عیش و نشاط میں گزارا تھا۔ کتنی دفعہ ان دونوں نے ان سے آنے کی التجا کی تھی لیکن وہ تو اس رنگوں بھری دنیا میں ایسے مگن ہوئے کہ انہیں احساس ہی نہیں ہوا کہ کس جنت سے منہ موڑے بیٹھے ہیں..... اور اب..... اب..... پچھتاوے کا احساس انہیں رات دن کچوکے لگاتا..... والدین کو دکھ دینے اور انہیں ناراض کرکے اتنے برس گزارے، یہ کیسا احساس تھا جو انہیں نشتر پر نشتر چبھوئے دے رہا تھا۔ وہ تو اپنے آپ سے نظر نہ ملا پا رہے تھے تو دوسروں سے کیسے ملاتے۔

"زاہد اپنے آپ کو سنبھالو بھائی، یہ کیا حال بنا لیا ہے تم نے؟ جو ہو چکا اسے بھول جاؤ، امی، ابو تم سے ناراض نہیں تھے، تم نے اُن کی اتنی خدمت کی، وہ تم سے راضی ہوکر گئے ہیں۔" بھائی جان بھی، زاہد کی بگڑتی حالت سے پریشان ہوگئے تھے، اس وقت بھی وہ ایک ڈاکٹر کو دکھا کر انہیں گھر واپس لا رہے تھے، ڈاکٹر نے بھی زاہد کی حالت دیکھ کر تشویش کا اظہار کیا تھا۔

"ان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں، ان کے بیوی بچے کہاں ہیں؟ انہیں فوری طور پر بلائیں یا انہیں ہی ان کے پاس بھیج دیں۔ مجھے آنے والے حالات ٹھیک نہیں لگ رہے۔" ڈاکٹر نے سارے واقعات سن کر سنجیدگی سے کہا تھا۔ بھائی جان اور گھر والے یہ سن کر پریشان ہوگئے تھے انہوں نے فوری طور پر لزا سے رابطہ کیا تھا اور اسے زاہد کی بگڑتی ذہنی حالت اور جسمانی صحت کے بارے میں بتایا تھا لیکن وہاں وہ فکرمندی مفقود تھی جو بحیثیت بیوی کے ہونی چاہیے تھی۔

"آپ علاج کرائیں، میں یہاں ڈاکٹروں سے مشورہ کرتی ہوں۔" اس نے جیسے ٹالا.....

"زاہد کے وہاں کئی ڈاکٹر دوست ہوں گے آپ بات کریں یا مجھے ان کے رابطہ نمبر دیں۔" بھائی جان ازحد پریشان تھے لیکن دوسری طرف نہ جانے کیوں لاتعلقی تھی۔ لیکن لزا نے کسی کا نمبر دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ بھائی جان کے حالات بھی اتنے اچھے نہیں تھے کہ وہ خود انہیں واپس لے جاتے وہ اور ان کے بچے یہیں بھاگ دوڑ کرتے رہے، زاہد جو رقم اپنے ساتھ لائے تھے وہ بھی کب کی ختم ہوچکی تھی۔ زاہد کے ویزے کی میعاد بھی کب کی ختم ہوچکی تھی۔ حالات نے نہ جانے کیسے پلٹا کھا لیا تھا۔ زاہد کی طبیعت بجائے سنبھلنے کے بگڑتی چلی جارہی تھی۔ والدین کی موت اور پھر بیوی، بچوں کے رویے نے مرے

Digitized by Google

پر سوزرے لگا دیے تھے۔ زاہد، بیوی، بچوں سے بات کرتے لیکن دوسری طرف اکھڑا اور اجنبی رویہ ہوتا۔ والدین کی بیماری کے دوران اور کچھ بھائی جان کے گھر کا ماحول ،زاہد جو مذہب اور دین کو اپنی زندگی سے تقریباً نکال بیٹھے تھے اس عرصے میں پھر سے دین کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ پنج وقت نماز، قمیص شلوار پہننا اور والدہ کی وفات کے بعد تو داڑھی بھی رکھ لی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اس حلیے کا باپ اور ذہن اور شوہر ان کو قبول نہیں لہٰذا وہ ان سے آہستہ، آہستہ دور ہو رہے تھے اور پھر......

زاہد کی حالت رات میں کسی وقت بگڑی ، یہ تو اتفاق تھا کہ فراز، چچا کے پاس انہیں دیکھنے آیا اور پھر گھر بھر میں ہل چل مچ گئی انہیں فوراً ایمبولینس منگوا کر اسپتال لے کر گئے جہاں ڈاکٹروں نے برین ہیمبرج بتایا تھا۔

☆☆☆

زاہد موت کے منہ سے واپس آئے تھے اگرچہ جان تو بچ گئی تھی۔ علاج بھی چل رہا تھا۔ بھائی جان نے ساری صورت حال لزا کو بھی بتا دی تھیں۔ لیکن وہاں.... بے توجہی ہنوز تھی۔ اور اب جبکہ زاہد ، وہ زاہد ہی نہیں رہے تھے۔ خاموش، گم صم، آنکھیں بند کیے وہ تو جیسے دنیا سے ہی روٹھ گئے تھے۔ بھائی جان اور گھر والے ان کی حالت دیکھ کر روتے ، بھائی جان نے زاہد کی حالت کے پیش نظر لزا سے تقریباً منت بھرے انداز میں یہاں آنے اور اب زاہد کو لے جانے کی درخواست کی تھی۔

''آپ پلیز زاہد کو لے جائیں، وہاں جدید علاج کی سہولتیں ہیں، یہاں نہ وہ سہولیات ہیں اور نہ ہی میرے اتنے وسائل ورنہ میں اپنے بھائی کا علاج خود کروا لیتا۔ آپ انسانیت کے ناتے ہی اس کے ویزے اور ٹکٹ کا بندوبست کریں۔ زاہد کے تو بہت تعلقات اور جاننے والے ہوں گے؟'' بھائی جان گھگیا رہے تھے۔

''میں اب یہاں زاہد کو نہیں لا سکتی، ویزے کی مدت ختم ہو چکی اور اب کئی قانونی پیچیدگیاں ہیں اور زاہد تو اب ذہنی مریض بن چکے، میں انہیں یہاں لا کر کیا کروں......؟ کون ان کی دیکھ بھال کرے گا؟ وہاں تو آپ لوگ اور دوسرے رشتے دار ہیں، یہاں تو ہمارے لیے بہت مسائل ہو جائیں گے۔'' وہ بے رحمی سے کہہ رہی تھی۔

''اچھا اگر کچھ رقم کا بندوبست......'' بھائی جان رقم کا کہتے ہوئے گر رہے جا رہے تھے۔'' اصل میں میرے پاس کچھ نہیں بچا...... پہلے ہی میں کافی مقروض ہو چکا ہوں اب تو کوئی معمولی رقم بھی دینے کے لیے تیار نہیں، یہ رقم زاہد ہی پر لگے گی......اور میں جلد لوٹانے کی بھی کوشش......''

''نہیں جی......سوری......ہمارے پاس کوئی رقم نہیں۔'' اس نے صاف جواب دیا تھا حالانکہ بھائی جان کو خود زاہد نے بتایا تھا کہ وہ باہر اچھا کھاتا کماتا تھا......اس سے زیادہ کچھ کہنے سننے کا ان میں حوصلہ نہ تھا اور وہ اپنوں کی بے حسی، بے دردی اور خود غرضی پر رو دیے۔ بھائی جان نے جتنا ہو سکا ان کا علاج کرایا اور پھر خاموش ہو گئے۔ ان کے ہی بیوی بچوں نے تو انہیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکا تھا۔

زاہد جو کبھی ڈاکٹر زاہد تھے، ہینڈسم، خوش لباس، خوش گفتار، ذہین، قابل، باصلاحیت......اب کیا تھے جو بھی انہیں دیکھتا اسے بہ مشکل ہی یقین آتا کہ یہ وہی ہیں جو اٹھارہ سال امریکا میں گزار کر آئے تھے۔ صدمات سے پہلے چٹخے پھر ٹوٹے اور آخر میں کرچی، کرچی ہو گئے۔

☆☆☆

سارہ مجھے اپنے گھریلو حالات اور چچا کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔ اس کے دادا، دادی کی وفات پر میں تعزیت کے لیے آئی تھی تب میں نے بھی بڑے طویل عرصے بعد زاہد چچا کو دیکھا تھا۔ اس کے بعد اب دو ماہ بعد دیکھا میں تو انہیں دیکھ کر ششدر ہی رہ گئی تھی۔ صدمات اور گھر والوں کے رویے نے انہیں کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ میں شدید شاک میں تھی۔ شاید سارہ اسی لیے مجھے کمرے سے باہر لے آئی تھی۔ شاید وہ یہی چاہتی تھی کہ اس کے عزیز چچا کو کوئی اس حالت میں نہ دیکھے۔ بے پروائی اور کچھ نظر اندازی کا رویہ اسی وجہ سے کیا ہوگا......

''اُف......! یہ کیا ہو گیا تھا؟'' اور میں یہی سوچتی رہی۔'' کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ کیا تقدیر انسان کو اوج ثریا پر لے جا کر پھر واپس زمین پر اس طرح بھی پٹخ سکتی ہے......؟'' میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

URDU TUBE
HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com

ایک تھی مینا

قرۃ العین سکندر

''اللہ نے اگر تمہیں لڑکی ذات بنا ہی دیا ہے تو کچھ لڑکیوں والے گُن بھی سیکھ لو......ایک تو کبھی ڈھنگ کے کپڑے ہی اوڑھ پہن لیا کرو، نت نئے فیشن ہیں......اور بھئی یہ فیشن زدہ لڑکیاں بھی کیا ایک سے ایک لباس پہنتی ہیں کہ جی خوش ہی نہیں ہوتا بلکہ عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ کیا ہو گیا ہے آج کل کی لڑکیوں کو۔ ایک فیشن موا ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا جی اٹھتا ہے۔'' دادی بیگم ناصحانہ انداز اپنائے لب کشائی

Digitized by Google

کررہی تھیں۔ پاس بیٹھی مینا ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا رہی تھی۔

''ویسے دادو، کتنی عجیب بات ہے ناں آپ خود ہی اپنی بات کی نفی کررہی ہیں۔ اگر میں بھی ان فیشن زدہ لڑکیوں کی قطار میں کھڑی ہوگئی ناں تو پھر میں تو کسی اور کام کی نہیں رہوں گی۔ اور آپ کو کیا اس بڑھاپے میں فیشن کی سوجھ رہی ہے؟'' آخری جملہ اس نے خاصے شرارتی انداز میں ادا کیا تھا۔

''ارے میں تو تمہارے بھلے کے لیے ہی کہہ رہی تھی۔ چلو فیشن نہ سہی گھر گرہستی ہی سیکھ لو۔ کوئی ڈھنگ کا کام کرنا تو آتا نہیں تمہیں، اتنی سی بات کہی تھی کہ ذرا ایک کپ چائے بنا دو مگر تم تو لگی ہو گلی محلے میں اٹھک بیٹھک کرنے۔'' دادی بیگم کا غصہ عود کر آیا تھا۔

''اٹھک بیٹھک نہیں دادو، ہم سب نے مل کر کرکٹ میچ رکھا تھا۔ اس لیے میں بھی اس کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی۔ آپ تو جانتی ہیں ناں کہ میں اپنی کرکٹ ٹیم کی کیپٹن ہوں۔ ارے دادو، آپ ہوتی ناں تو میری بیٹنگ دیکھ کر ہر چوکے چھکے پر واہ، واہ کر اٹھتیں۔'' مینا نے خود ہی مزہ لیتے ہوئے جھومتے ہوئے کہا۔

''شرم تو آتی نہیں..... دیدوں کا پانی مر گیا ہے جو جوان جہان لڑکوں کے ساتھ یوں گھومتی پھرتی ہو۔ تمہاری عمر میں تو میں ایک بچی کی ماں بن چکی تھی۔'' دادی بیگم نے اسے شرمندہ کرنے کی ناکام سعی کی تھی۔

''تو یہ کون سا کارنامہ ہے دادو..... اور یہ کام تو ہر لڑکی کرسکتی ہے جو جانوروں کی طرح کسی بھی کھونٹے سے باندھ دی جاتی ہے۔ میں تو کچھ الگ، کچھ منفرد کرنا چاہتی ہوں، کچھ ایسا کہ سب یاد رکھیں کہ مینا بھی ایک عظیم ہستی ہے۔'' مینا نے تصوراتی انداز میں خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

''ہونہہ، کافی زبان دراز ہوگئی ہو۔ آج آنے دے تیرے بابا کو، کرتوت بتاتی ہوں تیرے۔''

دادی بیگم بیچ وتاب کھا رہی تھیں مگر وہ سنی ان سنی کرتی ان کے پاندان سے چھالیا اٹھاتی پھلانگتی کودتی یہ جا وہ جا..... اور دادی بیگم اپنا سر پیٹ کر رہ گئی تھیں۔

''اللہ جانے کیا بنے گا اس لڑکی کا۔'' انہوں نے تاسف سے سوچا۔ مینا چار بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی سب سے چھوٹی بہن تھی۔ یاسر، ناصر، عامر اور اشعر کے بعد مینا تھی۔ مینا ان کی دعاؤں کا ثمر تھی۔ ارسلان صاحب اور سلمٰی بیگم نے بہت دعاؤں کے بعد بیٹی پائی تھی اور پھر سب اس کے لاڈ اٹھاتے نہ تھکتے تھے۔ کسی کو بھی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ بیٹی کی تربیت میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ دراصل وہ کمی تربیت، اخلاق یا بڑوں کا ادب نہ تھا بلکہ وہ نہایت سعادت مند تھی..... اور سب سے ملنساری سے ملتی تھی۔ ہر کوئی اس کے اخلاق کے گن گاتا تھا۔ مگر مسئلہ تھا تو یہ کہ اس کے لڑکی ہونے کے باوجود لڑکوں جیسے رنگ ڈھنگ تھے۔ دادی کے ٹوکنے کے بعد کم از کم کئی سال تک عامر، اشعر کے چھوٹے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے وہ جو خود کو لڑکا ہی گردانے لگی تھی۔ بالآخر اس کے لیے بھی ریڈی میڈ فراکیں آنے لگیں..... مگر بقول مینا۔

''دادو میں بھیا جیسے کپڑوں میں زیادہ آرام دہ محسوس کرتی ہوں۔'' وہ وضاحت کرتی مگر کسی کو بھی یہ بات سمجھ نہیں آرہی تھی۔ بات اب اوڑھنے پہننے سے بھی آگے کی تھی۔ وہ جب چاہتی دندناتی ہوئی محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں لگی رہتی۔ وہ تو خود چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ پھر سارا محلہ اس کو جانتا تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ آنکھ اٹھا کر بھی اسے دیکھ جاتا۔ سب جانتے تھے کہ وہ بچپن سے جوانی کی دہلیز تک قدم رکھنے میں بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ، ساتھ رہی ہے۔ اب محلے والے چہ مگوئیاں کرنے لگے تھے۔ کئی مرتبہ خواتین نے آکر سلمٰی بیگم کو ناصحانہ انداز میں سمجھایا تھا۔

''ارے لڑکی ذات ہے، ذرا سنبھل کے۔'' سلمٰی بیگم کا زور تو تب چلتا جب ارسلان صاحب بھی اس بات کا اثر لیتے۔ وہ تو ہر وہ کام کرتے جو مینا کی

رضامندی پر منحصر ہوا کرتا، مینا میں اس لیے خودسری در آئی تھی۔ ہر بات میں، میں کا زعم در آیا تھا۔ وہ بھی مکمل طور پر بھائیوں کے رنگ میں رنگتی چلی گئی تھی۔ میک اپ نہ چوڑیاں نہ پازیب نہ ہی رنگ برنگ کپڑوں کا انبار متاثر کرتا، وہ تو سرے سے ان باتوں سے ہی بیزار سی رہتی۔ اگر چہ اس پر ذرا سی بھی توجہ دی جاتی تو وہ غضب ڈھاتی شلوار قمیص پر اسٹائلر سا اوڑھے جو کبھی دوپٹے کا رول ادا کرتا تھا۔ اور بسا اوقات وہ کمر پر کسا ہوتا..... کہ بقول مینا گیم کے دوران وہ حائل ہو کر ضرر دے رہا ہوتا۔

''جرأت نہیں کسی میں کہ آنکھ اٹھا کر دیکھ تو لے، میں آنکھیں نہ پھوڑ ڈالوں اگلے کی۔'' مگر وہ لوگوں کی زبانوں کو بند کرنے پر قادر نہ تھی۔ اب چہار سو اس کے مردانہ انداز سب کو کھٹکنے لگے تھے۔ اعتراضات اٹھنے لگے تھے، سوالات اٹھنے لگے تھے، نتیجتاً اسے اب گھر میں ہی بھائیوں کے ساتھ کزنز کے ساتھ کھیلنا پڑتا۔ اس کے گلی میں جانے پر سخت ممانعت کردی گئی تھی۔ مگر وہ مینا ہی کیا جو سنور جائے۔ وہ بھی ایک آدھ بار نظر بچا کر جب تک گلی کا راؤنڈ نہ لگا آتی اس وقت تک اسے چین نہیں آتا۔ دادی بیگم کی راتوں کی ہی نہیں دن کی نیندیں بھی حرام ہو چکی تھیں۔ اب تو سلمٰی بیگم کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ وہ ایک اچھی ماں ثابت نہیں ہوئیں۔ لاڈ اور پیار نے معاملہ خراب کر ڈالا تھا۔ اب مینا کوئی دودھ پیتی بچی نہ تھی۔ باقاعدہ کالج گرل تھی مگر اس کے انداز وہی تھے پرانے والے۔ بلیک بیلٹ ہولڈر تھی اس لیے اسے کسی کا کوئی خاص خوف بھی مانع نہ تھا۔

''شام کو تیار رہنا ہم سب بھائی کے رشتے کے لیے جارہے ہیں۔'' سلمٰی بیگم نے اسے خوشی سے کہا تھا۔ وہ آرام سے ماں کے سامنے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی سیب کھا رہی تھی۔

''لو، کوئی ضرورت ہی نہیں اس منہ پھاڑ لڑکی کو ساتھ لے جانے کی۔ ابھی تو رشتہ دیکھنے جانا ہے، تم ہرگز اس کو نہ لے کر جانا۔'' دادی بیگم نے بالکل بھی اس بات کی تائید نہ کی تھی۔

''کیوں دادو، میں کیوں نہ جاؤں؟'' وہ ہونق ہوئی۔

''بس اب میرا منہ نہ کھلواؤ۔'' دادی بیگم کا چہرہ بن گیا تھا۔ سلمٰی نے آنکھوں کے اشارے سے مینا کو وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ وہ خفگی سے آدھا سیب وہیں چھوڑ کر اٹھ کر چلی گئی۔

''ایک بات کہوں، ناراض نہ ہونا۔ یہ سب چونچلے تبھی تک..... آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں جب تک اولاد، ماں، باپ کی دہلیز پر ہو۔ جیسے ہی لڑکی بیاہ کر سسرال میں قدم رکھتی ہے۔ اس کے ہر اٹھتے قدم پر پڑتی سو، سو نگاہیں اعتراضات میں ڈوب جاتی ہیں۔'' انہوں نے ناصحانہ انداز میں کہا تو سلمٰی بیگم سر جھکا گئی تھیں۔

''جی اماں بی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر میں اب کیا کروں..... وہ تو کسی طور کچھ سمجھنے پر آمادہ ہی نہیں۔'' سلمٰی بیگم نے ندامت سے وضاحت کی۔

''اب رشتے کے معاملات خاصے نازک ہوا کرتے ہیں، جب تک یہ رشتہ پکا نہ ہو جائے تم اس لڑکی کو وہاں مت لے جانا۔'' وہ ساس کی بات پر تائیدی انداز میں سر ہلا گئیں۔

پھر شام کو اماں بی، سلمٰی بیگم، ارسلان صاحب..... چھوٹے اشعر کو ساتھ لے گئے تھے۔ واپسی پر سب کے چہرے کھلکھلاتے ہوئے تھے۔

''ماشاء اللہ بہت اچھے لوگ ہیں۔'' ارسلان صاحب بولے۔

''مجھے تو بھابی بے حد پسند آئیں۔'' اشعر مسکرایا پھر آناً فاناً یہ رشتہ طے ہوگیا۔ نصیرہ بھابی واقعی بے حد اچھی تھیں۔ یاسر اور نصیرہ کی جوڑی بے حد اچھی تھی۔ سب اس رشتے سے خوش تھے۔ اور یوں چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق وہ بہو بیاہ لائے تھے۔

☆☆☆

صبح سویرے نصیرہ کچن میں یاسر کے لیے ناشتا تیار کررہی تھیں۔ جب مینا کچن میں آئی۔ آج اس کا سر

Digitized by Google

بوجھل سا تھا، اس لیے اس نے کالج سے چھٹی کرلی تھی۔

''بھابو، مجھے ایک کپ چائے بنادیں۔'' وہ لاڈ سے بولی تھی۔ جواب اس کی شخصیت کا خاصہ بن گیا تھا۔

''کیوں بھئی کیا تمہارے ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی ہے، تم خود بنالو.....''

نصیرہ بھابی نے خاصے سرد لہجے میں کہا۔ مینا نے ایک دم چونک کر نئی نویلی بھابی کو دیکھا۔ شاید وہ بھابی کے چہرے پر مذاق کا کوئی رنگ ڈھونڈنا چاہتی تھی۔ مگر وہاں محض سرد مہری کے سائے تھے۔

''بھابی آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟'' وہ مجو حیرت تھی۔ سرد رو میں جیسے اچانک اور بھی اضافہ بھر گیا تھا۔

''میں نے ایسا کیا کہہ دیا بی بنو، یہی تو کہا ہے کہ ایک کپ چائے چاہیے تو ہاتھ ہلالو اور بنالو۔'' نصیرہ بھابی کا لہجہ طنزیہ تھا، وہ ناراض سی منہ پھلائے کچن سے باہر آگئی۔

سامنے آتے ہوئے یاسر نے بہن کا انداز ملاحظہ کیا اور کھٹک سا گیا۔

''کیا ہوا میری مینا کو؟'' یاسر نے محبت سے پوچھا۔

''یہ آپ اپنی بیگم سے پوچھیں؟'' مینا نے خفگی سے کہا۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' مینا نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ دونوں ہاتھ لپیٹے منہ بنائے کھڑی رہی۔

''نصیرہ ذرا ادھر آؤ۔'' یاسر نے آواز لگائی۔

''جی بولیں۔'' نصیرہ مصروف سے انداز سے کچن سے باہر نکلی۔

''تم نے ایسا کیا کہہ دیا جو ہماری گڑیا کا موڈ اتنا خراب ہے۔''

یاسر نے ہنس کر پوچھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کوئی گڑیا نہیں ہے۔ جیتی جاگتی لڑکی ہے، دوسرے میں نے اسے ایسا کچھ بھی نہیں کہا جو اس نے اتنا موڈ بنالیا۔ میں نے اسے محض اپنا کام خود کرنے کو کہا ہے اور بس.....''

''ہاں یہ تو بالکل ٹھیک کہا۔ اس میں اتنا ناراض ہونے والی تو بات ہی نہیں اور یہ چھوٹی، چھوٹی باتوں پر بھابی کی شکایتیں لگانے والی نند نہ بنو مینا۔'' یاسر نے ذرا سخت لہجے میں کہا اور مینا ایک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ کہاں تو اس کے لاڈ اٹھانے میں اس کے بھائی کوئی کسر اٹھا... نہ رکھتے تھے اب اتنے سے دنوں میں وہ اس کو ڈانٹ بھی رہے تھے۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آگئی تھی اور کچھ دیر بعد پڑوس میں چلی گئی۔

''کیا بات ہے مینا اتنی اداس کیوں ہو..... کہیں میری آنکھیں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہیں۔''

پڑوس میں شبو خالہ کا گھر تھا۔ ان کے اکلوتے فرزند وقار سے جب تک وہ دل کا حال بیاں نہ کرلیتی اسے چین کہاں پڑتا تھا۔ یہاں بھی معاملہ برعکس تھا۔ لڑکیاں لڑکیوں کو دوست بناتی ہیں اور لڑکیاں، لڑکیوں سے دل کی باتیں، دکھ سکھ بانٹتی ہیں۔ مینا نے وقار سے گہری دوستی کر رکھی تھی۔ مگر اس دوستی میں شفافیت تھی۔ دونوں کا بچپن کا ساتھ تھا اور بہت گہرا تھا..... اگر بھولے سے بھی وقار کے دل میں اس انسیت نے کوئی اور رنگ اپنائے تھے تو بھی وقار نے محض اس خوف کے سائے تلے کہ مینا اس کی چپ کو اس کے نظروں کے تصادم کو کوئی مفہوم پہنا کر اس سے کنارہ کشی نہ اختیار کرلے..... وہ مینا سے بات کیے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ عمر کے اس حسین دور میں وقار سمجھ گیا تھا کہ اسے مینا کی سنگت ہی راس آئی ہے مگر مینا اب بھی ناسمجھی کی چادر اوڑھے ماہ و سال بتا رہی تھی۔ نہ جانے ان جذبوں کی آنچ مینا تک کب اور کیسے پہنچتی تھی۔ فی الحال تو راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

''یوں ہی اداس تو نہیں کچھ سوچ رہی تھی۔'' مینا پھیکی مسکان لبوں پر سجائے بولی۔ اس کے لہجے میں بھی شکستگی در آئی تھی۔

''ہونہہ... تو کیا سوچ رہی ہے میری مینا؟'' وقار شرارت سے مسکرایا۔

''یہی کہ بھائی شادی کے بعد بدل جاتے ہیں

ایسا سنا ضرور تھا مگر اب دیکھ بھی لیا ہے، بھائی شادی کے بعد بھابی کی زبان بولنے لگے ہیں۔ یوں جیسے اپنی کہیں گروی رکھوا آئے ہوں۔'' مینا نے بالآخر شکوہ کر ہی ڈالا تھا۔

''اچھا تو یہ بات ہے، اس میں کیا مشکل ہے زندگی ہمیشہ یکساں رنگ لیے تو نہیں ملتی ناں۔ اس میں ہجر کے، وصل کے، آس کے، نراس کے، کچھ پانے اور کچھ کھو دینے کے، محبت کے، نفرت کے، سارے رنگوں کا امتزاج ملتا ہے، اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم کون سے رنگ اپنی ذات کے لیے منتخب کرتے ہیں، اب اگر بھابی کو تم سے ناراضی ہے تو تم ان کو نظر انداز کردیا کرو..... بھائی سے بھابی کی بات ہی نہ کرو، بھابی سے امیدوں کا پاس نہ رکھو۔'' بڑے ناصحانہ انداز میں وقار بولا تھا۔ پھر مینا نے دوبارہ یہ غلطی نہ دُہرائی تھی اب وہ بھابی کو کم ہی مخاطب کیا کرتی۔ نصیرہ بھی ہر لحظہ اپنی بھٹکتی نظروں کو مینا پر ٹکائے اس کی کمی بھی غلطی کی تلاش میں رہا کرتی۔ جہاں مینا نے کوئی غلطی سرزد کی وہیں اس کی سرزنش شروع ہوجاتی۔ سب کے سامنے تذلیل کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی۔

انہی دنوں ناصر بھائی کا... بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ چل نکلا۔ یہ ایسا سنہری موقع تھا جسے نظر انداز کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ ناصر نے باپ کی منت سماجت کی۔ بہ ظاہر یہ شاندار مستقبل کی ایک ضمانت تھی۔ سلمٰی بیگم نے نمناک آنکھوں سے بیٹے کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔ ایک سچ تو یہ بھی تھا کہ ناصر کی شادی کے بعد جو حالات سامنے آئے تھے، سلمٰی بیگم اس سے قطعی خوش نہ تھیں۔ نصیرہ نے شوہر کو تو راضی کرلیا تھا مگر سسرال میں کوئی بھی اس سے راضی نہ تھا۔ ہر کسی کو نصیرہ سے شکوے تھے مگر یہ ایسے گلے تھے جو گلے سے نہیں نکل سکتے تھے کہ وہیں ان کا دم گھونٹ کر دبا دیے گئے تھے۔ ان کی آواز وہیں دل کے نہاں خانوں تک ہی مقید تھی۔ اب سلمٰی بیگم کی تمام امیدوں کا مرکز و محور صرف ناصر تھا۔ ناصر کے باہر جانے کی بات پر وہ..... بے حد اداس ہوگئی تھیں۔ دلگرفتہ سی تھیں اور پھر ناصر کو اجازت تو دے ڈالی۔ دل پر بھاری پتھر کی سل رکھ کر۔ تمام گھر والے اشکبار نم ناک آنکھیں لیے ناصر کو رخصت کررہے تھے سوائے ارسلان صاحب کے۔ وہ بے حد خاموش تھے۔

''میں خود تمہیں رخصت کرنے جاؤں گا۔'' ارسلان صاحب نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تھا۔ مینا کا رو، رو کر برا حال تھا۔ ناصر بھائی سے اس کی گہری دوستی تھی، بے حد محبت تھی۔ جب سے اس نے ناصر بھائی کے جانے کا سنا تھا بہت اداس تھی۔

''میں جلد آؤں گا گڑیا، اداس نہ ہو۔'' ناصر بھائی نے اس کے سر پر ہلکی سی پیار بھری چپت رسید کی تھی۔ وہ ہولے سے مسکرادی۔ ماں نے محبت سے بیٹے کا ماتھا چوما پھر ارسلان صاحب نے آواز دی تو وہ گاڑی میں آبیٹھا۔

''بھائی۔'' یہ عامر تھا۔

''میں بھی آپ کو سی آف کرنے جاؤں گا۔'' بشاشت طاری کرتا لہجہ تھا۔

ناصر نے زوردار انداز میں چھوٹے بھائی سے ہاتھ ملایا پھر ائرپورٹ تک چھوڑنے کے بعد ارسلان صاحب اور عامر واپس پلٹے۔

ارسلان صاحب کے کانوں میں ناصر کی آواز گونج رہی تھی۔

''امی کا خیال رکھیے گا، آج کل وہ پریشان رہتی ہیں، یہ الگ بات ہے کہ منہ سے کچھ نہیں کہتیں۔'' ڈرائیونگ کرتے ہوئے لحظہ بھر کو ان کا دماغ جیسے کہیں اور چلا گیا تھا۔ اور وہی لمحہ جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ وہ کار کو کنٹرول میں نہ رکھ سکے۔ سامنے سے آتی کار موڑ کاٹتے ہوئے بری طرح سے ان کی کار سے ٹکرائی تھی۔ وہ ڈانوں ڈول کار کو قابو کرنے کی سعی میں بری طرح ناکامی کا شکار ہوئے تھے اور بالآخر اس حادثے میں جانبر نہ ہوسکے۔

نہ صرف ارسلان صاحب بلکہ عامر کی بھی میت

Digitized by Google

گھر کے دروازے تک آئی تو محلے والوں نے ہی کہرام مچادیا۔ سلمٰی بیگم کو تو جیسے جامد خاموشی نے گھیر لیا تھا۔ سب روتے تھے مگر اُن کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا تھا۔ سکتے کی کیفیت سے دو چار سلمٰی یک ٹک دروازے کو گھورتی رہتیں۔ جیسے ابھی، ابھی ارسلان صاحب مع عامر کے آجائیں گے۔ اشعر، ماں کو رُلانے کے سو جتن کرتا۔ یاسر نے بھی ماں کو خوب گلے سے لگایا مگر وہ تو جیسے پتھر کا تودہ تھیں۔ جو پگھل ہی نہیں رہا تھا۔ ناصر کو اطلاع تو مل گئی تھی مگر اتنی جلدی وہ واپس نہیں آسکتا تھا۔ وہ آخری مرتبہ ائرپورٹ پر ہی باپ سے مل سکا تھا۔ اس کے بعد وہ نہ دیکھ سکا کہ تدفین ہوگئی مگر گھر کی سوگواری میں رتی بھر کمی نہ آئی تھی..... بے یقینی کا موسم پھیلا تھا۔ مینا مرجھا گئی تھی۔ اس کی خوشیوں، شوخیوں کا اصل مرکز ومحور تو جاچکا تھا۔ اس کا ناز اٹھانے والا اس کا باپ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ وہ کونوں میں جا کر روتی، کرلاتی تھی، نمناک نگاہیں لیے باپ کی ہر اک شے کو تکا کرتی تھی۔ کیا ناگہانی ہوگئی تھی۔

''بھئی کب تک یہ سوگ جاری رہے گا اب کچھ ہانڈی روٹی پر بھی توجہ دو، ماں تو مانا رکھتی ہے تم بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہتی ہو۔ کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہو۔'' نصیرہ نہ ختم ہونے والے کاموں کے سلسلے سے عاجز آگئی تھی، ایک روز ہالآخر بول اٹھی۔

''یاسر اپنی امی کو سنبھالیں اس طرح کب تک چلے گا۔ میں کام کرتے، کرتے تنگ آگئی ہوں اوپر سے دادی کے بھی کام.....'' حالانکہ ان کی نرس الگ تھی۔ نصیرہ کو تو جیسے کوئی خوف ہی نہیں رہا تھا۔ ارسلان صاحب اور دو بڑے بیٹوں کے جانے کے بعد وہ خوف جو اسے اپنا اصل چہرہ آشکار کرنے سے روکتا تھا۔ اب کھل کر سامنے آچکا تھا۔

مینا کو تو کوئی کام کرنا ہی نہیں آتا تھا۔ آٹا گوندھتی تو ڈھیر سارا پانی ڈال دیتی پھر دوبارہ آٹا ڈالتی پھر بھی اتنا سخت گوندھتی کہ پیڑا ہی نہ بن پاتا۔ مگر وہ سب سیکھ رہی تھی ماں کی خاطر، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اتنے صدمے میں اس کی ماں مزید صدمات کا شکار ہو، کھانا بنانے کی کوشش میں کئی بار جگہ، جگہ سے مینا کے ہاتھ جل جاتے مگر وہ گرم سیال آنکھوں سے بہاتے کام میں لگی رہتی۔ برتن دھوتے، ٹھٹھرتی سردی میں وہ کبھی نہ تھکتی۔ تھکان تو رگ وپے میں سرایت کرچکی تھی۔ وہ تھکان تھی نارسائی کی، اپنوں کے بدلتے ہوئے رویوں کی۔ وہ مسلسل کاموں میں لگی رہتی تھی۔ اس کا حلیہ بُرے سے برا ہو چکا تھا۔ مگر نصیرہ بھابی نے نہ خوش ہونے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اس کے ہر کام میں سو، سو کیڑے نظر آتے اور پھر سب کے سامنے اسے ذلیل کیا کرتیں اسے نکمی، کام چور، پھوہڑ اور آوارہ مزاجی اور نہ جانے کون، کون سے القابات سے نوازتی تھیں۔

وہ خاموشی سے ہر الزام سہتی رہتی۔ اس کا باپ مرا تھا۔ بھائی مرا تھا۔ ایک بھائی دیارِ غیر میں تھا..... ماں سکتے میں تھی اور ایک دن خاموشی سے دادی نے بھی آنکھیں بند کرلیں۔ ابھی ایک بھائی اتنا چھوٹا تھا کہ حق کے لیے بول نہیں سکتا تھا اور جو بھائی بول سکتا تھا وہ گونگا بنا یہ سب دیکھ رہا تھا بلکہ بسا اوقات وہ اپنی بیگم کا حامی بنا یوں بول رہا ہوتا تھا۔

''میں تو پہلے دن سے ہی کہتا تھا مگر بابا جان نے تو اس لڑکی کو خود سر بنا ڈالا اور اب یہ ہمارے سر پر مسلط ہے۔'' یہ وہی بھائی تھا جو اس کے ناز اٹھاتے نہ تھکتا تھا۔ باپ کے جاتے ہی اس کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔

ایک دن جب وہ سرِشام سرد موسم میں زمین پر پوچا لگا رہی تھی اور نصیرہ نے حظ اٹھانے کی خاطر جان بوجھ کر وہاں چائے گرادی۔

''لو صاف کرو اسے، مجھے کہا گیا تھا پہلی رات کہ اس گھر میں رہنا ہے تو مینا کو خوش کرنا سیکھو۔ اب میں کہتی ہوں، تم نے اس گھر میں رہنا ہے تو مجھے خوش کرنا سیکھو سمجھیں۔'' وقار اتنے عرصے سے مینا کے نظر نہ آنے سے مضطرب تھا جب اس دن وہ خود گھر آیا تو یہ منظر دیکھا۔ اس کا دل دکھ سے بوجھل ہوگیا۔

''بھابی کچھ تو خوف خدا کریں۔'' وقار تھا جو نصیرہ کو احساس دلا رہا تھا کہ وہ اللہ سے ڈریں۔

''تم ہوتے کون ہو ہمارے معاملات میں بولنے والے۔ یوں منہ اٹھائے چلے آرہے ہو، میں خوب جانتی ہوں، تمہاری اور مینا کی گہری دوستی کو..... خوب آنکھ مٹکا چل رہا ہے ناں؟'' وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔

''یہ آپ کیسی باتیں کررہی ہیں؟'' وقار نے متعجب لہجے میں کہا۔

''ایسا کیا غلط کہہ دیا، کیا میری آنکھیں نہیں ہیں۔'' وہ نہ جانے کیا، کیا کہہ رہی تھی۔

''بس اب ایک لفظ اور نہ کہنا میری بچی کے لیے۔'' سلمٰی بیگم جو خلاؤں میں تکتے رہتے اتنے ماہ و سال بتا گئی تھیں آج بول ہی پڑی تھیں۔

''لو جی بڑھیا کو بھی آج ہوش آگیا۔'' نصیرہ نے ہنس کر کہا۔ کہتے ہیں کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے مگر جس کو لگتی ہے، بہت زور سے لگتی ہے۔ آج اللہ پاک نے بھی انصاف کر ڈالا تھا، یہ سارا منظر نہ جانے کب آکر خود یاسر نے دیکھ لیا تھا۔ اور آج اسے نصیرہ کی مینا کے لیے نفرت بھی معلوم ہوگئی تھی۔ اس کی مذاق کے رنگ میں کہی ایک بات کہ ''اگر یہاں رہنا ہے تو مینا کو راضی رکھنا'' نے نصیرہ کے دل و دماغ میں مینا کے لیے اس قدر زہر بھر دیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا، نصیرہ کا آج کا تلخ رویہ دیکھ کر اس کا دل اس کی جانب سے شدید بدگمان ہوگیا تھا۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری ماں کو یوں مخاطب کرنے کی اور میری معصوم پاک دامن بہن کو... بدکردار کہنے کی۔'' یاسر نے غیظ وغضب سے کہا تو نصیرہ کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ اسے تو معلوم ہی نہ تھا کہ یاسر عین وقت پر اس کی ساری بات سن لے گا اور اصل حقیقت جان لے گا۔

''میں ابھی اسی وقت تمہیں.....'' قبل اس کے کہ وہ جملہ مکمل کرتا سلمٰی بیگم نے چٹاخ سے ایک تھپڑ یاسر کے منہ پر رسید کردیا۔

''کاش کبھی تم بھی صبر وتحمل سے، اپنی عقل سے ذرا دھیرج سے معاملات کو سمجھتے۔ کبھی تم اپنی بیوی کی زبان بول کر ہمیں زچ کرتے رہے اور آج بیوی کو طلاق دے رہے ہو، جتنی قصور وار وہ ہے اتنے ہی تم بھی ہو، تم اسے اتنی ڈھیل نہ دیتے تو آج یہ یوں منہ زوری نہ کرتی۔'' یاسر سر جھکائے کھڑا تھا۔ رہی بات وقار کی تو میں بتادوں کہ اس کا اور وقار کا رشتہ تو میں اور اس کی ماں نہ جانے کب کا طے کر چکے ہیں، ہم نے اس لیے کبھی یہ بات نہیں بتائی کہ بچوں کا دماغ خراب نہ ہو مگر آج جب تم نے میری بیٹی کے کردار پر انگلی اٹھائی ہے تو بتادوں یہ کوئی غیر نہیں بلکہ اس گھر کا ہونے والا داماد ہے۔'' سلمٰی بیگم نے نصیرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ سر جھکا گئی۔

''آنٹی..... آنٹی مجھے معاف کردیں۔ آج آپ کی وجہ سے میں بے گھر ہونے سے بچ گئی اور میرا بچہ بھی۔'' وہ گلوگیر لہجہ میں بولی۔

''بچہ.....؟'' سلمٰی بیگم نے تعجب سے پوچھا۔

''جی.....'' وہ نظریں جھکا گئی تھی۔ دادی بننے کی خوشخبری نے سلمٰی بیگم کو جیسے نئی توانائی دے دی تھی۔ آنسو تواتر سے ان کے گال بھگو رہے تھے پھر ساس اور بہو دونوں گلے مل کر خوب روئی تھیں۔ آج سب کے دل صاف ہوگئے تھے۔ مینا نے دیکھا وقار قدرے فاصلے پر کھڑا یہ سارا منظر دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

''شکر ہے آنٹی ٹھیک ہوگئیں۔ امی نے تو کتنی بار شادی کی تاریخ لینے کے لیے آنا چاہا تھا مگر وہ آنٹی کی طبیعت کی وجہ سے چپ تھیں۔ اب میں جلد امی کو بھیجوں گا۔ میں مزید اپنی ہونے والی بیوی کو اتنے کام میں کمزور ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔'' وقار نے محبت پاش نظروں سے مینا کو دیکھا تو مینا نے آج پہلی بار محسوس کیا کہ وہ بھی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے وقار کو چاہتی چلی آرہی تھی۔ صرف احساس آج ہوا تھا۔

Digitized by Google

ناولٹ

طوافِ آرزو

طیبہ عنصر مغل

دردِ زہ سے تڑپتے ہوئے شائلہ نے گردن گھما کر اپنے دائیں جانب والے بیڈ پر لیٹی ہوئی اس لڑکی کو دیکھا جو کم و بیش اسی کی ہی ہم عمر تھی اور اس کے چہرے پر بھی وہی اذیت رقم تھی جس کا سامنا اس وقت شائلہ کو تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شائلہ کے ساتھ اس وقت کوئی فرد نہیں تھا۔ وہ بالکل تنہا تھی جبکہ اس لڑکی کے سرہانے ایک حسین نقوش مگر کرخت تاثرات والی عورت موجود

تھی اور وہ بار بار اس لڑکی کے چہرے پر آنے والا پسینہ صاف کرتی تھی اور تکلیف دہ لمحات میں اس کو بار بار دلاسا بھی دے رہی تھی۔ اس وقت لیبر روم میں اور بھی بہت سی عورتیں تھیں جو جان کنی کی کیفیت میں جلد یا بدیر ایک نئی زندگی کو جنم دینے والی تھیں لیکن شائلہ کی تمام تر توجہ کا مرکز وہی لڑکی تھی۔

☆☆☆

Digitized by Google

''اماں میں شہر میں نہیں تھا تو کم از کم آپ ہی اس کے ساتھ چلی جاتیں مجھے تو تسلی رہتی.....'' عمر نے خفگی سے جھنجلا کر کہا۔

''میری عمر اب اس قابل ہے کیا کہ میں زچہ کو سنبھالتی پھروں جبکہ یہ جو دو مصیبتیں گھر میں ہیں ان کو کسی غیر کے بھروسے..... تو چھوڑنے سے رہی۔'' اماں کو بھی غصہ آ گیا تھا۔ منابل اور مشعل نے پچھلے کتنے گھنٹوں سے ان کو نچا کے رکھا ہوا تھا۔

''افوہ..... اماں تو آپ زریں آپا کو بھیج دیتیں ناں۔'' عمر نے اکتا کر کہا۔

''واہ بھیا! زریں کی بھی تم نے خوب کہی..... جیسے تم تو جانتے نہیں کہ اس کے موئے سسرال والوں نے کیسے جان ضیق کی ہوئی ہے میری بچی کی۔ مہینوں تو زریں کی شکل کو ترس جاتی ہوں۔ بیچاری میری بچی.....'' اماں حسب معمول رونے لگی تھیں۔

''اچھا اماں، آپ کوشش کریں کہ اس کی کوئی خیر خبر لے لیں، فون کر لیں اس اسپتال میں۔'' وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔

''چل کر لیتی ہوں پتا لیکن کچھ نیا نہیں ہونے والا پھر سے کوئی جونک اٹھا کے آ جائے گی۔ میں نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ اس بار لڑکی ہوئی تو اس گھر کا رستہ بھول جائے۔'' اماں نے سرد مہری سے جواب دیا۔

دوسری طرف عمر نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ کہتا بھی تو کیا ایسے ہی خیالات کا اظہار وہ بھی تو کر چکا تھا کہ اسے اب بیٹی نہیں چاہیے۔ ''اس کے بعد میں دوسری شادی کر لوں گا.....'' بے دلی سے اللہ حافظ کہتے عمر نے فون کا ریسیور رکھ دیا۔

اماں نے فون رکھا اور ایک بار پھر سے بڑبڑاتے ہوئے پوتیوں کی بکھیری ہوئی چیزوں کو سمیٹنے لگیں۔ ایک بار پھر سے فون کی تیز گھنٹی پہ وہ اچھل پڑیں۔

''موا یہ فون بھی نری مصیبت ہے، سارا دن اس پیاری کو ہی بستے رہو، اب ہمیں تو جیسے اور کوئی کام نہیں ہے۔'' ریسیور کو کان سے لگا کر ہیلو کہا اور دوسری طرف کی بات سن کر ایک دم سکتے میں آ گئیں۔

☆☆☆

اسپتال کے پرائیویٹ کمرے میں شفٹ ہونے کے بعد اس کے چہرے پر بے حد طمانیت کے آثار تھے۔ منابل کی پیدائش پر بھی زندگی و موت کی جنگ لڑنے کے بعد جب منابل اس دنیا میں آ گئی تو عمر نے اسے پرائیویٹ روم میں منتقل کروا دیا تھا لیکن مشعل کی دفعہ تکلیف کی انتہا سے گزرنے کے بعد وہ نیم جان ہو گئی تھی۔ خون کی کمی اور اوپر تلے کی پیدائش کی وجہ سے اسے آرام کی ضرورت تھی۔ اور ڈاکٹر کا بھی کہنا تھا کہ ابھی زچہ کی حالت درست نہیں ہے۔ کم از کم ایک دن بچے اور ماں دونوں کا اسپتال میں رہنا بہت ضروری ہے..... لیکن پرائیویٹ روم تو دور کی بات وارڈ میں بھی نہیں رکھا گیا اور عمر سمیت سب نے سنا ان سنا کر دیا اور بچی کی پیدائش کے دو گھنٹے بعد وہ گھر پر تھی۔ پورے گھر پر ایک سوگ کی کیفیت تھی۔

''شائل کیسی ہو؟ آنکھیں کھولو۔'' عمر کی آواز پہ شائل نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں۔

''آپ کب آئے؟'' وہ حیرانی سے عمر کو دیکھ کر بولی۔

''بس ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آیا ہوں..... میں نے اپنی میٹنگ ملتوی کر دی ہے۔ خیر ہی اتنی اچھی ملی، مبارک ہو.....'' وہ اپنے لہجے میں سارے جہان کا پیار سموئے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ اس کی بات پر اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے اس وی آئی پی روم کا جائزہ لیا جو اس وقت اسپتال کا کمرا کم پھولوں سے بھرا ہوا کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا کمرا زیادہ لگ رہا تھا۔ وہ ایک سنجیدہ نظر کمرے پر ڈال کر اٹھنے لگی تو اماں جو ابھی، ابھی کمرے میں دوبارہ آ رہی تھیں، جلدی سے اس کی جانب بڑھیں۔

''ارے، ارے اٹھ کیوں رہی ہو، ابھی تو ایک دن ہوا ہے بچہ پیدا کیے، آسان تھوڑی ہے ماں بننا..... ہڈی، خون ایک ہو جاتا ہے۔ لیٹی رہو تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔'' صحیح تو کہہ رہی تھیں اماں آسان تھوڑی ہے بچہ نہیں بیٹا اور صرف بیٹا پیدا کرنا..... بیٹا پیدا کرنے میں کتنا درد اٹھاتی ہے عورت،

یہ اس سے بہتر کون جان پاتا۔ اس نے بھی واپس لیٹ کر خاموشی سے آنکھیں بند کر لیں۔

''ہمیں بھائی کو دیکھنا ہے اور اٹھانا بھی ہے۔'' پانچ سالہ منابل کو بھائی کو گود میں لینے کی جلدی تھی۔ اماں نے اس کو گھر کا تو زریں نے جلدی سے معاملہ سنبھالا۔

''ابھی بھائی بہت چھوٹا ہے ناں تو منابل کے بھائی کو خدانخواستہ جراثیم بھی لگ سکتے ہیں۔ تھوڑا سا اور بڑا ہو جائے گا تو پھر منابل بھی اٹھائے گی اور میری گڑیا مشعل بھی۔'' منابل کو کچھ سمجھ میں آیا یا نہیں البتہ وہ منہ بسورتی ماں کے پاس آ گئی۔ شائل نے آنکھیں کھول کر منابل کے معصوم چہرے کو دیکھا اور گلے لگا لیا اس کی دیکھا دیکھی مشعل بھی ماں سے آن چپکی..... شائل نے اپنی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو پونچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی..... عمر نے اس کے خوشی سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنی پوروں پر چن لیا۔ شائل کے دونوں جانب منابل اور مشعل اور پاس میں محبت پاش نظروں سے دیکھتا عمر..... منظر گویا مکمل تھا۔

☆☆☆

انجمن آرا نے تو گویا خزانوں کے منہ کھول دیے تھے۔ کوٹھی باہر سے اندر تک جھلملاتی لائٹوں کی آرائش سے جگمگا رہی تھی۔ دور سے دیکھنے سے لگتا تھا کہ کسی کی شادی ہے لیکن انجمن آرا کی نواسی کا عقیقہ بھی کسی شادی سے کم تھوڑی تھا۔ جبل نے بچی کی پیدائش پہ کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کوٹھی میں جشن کا سماں تھا اور وہ کروٹ لیے دیوار پر نظریں گاڑے تھی گویا گزرے وقت کی ادھوری خوشیوں کو دیوار پر کسی فلم کی طرح چلتے ہوئے محویت سے دیکھ رہی ہو۔ علی حسن کی محبتوں کا ایک، ایک پل اس کی نظروں کے سامنے کسی فلم کی طرح گھوم رہا تھا۔

اس دن وہ اپنی دونوں بہنوں کے ساتھ مارکیٹ کے لیے نکلی تھی۔ نئی، نئی ڈرائیونگ سیکھی تھی۔ پہلا موڑ مڑتے ہی وہ بچاتے، بچاتے بھی سامنے سے آتی گاڑی سے اپنی گاڑی ٹکرا بیٹھی تھی، بیلٹ باندھے ہونے کی وجہ سے اس کا سر گاڑی کی ونڈ اسکرین سے ٹکرانے سے تو بچ گیا تھا لیکن ساتھ بیٹھی رائمہ ڈیش بورڈ سے ٹکرا گئی شاید اس کی کلائی مڑ گئی تھی۔ وہ ابھی اسی کی طرف دھیان کیے ہوئے تھی کہ سامنے والی گاڑی والے لڑکے نے ان کی گاڑی کے بند شیشے پہ اپنی جالبی سے دستک دی تھی۔

جبل جو پہلے سے پریشان بیٹھی تھی اس نوجوان کو دیکھ کر اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس نوجوان کی انتہائی قیمتی گاڑی ٹھیک ٹھاک قسم کی ٹھک گئی تھی۔ بادل ناخواستہ جبل نے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا۔

''دیکھیے، اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ غلطی میری تھی تو ایسا ہرگز نہیں ہے، میں تو بہت پرفیکٹ ڈرائیونگ کرتی ہوں اور اگر نقصان آپ کی گاڑی کا ہوا ہے تو میری بھی گاڑی اچھی خاصی قیمتی ہے اور اب ایسا بھی نہیں ہے کہ میں آپ کو ایسے ہی جانے دوں گی اور ہرجانہ بھی نہیں لوں گی۔''

''چپ، بالکل خاموشی ہو جائیں۔ کمال کی خاتون ہیں آپ..... بس بولے چلی جا رہی ہیں جبکہ آپ کی ساتھی زخمی ہیں اور سب سے پہلے ان کو اسپتال لے جانے کی ضرورت ہے اس وقت..... ہری اپ جلدی کریں اور ان کو لے کر میری گاڑی میں بیٹھیں ہم ان کو قریبی اسپتال لے کر چلتے ہیں۔'' وہ جو اس کی طویل بے ربط گفتگو سے تنگ آ کر بولا تو پھر بولتا چلا گیا۔

''میں اپنی ساتھی کو خود اسپتال لے جا سکتی ہوں، مجھے آپ کے احسان کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے رائمہ کے ماتھے سے نکلتے خون کو دیکھا اور جلے کٹے اور جتلانے والے انداز سے بولی۔

''دیکھیے محترمہ.....! آپ کے پاس کوئی اور آپشن نہیں ہے کیونکہ آپ کی انتہائی قیمتی اور نئی گاڑی میں سے دھواں برآمد ہو رہا ہے، جس کا مطلب ہے کہ ابھی وہ خود کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کو بے قرار ہے اور آپ کو میری مدد کی پیش کش قبول کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہیے۔''

اتنی دیر میں رائمہ بے ہوش ہو کر جبل کے کندھے سے آ لگی اور جبل کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تو اس نے پیچھے بیٹھی نائمہ کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا یہ مشکل دونوں نے تھیٹ گھسا کر رائمہ کو باہر نکالا۔ باہر نکالتے ہوئے

Digitized by Google

ان دونوں دھان پان سی لڑکیوں کا دم پھول گیا۔
’’موٹی، کم عقل اگر بیلٹ باندھ لیتی تو اس کا کیا جاتا...... پر نہیں جی ان کی حفاظت کے لیے ہم چوکیدار جو بیٹھے ہیں۔‘‘ دھڑام سے اس...نوجوان کی گاڑی میں رائمہ کو پھینک کر تجل نے بڑ بڑا کر اپنا غصہ نکالا......نوجوان زیرِلب مسکرا رہا تھا۔ اور بڑی دلچسپی سے تجل کے لال ہوتے حسین چہرے کو دیکھ رہا تھا۔
’’میرا خیال ہے مسٹر......‘‘
’’جی مجھے حسن کہتے ہیں۔‘‘ وہ جلدی سے بولا۔
’’جی مجھے نہیں پتا کہ کون، کس کو کیا کہتے ہیں‘ اس وقت اگر آپ میرا جائزہ لے چکے ہوں تو مہربانی فرما کر اسپتال لے چلیں۔‘‘ وہ طنز سے اس کو دیکھ کر بے ساختہ بولی...تو حسن نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر خود بھی گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔
اسپتال پہنچ کر رائمہ کی مرہم پٹی کی گئی اور کلائی کے مڑ جانے کے علاوہ اور کوئی سیریس چوٹ نہیں تھی۔ اور ڈاکٹر کے گال تھپتھپانے پر وہ فوراً ہوش میں بھی آ گئی تھی۔ تجل نے اس کی پٹ سے کھلی آنکھیں دیکھیں تو اس کے اوپر جھک آئی۔
’’توشنگی کہیں کی کھاتی اتنا ہے اور ذرا سی چوٹ پر بے ہوش یوں ہوئی گویا فاقہ زدہ فقیر ہو......‘‘ نائمہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر حسن کی موجودگی کا احساس دلایا......تو تجل کی زبان کو بریک لگی اور اب معمولی سے انکار کے بعد تجل مزے سے حسن کی گاڑی میں واپس گھر روانہ ہو گئی تھی۔ اور حسن نے ان کے گھر پر ڈراپ کرنے کے بعد اُن کی چائے کی آفر کو شکریہ کے ساتھ ’’پھر کبھی‘‘ کہہ کر انکار کر دیا......لیکن اتنی سی دیر میں تجل اس کے سارے کوائف جان چکی تھی کہ اس کا نام علی حسن ہے اور وہ کمپیوٹر انجینئر ہے......اور اپنی نہ رکتی زبان سے حسن کو اپنے نام سے لے کر گھر کے نوکروں تک کا تعارف بھی کروا چکی تھی۔
گاڑی کو آگے بڑھاتا علی حسن جہاں بیک ویو مرر میں سے تجل سے نظر نہیں ہٹا پا رہا تھا وہیں تجل اس کے ’’پھر کبھی آؤں گا‘‘ کے لیے اسی لمحے سے راہ دیکھنے لگ گئی تھی۔

☆☆☆

’’تجل بیٹا جلدی سے تیار ہو کر باہر آ جائیں۔‘‘ آپا بی کی آواز اس کو ماضی کے خوب صورت جھروکوں سے لمحۂ موجود کی تلخ حقیقت میں لے آئی۔
’’نہیں آپا بی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔‘‘ اس نے بیزاری سے کروٹ بدلے بغیر جواب دیا۔
’’بیٹا! انجمن آرا بیگم نے خاص کہلوایا ہے اور پھر آپ کی تو بیٹی کی خوشی ہے۔ آپ کو تو اچھے سے علم ہے کہ انجمن آرا کو اپنی بات کے رد ہو جانے پر بہت غصہ آتا ہے۔‘‘ آپا بی نے لجاجت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے پیار سے تجل کے بال سہلائے۔
’’ہونہہ......! جانتی ہوں کتنا غصہ آتا ہے۔‘‘ تجل نے آپا بی کے پریشان چہرے پر نظر ڈالی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ آپا بی نے الماری سے اس کے آج کے دن کے پہننے والے وہ کپڑے نکالے جو انجمن آرا نے خصوصی طور پر بنوائے تھے۔ بھاری کام والی فان اور میرون پشواز کو دیکھ کر تجل ایک مرتبہ پھر یادوں کے دوزخ میں بھڑ بھڑ جلنے لگی۔ یہی دو رنگ تھے جنہیں پسند کر وہ علی حسن کی زندگی میں رنگ بھرنے آئی تھی۔ علی حسن کا منتخب کردہ میرون اور فان لہنگا، میچنگ جیولری، بال، بال میں پروئے ہوئے موتی اور موتیے کی پھولوں کی لڑیوں کے گجروں سے سجی ہوئی تجل کسی اور دنیا کی مخلوق بنی علی حسن کے دل پر بجلیاں گرا گئی تھی۔ علی حسن کے آس پاس دنیا میں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔
ایک تجل کے سوا اس کی بصارت کسی چیز کو دیکھنے سے انکاری بھی تھی اور معذور بھی۔

☆☆☆

اماں نے بڑے ارمانوں سے ان تمام منتوں مرادوں کو پورا کیا جو پوتے کی پیدائش کے لیے وہ مانگے بیٹھی تھیں اور چونکہ ان کو پوتے کا بڑا ارمان تھا۔ اس لیے پوتے کا نام بھی ارمان رکھا اور اب تو وہ دن۔ رات ارمان کا سایہ بنی رہتیں۔ عمر کی خوشی بھی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ اماں نے بہت دھوم دھام سے ارمان کا عقیقہ کیا۔ پورا خاندان اور تمام دوست احباب

مدعو تھے۔ شمائل کو بھی اماں نے بالکل دلہن کی طرح سجایا تھا۔ ویسے بھی اس بار اماں نے شمائل کو ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا تھا۔ پورے چالیس دن اس کو زمین پر پاؤں نہیں اتارنے دیے۔ شمائل کو اپنی شادی کے ابتدائی دن یاد آنے لگے۔ جب اماں بڑے ارمانوں سے اسے دلہن بنا کر گھر لائی تھیں۔ شمائل کا صرف ایک بھائی تھا والدین تو اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور جب اس کا رشتہ لے کر اماں اپنے ملنے والوں کے توسط سے اس کے بھائی کے پاس آئیں تو وہ گریجویشن کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی۔ بھابی بظاہر تو اچھی تھیں لیکن اندر سے وہ شمائل سے جلد چھٹکارا چاہتی تھیں۔ یوں چٹ منگنی پٹ بیاہ کے بعد وہ شمائل صادق سے شمائل عمر بن گئی تھی۔ رشتے میں یوں بھی کوئی قباحت نہ تھی۔ عمر ایک پڑھا لکھا، سلجھا ہوا، برسر روزگار نوجوان تھا اور خاصا خوش شکل بھی......یوں شمائل اپنی ازدواجی زندگی سے بہت مطمئن اور خوش تھی۔ اماں کی بھی اکلوتی بہو تھی تو وہ سال بھر چاؤ چونچلے کرتی رہیں اس کے۔ زریں آپا بھی لیے دیے رہنے والی تعلیم یافتہ اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ اور نندوں کی عمومی منفی قسم سے بالکل مختلف تھیں۔ وہ اپنی شادی شدہ زندگی میں مگن تھیں اور بلاوجہ کبھی بھاوج پر روک ٹوک نہیں کرتی تھیں۔
شادی کے ڈیڑھ سال بعد مناہل اس کی زندگی کی خوب صورتی کو بڑھانے اس کی گود میں آ گئی۔ اگرچہ اس وقت بھی اماں کو پوتے کی آرزو تھی لیکن کوئی بھی شدید... ردِعمل دکھائے بغیر بیٹے کی پہلوٹی کی اولاد کو پیار کرتی تھیں لیکن مناہل ابھی ڈیڑھ سال کی تھی۔ جب مشعل اس دنیا میں آئی تو اماں نے کافی شدید ردِعمل دکھایا۔ وہ مشعل کی صورت میں دوسری بار بھی پوتی کو قبول ہی نہیں کر پا رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح ان کے ہاں پہلی اولاد زریں آپا کے بعد عمر پیدا ہوا تھا اسی طرح اب شمائل کے ہاں بھی لڑکا ہی ہونا چاہیے تھا۔ اور اس میں سارا قصور وہ شمائل کا ہی سمجھتی تھیں۔ عمر کے رویے میں بھی محسوس کی جانے والی سرد مہری تھی۔ یوں مشعل کی پیدائش کے ساتھ شمائل کی زندگی پیچیدگیوں کا شکار ہو گئی تھی اور اب جبکہ مشعل کے تین سال بعد ارمان اس کی گود میں آیا تو اس کی زندگی ایک بار پھر کھل کر سانس لینے لگی۔ ارمان نے اس کے لیے آکسیجن کا کام کیا تھا......اور آکسیجن کے بغیر بھلا وہ کیسے جی پاتی؟

☆☆☆

اور پھر! وہ پھر آ ہی گیا بالآخر جس کا تجل کو انتظار تھا۔ ایک دن علی حسن نے اچانک ہی ان کے گھر کو رونق بخش دی۔ تجل جو اس دن کے حادثے میں ایک اور حادثے سے دوچار ہو چکی تھی۔ علی حسن کو اپنے دل کی مسند پر شان سے بٹھا چکی تھی اور ہر رات یہ آس دل میں لے کر سوتی تھی کہ اگلے دن کا سورج علی حسن کے وعدے کی تکمیل کو اپنے جلو میں لائے گا۔ لیکن ہر ڈھلتی شام کے سایوں میں اس کی امید کی شمعیں بھی گل ہو جاتی تھیں۔ یوں تو علی حسن کا وزیٹنگ کارڈ اس کے پاس تھا اور اس پر سنہری حروف میں سجا اس کا نام، نمبر، ایڈریس بھی اس کے اوپر درج تھا لیکن شاید محبت کے درمیان نسوانی انا کا وجود اس کو ہر بار رابطہ کرنے سے روک دیتا تھا۔ پندارِ نسوانیت کے پرچم کو جھکنا گوارا کہاں ہوتا ہے۔ پہل کرتا تو مرد ہی ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔
انجمن آرا نے علی حسن کی آمد پر خوشدلی سے اس کا استقبال کیا تھا۔ تجل نے اپنے اوپر گزرنے والے حادثے کے علاوہ باقی سب احوال اماں کو بتا دیا تھا اور انجمن آرا ایک جہاندیدہ اور سمجھدار عورت تھیں۔ جانتی تھیں کہ تجل، رائمہ اور نائمہ سے بالکل مختلف طبیعت کی مالک ہے۔ رائمہ اور نائمہ والی تیزی‘ طراری اس میں بالکل نہیں ہے۔ نہ تو فیشن کی دلدادہ ہے اور نہ ہی کوئی اور شغل ہیں اس کی زندگی میں۔
علی حسن سے ایک ہی ملاقات میں ان کو معلوم ہو گیا کہ پڑھا لکھا نوجوان ہی نہیں بلکہ ایک وڈیرے کی اکلوتی اولادِ نرینہ بھی ہے اور اس کے خاندان کا ملک کی سیاست میں ڈنکا بجتا ہے۔
علی حسن نے جس دن سے تجل کو دیکھا تھا اس کے بعد سے اس کی نظر میں کچھ اور سماتا ہی نہیں تھا۔ وہ اس جذبے کو کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھا۔ تجل اس

Digitized by Google

کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی نہیں تھی۔ وہ بیرون ملک سے تعلیم حاصل کر کے آیا تھا۔ اور ایک دولت مند گھرانے کا اکلوتا چشم و چراغ تھا۔ دولت جن کے در کی لونڈی ہو۔ اختیارات کی کوئی مقررہ حد نہ ہو، جہاں ہر طرح کی بے فکری ہو اور آزادی کی کوئی حدود و قیود نہ ہوں۔ وہاں پھر پارسائی اپنے معنی اکثر کھو دیتی ہے۔ یوں اس کی زندگی میں بھی کبھی کرسٹینا تو کوئی انجلی آتی اور جاتی رہی تھیں۔ سجل بھی جب پہلی بار اسے ملی تو علی حسن کو لگا یہ بھی کوئی ایسی ہی آتی جاتی خوشبو ہے جو وقت کے ساتھ باسی ہو جائے گی۔ پھر جب وہ سجل سے ملنے کا وعدہ کر کے آیا تو پھر سے اسے ملک سے باہر جانا پڑ گیا۔ لیکن اس بار ایک عجیب سی بے چینی تھی جو اسے گھیرے رکھتی اور اس نے اپنے دوست عادل سے بھی اپنی اس کیفیت کا تذکرہ کیا۔

"یار اب مجھے کوئی اور لڑکی اچھی ہی نہیں لگتی۔ یوں لگتا ہے کہ ساری دنیا کی لڑکیاں اپنی کشش کھو بیٹھی ہوں۔" اس کے لہجے میں الجھن صاف محسوس ہو رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ تم اس لڑکی سے اس لیے متاثر ہو گئے ہو کہ دوسری ملاقات نہیں ہوئی ورنہ تم....." عادل نے ہنس کر خباثت سے اسے آنکھ ماری۔

"نہیں یار! دوبارہ اس لڑکی کے بارے میں اس طرح بات مت کرنا۔" یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں غصے کا عنصر بہت واضح تھا۔

"اوکے باس.....! نہیں کرتے ایسے بات لیکن پہلے تو کبھی اس طرح جذباتی نہیں ہوا۔ اب کیا تبدیلی آ گئی۔" عادل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"یار عادل! یہ کچھ اور ہی ہے۔ میں کسی لڑکی کو بھی دیکھوں تو مجھے سجل ہی نظر آتی ہے۔ گھبرائی ہوئی تو کبھی ڈانٹتی ہوئی.....حواس باختہ تو کبھی ہنستی ہوئی۔" اس نے جیسے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

"کچھ اور کیا؟ جس لڑکی کو تم ابھی صرف اتنا جانتے ہو کہ وہ کالج اسٹوڈنٹ ہے، اس کی دو بہنیں ہیں، ماں ہے اور باپ اس دنیا میں نہیں.....اس کا نام سجل ہے اور بس۔" عادل نے جیسے بات ہی ختم کر دی۔

"نہیں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کی آنکھیں گھور سیاہ اندھیروں جیسی ہیں۔ بال اماوس کی کالی اندھیری رات جیسے اور آبشار جیسے لمبے ہیں۔ اس کے ہونٹ گلاب کی تازہ ادھ کھلی کلی جس پر اوس کے قطروں کی سی چمک ہے اور چہرہ بالوں کی گھٹاؤں کے درمیان چمکتا ہوا چودھویں کا چاند.....چاندنی جیسی شفاف رنگت ہے اور اس کا ایک ایک نقش ازبر ہے مجھے۔ اس کی خاموشی بھی باتیں کرتی محسوس ہوتی ہے.....اور یہ معجزہ اس کی آنکھوں میں ہے کہ لب خاموش ہوں تو بھی آنکھیں سارے راز کھول دیں۔ وہ ہنستی ہے تو جلترنگ بجنے لگتا ہے۔ تو کیا ہے یہ؟ کون سا طلسم ہے جس سے رہائی نہیں ملتی مجھے۔" علی حسن نے اپنے بالوں میں اضطراری انداز میں انگلیاں پھنسائیں۔

عادل جو تحیر سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ ایک دم بول اٹھا۔

"لو بچے.....تو محبت ہو ہی گئی میرے یار کو، تجھے پیار ہو گیا ہے پیارے۔" عادل نے یوں کہا جیسے اس کو کوئی مرض لاحق ہو گیا ہو۔

اور یہ مرض ہی تو تھا۔ جب علی حسن جیسے آزاد پنچھی کو آسمان کی حدوں تک اڑنے کی اجازت بھی دی گئی تھی اور زمین سے اس کے پیروں کو ان دیکھی زنجیروں نے باندھ بھی رکھا تھا۔ بچپن میں ہی اس کی منگنی اس کی تایا زاد ماہم سے طے تھی۔ اور یہ ادلے بدلے کا رشتہ تھا جس میں علی حسن کی اکلوتی بہن رخسار، ماہم کی بھابی بن چکی تھی۔ وہ بظاہر آزاد لیکن درحقیقت ان دیکھی بیڑیوں کا قیدی تھا لیکن محبت بیڑیاں کہاں دیکھتی ہے، یہ تو دل کے دروازے من مانی سے کھولتی چلی جاتی ہے۔ ایک آسیب کی طرح وجود کو جکڑ لیتی ہے، رگوں میں خون بن کے سرسراتی ہے۔

"تو علی حسن تم نے بھی محبت کر ڈالی تم نے بھی پانی پہ خواب محل تعمیر کر لیا۔" علی حسن نے تھکے تھکے انداز میں آنکھیں موند کر سر صوفے کی پشت پر ٹکا دیا۔

☆☆☆

سجل اور علی حسن کی ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ اب یہ عالم تھا کہ جس دن ان کی ملاقات نہ ہوتی تو دن گویا ایک صدی بن جاتا تھا۔

علی حسن ایک گھاگ وڈیرے کا بیٹا تھا بہت جلد اسے علم ہو گیا کہ انجمن آرا کا تعلق کس خاصی الخاص جگہ سے ہے۔ اور سجل کے علاوہ دونوں لڑکیاں.....رائمہ اور نائمہ، انجمن آرا کے اشاروں پر شرفا کے درمیان دھڑلے سے ان کاموں میں مصروف ہیں جو شرفا ہی کے کچھ لوگوں کے تعاون سے وقوع پزیر ہو رہے تھے۔ سجل نے علی حسن سے کچھ نہیں چھپایا تھا اور ہر بات صاف، صاف بتا دی تھی۔

ادھر انجمن آرا کو لگتا تھا کہ علی حسن کے گھر والے سجل سے علی کی شادی کے لیے کبھی تیار نہیں ہوں گے.....انہیں علی حسن اور سجل کی شادی سے کوئی غرض نہیں تھی وہ تو بس علی حسن کی دولت پر نظر جمائے بیٹھی تھیں۔ سجل اگر ان کے مذاق کام دوسری طرح سے نہیں کر سکتی تھی تو نہ سہی، وہ ایک لمبا ہاتھ مار کر اس امیر زادے سے اس کے نام پر اتنا اینٹھ سکتی تھیں جو اُن کی عمر بھر کے لیے کافی ہوتا۔

☆☆☆

"چڑیلو! کب آئی ہو؟"

آواز پر مناہل اور مشعل دونوں نے پلٹ کر دیکھا اور دونوں ایک دم اس پر جھپٹ پڑیں۔ ارمان نے بچنے کے لیے ماں کے پیچھے جگہ ڈھونڈی تو شائل نے دونوں کو گھور کر پیچھے دھکیلا۔

"اٹس ناٹ فیئر.....امی، یہ ہم سے چھوٹا ہے اور ہمیں چڑیل کہہ کر بلا رہا ہے اور آپ اسے کچھ کہتی بھی نہیں اور ہم جو مہمان بن کر اپنے میکے آتی ہیں، آپ گھورتی بھی نہیں ہیں۔" مناہل نے چڑ کر منہ بنایا۔

"مہمان.....اخاہ! ہفتے میں بلا مبالغہ چار دن تو کم از کم آپ ادھر ہی پائی جاتی ہیں اگر ساس، پھپھو جیسی مہربان ہو تو یہ حال ہوتا ہے بہوؤں کی من مانی کا۔ توبہ، توبہ....." ارمان نے عورتوں کی طرح گال پیٹتے ہوئے کہا۔

"اللہ معافی! امی یہ تو پھپھا کٹنی بنتا جا رہا ہے، پتا کریں کن کی صحبت میں اٹھتا بیٹھتا ہے آج کل....." مشعل چیخی۔

"ارے چڑیلو میرے تو زیادہ دوست ہی نہیں، تم لوگوں کے شوہر صاحبان کے ساتھ ہی پکا یارانہ ہے۔" مشعل کو منہ چڑا کر وہ مسکرایا۔ شائل نے اس کے سر پر پیار سے چپت لگائی۔

"بہنیں ہیں تمہاری اور وہ بھی بڑی بہنیں، احترام کیا کرو.....بہت بدتمیز ہو رہے ہو تم سچ میں۔" شائل نے اسے گھرکا۔

"اچھا جی.....! فوراً پارٹی بدل لی اماں جان نے۔ اتنی جلدی تو ہمارے ملک میں حکومت بھی اب نہیں بدلتی۔" وہ فوراً رونی صورت بنا کر بولا۔ "چلو جاؤ اپنے گھر جب آتی ہو میری اماں بانٹ لیتی ہو۔" ارمان نے ماں کے گلے میں بازو ڈال کر لاڈ جتایا.....شائل نے جھٹ سے اس کے بازو ہٹائے۔

"جاؤ فریش ہو کر آؤ تاکہ میں کھانا لگاؤں.....اب بڑے ہو گئے ہو، یہ بچوں والی حرکتیں مت کیا کرو۔" ارمان مصنوعی اداسی منہ پر طاری کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو مناہل اور مشعل نے آپس میں تالی بجائی۔

مناہل اور مشعل کو زریں آپا نے اپنے دونوں بیٹوں کے لیے بچپن میں ہی مانگ لیا تھا اور اماں کی زندگی میں ہی دونوں بیاہ کر پھوپی کی بہویں بن گئی تھیں۔

عمر کی شدید خواہش کے باوجود ارمان نے ایم بی اے کیا اور نہ ہی بزنس کی جانب اس کا کوئی رجحان تھا۔ وہ تو بہت چھوٹا تھا جب وہ کمپیوٹر کو کھلونے کی طرح استعمال کرنے لگا تھا۔ اور اس کے سارے فنکشنز پر دست آزمائی کر لیتا تھا اور اب اس کا کمپیوٹر انجینئرنگ میں آخری سال تھا۔

☆☆☆

رمل کو بہت دیر سے اپنے علاقے کے پوائنٹ کا انتظار تھا لیکن اسے یہ خبر نہیں تھی کہ آج شہر کے حالات کچھ خراب ہو گئے تھے اور ٹرانسپورٹ نے ہڑتال کی کال دی تھی۔ وہ اس وقت بالکل ہراساں ہوئی جب

Digitized by Google

سڑک پر یکا یک ہنگامہ شروع ہوگیا اور نہ جانے کہاں سے لوگ ہاتھوں میں ڈنڈے، پتھر اٹھائے توڑ پھوڑ کرنے لگے۔ اسے لگا آج وہ زندہ گھر پہنچ گئی تو یقیناً معجزہ ہی ہوگا۔ اس کے مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتی ایک کار تیزی سے اس کے پاس آرکی اور اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر کسی نے جلدی سے اسے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا۔ عام حالات میں شاید وہ ایسا کرنے سے پہلے ہزار بار سوچتی لیکن آج اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ڈرائیورنگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کی طرف دیکھے بغیر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''بیٹا ایسے حالات میں آپ کو اپنے گھر سے یوں تنہا نکلنا نہیں چاہیے تھا۔''

رمل کے حواس بھی بحال ہو چکے تھے اور مخاطب ہونے والی شخصیت کی آواز میں اتنی شفقت تھی اوپر سے لفظ ''بیٹا'' نے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر دیں۔ اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس شخص کی جانب دیکھا۔ ادھیڑ عمر شخص لیکن بے حد گریس فل، سرخ و سفید رنگت پہ گھنے بال جن میں کہیں، کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ کنپٹیوں سے مکمل سفید بال اور آنکھوں پر قیمتی فریم والا نظر کا چشمہ ان کی شخصیت کو مزید پرکشش بنا رہا تھا۔

''دراصل انکل میرا لاسٹ سمسٹر چل رہا ہے اور میرا یونیورسٹی جانا اگر اتنا ضروری نہ ہوتا تو میں کبھی گھر سے نہ نکلتی۔'' رمل ان کا جائزہ لے چکی تو بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ لیکن چھلک آنے والے آنسوؤں کو وہ نہ روک سکی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا بیٹا اور نہ ہی میں آپ کو ڈانٹ رہا ہوں۔'' ٹشو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس شخص نے اسے معذرت کی۔ ''سوری اگر آپ ہرٹ ہوئی ہیں میری باتوں سے۔''

''نہیں سر ایسا کچھ نہیں ہے بس ویسے ہی پریشانی میں رو پڑی۔''

اس نے شرمندگی سے آنسو صاف کیے اور انہیں پتا سمجھانے لگی۔ گھر کی گلی کے سامنے اترنے تک کافی ریلیکسڈ ہو چکی تھی۔ انکل نے اسے اپنا کارڈ دیا اور کہا کہ جب بھی اس کی تعلیم مکمل ہو وہ بلا جھجک ان کی کمپنی جوائن کر سکتی ہے۔ رمل کے بے حد اصرار پر بھی انہوں نے اندر آنے سے انکار کر دیا کہ ہنگامے بڑھنے سے پہلے، پہلے انہیں اپنے گھر پہنچنا ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گاڑی کو آنکھوں سے اوجھل ہونے تک اس نے دیکھا پھر اس کی نظر ہاتھ میں تھامے ہوئے کارڈ پر پڑی۔

تو مشہور بزنس مین اے ایچ انڈسٹری کے مالک عمر حسن تھے وہ جو اس کو اس تنگ گلی میں ڈراپ کر کے گئے تھے۔ بزنس کی تعلیم حاصل کرنے والے تمام نامور بزنس ٹائیکونز کو جاننا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بڑی بات یہ تھی کہ وہ اتنی انکساری سے بات کرنے والے انسان تھے اور اتنی محبت اور عزت سے اس کے گھر تک اسے پہنچا کر گئے تھے۔ کچھ غیر ایسے ہوتے ہیں جو پل میں اپنا بنا لیتے ہیں اور کچھ اپنے ایسے ہوتے ہیں جو پل میں غیر ہو جاتے ہیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بے دلی سے گھر کی طرف جانے والی تنگ گلی میں قدم بڑھا دیے۔

پیار پیدائشی اندھا ہوتا ہے لوگ اس کی سماعت بھی چھین لیتے ہیں اور زبان بندی تو محبت کی شرطِ اول ٹھہری...... ایک دل ہے جو دیکھتا بھی ہے، سنتا بھی ہے اور سرگوشیاں بھی کرتا ہے...... دل مر جائے تو باقی صرف بے جان وجود رہ جاتا ہے، جسے گدھ نوچ لیتے ہیں۔

وہ بھی ایسی ہی ایک لاش کی طرح بے حس و حرکت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ لوہے کے دروازے کے وا ہونے کی آواز پہ اس نے صرف آنکھوں کو دروازے کی سمت گھما دیا۔ رمل نے معمول کے انداز میں گھر میں گھستے ہی دروازے کو کنڈی لگائی اور گھر کے اکلوتے کمرے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ جہاں ان کی ماں منتظر آنکھیں لیے حسب معمول لیٹی ہوئی تھیں۔

''السلام علیکم اماں......'' کہتے ہوئے رمل نے چادر کو تہ کیا اور بیگ کو کھونٹی پر لٹکا کر ماں کی طرف دیکھا۔

''وعلیکم السلام......'' اماں نے ایک بے تاثر نظر

اس پر ڈالی اور سلام کا جواب دیا۔

''آپ نے کھانا تو کھا لیا ہوگا اماں؟'' رمل کے الفاظ میں آس کے دیے روشن تھے کہ شاید اماں کہہ دے کہ نہیں کھایا تمہارا انتظار تھا۔ لیکن اماں کے جواب میں تبدیلی کہاں آئی تھی۔

''ہاں کھا چکی ہوں...... دوا لینی تھی، تم روز ایک ہی سوال مت دُہرایا کرو...... مٹر پلاؤ بنایا تھا تم اپنے لیے نکال لو......'' اماں نے کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔

رمل نے خاموشی سے ماں کے حسین چہرے کو دیکھا اور آنکھوں میں بھرتے ہوئے آنسوؤں کو واپس دھکیلا تو گلے میں نمکین پانی کا ذائقہ گھل گیا۔ بھوک تو مر چکی تھی لیکن جینے کے لیے کھانا ضروری تھا۔ صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ وہ جلدی سے چاول پلیٹ میں نکال کر برآمدے میں پڑے تخت پر بیٹھ کر جلدی، جلدی کھانے لگی۔ اماں کھانا تو بنا دیتی تھیں لیکن پانی کے کام وہ یونیورسٹی سے لوٹ کر آتی تو کرتی تھی۔

''انا بی آپ کیوں چلی گئیں مجھے یوں چھوڑ کر۔'' وہ نانی کو یاد کر کے رونے لگی۔ شروع، شروع میں جب نانی یعنی انا بی زندہ تھیں تو اُن کا دم غنیمت تھا۔ رمل، اماں سے زیادہ نانی کے قریب تھی ساری باتیں وہ انا بی سے کر لیتی تھی اور انا بی بھی نواسی کے جی بھر کے لاڈ اٹھاتیں۔

اس کے اندر بچپن سے یہ سوال اٹھتے تھے کہ اس کی ماں اس کی سہیلیوں کی ماؤں جیسی کیوں نہیں ہے۔ وہ ناز نخرے جو مائیں اٹھاتی ہیں وہ انا بی اٹھا رہی ہیں اور ماں نے تو کبھی کبھار کے علاوہ بے ساختہ سینے سے بھی نہیں لگایا تھا اسے۔ اس کی سہیلیوں میں سے کسی کی ماں اتنی حسین نہیں تھی جتنی حسین اس کی ماں تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ماں کے ریشمی ملائم کالے بالوں میں کنگھی کرے۔ اس کی بھوری آنکھوں میں کاجل ڈلا دیکھے۔ اماں کو سجا سنورا دیکھے لیکن بچپن تک یہ ساری باتیں اس کے دل میں ہی رہ جاتی تھیں۔ جب شعور کی منزل تک پہنچی تو انا بی سے سوال کرنے لگی۔

''انا بی... میری اماں اتنی حسین ہیں وہ کبھی سجتی کیوں نہیں ہیں۔'' انا بی اس سے نظر چرا لیتیں اور سمجھانے کی کوشش کرتیں۔

''تیری ماں سہاگن نہیں ہے رمل اور بیوہ سنگار نہیں کیا کرتیں۔ وہ خود ہی اتنی خوب صورت ہے کہ اسے کسی سنگار کی ضرورت نہیں ہے۔'' بہت سے سوال من کی کھڑکی میں پر جمائے رہے اور ایک دن انا بی بھی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ محلے والوں نے بہت ساتھ دیا، انا بی کی تدفین کا مرحلہ طے ہو گیا۔ وہ ایک دن تھا جب اس نے اماں کے چہرے پر کرب تو دیکھا تھا لیکن آنسو کہیں نہیں تھے۔ سب کہتے تم اپنی اماں کو رلاؤ لیکن وہ ایک ہی کام تو نہیں کرتی تھیں روتی نہ تھیں۔

انا بی جاتے، جاتے اس کو وہ ذمے داریاں دے گئی تھیں جو وہ کیا کرتی تھیں۔ باہر کے وہ سارے کام جو

غزل

وہ تھا، میں تھی اور ایک محبت تھی
زندگی کتنی خوب صورت تھی

لمحہ، لمحہ سفر تھا چاہت کا
خوب اپنی بھی اک حکایت تھی

راستے پھول بن گئے اپنے
کیا حسیں عشق کی وہ سنگت تھی

تھی محبت گمنام ہونے کو
خالی، خالی سی ایک حسرت تھی

کھو گئی ہے کہاں وہ چاہت کہ
پھر محبت کی کس کو فرصت تھی

مل کے نوشین خود سے کیا کرتی
خود سے ملنا بھی تو مصیبت تھی

شاعرہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدرجان

اناہی کیا کرتی تھیں وہ سب رمل کرنے لگی۔ یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ تھی۔ پہلے جب ہر ماہ کا خرچ بینک سے اناہی نکلوانے جاتی تھیں تب وہ بھی اُن کے ساتھ جاتی تھی اب یہ کام رمل کو تنہا ہی انجام دینا پڑتا۔ وہ خرچ، کہاں سے اکاؤنٹ میں آتا تھا یہ اب بھی راز ہی تھا۔ جسے جاننے کی جستجو وہ ترک کرچکی تھی۔ اس دن سے جب اناہی نے بھی اس بارے میں کوئی سوال کرنے سے اسے سختی سے منع کیا تھا اور ماں تو محض ایک چلتا پھرتا بت تھی۔

''کوئی اتنا خاموش کیسے رہ سکتا ہے؟'' اسے اماں کی خاموشی پہ کبھی غصہ آتا تو کبھی رحم...... شاید وہ سوچوں کی بھول بھلیوں میں دور چلی جاتی لیکن مغرب کی اذان پر ہڑ بڑا کے اٹھ بیٹھی...... آج پھر سوچوں میں کھو کر وہ سارے کام ادھورے چھوڑ بیٹھی تھی۔ دل ہی دل میں خود کو کوستی وہ جلدی سے وضو کرنے لگی۔

☆☆☆

''تو علی حسن مجھے بھی بالآخر ایک طوائف کی طرح ہی جینا ہوگا۔'' وہ بہت دیر سے حیرت بھری نظروں سے علی حسن کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے سوال پر علی حسن نے نظریں چرائیں اور شکستہ لہجے میں بولا۔

''سجل مجھے محبت صرف تم سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، میں ابا سائیں کے ہر اصول سے بھی ٹکرا جاتا لیکن میں ان تین معصوم بچوں کی ماں کو کیسے نظر انداز کردوں جو میری سگی ماں جائی ہے اگر میں ماہم کو نہیں اپناتا ہوں تو رخسار ادی کو وجاہت بھائی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گا اور پھر ابا سائیں اور تایا سائیں کے درمیان ایک نہ ختم ہونے والی ایسی جنگ شروع ہوجائے گی جس کی آگ سب کو اپنی لپیٹ میں لے، لے گی۔'' وہ بھرپور مرد ٹوٹے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔

''تو علی یہ بات محبت کرنے سے پہلے کیوں نہیں سوچی؟ مجھے اس راہ پر اتنی دور لانے سے پہلے کیوں نہیں سمجھ آئی آپ کو یہ بات۔'' سجل نے اس کے سینے پر سر رکھ کر آنسو بہا دیے۔

''جو سوچ سمجھ کر کی جاتی ہے ناں سجو......! وہ محبت ہوتی ہی نہیں، وہ تو کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ سچ بتاؤ کیا تم نے مجھ سے سوچ سمجھ کر محبت کی تھی، تم کہہ دو کہ تمہارے بس میں تھا محبت کرنا اور تمہارے بس میں ہے پلٹ جانا، میں تمہیں نہیں روکوں گا۔'' وہ اس کے بالوں میں پیار سے انگلیاں چلا رہا تھا، چودھویں کا چاند جوبن پر تھا ہلکی، ہلکی سردی تھی سجل کے ٹھنڈے پڑتے ہاتھوں کو علی حسن نے اپنی چادر میں سمیٹا اور پیار سے اس کا سر چوما۔ ابھی تو ایک ماہ ہی ہوا تھا ان کے نکاح کو......

انجمن آرا دل سے تو رضا مند تھی لیکن علی حسن کو دباؤ میں لینے کے لیے اس نے خوب واویلا کیا کہ تمہارے گھر والے رشتہ لینے آئیں گے تو ہی سجل تمہاری زندگی میں شامل ہوسکے گی۔ دراصل اس واویلے کے پیچھے محض علی سے بنگلا اور لاکھوں روپے تھے جو اس نے حق مہر کے نام پر بٹورنے تھے۔

''ستو میاں، ہماری تو گزر گئی جو ہم ہیں وہ تمہیں سجل بتا چکی ہیں، رائمہ اور نائمہ کی ہمیں فکر بالکل نہیں ہے، سجل بہت سیدھی سادی ہے اس لیے اس کے مستقبل کی فکر ہے جو ہم ضمانت میں یہ سب چاہتے ہیں، اوپر سے تم شریف لوگ ہماری بیٹیوں کو بیاہ کے لے جاتے ہو تو بھی چھپ کے ہی۔'' انجمن آرا کے لہجے میں طنز چھلک رہا تھا۔ ''میں خود ایک شریف زادے کی بیٹیوں کو ہی سینے سے لگا کر بیٹھی ہوں اگر تمہیں سجل کو اپنانا ہے تو یہ سب تو اس کے نام کرنا ہوگا۔''

علی حسن کو کہاں مشکل تھا یہ سب دینا دولت تو اس کے در کی لونڈی تھی۔ جتنی انجمن آرا کی مانگ تھی اتنا تو وہ سجل کے صدقے میں دے دیتا تو بھی اس کی دولت میں کمی نہیں آنی تھی یوں سجل اور علی حسن بہار کے اولین دنوں میں ایک ہوگئے۔ خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے ہوئے اس بات کا تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ علی حسن کی اس محبت کا علم ابا سائیں کے جاسوس ان تک پہنچا چکے ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ خبر تایا سائیں کے گھر تک پہنچے ابا سائیں نے علی حسن اور ماہم کی شادی کی تاریخ رکھ دی۔

''ابا سائیں مجھے ماہم سے شادی نہیں کرنی۔'' علی حسن نے اپنے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے کہا۔

دوسرے اور تیسرے ہفتے میں لندن کا ٹکٹ جیتنے والے خوش نصیب ہیں

تاریخ	نام	شہر
8th Jan	جاوید میاں داد	سکھر
15th Jan	محمد وقاس	لاہور

اور سونے کا بسکٹ جیتنے والے خوش نصیب یہ ہیں

تاریخ	نام	شہر
3rd Jan	علی رضا	ملتان
4th Jan	محمد راحیل	کراچی
5th Jan	شعیب رسول	لاہور
6th Jan	حسن اویس	گوجرانوالہ
7th Jan	فائزہ نومان	ملتان
8th Jan	مسدق علی شاہ	مانسہرہ
9th Jan	عروج فاطمہ	لاہور
10th Jan	ارسلان احمد	کراچی
11th Jan	جعفر کامران	کراچی
12th Jan	عامر	ملتان
13th Jan	سرفراز	کراچی
14th Jan	ناصر محمود	گوجرانوالہ
15th Jan	محمد عمران	لاہور

اگلے ونر آپ بھی ہوسکتے ہیں۔ تفصیلات کے لئے شیلڈ بے بی ڈائپرز کا پیک خریدیں۔
Call Free: 0800 - BABYS (22297) ShieldBabies

Digitized by Google

''تو مت کرو علی حسن لیکن ہمیں اس کی وجہ یہ مت بتانا کہ تم ایک طوائف زادی سے رشتہ جوڑنے لگے ہو۔ مرد بچے ہو، ہو جاتی ہیں دلچسپیاں اِدھر اُدھر، ہم نے بھی کی جوانی میں..... لیکن گھر اور نسل کے لیے اصیل گھوڑی اور اصیل عورت ہی ہمیشہ لائے..... پکی خاندانی، اپنا خون۔'' علی نے بولنے کے لیے منہ کھولا تو ابا سائیں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

''پہلے ہمیں بات مکمل کرنے دو..... چلو فرض کرو ایک بار ہم تمہیں اجازت دے بھی دیں کہ اپنی مرضی کر لو لیکن یاد رکھنا کہ ماہم اور تمہارا رشتہ ٹوٹنے سے کتنی قیامتیں آسکتی ہیں۔ رخسار سے بچے چھین کر وجاہت اس کو واپس بھیجنے میں دیر نہیں کرے گا۔ اس پر تیری ماں جو تیری تائی کی سگی بہن بھی ہے اسے ہم اسی پل گھر سے نکال دیں گے اور پھر ہم دو بھائی نہیں رہیں گے، دو قبیلے بن جائیں گے۔ تمہارا تایا جس دن تمہاری تائی کو گھر سے نکالے گا اور ہم تمہاری ماں کو..... اس دن ان کے میکے والے ایک تیسرا دشمن قبیلہ ہوگا اور یہ جنگ کبھی نہ ختم ہونے کے لیے شروع ہو جائے گی اب تم سوچو..... ایک طرف وہ طوائف زادی ہے تو دوسری طرف یہ سارا سسٹم جس کا تم حصہ ہو۔''

اب فیصلہ علی حسن کے بس میں کہاں رہا تھا۔ اسے بھی وہی کرنا پڑا جو ہمیشہ سے ہوتا رہا تھا۔ سجل کے ہاتھوں کی مہندی چھوٹنے سے پہلے علی حسن کے پیروں میں ماہم کے نام کی بیڑیاں پڑ گئی تھیں۔ وہ سجل کو سب سچ بتا کر رہا ہو گیا تھا۔ لیکن سجل جو بہت سی سچائیاں اس سے بانٹنا چاہتی تھی، اپنے اندر ہی دبا بیٹھی۔ اسے انجمن آرا کی باتیں یاد آرہی تھیں کہ یہ جاگیردار محبت نہیں کرتے۔ محبت کے نام پر فریب کا جال بنتے ہیں۔ اس کو اپنی ماں جھوٹی لگتی تھی جب علی حسن نے اس سے شادی کی تھی تو فتح مندی سے سرشار انجمن آرا کو جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھتی تھی کہ دیکھو میں آج وڈیرے علی حسن کی بیوی ہوں۔'' ملکہ کی طرح چتون دکھاتی تھی اور انجمن آرا کی آنکھوں میں چمکتے طنز کو نظر انداز کر دیتی تھی۔ جب علی حسن نے ماہم سے شادی کی تو اس نے خاموشی سے بنگلا، دولت، زیور سب جو علی نے اسے دیا تھا، اس نے انجمن آرا کے حوالے کر دیا۔ شروع، شروع میں تو علی حسن تواتر سے آتا تھا بتدریج اس کا آنا بھی کم ہونے لگا۔

آج وہ صبح سے علی حسن کو فون کر رہی تھی ..... بے چین تھی، خبر ہی ایسی تھی کہ اسے لگتا تھا کہ یہ خبر سن کر اگر وہ اتنی شاداں تھی تو علی حسن تو دیوانہ ہی ہو جائے گا۔ اب جب وہ اس کے روبرو بیٹھی شرماتے ہوئے اسے باپ بننے کی خوشخبری دے رہی تھی تو علی حسن کو گویا سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ جو اس بات کی منتظر تھی کہ وہ جانے کیسے، کیسے اپنی چاہت کا اظہار کرے گا اس کی خاموشی کا زہر سجل کے وجود کے اندر تک اتر گیا۔

☆☆☆

علی حسن بہت دیر سے بڑے کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے سے اضطراب چھلک رہا تھا۔ اس بار کے الیکشن میں اس کا انتخاب ہوا تھا پارٹی ٹکٹ کے لیے۔

جانے وقت کی دھول نے پیار کے جنون کو کم کر دیا تھا یا اس کے اندر کا وڈیرا جاگ اٹھا تھا وہ رہ رہ کر خود کو کوس رہا تھا کہ اس نے سجل سے شادی سے آگے تک کیوں نہیں سوچا تھا۔ اوپر سے اب بچہ..... اور وہ اتنا... بے پروا رہا کہ سجل کو بھی انجمن آرا کے پاس ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ آگے کا لائحہ عمل طے کرتا مسلسل کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

☆☆☆

''ارمان میرا خیال ہے کہ تم اب آفس جوائن کر ہی لو.....'' عمر حسن نے آملیٹ کا ٹکڑا نفاست سے کاٹ کر اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ارمان جو اطمینان سے جوس کے سپ لے رہا تھا ایک دم اس کو اچھو لگ گیا۔ شائل نے جلدی سے اٹھ کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارنا شروع کر دیا۔ جبکہ عمر حسن ناشتا چھوڑ کر ارمان کو... فکرمندی سے گھورنے لگے۔

''کیا عمر آپ بھی ناں..... بس.....!'' شائل نے خفگی سے شوہر کو دیکھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کیا میں بھی بس.....؟ ایک جائز بات کہی ہے

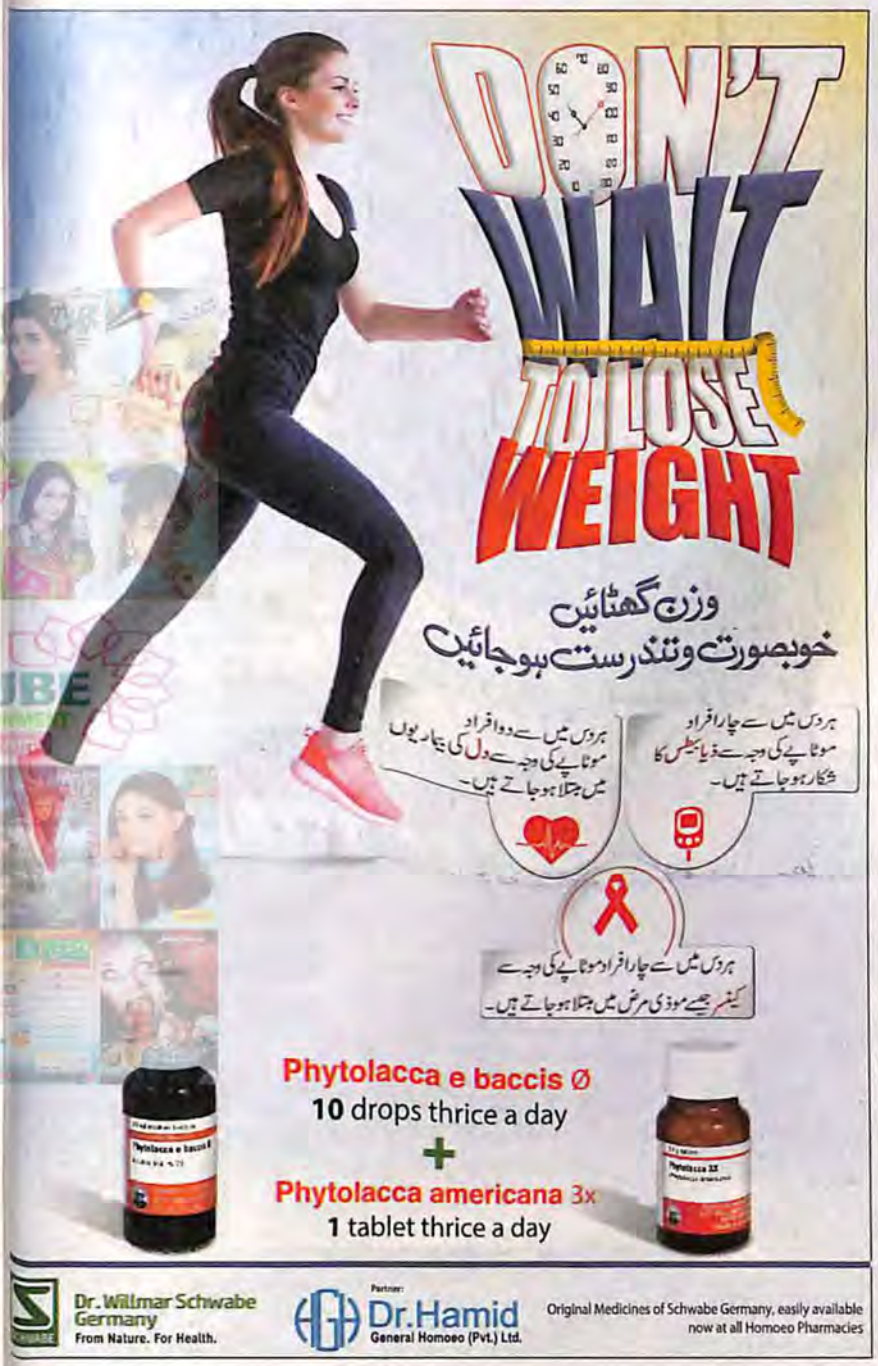

Digitized by Google

بیگم صاحبہ! اب تو صاحبزادے کی تعلیم بھی مکمل ہوگئی ہے۔ بزنس کے لیے کمپیوٹر کا تجربہ اور تعلیم بھی بہت... کارآمد ہے۔ تھوڑا عرصہ میرے ساتھ رہا تو سب سیکھ جائے گا۔ کیوں ینگ مین کیا ارادے ہیں۔'' انہوں نے اب ارمان کو مخاطب کیا۔

''جی پاپا! میں کل سے جوائن کرلوں گا، ان شاء اللہ.....''

اس نے بڑی تابعداری سے سر ہلایا۔

''کل سے نہیں' آج ہی سے آپ میرے ساتھ چل رہے ہیں اور یہ میں آخری دفعہ کہہ رہا ہوں۔ دیٹس آل.....''

''لیکن پاپا.....'' ارمان منمنایا۔

''بس اب کوئی بات نہیں ہوگی جلدی سے ناشتا تمام کریں اور میرے ساتھ جانے کے لیے ریڈی ہوجائیں۔'' وہ نیپکن سے منہ صاف کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔

''آپ کو نہیں لگتا.....اماں یہ والد صاحب کچھ ہٹلر صاحب بنتے جارہے ہیں۔ اپنے شوہر پر نظر رکھا کریں یہ صاحب کچھ ہاتھوں سے نکل رہے ہیں بتا رہا ہوں میں آپ کو.....''

''بس ارمان چپ کر کے اپنے پاپا کے ساتھ جاؤ، سچ میں مشعل ٹھیک کہتی ہے تم تو ایک دم پھاپھا کٹنی بنتے جارہے ہو۔'' شمائل نے ہنسی دباتے ہوئے اس کے سر پر چپت لگائی اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔

گھر میں اللہ کا فضل تو ارمان کی پیدائش سے پہلے بھی تھا.....عمر حسن ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ایک اچھی خاصی پوسٹ پر تھے.....لیکن ارمان کی پیدائش کے بعد تو خود بخود سب جیسے بنتے چلے گئے۔ عمر حسن نے پہلے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر کاروبار کیا اور پھر یہ کاروبار دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا چلا گیا۔ اب عمر شہر کے جانے مانے بزنس مین تھے۔ ارمان کی دادی اماں تو اسے اپنے پوتے کے قدموں کی برکت کہہ کر سب کو جتاتی تھیں کہ دراصل اس کے آنے سے گھر میں اتنی زیادہ خوشحالی اور ترقی آئی تھی۔ شمائل کو اگرچہ یہ حقیقت نہیں لگتی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو، جتنا اور جس وقت دینے کا وعدہ کیا ہوتا ہے وہ مل کر ہی رہتا ہے لیکن وہ ان سے اختلافی رائے بھی نہیں کرتی تھی۔ اس کو اپنے گھر کا امن وسکون بہت عزیز تھا جو بہر حال اس کی خاموشی اور صبر نے قائم رکھا ہوا تھا۔ بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد اب وہ بھی چاہتی تھی کہ ارمان سنجیدگی سے باپ کے ساتھ کام سنبھال لے تو بھی بہو گھر لائے۔

ارمان اسے سیڑھیاں اترتا نظر آیا تو اس نے جی بلائیں لے ڈالیں۔ آج وہ عمر حسن کی طرح سوٹ میں ملبوس سلیقے سے بال جیل سے سیٹ کر کے ہاتھ میں لیپ ٹاپ کا بیگ لیے آفس جارہا تھا۔ شمائل نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے پاس آکر ماں کو ساتھ لگایا تو شمائل نے آیات پڑھ کر اسے پیار سے دیکھتے اس کا سر چوما، وہ مسکراتا ہوا باپ کے پیچھے پیچھے گھر سے نکل آیا۔

شمائل نے حسب معمول ملازمہ کو برتن سمیٹنے کو کہا اور خود اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔ بہت آہستگی سے روزانہ کی طرح آکر الماری کھولی اور اپنے ذاتی سیف کو کھول کر کچھ چیزیں نکال کر بیڈ پر رکھیں اور اس سے پہلے وہ دروازہ بند کرنا بالکل نہیں بھولی تھی۔

وہ بیڈ پہ رکھی چیزوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ہر چیز کو اٹھاتی اور باری، باری سینے سے لگاتی پھر چومتی چلی جاتی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کا گریبان بھگو رہے تھے.....اور وہ دل ہی دل میں کسی کی صورت کے نقش بنا اور بگاڑ رہی تھی اور یہ تو وہ پچھلے کئی برسوں سے کرتی چلی آرہی تھی بلاناغہ.....اور جب کمرے سے نکلتی تھی تو اس کے چہرے پر کسی قسم کے ملال کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ سارا ملال وہ سیف میں چیزوں کے ساتھ کمرے میں چھوڑ آتی تھی یا دل میں کسی کونے میں دفن کردیتی تھی، یہ وہ بھی نہیں جانتی تھی بس اتنا جانتی تھی کہ شمائل عمر بلا کی اداکارہ تھی اور اس کا علم بھی صرف شمائل عمر کو ہی تھا۔

☆☆☆

''کاش! میری اناں آج آپ زندہ ہوتیں تو میں اپنی خوشی آپ سے بانٹتی۔'' رمل کو سمجھ نہیں آرہا تھا۔ وہ اپنی خوشی کس سے بانٹے۔

رمل کے چہرے پر خوشی کے جگمگاتے رنگوں کی دھنک اس کی ماں کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکی۔ وہ کمزور سی چال چلتی ہوئی بے خبر بیٹھی رمل کے پاس آئیں اور لرزتے ہوئے ہاتھ سے اس کے سر کو تھپکا۔

''رمل کیا تمہارا رزلٹ آگیا ہے؟'' اس نے حیرت و خوشی کے ملے جلے تاثرات سے ماں کی طرف دیکھا۔

''جی اماں' میں نے ٹاپ کیا ہے۔'' اس نے روتے ہوئے بتایا تو ماں نے بے اختیار اسے سینے سے لگالیا۔ اور رمل کو یوں لگا جیسے وہ تپتی دھوپ سے اچانک گھنیری چھاؤں میں آگئی ہو.....صدیوں کی پیاس بجھ گئی ہو، وہ لمحوں کو یہیں روک دینا چاہتی تھی ہمیشہ کے لیے۔

اور ماں.....کو بھی لگا کہ وہ اس معصوم سی بیٹی کو کس جرم کی سزا دے رہی ہے۔ وہ اس کی آس بھری آنکھوں کو کیوں نظر انداز کر کے اپنے غم کے دریا میں ڈوبی رہی۔ اس کے سینے میں ممتا کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ گویا اندر کا گلیشیر پگھل رہا تھا۔ اس نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو روکا نہیں بہنے دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ رمل کو اپنے ہاتھ سے بنے حلوے کے لقمے بنا، بنا کر کھلا رہی تھی۔ اور رمل پیار سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے انہیں بھی کھلا رہی تھی۔ دونوں کی آنکھیں نم تھیں پر ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

علی حسن کی زندگی کے سارے معمولات ہی بدل چکے تھے۔ سجل کا وجود تو جیسے اس کی زندگی میں نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اب وہ ایک سیاسی شخصیت تھا یا ایک گھاگ وڈیرا۔

سجل کی زندگی اور اس کی نظر میں تو علی حسن کا وجود اس وقت بہت چھوٹا پڑ گیا تھا جب علی حسن نے اسے حمل ضائع کردینے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ تو محبت کو اپنے دل سے رخصت نہیں کرسکتی تھی۔ علی کی عہد شکنی، بے وفائی کچھ بھی اس کے دل سے محبت کو نہیں نکال سکی تھی۔ لیکن علی حسن کی عزت اس کے دل سے بنا دھکیلے چلی گئی تھی۔ کبھی، کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ محبت ہمارے دل میں دھونی رمائے رکھتی ہے لیکن عزت کو ہم پابند سلاسل نہیں کرسکتے۔ وہ بنا بتائے، بغیر پوچھے، خود بخود دل کی قید سے رہائی پا جاتی ہے اور یہ ہونے کے لیے برس درکار نہیں ہوتے کچھ لمحے بھی نہیں محض ایک لمحہ کافی ہوتا ہے عزت کے رخصت ہونے کو......

سجل کو تو انجمن آرا سے بھی یہی امید تھی کہ وہ اس کو یہی کہے گی لیکن کتنی عجیب بات تھی کہ انجمن آرا، علی حسن کے سامنے ڈٹ گئی تھی۔ ایک طوائف نے ماں کو نہیں ہرایا تھا بلکہ ماں جیت گئی تھی۔

''علی حسن، میری بیٹی سے شادی کرتے وقت تم نے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی تھی کہ میری بیٹی کو اپنی اولاد سے دستبردار ہونا ہوگا یا وہ ماں بننے کا حق نہیں رکھتی۔ یاد رکھو میری بیٹی کو پورا حق ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اس دنیا میں لائے اور اگر تمہیں یہ ضد ہے کہ سجل تمہاری اولاد کو جنم نہ دے تو تم چاہو تو اس کی زندگی سے نکل جاؤ لیکن سجل ایسا کچھ نہیں کرے گی جیسا تم چاہتے ہو۔''

''سجل میری بیوی ہے اور میں تنہائی میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' علی حسن نے انگارہ لہجے میں چبا، چبا کر کہا۔

''اس سے ایسا کچھ نہ مانگنا کہ کل کو تمہاری زبان سے یہ لفظ بھی نہ آسکیں کہ...... ''سجل میری بیوی ہے۔'' انجمن آرا نے مرعوب ہوئے بغیر کہا اور ساڑی سمیٹتی وہاں سے ہٹ گئی۔

اور پھر علی حسن نے محبت اور طلاق کے تمام حربے آزمانے کی کوشش کرتے ہوئے سجل سے منوانے کی کوشش کی کہ وہ اس بچے کو دنیا میں نہ لائے۔

''سجل ابھی میں اس بچے کو اس دنیا میں لانے کے حق میں نہیں ہوں۔'' علی حسن کے لہجے میں بہت بے مروتی تھی۔

''علی حسن اتنے کٹھور ہوگے تم......! یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اور یہ بچہ جس پر تم حق کی بات بھی کرتے ہو اور اس کو دنیا میں آنکھ کھولنے کی اجازت بھی نہیں دے رہے، کیسے باپ بنو گے تم' اس کا مجھے بخوبی اندازہ ہوچکا ہے۔ اگر میں تمہارے بچے کی ماں نہیں بن سکتی تو کیا حیثیت ہے۔ میری تمہاری زندگی میں۔

محض ایک طوائف کی جو تمہاری چند راتوں کو رنگین بناتی رہے عمر بھر.....؟ تو جاؤ علی حسن میں خود تمہیں اپنی زندگی سے بے دخل کرتی ہوں۔'' کہہ کر اس نے علی حسن کی طرف پشت کرلی تھی۔

''سمجھو تم سمجھنے کی کوشش کرو.....اب میں صرف علی حسن نہیں ہوں۔ اپنے گاؤں کی پنچایت کا سربراہ ہوں، ایک اور بیوی بھی ہے میری اور سیاست کا میدان بھی.....'' اس کی بات کو نجل نے درمیان ہی سے کاٹ دیا۔

''علی حسن، جیسی زندگی تم مجھے دینا چاہتے ہو، وہ تو ایک طوائف بن کر بھی مجھے میسر رہتی۔ کیا مختلف ہے میری زندگی میں ایک طوائف سے؟ محض نکاح، کیا قربانیاں دینے کا فرض صرف میرے حصے میں ہی لکھا ہے؟ تمہاری مجبوریوں کی کہانیوں پر میں نے ایک عورت سے شراکت برداشت کرلی۔ میں تمہاری ایک خفیہ بیوی جو نکاح کے بندھن کے نام پر ایک طوائف سے بھی بدتر زندگی گزار رہی ہوں.....لیکن اب نہیں، اس بار نہیں علی.....! تم چاہو تو میں تمہاری زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جاؤں۔ ایسی جگہ چلی جاؤں جہاں تمہیں میرا سایہ بھی نہ ملے۔ تم چاہتے ہو ناں کہ میں جس بچے کو جنم دینے والی ہوں وہ علی حسن خان کا ہے۔ اس کی دنیا کو بالکل خبر نہیں ہو تو مجھے منظور ہے۔ جو بھی تم فیصلہ کرو.....'' نجل نے مضبوط لہجے میں اسے جواب دیا تھا۔

علی حسن نے ایک پل کو چاہا کہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر اسے اپنی بھرپور چاہت کا یقین دلائے، اسے سمجھائے کہ محبت تو وہ ازل سے ابد تک نجل ہی سے کرتا رہے گا لیکن روایات کی جن بیڑیوں میں یہ طاقتور لوگ قید ہوتے ہیں۔ اس میں وہ ایک آزاد مزدور پر کبھی، کبھی رشک کرتے ہیں.....لیکن اس وقت وہ اس کی کسی بات کا یقین نہیں کرے گی، یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا اس نے اپنے لہجے میں تختی پیدا کی۔

''یوں ہے تو یوں ہی سہی نجل حسن! لیکن سوچ لو! میں نے تمہیں اپنا نام دیا ہے، یہ میں تمہارے نام سے الگ بھی کرسکتا ہوں.....یہ جان لو تم.....'' اس کے لہجے میں وڈیرا علی حسن خان کا رعب و دبدبہ در آیا تھا۔

''اگر تمہارے دل میں میری محبت کا پودا تناور درخت نہیں بن پایا تو وہ بیج تو باقی ہوگا جسے میں نے تمہاری محبت میں بویا تھا۔ اگر تمہارا دل بنجر نہیں ہوا ہوگا تو مجھے یقین ہے کہ کوئی ننھی سی کونپل تمہیں مجھ سے مکمل طور پر الگ ہونے سے ضرور روکے گی۔ تم مجھے طلاق کبھی نہیں دو گے.....اگر ایسا نہیں ہے تو جاؤ دے دو طلاق! ہم جیسی حرماں نصیب عورتیں تم جیسے وڈیروں کی اولاد کو تن تنہا پروان چڑھانے کی ہمت رکھتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں ہم ''اصیل'' نہیں ہوتی ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ تم جیسے اصیل لوگ ہمیں ''اصیل'' ہونے ہی نہیں دیتے ہو۔'' نجل کی آواز غم و غصے سے لرز رہی تھی۔ ''دراصل تم طوائف سے نکاح بھی اس وقت کرتے ہو جب وہ تمہیں مفت میں حاصل نہ ہو۔''

''بس اب اور ایک لفظ نہیں.....'' علی حسن نے دہاڑتے ہوئے اس کے منہ کو اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں کس لیا۔ ''دراصل تم میری محبت کے کبھی قابل ہی نہیں تھیں نجل بیگم.....میں ہی جذبات میں تم سے رشتہ جوڑ بیٹھا۔ آج کے بعد میں تمہاری اور تم میری شکل بھی نہیں دیکھو گی۔ بھول جاؤ کہ کبھی کوئی علی حسن تمہاری زندگی میں آیا تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے جھٹکے سے نجل کو چھوڑا تو وہ تیورا کے پلنگ پر گر گئی۔ پلٹ کے دیکھے بغیر وہ دروازے سے نکل گیا۔ نجل کو لگا کہ وہ اس کے دل پر پیر رکھ کر وہاں سے نکلا ہے۔

اور جانے والے کو ایسا لگا کہ وہ اپنی سانسیں اسی دہلیز پر گروی رکھ کر جا رہا ہے لیکن اب وہ ایک وڈیرا تھا، پنچایت کا سربراہ.....رواجوں میں جکڑا ہوا، بظاہر بہت طاقتور مرد لیکن حقیقت میں ایک کمزور ترین انسان.....دل کی دنیا اجاڑ کے اپنے سسٹم کو بچانے والا ایک روایتی مرد.....فیصلہ اسے کہاں کرنا آتا تھا۔ فیصلہ تو اس کے لیے ہو جاتا تھا۔ وہ نجل کو طلاق تو نہ دے پایا لیکن یہ آخری عہد اس سے نبھانے کا پابند ضرور بنا کہ پھر نجل کو اپنی شکل کبھی نہیں دکھائے گا۔ یہ سزا نجل کے لیے تھی یا علی حسن کے لیے.....بہرحال اسے اس پر عمل کرنا تھا.....تو زندگی اس

موڑ پر بھی لاتی ہے جب ہمارے بس میں کچھ نہیں ہوتا۔

☆☆☆

آج صبح ہی سے منی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ نجل اسے اپنا دودھ پلانے پر رضامند ہی نہیں ہوئی تھی۔ اور اوپر کے دودھ سے بچی کی طبیعت ہر وقت خراب رہتی تھی اور آج جب بچی صبح سے الٹیاں کر کے کرے.....بے حال ہوگئی تو آیا بی نے انجمن آرا کو آگاہ کیا کہ اگر بچی کو بروقت اسپتال نہ لے جایا گیا تو خدانخواستہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ انجمن آرا پچھلے دو ماہ سے بہت ہی پریشان تھیں۔ علی حسن لوٹ کے دوبارہ نہ آیا تھا لیکن اس کے گھر والوں کو دونوں کے بارے میں سن گن مل گئی تھی اور انجمن آرا کو آئے روز دھمکیاں بھی مل رہی تھیں.....وہ لوگ جان سے مارنے کی باتیں کر رہے تھے۔

انجمن آرا نے اپنے طور پر علی حسن سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہی کہ وہ تو ان دنوں بیرون ملک کے دورے پر تھا۔

انجمن آرا کے ہاتھوں کے طوطے اڑے ہوئے تھے۔ ایسے میں آیا بی کو نجل کو ساتھ لے کر زبردستی اسپتال روانہ کیا۔ اور خود اپنے تعلقات کو استعمال میں لانے کے لیے فون ملانے لگی۔

☆☆☆

شعلے آسمان کی طرف لپک رہے تھے پوری کوٹھی میں آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ گاڑی کو کھلا چھوڑ کر اتری اور دیوانہ وار کوٹھی کی جانب لپکی ہی تھی کہ آیا بی نے نجل کو بازو سے پکڑ کر گاڑی میں دھکیلا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو آیا بی نجل اور منی کو لے کر اسپتال گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے بچی کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر ڈرپ لگا دی تھی۔ ٹریٹ منٹ کے دوران نجل، آیا بی کی گود میں لیٹی کمزور اور لاغر سی بچی کو کبھی ترس بھری نظر سے دیکھتی تو کبھی.....بے حس ہو جاتی۔ علاج مکمل ہوتے ہی نجل بھاگ کر اسپتال سے نکلی تھی اور آیا بی بھی نشتم پشتم اس کے پیچھے لپکی تھیں لیکن گھر والی روڈ پر پہنچتے ہی شعلوں میں گھرا ان کا بنگلا دور سے آیا بی کو نظر آ گیا اور نجل نے فوراً اگر بریک پہ پاؤں نہ رکھے ہوتے تو شاید ایکسیڈنٹ ہی کر بیٹھتی۔

آیا بی نے اسے اُدھر لپکنے سے روکا تو پہلی بار نجل نے آیا بی کو خشمگیں نظروں سے گھورا۔

''آیا بی اندر میری ماں اور بہنیں ہیں، مجھے ان کو بچانا ہے۔'' لیکن آیا بی نے اس کی ایک نہ سنی اور اس کو اشارے سے کوٹھی کے آس پاس بڑھتے ہجوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

''نجو، اس ہجوم میں علی حسن کے سسرال والوں کے غنڈے بھی ہیں، یہ پہلے بھی انجمن آرا کو دھمکانے آ چکے ہیں، میں ان کو پہچانتی ہوں بٹیا، اس دن بھی وہ دھمکا کے چلے گئے تھے دراصل وہ تمہیں اور منی کو مارنا چاہتے تھے، یہ تو اچھا ہوا کہ تم دونوں آج وہاں تھیں ہی نہیں.....''

''کیا خاک اچھا ہوا آیا بی.....! اس سے اچھا تھا میں بھی منی کے ساتھ اندر ہی جل مرتی.....کیا فائدہ اس زندگی کا جس کو علی حسن دھتکار کر چلا گیا اور میری وجہ سے میری ماں اور بہنیں اگر جل کر مر رہی ہیں تو میں ان کو اکیلا چھوڑ کر چلی جاؤں.....؟ اتنی بے حس لگتی ہوں میں آپ کو کیا آیا بی۔'' وہ روتے ہوئے بولتی چلی گئی۔

''میری بچی آج تجھے یہ علم ہو جانا بہت ضروری ہے کہ تم انجمن آرا جیسی عورت کی نہیں میری اولاد ہو.....میری اپنی بیٹی.....تمہاری رگوں میں دوڑتا ہوا لہو میرا ہے۔ ہاں میں ہی بدنصیب تیری ماں ہوں.....میں تمہیں سب سچ بتاتی ہوں لیکن اس وقت تم گاڑی کو واپس موڑ دو اور کسی محفوظ جگہ تک لے چلو۔ نجل جو سکتے میں آ گئی تھی اس نے جلدی سے گاڑی کو واپس موڑ لیا۔

''ہاں میں بدنصیب جو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی، کچھ انوکھا نہیں ہے میری کہانی میں، وہی ایک متوسط طبقے کی خوابوں میں رہنے والی معصوم لڑکی جو فلمیں دیکھتی ہے تو ہر فلم کے اندر ہیروئن ہر بار وہ خود کو ہی سمجھتی ہے۔ میں بھی ایک ایسی ہی لڑکی تھی جو اپنے محلے کے سب سے امیر گھر کے لڑکے کی باتوں کے جھانسے میں آ گئی۔ باتیں بھی تو وہ اتنی خوب صورت کرتا تھا۔ میں جو نین نقش میں ہیروئن کی طرح ہی حسین تھی، وہ جب میری خوب صورتی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا تو میں کسی اور ہی دنیا کے سفر پر نکل

Digitized by Google

جاتی۔ ہم محبت میں بہت دور نکل آئے تھے اب کسی دوسرے کی ہماری زندگی میں گنجائش کہاں تھی۔ میرے اصرار پر اس نے اپنے گھر والوں کو میرے گھر رشتہ بھجوانے کے لیے راضی کیا تو ہم جو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ہماری راہیں بہت سہل ہیں، ان راہوں کو تو دونوں گھرانوں کے الگ مسلک نے مشکل بناڈالا۔ نہ اس کے گھرانے والے رشتہ لینے کو مانے نہ ہی میرے گھر والے اس کے گھرانے کو رشتہ دینے کو مانے......اب ہم دونوں کے درمیان کوئی چارہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ ہم گھر سے فرار ہو کر کورٹ میرج کر لیتے۔ دونوں ہی کی عمریں ایسی تھیں جو زندگی میں جذبات کے علاوہ کچھ نہیں سوچتی ہیں......سو میں بھی رات کے اندھیرے میں نقدی اور وہ زیور جو میری ماں نے میرے جہیز کے لیے جوڑ رکھا تھا لے کر سرفراز کے ہمراہ گھر سے بھاگ گئی۔ ماں، باپ کی عزت کو ہمیشہ کے لیے رات کے اندھیرے کی چادر اوڑھا کر......"

آپا بی کا گلا بولتے، بولتے رندھ گیا تھا وہ مسلسل رو رہی تھیں لیکن سجل نے کوئی تسلی یا دلاسا نہیں دیا۔

"سرفراز نے مجھ سے نکاح تو کر لیا لیکن مجھے سنبھال کر چھ ماہ بھی نہ رکھ سکا۔ چھ ماہ بعد جب تم میری کوکھ میں آ چکی تھیں تو سرفراز مجھے چھوڑ کر ایسا گیا کہ واپس ہی نہیں لوٹا شاید وہ تھک گیا تھا۔ اس کا جی بھر چکا تھا۔ سو وہ مجھے یوں تنہا چھوڑ گیا۔ اور میں جو اسکول سے گھر تک کے راستے کے علاوہ اور کسی جگہ کا راستہ نہیں جانتی تھی۔ سرفراز کے لائے ہوئے اس بڑے شہر میں کدھر جاتی لیکن پیٹ کی آگ تو بجھانی تھی تو ایک ہمسائی نے مجھے انجمن آرا کے ہاں ملازمت پر رکھوا دیا، پڑھی لکھی تو میں تھی نہیں، گھر کا کام آتا تھا سو کرنے لگی۔ انجمن آرا نے بہت چالاکی سے ہمدردی جتا کر مجھ سے میرا سارا احوال جان لیا اور پھر مجھے مستقل اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ بہت جلد مجھے انجمن آرا کے اصل کاروبار کا پتا چل گیا۔ تیری پیدائش میں زیادہ وقت نہیں تھا جب میں نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن پکڑی گئی جب بار، بار میں نے وہاں سے نکلنے کی کوشش ترک نہ کی تو بالآخر انجمن آرا ایک دن مجھے میرے قصبے میں اس چھوٹے سے گھر میں خود ہی لے کر آئی، یہ دکھانے کو کہ اب میں بھاگ کر جاؤں گی بھی تو کس کے پاس......میرے والدین تو میری اس حرکت کو سہار ہی نہیں پائے تھے۔ کچھ ماہ میں ہی آگے پیچھے دنیا چھوڑ گئے تھے۔ اور سرفراز کے گھر والے وہ محلہ چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو گئے تھے اور یوں آزادی کی خواہش نے بھی دم توڑ دیا۔ شاید میں مر جاتی لیکن اسی ماہ جب تم پیدا ہوئیں تو مجھ میں زندہ رہنے کی وجہ سانس لینے لگی۔ میں نے انجمن آرا کی منت کی کہ میں اس کے لیے ہر کام کروں گی۔ بس وہ میری بیٹی کو ایک عام گھرانے کی بیٹی کی طرح پرورش کرنے کا حق دے، دے۔ اس کو طوائف نہ بنائے۔ تم جانتی ہو کہ انجمن آرا نے اس کے بدلے میں مجھ سے چند وعدے لیے کہ میں تمہیں کبھی نہ بتاؤں کہ تم میری بیٹی ہو۔ اپنے ماضی کو چھپائے رکھوں تو وہ مجھے بھی کوئی غلط کام کرنے نہیں دے گی لیکن اس کی اگلی شرط بہت بھیانک تھی کہ...... وہ تمہیں یعنی بجو کو دھندے پر نہیں لگائے گی لیکن اس کی پرورش کا ہرجانہ سجل کی بیٹی کو ضرور بھرنا ہوگا۔ اور پھر بالآخر تم نے ایک بیٹی کو ہی جنم دیا۔ میری دعائیں مستجاب نہیں ہوئیں۔ وہ وقت بہت مشکل تھا میرے لیے جب تم امید سے تھیں۔ میں دن رات دعا کرتی کہ تم بیٹے کی ماں بنو لیکن قدرت کو یہی منظور تھا کہ تم بیٹی کی ماں......" آپا بی، منی کو سینے سے لگا کر سسکیاں بھرنے لگیں۔ گاڑی میں آپا بی کی سسکیاں گونج رہی تھیں اور سجل نے کچھ بولنے کو منہ کھولا لیکن پھر سختی سے ہونٹ بھینچ لیے اور ٹیکسی لریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا کر گاڑی کو گیئر میں ڈال دیا۔

"سجل بیٹا! یہ گاڑی ہمیں چھوڑ دینی ہوگی ورنہ وڈیرے کے کتے ہمیں جلد ڈھونڈ لیں گے، تم گاڑی کو اِدھر ہی کہیں چھوڑ دو......اب ہمیں ٹرین میں سفر کرنا ہوگا۔ ایک گمنام منزل کی جانب سفر......" آپا بی نے سجل کو جو کہا وہ سجل پوری طرح سمجھ گئی تھی۔ اس نے گاڑی کو سڑک کے کنارے روک دیا اور کچھ دور جا کر رکشا روک کر اسے ریلوے اسٹیشن چلنے کو کہا۔

(باقی آئندہ)

ایڈونچر

فریدہ سیفی

"یہ لو ہرا دھنیا، پودینہ اور سبز مرچیں۔" امبر نے تینوں چیزیں کاٹ کر فلک کو دیں، وہ مسالا بھون رہی تھی۔

"جلدی سے لیموں بھی کاٹ دو اور چاول نکال لو......" فلک نے مصروفیت کے عالم میں اگلا آرڈر دیا۔ وہ خاموشی سے لیموں نکالنے فریج کی طرف بڑھ گئی۔ عام حالات میں امبر جیسا نکما اور کام چور کوئی نہیں تھا لیکن آج وہ انتہائی ذوق و شوق سے کام میں مصروف تھی۔ آج حنا آپی کی شادی کے بعد پہلی باقاعدہ دعوت تھی۔ مکلاوے میں بھی وہ نہیں آئی تھیں کہ بقول ان کی سسرال والوں کے ان کے ہاں اس کا رواج نہیں تھا۔ بہرحال اب وہ اپنی پوری سسرال یعنی دو نندوں، ایک جیٹھ، جیٹھانی اور ساس، سسر سمیت رات کے کھانے پر آ رہی تھیں۔ امبر، فلک اور امی... تندہی سے تیاریوں میں مشغول تھیں۔ شادی والا گھر تھا۔ دور کے مہمان تو کل ہی رخصت ہوئے تھے چنانچہ کل دونوں بہنوں نے سارا پھیلاوا سمیٹا تھا......اور امی نے

Digitized by Google

آج کے لیے گاجر کا حلوا، شامی کباب اور چپل کباب بنا کر رکھے تھے۔ ساتھ ہی فش اور چکن کو مسالا بھی لگا دیا تھا۔ آج وہ دم کا قیمہ اور کوفتے بنا رہی تھیں۔ بریانی اور بادامی قورمہ فلک کی ذمے داری تھی جبکہ رس ملائی، رشین سلاد، رائتہ اور ڈھیروں ڈھیر برتن سدا کی کام چور امبر کے ذمے تھے۔

حنا آپی تینوں بہنوں میں سب سے زیادہ خوب صورت تھیں۔ خوب صورت تو بہت سے لوگ ہوتے ہیں لیکن بادامی آنکھوں اور گلابی رنگت والی حنا آپی میں ایک عجیب سی کشش اور من موہنا پن تھا کہ نظریں ایک دفعہ ان کے چہرے پر پڑتیں تو پھر واپس پلٹنا ہی بھول جاتیں وہیں پر نثار ہوتی رہتیں۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ان کے شوہر عمران کا اُن کے ساتھ جوڑ کوئی بہت جچتا ہوا نہیں تھا۔ وہ پڑھے لکھے اور ویل گرومڈ ہونے کی وجہ سے ڈیسنٹ لگتے تھے لیکن شکل صورت بس مناسب ہی تھی۔ امی، ابو سمجھدار تھے۔ چاند کے ساتھ سورج ملانے کے چکر میں وقت ضائع کرنے کے حق میں قطعی نہ تھے چنانچہ جب عمران کی تصویر دیکھ کر حنا نے منہ بنایا تو امی نے یہی کہہ کر بیٹی کو سمجھایا۔

”شکل صورت میں شوہر کو بیوی سے کم ہی ہونا چاہیے تب ہی تو وہ اس کی قدر کرتا ہے۔ ورنہ تو اس کے اپنے نخرے ہی ختم نہیں ہوتے۔ دیکھنا عمران تمہارا کیسا دیوانہ بن کے رہے گا۔“ بس اس کے بعد تو امبر اور فلک نے حنا آپی کی چھیڑ ہی بنالی تھی۔ وہ عمران کا نام لینے کے بجائے اسے دیوانہ کہہ کر بلاتی تھیں اور حنا آپی شرم کے مارے لال، گلابی ہوتی رہتی تھیں۔

”میں تیار ہونے جا رہی ہوں۔“ امبر نے رائتہ بنا کر رکھا اور فلک کو اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے، میں بھی بریانی دم پر رکھ کر آتی ہوں۔ اللہ کرے یہ لوگ ذرا جلدی چلے جائیں، میرا بہت امپورٹنٹ ٹیسٹ ہے کل۔“ فلک نے پریشانی سے کہا۔ وہ میڈیکل میں تھی اور امبر سے چھوٹی ہونے کے باوجود زیادہ سمجھدار اور سگھڑ بھی......

سات بجے کے قریب وہ لوگ آئے تھے۔ حنا آپی میرون کامدار سوٹ میں بے حد پیاری لگ رہی تھیں، ڈرائنگ روم جلد ہی پُرتکلف باتوں سے بھر گیا تھا۔ خواتین موسم، بجلی اور گیس کی لوڈ شیڈنگ کی گفتگو کے بعد جلد ہی اپنی ہڈیوں اور جوڑوں کی پرابلمز کی طرف آ گئی تھیں اور مرد حضرات حسبِ معمول حالات حاضرہ پر گفتگو میں مشغول تھے۔ امبر اور فلک کھانا لگانے کے لیے اٹھیں تو حنا آپی بھی کچن میں چلی آئیں۔

”کیا، کیا بنایا ہے تم لوگوں نے؟“ وہ کچن میں کھڑی طائرانہ نظروں سے جائزہ لے رہی تھیں۔ شادی سے قبل یہ کچن ان کی راجدھانی تھا۔

”بہت کچھ......“ امبر مسکرائی اور ان کے گلے لگ گئی۔ ”ہائے آپی آپ کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔“ اس نے زور سے اُن کا منہ چوم لیا۔

”بدتمیز...... آپی کے چہرے پر لپ اسٹک لگادی ہے تم نے۔“ فلک نے اسے جھاڑا اور ٹشو لے کر حنا کا چہرہ صاف کیا۔

”اب بتائیں ذرا تفصیل کے ساتھ......“ امبر نے شرارت سے آنکھیں نچائیں۔ ”کیا، کیا تعریفیں کیں عمران بھائی نے۔“

”کچھ بھی نہیں......“ حنا ذرا سا مسکرا کر چپ ہوگئی۔

”اوئے ہوئے پردہ داریاں......“ امبر نے سر ہلایا۔ ”اب ہم سے چھپائیں گی آپ۔“

”ارے نہیں...... وہ ذرا سنجیدہ مزاج کے ہیں۔ ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتے۔“ حنا کا لہجہ دھیما تھا۔

”کیا مطلب......؟“ امبر کا انداز سوالیہ تھا۔

”آج بھی آپ اتنی اچھی لگ رہی ہیں۔ انہوں نے کوئی تعریف نہیں کی آپ کی؟“

”نہیں۔“ حنا نے نفی میں سر ہلایا۔

امبر نے نہ سمجھنے والے انداز میں فلک کی طرف دیکھا۔ وہ حقیقتاً یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ کوئی حنا آپی کے خیرہ کُن حسن کو سراہے بغیر کیسے رہ سکتا ہے۔

”آپ نے پوچھا نہیں کہ میں کیسی لگ رہی

ہوں؟“ اب وہ ذرا سنجیدہ تھی۔

”پوچھا تھا۔“ حنا نے افسردگی سے جواب دیا۔

”تو......؟“ امبر نے بے صبری سے پوچھا۔

”انہوں نے کہا کہ مجھے کیا پتا اور مجھ سے ایسی باتیں مت پوچھا کرو۔“

”کیا؟“ امبر کی آواز اونچی ہوگئی تھی۔

”آہستہ......“ فلک نے اسے گھورا۔

”اچھا شادی کے پہلے دن تو انہوں نے آپ کو خوب سراہا ہوگا ناں......“ امبر نے کریدا۔ وہ حیران تھی کہ عمران بھائی جن کو پچھلے تین ماہ سے وہ لوگ دیوانہ، دیوانہ کہہ کر حنا آپی کو چھیڑ رہی تھیں، وہ اپنے انداز سے ان کے دیوانے قطعاً دکھائی نہیں دیتے تھے۔

”نہیں......“ حنا کا جواب مختصر اور خلافِ توقع تھا۔ اب اس نے غور کیا۔ حنا آپی چپ، چپ تھیں۔ شوہر کی پسندیدگی اور محبت پا کر جو عورت میں ایک مان اور اعتماد سا پیدا ہوا جاتا ہے وہ ان میں مفقود تھا۔ وہ ریزروڈ اور محتاط نظر آ رہی تھیں اور شاید کچھ مایوس اور اداس بھی۔ ان کی اپنی توقعات کو بھی بری طرح ٹھیس لگی تھی۔

”وہ بالکل مختلف مزاج کے ہیں۔ سخت سے، لیے دیے رہنے والے۔ وہ تو شاید مجھے غور سے دیکھتے بھی نہیں ہیں۔“ حنا کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

دونوں بہنیں خاموشی سے اپنی پیاری آپی کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ مارے دکھ کے امبر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”لڑکیوں، کھانا لگاؤ ناں بھئی......“ اسی وقت امی کچن میں داخل ہوئیں۔

”امی بات سنیں۔“ فلک نے انہیں بلایا...... وہ بیٹیوں کی اتری ہوئی شکلیں دیکھ کر پریشان ہوگئیں۔

”کیا ہوا؟“

”امی، عمران بھائی تو بالکل بھی ویسے نہیں ہیں جیسا کہ ہم نے انہیں سمجھا تھا۔“ امبر نے شکوہ کیا۔

”کیا مطلب......؟“ امی نے تشویش سے حنا کی اتری ہوئی شکل دیکھی۔

”انہوں نے آپی کی ایک دفعہ بھی تعریف نہیں۔ یہاں تک کہ پہلے دن بھی انہیں نہیں سراہا۔ کوئی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا...... وہ بہت ٹھس قسم کے انسان ہیں امی...... بے حس سے۔“ امبر نے بتانے کے ساتھ، ساتھ اپنے دلی جذبات کا بھی اظہار کیا تھا۔

امی نے بے اختیار گہری سانس لی۔

”میں سمجھی پتا نہیں کیا ہوگیا...... بھئی مردوں کا اپنا، اپنا مزاج ہوتا ہے۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہے...... اور تو کوئی مسئلہ نہیں ہے ناں بیٹے۔“ انہوں نے حنا سے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”نئی جگہ ہے، نیا ماحول اور نئے لوگ...... ایڈجسٹ ہونے میں تھوڑا ٹائم لگے گا۔“ امی نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ”تم پریشان مت ہونا میرا بیٹا...... حوصلے اور سمجھداری سے کام لینا...... ہوں......“ انہوں نے اس کی پیشانی چومی اور پھر اُن دونوں کی طرف مڑیں۔

”جلدی کرو بھئی کھانا لگاؤ۔“

کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ امبر اس دوران عمران بھائی کو بطورِ خاص جانچ رہی تھی...... کھانے کے بعد جب گرین ٹی کا دور چل رہا تھا وہ اپنا کپ لے کر عمران بھائی کے پاس آ بیٹھی۔

”عمران بھائی...... اتنا خوب صورت لائف پارٹنر پا کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟“ اس نے خوشگوار انداز میں انہیں مخاطب کیا تھا۔

”بھئی آپ تو ایسے پوچھ رہی ہیں جیسے مجھے کوئی ایوارڈ ملا ہو۔“ وہ مسکرا کر بولے۔

”انتہائی حسین بیوی ایوارڈ ہی تو ہے۔“ اس نے تائید چاہنے والا انداز اختیار کیا۔

”دراصل میں حسن صورت سے زیادہ حسن سیرت کو ترجیح دیتا ہوں۔“ عمران بھائی نے پہلو بدلا...

”اس میں بھی میری آپی اپنی مثال آپ ہیں۔“ امبر نے فخریہ کہا۔

”یہ تو وقت بتائے گا۔“ عمران بھائی کے جواب نے اُن کے ناقدرے اور ناشکرے ہونے پر مہر ثبت کی

URDU TUBE
Digitized by Google

تھی۔ امبر بدمزہ ہو کر اٹھ گئی۔

☆☆☆

خواب دیکھنا انسان کی فطری جبلت ہے، زندگی جتنی پھیکی اور بے رنگ ہو اس سے منسلک خواب اتنے ہی رنگین اور شوخ ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی لڑکیوں کی زندگی تو ویسے ہی بہت محدود ہوتی ہے۔ بہت سی خواہشات اور خوشیوں کو شادی کے ساتھ منسلک کر کے انتظار کی کال کوٹھڑی میں بند کر دیا جاتا ہے۔ ایسے میں فلموں کا رومان، کہانیوں کی سحر انگیزی، ڈراموں کے ڈائیلاگز اور گانوں کی شاعری، جذبات کو مہمیز کرنے کا کام انجام دیتی ہے۔

عام طور پر لڑکیوں کے لیے شادی ایسے ہی ہوتی ہے جیسے کسی ونڈرلینڈ میں داخل ہونا جہاں ان کے خوابوں کا شہزادہ ان پر اپنی بھرپور محبت نچھاور کرتا ہے..... ان کو سراہتا ہے..... پیار بھرے جملے بولتا ہے اور ان کی چھوٹی، چھوٹی خواہشات کو پورا کرتا ہے۔ ایک پیار بھرا گھر جس میں ان کا مکمل اختیار ہوتا ہے..... پیاری فیملی۔

لیکن حقیقت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ مستثنیات کو چھوڑ کر ہمارے ہاں کے زیادہ تر مردوں میں قصہ کہانیوں کے ہیروز کی صفات تو کجا خود غرضی اور مطلب پرستی کوٹ، کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ ایک... بھرپور دن گھر سے باہر گزار کر مرد جب گھر واپس آتا ہے تو اسے بیوی سے بات کرنے کی خواہش ہوتی ہے نہ اس کی بات سننے کی ضرورت..... ایک جھنجلایا تھکا ہوا مرد بیوی کے خوابوں کے محل کو بری طرح مسمار کر دیتا ہے۔ چھوٹی، چھوٹی معصوم سی تشنہ خواہشات کی حسرت دل میں لیے عورت اپنے شوہر کی بڑی، بڑی آرزوؤں کو پورا کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کا گھر، اس کے بچے، اس کا خاندان ہر چیز سنبھالتی ہے۔ اپنے خوابوں کو بھول جاتی ہے اور دل بچوں میں لگا لیتی ہے۔

یہ ہے ہمارا معاشرہ جہاں کے پچانوے فی صد گھروں کی بنیادوں میں سمجھوتوں کی اینٹیں آنسوؤں کے سیمنٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہیں۔ یہی حنا کے ساتھ ہوا تھا۔ عمران اس کے حسن سے بری طرح خائف ہو گیا تھا۔ بیوی کے نیچے لگ جانے کا خوف اور زن مرید کہلائے جانے کا ڈر اسے حنا سے اس انداز سے بے تکلف ہونے سے روک دیتا تھا۔ اس کی ماں، بہنوں نے مذاق، مذاق میں بارہا اسے کہہ رکھا تھا کہ بس بیوی آنے کی دیر ہے، وہ تو بیوی کا ہی ہو کر رہ جائے گا۔ اب وہ ان کی یہ بات غلط ثابت کرنا چاہتا تھا، اس لیے وہ حتی الامکان کوشش کرتا کہ وہ بیوی کا نہ بنے اور اس سے فاصلے پر ہی رہے۔

جوائنٹ فیملی سسٹم تھا۔ شوہر کی سپورٹ کے بغیر حنا کا وہی حال ہوا جو ایسی عورتوں کا ہوتا ہے۔ گھر کے سارے کاموں کا بوجھ تو اس پر ڈال ہی دیا گیا، ساس، نندوں کے طنز اور طعنے الگ دل جلاتے، اسی پر بس نہیں تھا۔ وہ عمران کے بھی کان بھرتیں نتیجتاً ان دونوں کے آپس کے تعلقات مزید کشیدہ ہو جاتے۔ وہ دنوں میں مرجھا کے رہ گئی تھی۔ ماں سے مدد چاہتی تو وہاں سے وہی نصیحتیں ملتیں جو شاید ساری ماؤں نے اپنی بیٹیوں کو دینے کے لیے ازبر کی ہوتی ہیں۔

"شادی کے پہلے کچھ سال مشکل ہوتے ہیں، دو صبر سے گزار لو بعد میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"ہاں... بعد میں عادت جو ہو جاتی ہے۔" وہ جل کر سوچتی۔

"بیٹا تم سوچ، سوچ کر کیوں دل جلاتی ہو، ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرو۔" وہ مزید کہتیں۔

لیکن یہ اتنا آسان ہوتا تو نفرت بھری باتیں سن کر درخت کیوں مرجاتے۔ بہرحال وہ درخت نہیں، انسان تھی اور انسان کو سمجھوتا کرنا آتا ہے۔ وہ بھی اپنے گھر کی بنیادوں میں سمجھوتے کی اینٹیں لگا رہی تھی..... آنسوؤں کے سیمنٹ کے ساتھ اپنے جذبوں کی بجری ڈال کر.....

زندگی مختلف انسانوں کے درمیان سفر کرتی ہوئی اپنی ترجیحات اور نظریات بدلتی چلی جاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے دریا جن زمینوں کے بیچ میں سے گزرتا ہے وہیں کی مٹی اور ذائقوں کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ زندگی

پر کبھی دو جمع دو برابر چار کا فارمولا لاگو نہیں ہوتا۔ ایک چیز اگر ایک بیس سال کی رومان پرور اور چلبلی لڑکی کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے تو وہی چیز ایک چالیس سالہ تجربہ کار اور برد بار عورت کے لیے انتہائی فضول اور احمقانہ ہو سکتی ہے لیکن یہ بھی کوئی طے شدہ اصول نہیں ہے، نہ ہر بیس سالہ لڑکی رومان پرور اور چلبلی ہوتی ہے اور نہ ہر چالیس سالہ عورت بردبار اور تجربہ کار.....

☆☆☆

"یار کیا مصیبت ہے ناں یہ میڈیکل کی پڑھائی بھی۔" فلک نے اپنی موٹی سی کتاب کو زور سے بند کیا اور مڑ کر امبر کو دیکھا جو بڑے انہماک سے اپنے سیل فون میں بزی تھی۔

"تم اپنی کتابوں کی دنیا سے باہر نکل کر دیکھو تو تمہیں پتا چلے کیا ہو رہا ہے دنیا میں۔" امبر نے جواب دیا۔

"تم کیا دیکھ رہی ہو۔" فلک اپنی اسٹڈی ٹیبل سے اٹھ کر بیڈ پر آ کر بیٹھی اور آگے ہو کر امبر کے ہاتھ میں پکڑے موبائل کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ کسی کی پکچرز دیکھ رہی تھی۔

"یہ....." امبر نے اپنا فون اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "ہنسوں کا جوڑا' لو برڈز..... پریم کہانی....."

"واؤ....." فلک نے تصویریں دیکھنی شروع کیں۔ "عینی اور شہزاد..... یار یہ تو شادی سے پہلے ہی میرڈ کپلز کی طرح بی ہیو کر رہے ہیں۔"

"شادی انہوں نے پتا نہیں کرنی بھی ہے یا نہیں....." امبر نے منہ بنایا۔ "یونیورسٹی کے شروع کے دنوں سے چل رہا ہے ان کا افیئر..... ابھی تک منگنی تو ہوئی نہیں۔"

"ایسے ہی لوگوں نے تعلیمی درسگاہوں کو بدنام کر رکھا ہے ناں....." فلک نے افسوس سے کہا۔

"لیکن دیکھو ناں کتنا انجوائے کر رہے ہیں یہ لوگ..... زندگی کا بھرپور لطف اٹھا رہے ہیں۔" امبر کے لہجے میں حسرت تھی۔

"ہاں۔ ماں، باپ کی عزت کو داؤ پر لگا کر....."

فلک نے تصویریں دیکھ کر سیل فون رکھ دیا تھا۔

"چار دن کی زندگی ہے یار..... انجوائے کرنا چاہیے۔" امبر نے جواب دیا۔

"مجھے تمہارے ادارے کچھ خطرناک لگ رہے ہیں۔" فلک نے اسے غور سے دیکھا تھا۔ "تم کہیں انوالو تو نہیں ہو رہیں۔"

"نہیں بھئی....." امبر نے نفی میں سر ہلایا پھر شرارت سے آنکھیں گھمائیں۔ "لیکن چھوٹا موٹا افیئر چلانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

"سوچنا بھی مت....." فلک نے خبردار کیا۔ "تم یونیورسٹی جس کام کے لیے جاتی ہو وہی کرو..... اپنے ماں، باپ کی عزت خاک میں ملانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے احساسات، جذبات، مسکراہٹ ہر چیز کو اس کے لیے سنبھال کر رکھو جسے اللہ نے تمہاری تقدیر میں لکھ رکھا ہے تاکہ وقت آنے پر تم اس کے سامنے شرمندہ ہونہ ہی اپنے سامنے۔"

"میں تو صرف دل لگی کی بات کر رہی ہوں۔" امبر نے بیڈ پر دراز ہو کر اطمینان سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"دل لگی بعض اوقات دل کو لگ بھی جاتی ہے۔"

"کم آن فلک..... یہ اکیسویں صدی ہے، اب دل بہت سمجھدار ہو گئے ہیں۔ انہیں اپنا سارا نفع نقصان پتا ہوتا ہے۔ تم فکر مت کرو اور لائٹ آف کر دو..... میں سونے لگی ہوں۔"

"مجھے بس اتنا پتا ہے کہ جس کام سے اللہ نے منع کیا ہے اس میں ہمیشہ نقصان ہوتا ہے۔" فلک نے اٹھ کر لائٹ آف کر دی تھی۔ وہ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہونے کے ناتے یہ تو جانتی تھی کہ انسان کی تخلیق کا بنیادی عنصر پانی ہے لیکن اسے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ جس طرح پانی تغیر پزیر ہے بالکل اسی طرح انسان بھی بدلتا رہتا ہے، ہر لمحہ، ہر دن بھی پُرشور طریقے سے اور کبھی چپ چاپ.....

☆☆☆

جس طرح ٹریفک کے سگنلز ہوتے ہیں ویسے ہی

Digitized by Google

کئی سگنلز عورت کی نگاہوں اور انداز میں چھپے ہوتے ہیں، مردان اشاروں کو خوب سمجھتا ہے جہاں سرخ بتی روشن ہو وہاں وہ کبھی آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ جرأت وہیں ہوتی ہے جہاں زرد بتی کا خیر مقدمی انداز ہو یا گرین سگنل کھلا ملے۔

''امبر......'' وہ سر زید کی کلاس اٹینڈ کر کے باہر نکلی ہی تھی کہ پیچھے سے پکار کر سن کر رک گئی۔ وہ معاذ تھا۔

''آپ نوٹس بہت اچھے بناتی ہیں۔'' اس کے نوٹس واپس کرتے ہوئے وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

''یہ اچھے نوٹس آپ خود بھی بنا سکتے ہیں۔'' امبر نے بردباری سے کہا۔

''بہت مشکل ہے۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے منہ بنایا تھا۔

''یوں کہیے پکا پکایا کھانے کی عادت پڑ گئی ہے۔'' امبر نے طنز کیا۔ معاذ ان چند کلاس فیلوز میں سے تھا جو امبر کے بنائے گئے نوٹس سے ریگولر لی استفادہ حاصل کرتے تھے۔

''نہیں، دراصل میں تو دھکے سے اسٹڈیز کر رہا ہوں، یہ ماسٹرز کی ڈگری لینے کے لیے...... ورنہ سنبھالنا تو پاپا کا بزنس ہی ہے ناں۔'' معاذ نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ اس ڈھٹائی پر وہ کیا کہہ سکتی تھی سو خاموش ہو گئی۔

''آپ نے مائنڈ کیا ہے؟'' معاذ نے غور سے اس کی شکل دیکھی۔

''نہیں......'' امبر نے جواب دیا۔

''میں بھی کہوں ایک حسین لڑکی مائنڈ کر بھی کیسے سکتی ہے۔'' معاذ نے گہری سانس لی۔

''کیوں......؟'' امبر نے حیرت سے بھویں اچکائیں۔

''مطلب......'' اس نے لبوں پر زبان پھیری...... اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔ ''حسین لڑکیوں کے پاس مائنڈ ہوتا نہیں ہے ناں......''

''کافی پرانا اور چیپ جوک ہے۔'' امبر نے بیچ بیچ خفا ہو کر قدم آگے بڑھا دیے۔

''کہاں جا رہی ہیں آپ......؟'' وہ ساتھ ہو لیا تھا۔

''جہنم میں...... چلیں گے آپ......؟''

''شیور، وائے ناٹ......'' وہ ہنس رہا تھا۔ ''چلیں آپ کو کچھ ٹھنڈا پلاتا ہوں تاکہ آپ کا موڈ ٹھیک ہو۔''

امبر نے اس کی طرف دیکھا اور مضبوطی سے تھاما اپنے دل کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

چلو کچھ دن جی لیں ہم بھی
پھولوں کی معیت میں
شعروں کی سنگت میں
بارش کے پانیوں کو
ہتھیلیوں میں جمع کر لیں
تتلیوں کے رنگوں کو
آنکھوں میں مقید کر لیں
زندگی کی سختیوں سے چھپ کر
کچھ لمحے چرا لیں
آئندہ کے خوف کو بھلا کر
کچھ یادیں کما لیں
خواب کے جزیرے پر
دن گزاریں
چاند کے سفینے پر
شام کر لیں
زیست کے چند پل
صرف اپنے نام کر لیں

☆☆☆

تبدیلی کا لفظ کائنات کی ہر چیز کے ساتھ وابستہ ہے۔ دن بدل رہے تھے، موسم بدل رہا تھا۔ سردی جاتے، جاتے رک جاتی تھی اور گرمی آتے، آتے تھم جاتی تھی۔ کبھی کمبل اچھا لگتا تو کبھی پنکھا۔ عجیب دودلا سا موسم تھا جیسے بعض اوقات انسان خود کو سمجھ نہیں پاتا ویسے ہی موسم بھی اپنے انتخاب میں الجھا ہوا تھا۔

سیل فون کافی دیر سے بج رہا تھا۔ امبر نے باتھ روم سے نکل کر دیکھا۔ چودہ مسڈ کالز، اس کی اور معاذ کی دوستی کچھ ہی عرصے میں طوفانی رفتار سے آگے بڑھی تھی۔ امبر نے گہری سانس لی اور بالوں کے گرد لپٹا

تولیا نکالا...... وہ بال خشک کر کے تولیا باہر تار پر ڈال کر واپس آئی تو بیل ایک دفعہ پھر بجنا شروع ہو چکی تھی۔ اس نے فون اٹینڈ کر کے کان سے لگایا۔

''کہاں تھیں تم......؟'' دوسری طرف معاذ.... بے تابی سے پوچھ رہا تھا۔

''باتھ روم میں تھی یار...... شاور لے رہی تھی۔'' امبر نے سامنے ڈریسنگ ٹیبل میں خود کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' معاذ نے گہری سانس لی۔ ''تم فون اٹینڈ نہیں کرتیں تو میں گھبرا جاتا ہوں۔''

''کیوں؟''

''آئی ڈونٹ نو امبر...... مجھے لگتا ہے میں تمہیں کھو دوں گا اور مجھے اس بات سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''ایسی باتیں تو لڑکیاں کرتی ہیں معاذ......'' امبر ہنسی۔

''ہاں......'' وہ بھی ہنسا پھر سنجیدہ ہو گیا۔ ''مجھے لگتا ہے تم مجھ سے اتنی محبت نہیں کرتیں جتنی میں تم سے کرنے لگا ہوں۔''

''ایسی بات نہیں ہے، آدھا دن تو یونیورسٹی میں نکل جاتا ہے پھر واپس آ کر تم سے بات ہوتی ہی رہتی ہے۔ رات کو بھی ہم دیر تک باتیں کرتے ہیں بلکہ سچ پوچھو تو میری اسٹڈیز کا بہت حرج ہو رہا ہے۔''

''یونیورسٹی میں کون سا تم مجھ سے بات کرتی ہو۔'' معاذ کا لہجہ شکایتی تھا۔ ''تمہیں ڈر ہی لگا رہتا ہے کہ کسی کو ہمارے بارے میں پتا نہیں چل جائے۔''

''ہاں تو میں ایک عزت دار لڑکی ہوں معاذ...... کوئی اسکینڈل افورڈ نہیں کر سکتی۔ آئی ایم سوری......''

امبر کا انداز دوٹوک تھا۔

''تو میں کب تمہاری بات سے انکار کرتا ہوں۔ جیسے کہتی ہو ویسے ہی کرتا ہوں۔ جتنی مل جاتی ہو اسی پر صبر کرتا ہوں، آدھا دن تمہیں دیکھتا ہوں اور آدھا دن تم سے بات کرتا ہوں۔'' وہ بیچارگی سے بولا۔

''اچھا اب زیادہ مظلوم مت بنو......'' امبر ہنسی۔

''یہ بتاؤ تم کیسی لگ رہی ہو؟'' معاذ نے موضوع

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

فروری 2019ء کی نرم نرم سی خماریاں
جاسوسی کے شمارے کی یادگار کہانیاں

اولین صفحات

عالمی بساط پر بکھیرے مُہروں کا خون رنگ
سازشی کھیل، جرم اور قانون کی ازلی کشمکش......
امجد رئیس کے قلم کا جادو

انگارے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن
کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا
طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت
سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت......
عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

متکبر اور فرعون صفت فطرت کے
ردِعمل میں جنم لینے والی سازشی کہانی

دھوپ چھاؤں کی طرح ڈوبتے ابھرتے
کرداروں کا عکاس...... لیک تیکھا سرورق

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے ... محبتیں...
شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں ... کتھائیں

Digitized by Google

اور انداز دونوں بدلے۔

''ویسی ہی جیسی میں ہوں۔'' وہ مسکرائی۔

''یعنی چڑیل.....'' معاذ نے شرارت سے کہا۔

''اچھا، کچھ ہی دنوں میں، میں پری سے چڑیل بن گئی ہوں۔'' وہ دھیمی آواز میں چلائی۔

''نہا کے نکلی ہو۔'' وہ اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں۔'' امبر نے نروٹھے پن سے جواب دیا۔

''بال کھلے ہیں۔''

''ہوں۔''

''اور گیلے بھی؟''

''ظاہر ہے۔''

''تمہارے بالوں سے قطرہ، قطرہ پانی ٹپک کر تمہاری پشت پر گر رہا ہے۔'' معاذ کا لہجہ گمبھیر ہو گیا تھا۔

''کیا بدتمیزی ہے معاذ.....'' امبر نے مزید کچھ اور بھی کہنا چاہا۔

''ٹھہرو.....'' اس نے نرمی سے امبر کو ٹوکا.....

''مجھے اپنے بالوں سے اٹھتی دھیمی، دھیمی خوشبو کو محسوس کرنے دو۔''

امبر خاموش ہو گئی۔ یہی باتیں تھیں جو وہ سننا چاہتی تھی۔ یہی بے تابی تھی جو وہ محسوس کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

وہ یونیورسٹی سے نکلی تو معاذ کی سیاہ کار ریینگتی ہوئی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ وہ لاک کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ امبر نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا جواباً اس کی آنکھوں میں لجاجت امڈ آئی۔ آس پاس لوگ دیکھ رہے تھے۔ مجبوراً وہ پچھلی سیٹ کی طرف بڑھی اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

''آگے کیوں نہیں بیٹھیں؟'' معاذ نے بیک مرر سیٹ کر کے اسے دیکھا۔

''یہ صحیح نہیں ہے معاذ.....'' امبر کے لہجے میں ناراضی تھی۔

''آگے بیٹھنا؟'' معاذ نے پوچھا۔

''نہیں، یوں تمہاری گاڑی میں بیٹھنا۔'' وہ جتا کر بولی تھی۔

''کچھ نہیں ہوتا یار.....'' معاذ بے پروائی سے بولا۔

''ایٹی ویز..... آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔''

''اوکے.....اور کوئی حکم.....؟''

''مجھے گھر ڈراپ کر دو بس.....''

''اچھا پہلے آئس کریم کھا لیتے ہیں۔'' معاذ نے تجویز پیش کی۔

''ہرگز نہیں.....'' امبر نے سختی سے کہا۔

''ایڈریس بتاؤ۔'' معاذ کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

''مجھے گھر سے کچھ دور اتارنا۔'' اس نے ایڈریس بتایا اور ساتھ ہی ہدایت کر دی۔

''ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے معاذ..... میں نے تم سے دوستی کی ہے میرے لیے یہی بہت بڑی بات ہے، میں اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔'' گاڑی سے اترنے سے پہلے اس نے کہا تھا۔ معاذ لب بھینچے اسے جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

حنا پریگننٹ تھی ابو کے کہنے پر عمران اسے کچھ دن میکے میں رہنے کے لیے چھوڑ گیا۔ امی اس کی حالت دیکھ، دیکھ کر پریشان ہو رہی تھیں۔ پیلا زرد رنگ، اندر کو دھنسی آنکھیں وہ ان کی تینوں بیٹیوں میں سب سے زیادہ خوب صورت تھی اور اب جیسے اس کے حسن کو دیمک لگ گئی تھی۔

''آپی آپ لیٹ جائیں۔'' امبر نے تکیہ ٹھیک کر کے زبردستی حنا کو لٹا دیا تھا۔

''ارے اب ایسی بھی بیمار نہیں ہوں میں.....'' اس نے لیٹتے ہوئے کہا۔ ''وہاں سارے گھر کا کام کرتی تھی میں۔''

''تبھی تو یہ حالت ہوئی ہے۔'' امبر نے کہا۔

''تم سناؤ، تمہاری یونیورسٹی کیسی چل رہی ہے؟'' اس نے امبر سے پوچھا۔

''بس ایگزامز ہونے والے ہیں۔''

''تمہارے لیے میں نے سوپ بنا دیا ہے حنا.....

تھوڑی دیر بعد پی لینا۔'' امی کہتے ہوئے بیڈ پر حنا کے پاس ہی آ بیٹھیں۔ ''کیا حالت بنالی ہے تم نے اپنی.....''

''امی آپ پریشان نہیں ہوں..... آپی کچھ دن یہاں رہیں گی کھائیں پئیں گی تو ٹھیک ہو جائیں گی..... ہے ناں آپی.....'' امبر نے ماں کو تسلی دینے کے ساتھ، ساتھ بہن سے بھی تصدیق چاہی تھی۔

''اچھی خاصی گرمی ہو گئی ہے اور تم نے یہ لینن کا جوڑا پہنا ہوا ہے، لان کے کپڑے نہیں خریدے کیا؟'' اب امی کی توجہ اس کے کپڑوں کی طرف گئی تھی۔

''نہیں امی.....'' حنا کے لہجے میں نقاہت اور اداسی گھل مل گئی تھی۔ ''میں کہاں جاتی ہوں بازار.....''

''امبر تم ایسا کرو..... فلک کے ساتھ بازار جاؤ، چار، پانچ اچھے سے جوڑے لے کر آؤ میری بیٹی کے لیے اور یاد رہے ہلکے رنگ مت لینا۔ کھلتے ہوئے شوخ رنگ ہوں..... پیسے میری الماری میں سے نکال لو بلکہ ایسا کرو.....'' امبر کو ہدایت دیتے ہوئے امی کو خیال آیا۔

''پہلے کچن میں سے فروٹ کی باسکٹ لا کر مجھے دو۔''

امبر اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔

''یہ لو کب سے چیخ رہا ہے۔'' فلک اس کا موبائل اٹھائے اس کے پیچھے کچن میں آئی تھی۔ امبر نے دیکھا۔ معاذ تھا۔

''کون ہے یہ معاذ؟'' فلک نے پوچھا۔

''فرینڈ ہے۔'' امبر کے لہجے میں بے پروائی تھی۔

''تو تم باز نہیں آئیں۔''

''ارے کچھ نہیں کر رہی میں، صرف گپ شپ ہے اور بس، تم تیار ہو جاؤ شاپنگ کے لیے جانا ہے۔'' وہ پھلوں کی ٹوکری اٹھائے کچن سے نکل گئی۔

☆☆☆

حنا کچھ دن آرام کر کے واپس اپنے گھر چلی گئی تھی۔ امبر کے فائنل ایگزامز ہو چکے تھے۔ فلک حسبِ معمول دن رات اپنی پڑھائی میں جتی ہوئی تھی۔ امی کی اب دو ہی کوششیں تھیں ایک امبر گھر داری سنبھال لے اور دوسرے اس کا کسی اچھی جگہ رشتہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں گھر میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔

''اب اس معاذ نام کے ایڈونچر کو بھی ختم ہو جانا چاہیے۔'' امبر موبائل ہاتھ میں لیے سوچ رہی تھی۔ امی نے اس کے ہاتھ میں موبائل دیکھا تو انہیں غصہ آ گیا۔

''خدا کے لیے امبر..... اس موبائل کا پیچھا چھوڑ کے کسی وقت کچن میں بھی جھانک لیا کرو۔'' انہوں نے اسے لتاڑا تھا۔

''امی ساری عمر کچن میں ہی گزارنی ہے، کچھ دن تو مجھے سکون سے رہنے دیں۔'' امبر نے صاف جواب دیا۔

''تمہاری عمر میں حنا نے سارا گھر سنبھالا ہوا تھا اور ایک تم ہو، پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتیں۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھیں۔

''آپی کو دیکھ کر ہی تو نصیحت پکڑی ہے میں نے۔'' اس نے معاذ کا نمبر پریس کیا۔

''زہے نصیب..... میں تمہیں ہی یاد کر رہا تھا۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔

''آفس میں بیٹھ کر بھی مجھے ہی یاد کرتے ہو؟'' امبر کے لہجے میں اتراہٹ آ گئی۔

''آہ ہا.....

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا''

معاذ نے آہ بھر کے شعر پڑھا۔

''کیا سوچتے رہتے ہو میرے بارے میں؟''

''اونہوں..... ابھی بتایا تو تم ناراض ہو جاؤ گی، شادی کے بعد بتاؤں گا۔'' وہ ہنسا۔

''معاذ..... اسی بارے میں مجھے تم سے بات کرنی تھی۔''

''کیا..... شادی کے بارے میں؟''

''ہوں.....''

''تو یار بھیجتا ہوں ناں اپنے پیرنٹس کو تمہارے گھر اس سلسلے میں..... کیا خیال ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' امبر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

Digitized by Google

''کیوں.....؟'' معاذ چونکا۔

''تمہارا مسلک دوسرا ہے۔'' وہ ذرا جھجک کر بولی۔

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم بھی مسلمان ہو اور میں بھی۔'' معاذ نے جیسے کان پر سے مکھی اڑائی۔

''میری فیملی میں ذات سے باہر شادی نہیں کی جاتی اور تمہاری ذات اور مسلک دونوں مختلف ہیں۔'' امبر نے وضاحت کی۔

''تو یہ بات تمہیں پہلے نہیں پتا تھی۔'' معاذ کا لہجہ تلخ ہوا۔

''پتا تھی۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''تو پھر تم نے مجھے خواب کیوں دکھائے جب انکار ہی کرنا تھا تو۔''

''میں انکار نہیں کر رہی معاذ۔''

''تو اور انکار کیا ہوتا ہے۔'' معاذ کا لہجہ ہنوز تلخ تھا۔

''اور دوسری بات یہ ہے کہ خواب میں نے تمہیں نہیں دکھائے۔ تم نے مجھے دکھائے ہیں۔''

''دیکھو امبر.....لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' معاذ نے کہا۔ ''تم مجھے بس اتنا بتاؤ کیا تم نے مجھ سے فلرٹ کیا ہے؟''

''نہیں.....'' امبر دھیمی پڑ گئی۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے، میں اپنے گھر والوں سے بات کر کے رشتہ لاتا ہوں تمہارے گھر.....'' اس نے فون بند کر دیا تھا۔

امبر نے گہری سانس لے کر فون کو دیکھا۔ وہ کمبل کو چھوڑنا چاہتی تھی لیکن اب کمبل اس سے لپٹ گیا تھا۔

☆☆☆

''چٹا گٹر بیرے تے.....کاسنی دوپٹے والیے، منڈا عاشق تیرے تے.....'' فلک تالیاں بجاتے ہوئے اور لہراتے ہوئے امبر کے گرد گھوم رہی تھی۔

''کیا کر رہی ہو فلک.....؟'' امبر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ساڈا چڑیاں دا چنبہ وے بابل اساں اڈ جاناں.....ساڈی لمبی اڈاری وے، بابل اساں اڈ جاناں.....'' فلک نے تان بدلی تھی۔

''پڑھ پڑھ کر دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا.....'' امبر نے کہا اور اسے پکڑ کر بٹھا دیا۔

''کم از کم یہ گھومنا تو بند کرو.....''

''میڈم تیاری پکڑیں سسرال جانے کی۔'' فلک نے شرارت سے آنکھیں نچائیں۔

''ابو کے دوست نے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے آپ کے رشتے کی بات کی ہے۔ امی، ابو دونوں کو یہ رشتہ بہت پسند ہے۔ کل آ رہے ہیں وہ لوگ آپ کو دیکھنے۔ اگر آپ انہیں پسند آ جاتی ہیں تو ہماری طرف سے ہاں سمجھیں۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوگا۔''

''اچھا.....'' امبر چپ ہو گئی۔

''کیا ہوا.....تم خوش نہیں ہوئیں؟'' فلک نے پوچھا۔

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔'' امبر نے کہا۔

''بس کچھ زیادہ جلدی نہیں ہو رہا یہ سب۔''

''جلدی؟'' فلک نے حیرت سے کہا۔ ''بی بی تم ماسٹرز کر چکی ہو اور ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو فضول میں بٹھانے کا رواج نہیں ہے۔''

اسی وقت امبر کا سیل فون بجا۔

''اور پلیز اب تم یہ اپنے احمقانہ ایڈونچرز بند کرو.....'' فلک منہ بنا کر اٹھ گئی۔

''فلک تم کچھ زیادہ ہی اماں نہیں بنتی جا رہی ہو۔'' اس نے چڑ کر کہا اور فون لے کر باہر نکل گئی۔ اس کا رخ چھت کی طرف تھا۔

''ہاں معاذ کیسے ہو؟'' سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے فون اٹینڈ کیا۔

وہ خود اس قصے کو ختم کرنا چاہتی تھی لیکن طریقے سلیقے سے۔ اب ایک دم کیسے منہ موڑ لیتی۔

''ٹھیک نہیں ہوں امبر.....'' معاذ کی آواز بجھی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا؟'' وہ چھت پر پڑی واحد کرسی پر بیٹھ گئی۔ جاتی دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ منڈیروں پر کھڑی تھی۔ ہوا تقریباً بند تھی۔

''وہی ہماری سوسائٹی کے پرابلمز.....

مرضی ہم لبرل بن جائیں۔ ذات، برادری، مسلک گھومنا ہم نے انہی دائروں میں ہے۔'' وہ اچھا خاصا دلبرداشتہ تھا۔

''اس کا مطلب ہے، تمہارے پیرنٹس نے انکار کر دیا ہے۔'' امبر نے پوچھا۔

''ہاں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم جانتی ہو ناں یہ ماں، باپ ان کی ناراضی چند دن سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں، کچھ دنوں میں ان کا غصہ اتر جائے گا ایکسیپٹ کر لیں گے سب کچھ۔'' معاذ سب کچھ خود سے ہی طے کیے بیٹھا تھا۔

''یہ سب کچھ تم اپنے پیرنٹس کے بارے میں کہہ رہے ہو معاذ.....'' امبر کے چہرے پر حدت سے پسینہ آنے لگا۔ ''کیونکہ تم ایک لڑکے ہو، میرے والدین تو ایسی کسی بات کے تصور سے ہی مر جائیں گے اور میں اتنی خود غرض نہیں ہوں کہ اپنی خوشی کی خاطر انہیں بدنامی کے گہرے گڑھے میں دھکیل دوں۔''

''تو پھر کیا حل ہے اس مسئلے کا؟'' معاذ نے پوچھا۔

''وہی جو سامنے نظر آ رہا ہے اور جس سے تم آنکھیں چرا رہے ہو، ہمیں یہ سب ختم کرنا ہوگا۔'' امبر نے دوپٹے سے چہرے پر آیا پسینہ صاف کیا۔

''یہ ممکن نہیں ہے، میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔'' معاذ کی آواز بلند ہو گئی تھی۔

''لیکن میں اب مزید تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔'' امبر نے بالآخر دوٹوک جواب دیا۔ ''ویسے بھی کل شام کو میرے رشتے کے لیے کچھ لوگ آ رہے ہیں۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' معاذ تلخی سے ہنسا.....

''تم رستہ بدل رہی ہو۔''

''یہی بہتر ہے ہمارے لیے.....'' امبر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''تم بھی کسی اچھی لڑکی کو دیکھ کر شادی کر لو.....بھول جاؤ گے کچھ عرصے میں مجھے۔''

''تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ مجھے دھوکا دے کر تم شادی کر لو گی اور خوش رہو گی۔'' وہ امبر کی بات پر توجہ دیے بغیر بولا۔

''تو کیا تم مجھے بلیک میل کرو گے؟'' امبر کا دل زور سے دھڑکا۔

''اتنا گھٹیا نہیں ہوں میں۔'' معاذ کے لہجے میں ناراضی تھی۔

امبر نے سکون کی سانس لی۔

''لیکن تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔'' وہ مزید کہہ رہا تھا۔

''تم کل ان رشتے والوں کے سامنے نہیں جاؤ گی۔''

''کیا مطلب.....؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔''

''دیکھو امبر.....'' معاذ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''میں کوئی حل نکالتا ہوں لیکن تم مجھے تھوڑا ٹائم تو دو.....''

''تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو۔'' امبر جھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ چھت پر بہت گرمی تھی۔ ''اب ہمیں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ دینا چاہیے یہی ہم دونوں کے لیے بہتر ہے۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' معاذ کے لہجے میں مجنونانہ شدت تھی۔ ''میں نہیں رہ سکتا تمہارے بغیر۔ مر جاؤں گا میں اگر تم مجھے نہیں ملیں تو.....خودکشی کر لوں گا پھر میری لاش پر تم اپنی خوشیوں کے شادیانے بجوانا۔'' اس نے فون بند کر دیا۔ امبر سر پکڑ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

آج موسم بہت اچھا تھا۔ صبح سے ہی آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ فلک، امی کے ساتھ کچن میں بزی تھی اور امبر، معاذ کے ساتھ فون پر.....

''دیکھو امبر تم ان کے سامنے نہیں جاؤ گی۔'' معاذ کی وہی کل والی رٹ تھی۔

''ضروری تو نہیں ہے کہ وہ مجھے پسند ہی کر لیں۔ جانے دو مجھے کچھ نہیں ہوتا۔'' امبر چاہتے ہوئے بھی بے مروتی نہیں دکھا پا رہی تھی۔

''یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ تمہیں کوئی پسند نہ کرے۔'' معاذ نے پُریقین لہجے میں کہا۔ یہی باتیں تھیں جن پر کسی زمانے میں امبر بہت خوش ہوتی تھی

Digitized by Google

لیکن اب خوش ہونے کا وقت تھا نہ موقع.....

''امبر تم تیار نہیں ہوئیں اب تک.....'' فلک بولتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی اور پھر اسے فون پر بزی دیکھ کر سر پیٹ کر رہ گئی۔

''بند کرو اسے.....'' وہ اب اس کے سر پر کھڑے ہو کر آرڈر دے رہی تھی۔

''اچھا معاذ ابھی تھوڑی دیر میں بات کرتی ہوں میں۔'' امبر نے فون بند کر کے رکھ دیا۔

فلک پٹی اور وارڈ روب کھول کر اس میں سے ریڈ اور بلو امبر انڈڈ جوڑا نکال کر بیڈ پر رکھا۔ اسی دوران سیل فون کی بیل بجنا شروع ہو گئی تھی۔ فلک نے اسے اٹھ کر آف کر دیا۔

''مہمان ویٹ کر رہے ہیں، چائے تیار ہے، تم جلدی سے ریڈی ہو کر آ جاؤ۔'' وہ باہر جاتے ہوئے پلٹی۔ ''اور ہاں موبائل دوبارہ آن مت کرنا۔''

امبر جب تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں پہنچی تو وہاں کا ماحول کافی خوشگوار تھا۔ ابو کے دوست عدنان انکل کی چھوٹی سی فیملی تھی۔ انکل، آنٹی اور ان کا اکلوتا بیٹا شعیب..... وہ تینوں کافی بے تکلف اور ہنس مکھ طبیعت کے مالک تھے۔ شعیب اچھا خاصا ہینڈسم لڑکا تھا۔ امبر کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کی اتنی واضح چمک ابھری تھی جسے وہاں پر موجود ہر فرد نے ہی دیکھ لیا تھا۔ ماحول میں مزید گرمجوشی آ گئی تھی۔

''چائے بہت زبردست بنی ہے۔'' انکل عدنان نے چائے کا سپ لیتے ہوئے تعریف کی۔ ''امبر بیٹا آپ نے بنائی ہے؟''

''نہیں انکل.....'' امبر جھینپ گئی۔ ''یہ تو فلک نے بنائی ہے۔'' انکل نے قہقہہ لگایا۔ ''اگر تمہیں چائے نہیں بھی بنانی آتی ناں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ شعیب بہت اچھی چائے بناتا ہے۔''

''ابو اب آپ مجھے پھنسا دیں۔'' شعیب ہنسا۔

''پھنس تو آپ رہے ہیں بیٹا جی۔'' انکل نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ انہیں شاید بات، بات پر قہقہہ لگانے کی عادت تھی اور یہ قہقہہ بذاتِ خود اتنا مزے دار ہوتا تھا کہ محفل میں موجود حاضرین خواہ مخواہ ہی ہنس پڑتے تھے۔

شعیب نے مسکراتے ہوئے امبر کو دیکھا تھا جو بلش کر رہی تھی۔

''بہن شادی ہم نے جلدی کرنی ہے۔ میں اکیلے رہ، رہ کر تنگ آ گئی ہوں۔'' آنٹی نے امی سے کہا۔

''سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہو گا بھابی..... آپ فکر مت کریں۔'' امی کے بجائے ابو نے انہیں تسلی دی تھی۔

''ہاں، ہاں بیگم، امتیاز اپنا ہی بندہ ہے۔'' انکل نے ابو کا شانہ تھپتھپایا۔

''آنٹی اب آپ لوگ رات کا کھانا کھا کر جائیں گے۔'' فلک کو وہ لوگ کچھ زیادہ ہی پسند آ گئے تھے۔

''بنائے گا کون..... ہماری بہو.....؟'' آنٹی نے مسکرا کر امبر کو دیکھا۔

''جی نہیں.....'' فلک مسکرائی۔ ''میں اور امی..... آپ کی بہو صرف سلاد بنائیں گی۔ اور پانی رکھیں گی۔''

''فلک.....'' امبر تقریباً چیخی تھی۔ امی نے تنبیہی نظروں سے فلک کو دیکھا۔

''ویل سیڈ..... ویل سیڈ.....'' عدنان انکل نے فلک کو شاباش دی پھر امبر کے خجل چہرے کو دیکھ کر بولے۔ ''فکر کی کوئی بات نہیں بیٹا..... ہمارے ہاں کک ہے۔ میں بھی بہت اچھا کھانا بنا لیتا ہوں۔ شعیب کو بھی سکھا لیں گے۔''

''ابو.....'' شعیب نے احتجاج کیا۔

سب ایک دفعہ پھر ہنس پڑے تھے۔

رات کو جب وہ لوگ واپس آ گئے تو رشتہ پکا اور منگنی کی ڈیٹ فکس ہو چکی تھی۔

''قسم سے امبر تم بہت لکی ہو ماشاء اللہ.....'' کمرے میں پہنچ کر فلک نے امبر سے کہا۔ امبر خود بھی بے حد خوش تھی۔ شعیب اس کی توقع سے بھی بڑھ کر اچھا تھا۔ اس نے بیڈ پر پڑا موبائل اٹھایا جو ابھی تک آف تھا۔

''میں تو سونے لگی ہوں۔ تمہارے رشتے داروں کی خاطر تواضع کر کر کے تھک گئی ہوں۔'' وہ بیڈ پر دراز ہو گئی پھر اس کی طرف دیکھا۔ ''اور پلیز امبر اپنے چمکتے ہوئے بخت پر لات مت مارو..... سمجھ رہی ہو ناں میری بات.....'' امبر نے اثبات میں سر ہلا کر فون آن کیا..... فوراً ہی بیل بجنے لگی۔ معاذ کا لنگ یعنی اتنی دیر سے وہ مسلسل ٹرائی کر رہا تھا۔

امبر نے کن انکھیوں سے فلک کی پشت کو دیکھتے ہوئے فون اٹینڈ کیا۔

''کہاں تھیں تم؟'' معاذ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا تھا۔

''پلیز معاذ آرام سے بات کرو۔'' امبر نے ناگواری سے کہا۔

''ہاں اب تو تمہیں میرا سب کچھ برا لگے گا۔ کوئی اور جو پسند آ گیا ہے۔'' اس نے دانت کچکچا کر کہا۔

''اب میں تمہاری اس بات کا کیا جواب دوں.....'' امبر جی بھر کے بیزار ہو چکی تھی۔

''تم مجھے صرف ایک بات کا جواب دو..... تم مجھ سے شادی کرو گی یا نہیں.....؟'' معاذ نے دو ٹوک انداز میں پوچھا۔

''میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ معاذ یہ ممکن نہیں ہے۔'' امبر نے اپنے جواب کو شوگر کوٹڈ کرنے کی کوشش کی۔

''میں جانتا تھا تمہارا جواب یہی ہو گا کیونکہ محبت میں نے تم سے کی ہے۔ تم نے مجھ سے نہیں کی۔''

امبر خاموش رہی۔

''تم جانتی ہو، اس وقت میرے ہاتھ میں کیا ہے۔''

''کیا.....؟''

''سلیپنگ پلز کی پوری شیشی.....''

''کیا مطلب؟'' امبر چونکی۔

''ہم وفادار لوگ ہیں امبر بی بی۔'' معاذ کا لہجہ طنزیہ تھا۔ یقیناً پانچ چھ گھنٹے فون آف رہنے کی وجہ سے وہ بری طرح ہرٹ ہوا تھا۔ ''اگر تم نہیں تو یہ زندگی بھی نہیں.....''

غزل

اداسیوں کا یہ موسم بدل بھی سکتا تھا
وہ چاہتا تو میرے ساتھ چل بھی سکتا تھا

وہ شخص تو نے جسے چھوڑنے میں جلدی کی
تیرے مزاج کے سانچے میں ڈھل بھی سکتا تھا

وہ جلد باز خفا ہو کے چل دیا ورنہ
تنازعات کا کچھ حل نکل بھی سکتا تھا

انا نے ہاتھ اٹھانے نہیں دیا ورنہ
میری دعا سے وہ پتھر پگھل بھی سکتا تھا

تمام عمر تیرا منتظر رہا محسن
یہ اور بات کہ رستہ بدل بھی سکتا تھا

شاعر: محسن نقوی
پسند: حمیرا وحید، واہ کینٹ

غزل

جس قدر ہوگا پرانا ہے نکھرنے والا
زخم جو دل پہ لگا ہے نہیں بھرنے والا

پھر تیری یاد جنازوں کو لیے آتی ہے
پھر تیرا سوگ میرے گھر ہے بکھرنے والا

وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے مشکل میں
اس کو معلوم ہے سب، میں نہیں ڈرنے والا

موت اک بچھڑی ہوئی شام ہے آنے والی
زندگی ریت کا دریا ہے اترنے والا

ایسے لگتا ہے زمانے کی نگاہوں سے مجھے
کوئی الزام میرے سر پہ ہے دھرنے والا

شاعر: فرحت عباس شاہ
مرسلہ: ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ

Digitized by Google

''معاذ تم کوئی فضول حرکت نہیں کرو گے.....''
امبر نے اسے وارن کیا۔
''فضول حرکت تو میں نے ایک ہی کی ہے پوری زندگی میں اور وہ تم سے محبت کرنا تھا لیکن اب اس غلطی کا کوئی مداوا نہیں ہے کیونکہ میری محبت میں کوئی فریب نہیں تھا۔ کوئی کھوٹ کوئی ملاوٹ نہیں تھی۔''
معاذ کی آواز رندھ گئی۔
''زندگی بہت خوب صورت ہے پلیز اسے ضائع مت کرو..... دیکھنا تمہیں مجھ سے کہیں زیادہ اچھی لڑکی ملے گی۔'' امبر نے اسے سمجھایا۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔ وہ متوحش ہوگئی۔
''کیا کر رہے ہو تم؟''
''میں نے ساری گولیاں کھالی ہیں۔'' اس کی آواز آئی۔
''یہ کیا، کیا ہے تم نے.....'' امبر چلائی..... ''اٹھو اور ڈاکٹر کے پاس جاؤ.....''
''تم صرف ایک فیور کرو..... فون بند مت کرنا..... مجھ سے باتیں کرتی رہو..... ویسے بھی یہ میری آخری کال ہے، میں تمہاری آواز سنتے ہوئے مرنا چاہتا ہوں۔''
''معاذ تم ڈاکٹر کے پاس جاؤ یا اپنے گھر والوں کو بلاؤ..... پلیز جلدی کرو.....'' امبر روہانسی ہوگئی۔
دوسری طرف خاموشی تھی۔
''معاذ.....'' امبر نے پکارا۔
''مجھے بہت اچھی اور گہری نیند آرہی ہے امبر.....''
معاذ کی آواز دھیمی اور پرسکون تھی۔
امبر سر پکڑ کر رہ گئی۔
''معاذ تم جانتے ہو میرے پاس تمہارے گھر کا کوئی نمبر نہیں ہے میں کیسے ان سے کہوں کہ وہ تمہیں اسپتال لے جائیں پلیز تم کسی کو بلاؤ۔ پلیز معاذ.....'' فون خاموش تھا..... وہ روہانسی ہو کر آواز دیتی رہی۔
''کیا ہے امبر.....؟ کیوں شور کر رہی ہو۔''
فلک نے پلٹ کر مندی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔
''معاذ.....'' امبر نے اسے کوئی جواب دیے بغیر پھر معاذ کو پکارا۔
فلک نے اس کی متوحش شکل دیکھی اور اٹھ کر اس کے ہاتھ سے موبائل لے لیا۔
''ہیلو.....'' وہ فون کان سے لگا کر کہہ رہی تھی دوسری طرف خاموشی تھی۔ فلک نے فون بند کر دیا۔
''تم نے فون کیوں بند کر دیا؟'' امبر جھنجلائی اور دوبارہ معاذ کا نمبر ڈائل کیا۔
''ہوا کیا ہے؟''
''معاذ نے خودکشی کر لی ہے۔'' امبر دور بجتی بیل کی ٹوں ٹوں سن رہی تھی۔
''کیوں؟'' فلک نے اگلا سوال کیا۔
''بہتر ہے کہ تم سو جاؤ.....'' امبر نے چڑ کر کہا۔
''اوکے.....'' فلک واقعی کروٹ بدل کر سو گئی تھی۔
ساری رات امبر، معاذ کو فون کرتی رہی۔ اس کے فون اٹینڈ کرنے کی، اس کے زندہ بچ جانے کی دعائیں مانگتی رہی لیکن اس نے فون اٹینڈ کیا نہ کسی اور نے ہی اس کا فون اٹینڈ کر کے کوئی اطلاع دی۔
فلک صبح نماز کے لیے اٹھی تو امبر کو روتے اور فون کرتے دیکھا۔
''موبائل ادھر دو مجھے.....'' فلک نے افسوس سے اسے دیکھتے ہوئے موبائل اس سے مانگا تھا۔ امبر نے خاموشی سے اپنا فون اسے تھما دیا۔ فلک نے فون میں سے معاذ کا ٹیکسٹ نمبر اور اس کے میسجز ڈیلیٹ کیے اور فون اسے واپس کر دیا۔
''یہ کیا، کیا ہے تم نے؟''
''جب تک تمہارے پاس اس کا نمبر رہتا تم اسے فون کرتے رہتا۔ اب پلیز اپنی زندگی میں سے بھی اس پورے قصے کو ڈیلیٹ کر دو ابھی کے ابھی.....''
فلک نے ہال سمیٹ کر پونی بنائی۔
''فلک اس نے خودکشی کر لی ہے۔'' امبر کی آواز بھرا گئی تھی۔

''سوواٹ.....؟'' فلک نے اسے گھورا۔ ''اس کی اپنی زندگی تھی۔ اس کو پورا اختیار تھا کہ وہ اپنی زندگی کے ساتھ جو چاہے کرے..... تم اس چیپٹر کو اب ہمیشہ کے لیے بند کر دو..... اس سنڈے کو تمہاری منگنی ہے اور آج ہم نے پارلر جانا ہے تاکہ تمہاری شکل کی نحوست کچھ کم ہو.....'' وہ اٹھ کر باتھ روم میں گھس گئی تھی۔

☆☆☆

وقت بہت بے مروت ہے، کسی کے آنسو صاف کرنے کے لیے تھمتا ہے نہ کسی کی خوشی میں شرکت کے لیے رکتا ہے۔ اس کے پاؤں میں سفر ہے اور دل میں پتھر.....

امبر کی شادی ہوگئی۔ شعیب بہت اچھا ہم سفر ثابت ہوا تھا۔ آفس سے آنے کے بعد وہ سارا وقت اسے کمپنی دیتا۔ اس کی تعریفیں کرتا، محبت کا اظہار کرتا۔ کبھی شاپنگ کرانے کے لیے لے جاتا تو کبھی باہر کھانا کھلانے۔ وہ سب چیزیں جن کی اس نے خواہش کی تھی قدرت نے پلیٹ میں رکھ کر اس کے حوالے کر دی تھیں۔ اسے اپنی قسمت پر رشک آتا تھا۔ وہ خوش ہونا چاہتی تھی۔ اپنی لائف کو انجوائے کرنا چاہتی تھی لیکن ایک کانٹا تھا جو اس کے حلق میں پھنسا تھا، اگلا جاتا تھا نہ نگلا..... اس کانٹے نے اس کے سکون میں خلل ڈال رکھا تھا، اس کی خوشیوں کی مٹھاس میں کڑواہٹ بھر دی تھی۔ اس کی حالت شوگر کے اس مریض جیسی تھی جس کے سامنے اس کی من پسند مٹھائیوں سے پوری ٹیبل سجی تھی لیکن وہ اس میں سے کچھ بھی کھا نہیں سکتا تھا۔ وہ اس ونر کی طرح تھی جو اپنی انعامی رقم پہلے ہی چوری کر کے کھا پی چکا ہو اور اب جانتا ہو کہ جو انعامی رقم کا لفافہ اسے پیش کیا جا رہا ہے وہ اندر سے خالی ہے۔
جب شعیب کہتا۔ ''جان تم میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہو۔'' تو اس کی نگاہیں جھک جاتی تھیں۔
''تمہاری لائف میں مجھ سے پہلے کوئی آیا تو نہیں ناں.....؟'' وہ تسلی چاہتا تو اس کا جی چاہتا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔
اس نے اپنے کانوں کو ایک غیر مرد کی دل لبھانے والی گفتگو سے آلودہ کیا تھا۔ اپنی راتیں اس کی بیہودہ باتوں سے لطف اندوز ہونے میں ضائع کی تھیں۔ اس نے اپنے جذبوں میں ملاوٹ کی تھی، اپنی زندگی میں کھوٹ شامل کیا تھا۔ اور اب وہ ایک سچے اور کھرے انسان کو دھوکے میں رکھ کر ایک اور گناہ کی مرتکب ہو رہی تھی۔ ایک عدالت تھی جو ہر روز لگتی۔ دماغ ایک کے بعد ایک الزام عائد کرتا، دل صفائی پیش کرنے کی کوشش کرتا تو ضمیر نام کا جج آرڈر، آرڈر کہہ کر زور، زور سے ہتھوڑے برساتا۔ اس کا سر دکھنا شروع ہو جاتا، انسان دوسروں سے بھاگ سکتا ہے لیکن خود سے بھاگ کر کہاں جائے۔
کاش وہ اپنی زندگی میں کسی غیر مرد کی پرچھائیں بھی نہ پڑنے دیتی کاش وہ اپنی سماعت کو اپنی بصارت کو پاک رکھتی تو آج فخر سے سر اٹھا کر جیتی..... پچھتاوا..... پچھتاوا..... پچھتاوا..... ہر طرف پچھتاوا تھا۔ رات کی تاریکی کے مانند سیاہ، پھنکارتے ناگ کے مانند زہریلا..... وہ شعیب کی محبت کو شرمساری کے ساتھ قبول کرتی تھی۔ وہ گناہ گار تھی اور شاید قاتل بھی۔ کوئی غلطی ایسی نہیں تھی جس کا مداوا ہو سکتا۔ بے حسی ہی واحد علاج تھا جو اس کو میسر نہ تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں ناشتا کر رہے تھے۔ شعیب تر و تازہ نک سک سے تیار تھا جبکہ امبر ہنوز سلیپنگ سوٹ میں تھی۔
''تم شام کو جتنی حسین ہوتی ہو صبح اس سے زیادہ نظر آتی ہو، کیا راز ہے اس میں۔'' شعیب کی مسکراتی نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔
''اچھا اب صبح، صبح مکھن مت لگائیں۔'' امبر نے اپنے ڈھیلے ہوتے بالوں کو دوبارہ جوڑے کی شکل میں لپیٹا اور بولی۔
''لیکن تم تو لگا دو۔''
''کیا.....؟''
''مکھن..... بریڈ پر.....'' شعیب نے مسکرا کر بریڈ

Digitized by Google

کی طرف اشارہ کیا۔ امبر نے مکھن لگا کر سلائس اس کو تھمایا۔
''شام کو تیار رہنا۔ کھانا باہر کھائیں گے۔'' ناشتا ختم کر کے وہ بولا تھا۔ ''اِدھر آؤ میرے ساتھ۔''
وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ہولی۔ وہ اب اپنے کمرے میں اس کی وارڈ روب کھولے کھڑا تھا۔ سارے کپڑوں کا جائزہ لے کر بالآخر اس نے ایک ریڈ بارڈر کی بلیک ساڑی نکالی۔
''یہ پہننا تم اور لپ اسٹک ریڈ لگانا۔''
''اور کوئی حکم......؟'' امبر مسکرائی۔
''ظالم نظروں سے تم نہ مجھ کو دیکھو...... مرجاؤں گا او جانِ جاناں مرجاؤں گا۔'' وہ گنگناتے ہوئے اس کی طرف جھکا۔
''چلیں آفس جائیں، دیر ہورہی ہے۔'' امبر نے ہنستے ہوئے اسے باہر کی طرف دھکیلا تھا۔

☆☆☆

فضا میں خنکی تھی۔ گلاس وال کے باہر روشنیاں چمک رہی تھیں۔ امبر مینیو کارڈ دیکھ رہی تھی۔ بلیک ساڑی اس پر خوب سج رہی تھی۔ شعیب شاید واش روم گیا تھا۔ ڈشز منتخب کرتے ہوئے امبر نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ ریسٹورنٹ بھرا ہوا تھا۔ اس کی نگاہ مختلف لوگوں کا جائزہ لیتے ہوئے سامنے والی ٹیبل پر رک گئی۔ وہاں چار لوگ بیٹھے تھے اور ان میں سے ایک معاذ تھا۔ اس کے بالکل سامنے بیٹھا ہوا بلاشبہ وہ معاذ ہی تھا۔ اس نے پلکیں جھپکا کر غور سے دیکھا۔ فریش، چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ خوش باش معاذ کے چہرے پر گئے وقت کی کوئی پرچھائیں نہیں تھی۔ اسی پل معاذ کی نظر اس پر پڑی تھی۔ وہ کچھ دیر یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ امبر کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ اٹھ کر اسی کی طرف آرہا تھا۔ امبر نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ شعیب کا کہیں کوئی پتا نہیں تھا۔
''ہیلو......'' اب وہ اس کے سامنے کھڑا مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔
امبر ساکت بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔
معاذ نے کرسی کھینچی اور اس پر بیٹھ گیا۔
''تم پہلے سے زیادہ حسین ہوگئی ہو۔''
''تو تم زندہ ہو؟'' بالآخر امبر کے لبوں سے نکلا۔
معاذ کا قہقہہ بلند اور بے ساختہ تھا۔ ''تو کیا چاہتی تھیں کہ میں مرجاؤں۔'' وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''کیا میں تمہیں شکل سے بے وقوف نظر آتا ہوں؟''
''تو وہ سب ایک ڈراما تھا۔'' امبر نے سمجھ کر سر ہلایا۔ ''مجھے گلٹ میں مبتلا کرنے کے لیے۔''
''نہیں میری جان...... میں نے سچ میں تم سے محبت کی ہے۔'' معاذ نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔
''ایکسکیوز می......!'' شعیب کی آواز پر امبر نے گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچا...... معاذ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے یہ بیہودہ حرکت یقیناً شعیب کو اس کی طرف آتے دیکھ کر کی تھی۔ امبر کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔
''آپ کی تعریف......؟'' شعیب، معاذ سے پوچھ رہا تھا۔ امبر نے ڈرتے، ڈرتے اس کی شکل دیکھی۔ اس کی رنگت سرخی مائل ہورہی تھی اور وہ غیر معمولی حد تک سنجیدہ تھا۔
''میں معاذ ہوں، امبر کا یونیورسٹی فیلو اور کافی عزیز دوست۔ امبر نے ذکر تو کیا ہی ہوگا میرا......'' معاذ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ شعیب نے اس کا ہاتھ نظر انداز کر کے ٹیبل پر پڑی کار کی چابیاں اٹھائیں اور قہر بھری نظروں سے امبر کو دیکھتے ہوئے قدم باہر کی طرف بڑھا دیے۔ لرزتے قدموں کے ساتھ امبر اس کے پیچھے تھی۔ وہ کانٹا جو کافی عرصے سے اس کے حلق میں پھنسا تھا اب وہاں سے نکل کر اس کے دل میں پیوست ہو چکا تھا۔ وہ اچھی طرح جان گئی تھی کہ زندگی میں کیا جانے والا واحد ایڈونچر پوری زندگی کے لیے اس کے گلے پڑ چکا تھا۔

سوداگری

سیما رضا ردا

''کپڑے لائی بی بی جی؟''
گاڑی جیسے ہی سگنل پر رکی، یک دم ہرنی کی طرح جانے کہاں سے پکے رنگ والی دبلی دانتوں کو چمکائے تیزی سے میری طرف بڑھی اور اپنا آدھا سر کھڑکی کے شیشے میں ڈال کر گول، گول آنکھیں گھمانے لگی۔
اس کا کئی دنوں کا یہ سوال آج بھی سن کر میں شرمندہ سی ہوگئی اور اپنی اس کوتاہی پہ غصہ آنے لگا۔
''اوہ، معاف کرنا دراصل آج میں بہت جلدی میں تھی دیر ہوگئی کوئی بات نہیں دو چار روز میں لے آؤں گی۔'' میں نے وضاحت دی۔
''بس رہنے دو بی بی آپ یہی کرتی ہو۔ ایمان سے گاڑی میں آتی ہے گاڑی میں جاتی ہے۔ سوٹ نہیں رکھ سکتی بھلا چھ، سات سوٹ نہیں رکھ سکتی کچھ میرے لیے کچھ میری لڑکی کے لیے۔''

Digitized by Google

سگنل کسی بھی لمحے کھلنے والا تھا۔ مگر وہ بضد تھی۔

”یہ دیکھو ناں میری قمیص بس دو دن کی ہے کیسی ختم ہو گئی ہے۔“ وہ اپنی قمیص دکھانے لگی اور میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی۔ زرد لائٹ جل گئی تھی۔

”ٹھیک ہے اب تم جاؤ اور یہ لو۔“ میں نے ڈیش بورڈ میں رکھی تھیلی سے پانچ روپے کا سکہ اسے تھمایا۔ سبز روشنی کے ساتھ ہی گاڑی حرکت میں آچکی تھی۔ میں نے جلدی سے گاڑی گیئر میں ڈالی۔

”کل کپڑوں کا تھیلا ضرور لانا میرے علاوہ کسی کو نہ دینا وہ پارو کو بالکل نہ دینا۔ میری لائن وہ فوراً کاٹتی ہے۔“ وہ چلاتے ہوئے زور سے بول رہی تھی۔ پیچھے موجود گاڑیاں مسلسل ہارن دے رہی تھیں۔ بالکل برابر سے ایک گاڑی تیزی سے گزری اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص جملہ پھینک گیا تھا۔

”بھکاریوں کو منہ لگانے کے لیے یہی جگہ ملی ہے۔“

ٹریفک کے شور میں یہ جملہ ہوا ہو گیا مگر دل پر نقش ہو گیا تھا۔ آگے جانے والی گاڑی نے سڑک کے بیچوں بیچ بلی کے معصوم سے بچے کو کچلنے میں ذرا دیر نہ لگائی کہ اگلا سگنل کسی بھی وقت بند ہو سکتا تھا۔

”کتنا بے حس ہے۔“ میں نے دل میں چھپے درد کو دباتے ہوئے سوچا۔

.....

دفتر کی فائلوں میں سر کھپاتے ہوئے بارہا دنتی کی باتیں مجھے پریشان کرتی رہیں۔ گزشتہ دو، تین مہینے سے وہ کلفٹن برج سے پہلے سگنل پر ملتی تھی لال بتی سے سبز بتی کے درمیان وہ اپنی بات بڑے آرام سے کر جاتی اور مجھے لگتا جیسے واقعی اسے دریا کو کوزے میں بند کرنا آتا ہے۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ اپنی پریشانی کا اس طرح تذکرہ کرتی کہ دل پیچ کر رہ جاتا کبھی اسے میاں کو لے کر سول اسپتال جانا ہے۔ بوڑھی ماں کی آنکھیں ٹیسٹ کروانی ہیں۔ چھوٹی کا قد چھوٹا رہ گیا ہے۔ وہ پریشان ہو کر گھر سے نکل آئی ہے۔

”بنگلوں میں جھاڑو، پوچے اور برتن دھونے کے پیسے ذرا کم ہی ملتے ہیں اس لیے باقی وقت اس سگنل پر گزار دیتی ہوں یہاں آپ جیسے دریا دل لوگ جو مل جاتے ہیں۔“ وہ سو کا نوٹ ہاتھ میں دباتے ہوئے بولی۔

دنتی باتیں بنانے کے فن سے خوب واقف تھی اس کی کوشش ہوتی تھی کہ سگنل کھلنے سے پہلے ہر گاڑی سے اسے کچھ نہ کچھ مل جائے۔ کوئی گاڑی والا اس کو ٹکا سا جواب دیتا تو وہ اپنی اوقات اس طرح دکھاتی کہ اگلے روز وہ گاڑی والا اُدھر سے گزرنا بھول جاتا۔

کیا عورت ہے...... یہ تو سیاستداں ہو سکتی تھی، کتنے آرام سے رام کرتی اور پینترا بدل کر وہ انداز دکھاتی کہ میں حیران رہ جاتی۔ دنتی کے دعائیہ کلمات بھی عجیب ہوتے۔

”ہائے بی بی جی کیا اچھا بالوں میں تو نے پھول کلپ کسا ہے۔ رب تجھے اور دے ایسا میری چھوٹی کے لیے لے آنا۔“

”ہاں لے آؤں گی۔“ میں نے کہا۔

”اور سن بی بی تیرا یہ تین رنگ کا دوپٹا بہت اچھا لاگے ہے۔ بڑی سندر لگتی ہے تو، میری بڑی کے لیے لے آنا۔“ اور پھر وہ اپنی فہرست گنوانا شروع کر دیتی۔ میں سوچتی۔

”زندگی نے اسے محرومیاں عطا کی ہیں۔ ایسی محرومیاں جو اس کی اولاد کے حصے میں آ گئی ہیں۔ ہر ماں کی طرح اس کی بھی خواہش ہے کہ اس کی اولاد اچھا کھائے، اچھا پہنے۔“

پھر یوں ہوا کہ میں دفتر کے کاموں میں ایسا الجھی کہ صبح سویرے جلدی جانا اور رات کو دیر سے گھر آنا زندگی کا جیسے معمول بن گیا تھا۔ بہت دنوں کے بعد دفتر کے بڑھتے ہوئے کاموں سے سکون ملا تو اپنے آپ کو دیکھنے کا خیال آیا۔ بچے الگ عجیب طرح کی خواہشوں میں مبتلا رہتے۔

”مما آپ کے پاس تو ہمارے لیے وقت ہی نہیں۔“ نوشی منمنا کر بولی۔

”سچی بات تو یہ نوشی کہ مما کو اپنے دفتر کی زندگی

بہت پیاری ہے اور پپا کو اپنا کاروبار۔“ چودہ سالہ سونو اپنے بالوں کو کلپ کی قید سے آزاد کرتے ہوئے بولی۔

روز بروز اس کا قد نکلتا جا رہا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور اپنی دونوں بچیوں پر بے حد پیار آیا اور اسی لمحے دنتی میری آنکھوں کے سامنے آ کھڑی ہوئی اس کی خواہشیں زبان بن کر میرے اطراف بولنے لگیں تبھی میں نے کہا۔

”نوشی اور سونو آج ایسا کرتے ہیں کہ شاپنگ کو چلتے ہیں، کھانا باہر ہی کھائیں گے۔“

”یس مما۔“ دونوں نے نعرہ لگایا اور ان کی آنکھوں میں جگنو رقص کرنے لگے۔ میرا دھیان پھر دنتی کی طرف چلا گیا۔

”چلو اچھا ہے کل اس کے مانگنے سے پہلے اس کی چیزیں دے دوں گی۔“

چھ گھنٹے شاپنگ کی نذر ہو گئے تھے۔ سونو اور نوشی نے اپنی، اپنی پسند کی کتنی ہی چیزیں لے لیں۔ وہ جس چیز کی طرف اشارہ کرتیں وہ فوراً ہی پیک ہو جاتی۔ اولاد کی خوشی میں تو والدین کی خوشی ہے۔ پھر والدین کماتے کس لیے ہیں آئس کریم پارلر سے نکلتے ہی کتنے ہی فقیر کتنے بھکاری، بھکارن ان کے بچے میری طرف لپکے۔

”مما ان لوگوں کو کوئی اور کام نہیں ہے سوائے ہاتھ پھیلانے کے۔“ سونو نے ایک بچے کو معاف کرو کہتے ہوئے کہا۔

”نہیں بیٹا، اللہ سے ڈرنا چاہیے اور اس کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے کہ اس نے ہمیں کتنا نوازا ہے اور کتنے اچھے حال میں رکھا ہے، ان لوگوں کو دیکھ کر سبق سیکھو۔ ایک، دو روپے دینے میں حرج نہیں ہے، دھتکارنے والے لہجے میں بات مت کیا کرو۔“ سونو کو پیار سے سمجھایا تو اس نے دو روپے کا سکہ بوڑھی مائی کی طرف بڑھا دیا اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر دعا دی۔

”دیکھا تم نے۔“ میں نے سونو سے کہا۔ ”نہ دیتیں تم اور بدتمیزی بھی کرتیں تو ان کا دل دکھتا اور ان کے دل سے آہ نکلتی اب تم نے یہ معمولی سکہ دیا ہے تو تمہارے لیے

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ سرگزشت

شمارہ فروری 2019ء کی جھلکیاں

آخری حصار
اس جواں مرد حکمران کا زندگی نامہ جسے اپنوں نے پیٹھ میں چھری ماری نتیجتاً برصغیر کی تاریخ بدل گئی۔

مصورِ جنوں
وہ مسلمان تھا، دنیا اس کے فن کی قدرداں تھی، اسے جادوئی انگلیوں والا کہتی لیکن اس کے ہم وطن اسے قتل کرنا چاہتے تھے۔ ناکام ہوئے تو اسے ملک سے ہی بھگا دیا۔

قیامتِ صغریٰ
یورپ کی تاریخ میں اس طرح کی تباہی پہلے کبھی نہ آئی تھی۔ وہ دن قیامت سے کم نہ تھا

زندگی کوہ گراں
وہ کالی تھی اسی لیے اس کی قسمت پر کالک لگ گئی تھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر دینے والی سچ بیانی

اس کے علاوہ
بہت سے تاریخی واقعات، سچ بیانیاں اور سچے قصے

بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں آپ خود گرویدہ ہو جائیں گے۔

Digitized by Google

اس نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی ہے، چاہے پروفیشنل انداز میں کی ہو لیکن کی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نیتوں کا جاننے والا ہے اس لیے اپنے آپ کو درست رکھنا چاہیے۔"

ان ہی باتوں میں سفر تمام ہوا۔ دونوں بچیاں بے حد خوش تھیں۔ دفتی کے لیے لی ہوئی چیزیں میں نے ایک طرف سنبھال کر رکھیں کہ صبح لے کر جانی تھیں۔

"سونو ذرا بات سنو۔" مجھے ایک دم کچھ یاد آیا۔ "جو کپڑے تم پہنتی نہیں ہو کیا ابھی نکال سکتی ہو؟"

"کیوں مما...؟" وہ حیران ہوئی۔

"بس بیٹا کسی ضرورت مند کو دینا ہے..... اگر ابھی نکال دو تو....."

"اچھا مما۔" کوئی اور وقت ہوتا تو وہ کل پر ٹال دیتی مگر آج مما نے انہیں بہت خوش کر دیا تھا اس لیے وہ انہیں خوش دیکھنا چاہتی تھی، ذرا سی دیر میں تقریباً وہ چھ، سات جوڑے نکال کر لے آئی۔

"مما کچھ سوٹ ایسے ہیں جو تھوڑے چھوٹے ہو گئے ہیں مگر صرف دو دفعہ کے پہنے ہوئے ہیں ایک کی شرٹ اتنی چھوٹی ہو گئی ہے اور آج کل انڈین اسٹائل کے سوٹ زیادہ پاپولر ہیں اس لیے آپ یہ دے دیجیے گا۔" وہ آنکھوں میں نیند لے کر بات کر رہی تھی۔

"او کے بیٹا تم سو جاؤ بہت، بہت شکریہ۔" اللہ حافظ کہہ کر وہ چلی گئی۔ "چلو اچھا ہوا کہ دفتی کے لیے اچھا خاصا سامان اکٹھا ہو گیا۔ کچھ میرے کپڑے ہو گئے ہیں۔ اتنے جوڑے کافی ہیں۔"

دو تھیلے جوڑوں کے اور چھوٹی، چھوٹی اور دوسری چیزوں کا ایک اچھا خاصا تھیلا بن گیا تھا۔ تمام چیزوں کو دیکھ کر مجھے انجانی خوشی سی ہو رہی تھی اور میں اپنے آپ کو بہت پُرسکون اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ "ٹھیک ہے ناں۔" گھٹ سے دفتی سامنے آ گئی۔

"کیا بات ہے چپکے، چپکے کیا سوچا جا رہا ہے؟" فواد جانے کب آ گئے تھے پتا ہی نہیں چلا اور میں سوچوں میں دفتی سے اس کی رائے پوچھ رہی تھی۔

"آپ کب آئے؟ آپ نے بہت انتظار کروایا۔" میں نے اپنی کیفیت بتائی۔

"ایک تو تم بہت عجیب ہو، دل رکھنے کو ہی کہہ دیتا ہوتا کہ آپ کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی وضاحت کرنے کی عادت تمہاری گئی نہیں۔" وہ مسکرا کر بولے اور ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے لگے۔ میں خاموش رہی تو فواد خود ہی بولے۔ "کیا کچھ خرید لیا؟ بچوں نے بہت انجوائے کیا ہوگا۔" اور میں شاپنگ بیگز کھول کر دکھانے لگی۔

"وہ سونو اور نوشین نے آج کافی دنوں کے بعد اپنی خواہشوں کو پورا کیا ہے۔"

"اور یہ تھیلے بھی تو دکھاؤ۔" فواد نے دفتی کے تھیلوں کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ، یہ گھر کے نہیں ہیں۔ میں آپ کو ساری بات بتاتی ہوں۔" میں نے فوراً کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ یہ شاپنگ میری نہیں ہے۔" فواد نے کہا۔

"آپ تو فواد اپنی شاپنگ میرے ساتھ ہی کرتے ہیں۔ مجھ پہ خالی کہاں اعتبار کرتے ہیں۔" میں روہانسی ہو گئی۔

"پھر وضاحت..... خدایا بیگم فریحہ فواد، کم از کم میں آپ کو چھیڑنے کا حق تو رکھتا ہوں۔" فواد نے ہلکا سا ہاتھ میرے سر پر مارا اور میں ہنس دی۔

"پتا ہے فواد کیا بات ہے۔" میں نے فواد کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔

"ایک عورت دفتی نام کی ہے جو روزانہ مجھے کلفٹن برج کے پہلے سگنل پر ملتی ہے۔ وہ بیچاری بہت غریب ہے۔ گھروں میں بھی کام کرتی ہے اور اپنے مسئلے بھی لوگوں کو بتاتی ہے کہ اس کے گھر میں بڑی پریشانی ہے اور....."

"اور اس کی پریشانی اور مسئلہ تمہارے سر پر سوار ہو گیا ہے ناں۔"

"لیکن فواد آپ اس کی باتیں سنیں تو آپ کا دل بھی پسیج جائے گا۔" مجھے لگا کہ فواد خفا ہو رہے ہیں۔

غزل

دردِ دل ہے کہ سوزِ جگر زندگی
آج کل ہے عجب پُرخطر زندگی
خوف میں ہو رہی ہے بسر زندگی
منزلیں دور ہیں راستے ہیں کٹھن
اور ہے اک مسلسل سفر زندگی
بے خطا چھین لے کون کب کس جگہ
آج کتنی ہے نامعتبر زندگی
زندہ رہنا بھی دشوار تر ہو گیا
اک قیامت ہے شام و سحر زندگی
کئی رستہ، نہ منزل، نہ مقصد کوئی
جا رہی ہے نہ جانے کدھر زندگی
اپنی مرضی سے جینا ہے مشکل بہت
ظالموں کے ہے زیرِ اثر زندگی
پوچھیے کس سے یمنیٰ بتائے گا کون
درد و غم کی ہے کیوں ہم سفر زندگی!

کلام: یمنیٰ احمد
پسند: مونا رضوان، کراچی

"دیکھو فریحہ اس طرح کی عورتیں ہر جگہ، ہر سگنل پر ہوتی ہیں اب یہ تو نہیں کہ ان کے مسئلوں کو لے کر گھر آ جاؤ، اپنے حواس پر سوار کر لو، تمہیں پتا نہیں ہے کہ یہ کس قسم کی عورتیں ہیں، جذباتی وار کرتی ہیں، بہانے، حربے جانتی ہیں۔ تم ہمدرد ہو، غمگسار ہو، جذباتی ہو، سب سے بڑھ کر بیوقوف ہو، ہر ایک کی باتوں میں آ جاتی ہو۔"

فواد کی نرمی کہیں غائب ہو گئی تھی اور غصہ اپنی حدوں کو چھو رہا تھا۔

"لیکن فواد میری بات تو سنیں۔" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"چپ رہو تم۔" وہ غصے سے بولے۔ "میری بات سنو تمہیں ہر مسئلے کو اس حد تک اپنے اعصاب پر سوار نہیں کرنا چاہیے کہ ان کی پریشانیاں انہیں چھوڑ کر تمہارا ہی گھر دیکھ لیں۔ ماضی میں بھی تم ایسی ہی حماقتیں کر چکی ہو، تمہاری جذباتی نیچر اور تمہاری خواہ مخواہ کی نیکیاں الٹا تمہیں ہی نقصان پہنچاتی ہیں۔ چلو وہ تو رشتے داری اور دوستی تک معاملہ تھا، جہاں تمہارے احسان کا تمہیں الٹا صلہ ملا۔ یہ بہت چالاک عورتیں ہوتی ہیں اگر ایک دفعہ کوئی ان کے قابو میں آ گیا ناں تو وہ پوری طرح اسے گرفت میں لے لیتی ہیں تمہیں زیادہ ہمدرد پا کر کبھی تمہیں اسپتال لے جائیں گی کبھی تمہارے گھر پہنچ جائیں گی اور دیکھنا تمہیں لوٹنے میں زیادہ دیر نہیں لگائیں گی۔" فواد نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی تھی جسے سن کر میں خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"میں نے فواد اس کے لیے یہ چیزیں اور یہ پرانے جوڑے رکھ لیے تھے، اب ان کا کیا ہوگا؟"

"ان کا یہ ہوگا کہ کل آپ آخری بار اسے یہ تمام چیزیں دے کر آئیں گی اور اس طرح کے غم آئندہ نہیں پالیں گی۔ یہ میری آخری وارننگ بلکہ حکم ہے۔" وہ سختی سے بولے اور بستر پر لیٹ گئے۔ یہ اس امر کا اشارہ تھا کہ اب مزید بات نہیں ہوگی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے نائٹ بلب آن کیا اور اس کی سبز روشنی میں میرے آنسو میری ہتھیلیوں پر گرتے رہے یہاں تک کہ ہتھیلیاں بھی آنسوؤں کو بھرتے، بھرتے تھک گئیں۔

سنا کے حالِ غمِ دل بڑے خلوص کے ساتھ
ہم اس کی آنکھوں میں آنسو تلاش کرتے ہیں

جانے رات کے کس پہر میری آنکھ لگی تھی۔ صبح اٹھی تو دماغ بوجھل تھا۔ فواد کی باتوں کا اثر بھی غالب تھا۔ ناشتے کی میز پر ہم دونوں خاموش تھے اور بچیاں چہک رہی تھیں۔ وہ اسکول جا رہی تھیں۔ فواد نے اپنے دفتر جانے کے لیے گاڑی کی چابی اٹھائی تو میری طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے فریحہ..... مگر اپنا خیال رکھنا۔" سنجیدگی سے کہہ کر اور ہلکا سا مسکرا کر وہ باہر کی جانب بڑے گئے اور مجھے ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی نکال کر لے گئے

Digitized by Google

اور میں پُرسکون ہوگئی اور یہ سوچ کر خوش بھی کہ فواد مجھے زیادہ دیر آزردہ نہیں دیکھ سکتے۔ زندگی کا سفر آسان ہونے کے خیال سے آسودگی جیسی نعمت پہ اللہ کا شکر ادا کیا اور اپنے دفتر کے لیے تیاری کرنے لگی۔

دفتی کے تھیلے پچھلی سیٹ پر رکھے اور گاڑی جانے پہچانے راستوں سے گزرنے لگی۔ روز یہ راستے ہوتے، سڑک کے دونوں اطراف سفید اور گلابی گلاب کی روش، جگہ، جگہ اسپیڈ بریکر بنائے ہوئے تھے۔ راستوں سے اتنی آشنائی تھی کہ کس جگہ سڑک کے بیچوں بیچ گڑھا ہے لاشعوری طور پر گاڑی اس جگہ سے بچ کر نکل جاتی۔ اب گاڑی کلفٹن کے برج کے سگنل پر پہنچنے والی تھی گرین سگنل دور سے دکھائی دے رہا تھا۔

''اللہ کرے پہنچتے، پہنچتے سگنل بند ہوجائے۔'' میں نے دعا کی تاکہ دفتی کو اس کی چیزیں دے سکوں اس کے چہرے کا اطمینان اور خوشی دیکھ سکوں۔ روز کی بے کلی، بے چینی سے اس کے وجود کو نکال سکوں۔ قبولیت کا لمحہ تھا۔ میری گاڑی کے پہنچنے تک سگنل بند ہو چکا تھا تب ہی ایک گاڑی کے مسافر سے الجھی ہوئی وہ تیز، تیز آواز میں بولتی ہوئی دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کو مغلظات بک رہی تھی۔ وہ گاڑی سگنل توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ میں نے اپنی گاڑی فٹ پاتھ سے قریب روکی۔ دفتی اپنی دوسری ساتھیوں کے ساتھ قریب کھڑی باتیں کررہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ان عورتوں نے دفتی کو بتایا تو وہ بھاگی ہوئی قریب آگئی۔

''شکر ہے بی بی جی تجھے میرا خیال تو آیا، کہاں غائب ہوگئی تھی تو، تیرا بڑا انتظار رہتا ہے مجھے، آج بھی بڑی سوہنی لگ رہی ہے۔''

دفتی کے چہرے کا رنگ مجھے دیکھ کر بالکل تبدیل ہو چکا تھا ابھی کچھ دیر پہلے کا عکس بھی نہ تھا۔ ہر مسافر سے نمٹنے کا گُر وہ جانتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات عجیب ہو جاتے اس سے پہلے کہ اس کی زبان چلتی۔

''سنو دفتی، اس سے پہلے کہ سگنل کھل جائے تم تھیلے لے لو۔ اس میں تمہارے اور تمہاری چھوٹی کپڑے ہیں اور اچھے خاصے ہیں اور یہ تھیلا دیکھ لو ہو اس میں وہ چیزیں ہیں جو تمہیں پسند ہیں یقیناً پسند آئیں گی۔''

وہ تھیلے دیکھ کر پھولے نہ سمارہی تھی۔

''بی بی جی تو ہمیشہ خوش رہے۔ تو سدا سہاگن رہے، رب سائیں تجھے بہت دیوے تو رکھ، رکھ خوشیاں بھولے۔ بی بی جی تو بہت اچھی ہے بہت اچھی۔'' اس کی دعاؤں کا دائرہ بہت وسیع ہوتا جارہا تھا اور زرد لائٹ جل اٹھی۔

''اچھا دفتی اشارہ کھل رہا ہے اب میں چلتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے بی بی جی۔'' وہ احسان مندی سے بولی۔ ''بس کسی روز تو مجھے سول اسپتال لے جا۔ میری بڑی کو پیٹ میں درد اٹھتا ہے، میں چھوٹی کو بھی لے آؤں گی۔''

''اچھا، اچھا ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے گاڑی آگے بڑھالی اور وہ تھیلے سنبھالتی بڑے فخر کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ ساری عورتیں اس کی طرف بڑھ آئیں جیسے مبارک باد دے رہی ہوں۔ ان کی باتوں کی بھنبھناہٹ میرا پیچھا کرتی رہی۔ دفتی ملکہ بنی ان سب سے بازی لے گئی تھی۔ شکر ہے میرا وعدہ پورا ہو گیا اور وہ خوش بھی ہوگئی کم از کم وہ اور اس کے بچے ہمیں دعا تو دیں گے۔ کپڑے پہن کر خوش ہوں گے۔ ان کی خوشی کے تصور سے میرا دل خوش ہونے لگا۔

☆☆☆

یونہی کئی روز گزر گئے، روزانہ میرا اُدھر سے گزر ہوتا وہ ہر گاڑی کے رکنے پر تقاضا کرتی، سب سے پہلے کپڑوں کا تقاضا کرتی اور وعدہ لیتی، کبھی بھپر جاتی کبھی اکڑ جاتی اور کبھی دعاؤں کی پٹاری کھول دیتی۔ میرے پاس آتی کپڑوں کا رونا ضرور روتی۔ میں اگلی دفعہ کا وعدہ کرتی اور پانچ روپے کا سکہ دے کر ٹال دیتی۔ فواد کے غصے سے مجھے بہت ڈر لگتا تھا۔ پھر تنگ آکر میں نے وہ راستہ تبدیل کر دیا۔ وقت کا کام گزرنا ہے گزر ہی جاتا ہے۔

''سنو کشمیر روڈ چلو گی میرے ساتھ۔'' میری آفس کولیگ ماریہ نے کہا۔

''کیوں خیریت؟'' میں نے اپنی فائلیں سمیٹتے ہوئے کہا۔

''اصل میں کشمیر روڈ پر بہت بڑا منگل بازار لگتا ہے اور مجھے صوفوں کے لیے کپڑا لینا ہے اور کشن کورز بھی زبردست ملتے ہیں اور کچھ ضروری چیزیں بھی ہیں تم خود چل کر دیکھو، تمہیں بھی بہت ساری چیزیں مل جائیں گی جو عام شاپنگ سینٹر میں نہیں ملتیں۔''

کچھ ماریہ کا اصرار کچھ جانے کا اشتیاق، میں ماریہ کے ساتھ منگل بازار چلی آئی۔ وسیع و عریض گراؤنڈ میں ایک ہجوم بیکراں تھا۔ جگہ، جگہ مختلف اشیا کے اسٹالز لگے ہوئے تھے۔ دنیا بھر کا سامان اس بازار میں نظر آرہا تھا۔ بھانت، بھانت کی بولیاں عجب سا سماں پیش کررہی تھیں۔

''اس کو منی... دٹی شاپنگ مال بھی کہا جاتا ہے۔'' ماریہ نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

''اچھا۔'' میں حیران ہوئی۔

''آؤ اس طرف چلتے ہیں۔'' ماریہ میرا ہاتھ پکڑے برتنوں اور دوپٹوں کے اسٹال سے آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

''شکر ہے خدا کا تمہارا راستہ تو تمہیں ملا۔ میں واقعی تھک گئی تھی۔ توبہ کس قدر رش ہوتا ہے یہاں، لگتا ہے سارے شاپنگ سینٹر یہاں جمع ہوگئے ہیں۔'' میں بڑبڑائی۔

''ارے ماردیا بھائی، آپ کے اسٹال تک پہنچتے، پہنچتے حالت بری ہوجاتی ہے آپ نے بھی کس کونے پر لگایا ہے۔'' ماریہ اطمینان کی سانس لے کر بولی۔

''باجی جی ساری ہیرا دکانیں اسی لائن میں ہیں۔'' وہ فخر سے بولا اور ماریہ کے آگے کپڑوں کے تھان کھول کر رکھ دیے اور میں ہیرا دکانوں کا جائزہ لینے لگی۔

ہر اسٹال پر رش تھا۔ سامنے والی ساری لائن پر ریڈی میڈ کپڑے لٹکے ہوئے تھے جو ہوا کی تیزی سے لہرا رہے تھے۔ خواتین ہر اسٹال پر موجود تھیں کچھ نیچے پھیلے ہوئے کپڑوں پر بحث کررہی تھیں اور کچھ لٹکے ہوئے سوٹوں کی قیمتیں کم کرارہی تھیں۔ ایک اسٹال پر خواتین کا کچھ زیادہ ہی رش تھا۔

''لگتا ہے یہاں سوٹ زیادہ ہی اچھے ہیں شاید سیل کا چکر ہے۔'' اسی سوچ میں، میں تجسس کے ہاتھوں آگے بڑھ گئی۔ عام دکانوں کی بہ نسبت اسٹال پر غیر معمولی رش تھا۔

''افوہ کس قدر چالاک عورت ہے تین سوٹوں پر پانچ روپے بہ مشکل کم کیے ہیں، جاہل کہیں کی۔'' پیسنے سے شرابور ایک خاتون اسٹال سے باہر نکلیں۔ میں نے اندر جانے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ وہ خاتون مجھے دیکھ کر بولیں۔

''جائیں آپ بھی جائیں مگر ذرا سنبھل کر عجیب سی عورت ہے۔ کیسے بات کرتی ہے، اللہ بچائے۔''

''اس قدر رش ہے توبہ۔'' کسی عورت کے تیز، تیز بولنے کی آواز آرہی تھی۔ اسٹال کے چہار جانب خوب صورت، دیدہ زیب لباس تھے جو اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کسی بوتیک شاپ پہ کھڑے ہوں پھر تو رش کا عالم ٹھیک تھا۔ ایک خاتون سے ایکسکیوز کرکے میں مزید آگے بڑھ گئی۔ کسی سوٹ پہ بحث ہورہی تھی۔

''نہ جی بیگم صاحبہ، یہ کوئی معمولی کپڑے پہ بنا ہوا کام نہیں ہے۔ ذرا سوٹ کو غور سے دیکھو، دبئی سے مال آیا ہے کوئی اتر اوا نہیں ہے، پہنے گی تو بہت سوہنی لگے گی تو، تیرے دل سے دعا نکلے گی میرے لیے کیا پیسے کا منہ دیکھتی ہے۔ لینا ہے تو لے، لے ورنہ تیرے پیچھے کھڑی آنٹی کا دل ہے اس پر، چل چھوٹی، میرون دکھا بیگم صاحبہ کو وہ۔'' جال پھینک کر نیا شکار بھی فوراً تلاش کرتی۔

''ارے..... یہ تو دفتی ہے۔'' اس کا انداز اس کا لہجہ تو دل و دماغ میں بسا ہوا تھا۔ ''مگر یہ یہاں، یہ تو بھکارن؟''

اور سوداگری کا ایک نیا روپ، نیا انداز مجھے حیران کردینے کے لیے کافی تھا۔

Digitized by Google

منی ناول

صُفّہ

دُردانہ نوشین خان

آٹھواں حصہ

مسجد صفہ کا پردہ دار ہال خواتین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ محترمہ صفہ بخاری کو شہر کی متعدد عورتیں دیکھنا اور سننا چاہتی تھیں مگر وہ پوشیدہ اور الگ تھلگ رہتی تھی۔ آج اس کا نام گھروں سے عورتوں کو کھینچ لایا...... دلچسپی کی بات یہ تھی کہ ان میں زیادہ تر پڑھی لکھی تھیں...... بے لاگ، مستند، معتبر، غیر جانب دار علما و عالمات کی زبان سے آیاتِ قرآنی کی تفسیر کی ساعتیں کمیاب تھیں، شہر ابھی مکمل طور پر ماڈرن دوڑ میں بھی شامل نہیں ہوا تھا۔

مردانہ و زنانہ سامعین کے لیے اجلی نئی دریاں اور بزرگ و بیمار کے لیے کرسیاں رکھی گئی تھیں... میں سفید چادر میں لپٹی نخ... بیٹھی تھی... چمکتی انگلیوں والا... نظر پڑی تو برسوں پہلے کی انگوٹھیوں... خوب صورت شبہہ یاد آگئی جو شعبان کی بھی تھی مگر پر... اچانک آنکلی تھی۔ خوب صورت وہ اب نہیں، خوب صورتی اور کشش میں فرق ہوتا ہے۔

لحنِ داؤدی کے حامل بزرگ قاری نے... 20 سورہ نمل کی پانچ آیات کی تلاوت کی بعد ازاں ننھے شاگرد عبداللہ اعوان نے وہی تلاوت دہرائی، آ...

Digitized by Google

کے فرق کے سوا کوئی بھی فرق نہ تھا۔ جب یہ آیت اٹھائی جاتی۔ ''الٰہٌ مّعَ اللہ...... (کیا ہے کوئی اور معبود اللہ کے سوا؟) تو ساعتوں سے جسم میں لہریں دوڑ جاتی تھیں' ایک گونجتا ہوا سوال اشک بن کے ٹپکتا تھا۔ نخبہ کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر وہاں تو نخبہ کے علاوہ بہت اشکبار تھے۔ عبد اللہ اعوان کو علما و عالمات نے شاباش دی...... پھر مفسرین کا خطاب شروع ہوا...... سائنسی، جغرافیائی، کائناتی اور منطقی سطح پر لاجواب دلائل و براہین امڈتے چلے آئے...... وہ جس نے زمین آسمان بنائے، تمہارے لیے آسمان سے پانی اتارا، رونق والے باغ اگائے، بشر کی طاقت نہ تھی کہ پودے پیڑ اگاتے۔ ایک آیت کی ہزار جہات تھیں، دل کو قائل، مائل اور گھائل کر دینے والی تمثال تھیں...... بشر کے دست و بازو نے محنت کی یا بشر کے دماغ نے...... غور کیا تو بشر کو دست و بازو کس نے دیے؟ بشر کو دماغ کس نے دیا؟ بشر تو بذاتِ خود اس قدر دقیق ٹیکنالوجی ہے کہ پانچ سال کی طبی تعلیم صرف اس کی ہیڈ لائنز بتا پاتی ہے جبکہ اس پانچ سال میں سیکھنے والے کی ذہنی مشقت از حد ہے۔ بشر خود کو ہی نہیں سمجھ پاتا ڈگریوں کے ڈھیر لگا کر بھی وہ مکمل آگاہی کا دعویٰ نہیں کر سکتا...... تو یہ آسمان و زمین و مابین جو بالواسطہ، بلاواسطہ ایک معبود کی طرف رواں ہے، ایک معبود کی تصدیق در تصدیق ہے۔

گفتگو مقبولِ عام اور پسندیدہ ہوئی کہ بعد از خطاب یونیورسٹی کی چند طالبات اور ٹیچرز نے سوالات کے لیے وقت طلب کیا...... افشاں نصیر نے معذرت کرلی کہ اسے مقررہ وقت پر واپس جانا تھا، ٹرین میں بکنگ تھی۔ اس کے ہمراہ اس کا ڈاکٹر شوہر بھی تھا۔ صفہ بخاری نے اُن کو شبانہ کے ہمراہ گھر بھجوا دیا تا کہ انہیں کھانا، کھلائے اِدھر وہ منتظر خواتین کو مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی جو کھڑی ہوئی راہ تک رہی تھیں۔ صفہ نے مسکرا کر انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا...... سفید لبادے میں سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی پچاس سالہ صفہ جو اپنے چہرے کی نورانی حیا کے سبب گناہوں کی تھکی ہوئی سیاہی

سے دور اور کم عمر دکھائی دیتی تھی مگر جس کی زبان سچائی کا اعتماد اور اللہ کی رسی تھامے رکھنے کا یقین تھا۔ بیٹھ چکنے کے بعد انہوں نے اپنا تعارف کرایا...... دو اسسٹنٹ پروفیسرز تھیں، دو اسکول تھیں، چار مختلف شعبہ جات کی طالبات اور ان مائیں تھیں۔ ان کی کرید وہی پرانی تھی۔ اسلامی تع... عورت کا مقام کیا ہے؟ اور دبا، دبا استفہام کہ عورت جنت واضح کیوں نہ کی گئی۔ صفہ نے عمر بھر اس سوال کے ساتھ سفر کیا تھا۔ یہ سوال اس کی بھی آنکھوں ... آنسو بن کے مچلتا تھا۔ کبھی، یہ سوال وہ اپنی مرشد سے بدل، بدل کر پوچھتی تھی، اس سوال کا اپنے گرد و نواح جواب دینے کا حوصلہ بھی اس نے اپنایا تھا۔ بالآ... یقین اس پر القا ہوتا چلا گیا۔

''پیاری عورتو!...... کاش کہ میں یہ بات ساری مسلمان عورتوں کو یکجا کر کے بتاتی جو آپ چند کو بتا رہی ہوں...... عورت کوئی الجھن نہیں...... کمپلیکس نہیں، کمتر نہیں، برتر نہیں، عورت اور مرد انسان ہیں...... انسان نامی مخلوق میں مذکر مرد اور مونث عورت پکارے جاتے ہیں جس طرح کہ ہر جانور میں مذکر، مونث ہوتے ہیں۔ جانور سے مراد آ... نہیں ہے بلکہ ہر جاندار مراد ہے۔ قرآن میں پچاس بار انسان کا ذکر آیا ہے۔ اس کا مطلب ہے پچاس بار خالقِ کائنات نے عورت اور مرد کو یکساں کھاتے میں مخاطب کیا ہے...... بس ہم اس کو سیدھا سیدھا کر کے سمجھتے ہیں۔ آخرت میں انسان کو نیکیوں کا انعام ہے...... کیا؟ جنت...... انسان کو برائیوں پر سزا ہے...... کیا؟ جہنم...... یہ تو طے ہو گیا...... اب سوال رہ گیا مرد کی جنت کیسی ہوگی......؟ مرد کا جہنم کیسا ہوگا؟ عورت کی جنت کیسی ہوگی وغیرہ...... کیا انسان کا خالق اس کی خواہشات کو نہیں جانتا......؟ بلاشک وہ اس کئی گنا زیادہ جانتا ہے جتنا کہ ماں اپنے بچے کی خواہشات، پسند ناپسند کو جانے' ماں تو مختارِ کل خالق نہیں وہ تو ودیعت کردہ خالق ہے لیکن آپ میں سے جو مائیں ہیں وہ کہتی ہوں گی کہ میں اپنے بچے کی پسند ناپسند، خو...

اور فکریں جانتی ہوں......''

کئی خواتین اقرار میں سر ہلا کر تائید کرنے لگیں۔

''تو رب حقیقی خالق ہے وہ بہت زیادہ جانتا ہے...... جو بتایا گیا ہے جو نہیں بتایا گیا وہ سب جانتا ہے...... یہ سوال کرید نہیں رہنا چاہیے...... دوسرا سوال ایک بہن نے یہ کیا کہ عورت کا مقام روحانی طور پر کیا ہے؟ اس ضمن میں اول تو یہ اقرار ہے کہ ہمارا علم کم ہے...... اسلام صدیوں سے کہاں، کہاں تک رہا جغرافیائی سطح پر ہم نہیں جانتے کہ کہاں کیسی اولیات تھیں...... ہم تو ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا کرام میں سے گنتی کے نام جانتے ہیں...... بائبل میں حنہ نبیہ، خلدہ نبیہ، نوعید یاہ، دبورہ کے نام ہیں مگر اللہ بہتر جانتا ہے جانچ کا یہ پیمانہ لگانے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ نیک عورتیں، پارسا عورتیں اولیات ہیں وہ کہیں بھی ہو سکتی ہیں ان کی شہرت نہ ہونا ان کے وجود نہ ہونے کی دلیل نہیں......''

''جی...... بالکل درست فرما رہی ہیں آپ......''

ایک آواز آئی۔

''میری پیاری عورتو!...... اسلام نے عورت کو حقیقتاً زمین سے آسمان تک پہنچایا ہے...... کاروبارِ حیات میں عورت پر کوئی قدغن نہیں ہے...... حضرت بی بی زینبؓ کی قوت برداشت اور بلا کا اعتماد مجھے تو آج کی عورت میں انہی کی مثال نہیں ملتی۔ اسلام عزت، محبت، مقام دیتا ہے عورت کو...... مرد کی نماز اور عورت کی نماز کے ثواب جدا، جدا نہیں ہیں۔ اپنی زندگیوں میں... سرِفہرست اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت و محبت کو رکھو...... پیاری عورتو!''

''کتنا سویٹ لگتا ہے پیاری عورتو سن کے......''

ایک نے دوسرے کے ساتھ سرگوشی کی۔

''میں پہلی بار عورتوں کے لیے اس طرح خطاب سن رہی ہوں۔'' دوسری ہلکا سا مسکرائی۔

''پیاری عورتو...... ایک واقعہ سنو۔ حضرت عمر فاروقؓ معمول کے مطابق رات کو گشت کر رہے تھے، ایک گھر سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ اندر سے اون کاتتے ہوئے کسی نسائی آواز میں اشعار گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔ عمر فاروقؓ رک گئے، سننے لگے، سنتے رہے، زار و قطار روتے رہے، اشعار کچھ اس طرح تھے۔

''محمدؐ پر اللہ کے تمام ماننے والوں کی طرف سے سلام ہو، آپ راتوں کو اللہ کی یاد میں کثیر قیام کرنے والے اور سحری وقت اشک بہانے والے تھے...... ہائے افسوس، اسباب موت متعدد ہیں کاش مجھے یقین ہو جائے کہ روزِ قیامت مجھے آقاؐ کا پڑوس نصیب ہو گا......'' اب اس میں غور و تدبر کی دو باتیں ہیں، مسلمان عورت کا والہانہ حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ جس پر عمر فاروقؓ رشک کریں۔ دوسری بات عورت کی آواز کا باہر آنا مگر اس آواز میں اللہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہونا...... ایسی آواز کا کسی مرد کا بھی توجہ اور راست نیت سے سننا اور تاثیر محسوس کرنا...... قباحتیں خواہ مخواہ کھڑی نہ کی جائیں' اسلام بہت پیارا دین ہے...... امت کی عورت یا مرد ہو...... نیکی کا تول باٹ ایک ہے، برائی کا تول باٹ ایک ہے...... ضروری بات یاد رکھو اور غیر ضروری، فروعی کو بھول جاؤ......''

صفہ کا سادہ، سیدھا دل میں اتر جانے والا انداز ایسا ہوتا کہ دلوں کے غبار دھل جاتے۔ خواتین مطمئن، خوش و سرشار رخصت ہوئیں۔ صفہ نے گھر کی راہ لی۔ مسجد کے ہم دیوار تو گھر تھا۔ افشاں نصیر بس اٹھنے ہی والی تھیں۔

''آئیے صفہ بخاری صاحبہ، آپ کی بہنوں نے ہماری بہت مدارت کی۔''

''معذرت خواہ ہوں، تاخیر ہوئی......'' میز پر کھانے کے برتن دیکھ کر شبانہ سے کہا۔ ''شبانہ...... چائے بنوالیں......''

''نہیں...... جزاک اللہ خیراً...... میں چائے نہیں پیتی۔ عادت ہی نہیں بن پائی ویسے بھی اب چلنا چاہیے......''

نخبہ چہرہ دھو کر لپ اسٹک لگا کر خود کو فریش دکھانے کی کوشش کے ساتھ وہاں آ بیٹھی تھی، صفہ کو بتانے لگی کہ ان کا بیٹا جامعہ الازہر میں انجینئرنگ پڑھ رہا ہے، صفہ کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی وہ تو......

جامعہ الازہر کو پسند کرتی تھی۔

''میں عبد اللہ اعوان کی قرأت سے متاثر ہوئی ہوں، اس سے ملی ہوں، ذہین اور سلجھا ہوا بچہ ہے......'' افشاں نصیر نے کہا۔ یہ سن کر شبانہ کھل اٹھی...... نخبہ نے ان کا نمبر لے لیا تاکہ مزید تفصیل معلوم کر سکے۔

''افشاں نصیر...... محترمہ بی بی عائشہ صبیحہ معظمہ کے بارے میں کچھ پتا ہے؟''

''وہ تو برسوں پہلے جامعہ چھوڑ کر تھر کے علاقے میں چلی گئی تھیں سنا ہے وہاں پانی والی مائی کے نام سے مشہور ہیں۔ مزید تفصیل معلوم نہیں ہے...... ملنا چاہتی ہیں آپ؟'' پُرسوچ انداز میں صفہ نے اقرار میں سر ہلایا...... وہ اجازت طلب کر کے اٹھ گئی...... گیٹ تک اسے رخصت کرتے کے صفہ کمرے میں واپس آئی اور نخبہ کو اٹھتے پا کر روکا۔

''بیٹھو...... ابھی کچھ بات کرنی ہے۔''

''اچھا...... میں ادھر لیٹ جاتی ہوں، کمر تھک گئی ہے میری۔'' وہ پھر سے صوفے پر دراز ہوگئی ایسے میں شبانہ کو محفل لمبی جمائے رکھنے کا شوق ہوتا تھا۔

''میں چائے بنا لاؤں؟''

''ذرا ٹھہر کر......''

''اس کی بارہ مہینے چائے کی چاہ نہیں مرتی۔'' نخبہ نے ٹکڑا لگایا۔

''تم بھی بیٹھو شبانہ......'' صفہ مسکرائی پھر نخبہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

''نخبہ...... میں چاہتی ہوں اپنے عبد اللہ کو جامعہ الازہر میں داخلہ دلوانے کی تیاری کرائی جائے۔''

''افشاں نصیر سے وہاں کی باتیں سن کر سوچ تو میں بھی یہی رہی تھی...... مگر عبد اللہ ابھی چھوٹا ہے، اکیلے رہنے کا عادی نہیں ہے۔''

''سب ہی بچے ماؤں، گھروں کے عادی ہوتے ہیں...... عبد اللہ ماشاء اللہ تیرہ برس کا ہے۔''

''نہیں...... وہ اگلے ماہ چودہ کا ہو جائے گا۔'' نخبہ نے بتایا۔

''پھر بھی...... شروعات میں اسے اکیلا بھیجیں گے...... آخر اس کی تین مائیں ہیں......'' نے تبسم کیا۔

''خدا لگتی کہوں...... میں عبد اللہ کے بغیر اب تصور بھی نہیں کر سکتی۔ وہ تو میری زندگی کی ہے، میرا اپتر ہے...... مجھ بنجر کو رب نے سرسبز کر امی، امی کہتا ہے تو دل مور کی طرح ناچتا ہے۔'' شبا چہرہ ممتا کی سچائی سے چمک رہا تھا۔

''شبانہ، مجھے تمہاری بات کا پورا یقین ہے...... لیے میں اسے اور طرح کی تشکیل دینا چاہتی ہوں میں تمہیں انگلش بول چال اور عربی سکھانا چاہتی ہوں زندگی نے آگے بڑھنا ہے، ہمیں فیصلے کرنے ہوں گے اپنے بچے کے بہترین مستقبل کے لیے، مستقبل صرف زمینی زندگی تک محدود نہیں ہوتا...... نخبہ پیاری بہن تمہارا کیا خیال ہے؟'' نخبہ کی آنکھوں میں چمکیلی نمی اس نے ہونٹ پر مسکراہٹ کا پھول کھلا لیا۔

''صفہ...... تم جو بھی فیصلے کرو گی، مجھے قبول ہیں میں نے تجھے مرشد مانا ہے، اپنی منزل کا آسرا مانا ہے۔''

''ذاتی طور پر تم accept کرتی ہو؟''

''ذات ہے نہ ذات کی بات ہے......'' وہ ہنسنے لگی۔

''نخبہ باجی...... آپ بھی بس...... مجھے آپ کی سمجھ نہیں آتی سچی......''

''اری شبانہ...... میری نادانہ...... میں نے تجھے عبد اللہ کی امی کہلوایا نہیں مانا ہے...... تم اگر ساتھ ہوگی اس کا خیال رکھنے والی ہوگی تو مجھے کا ہے کی فکر ہوگی۔''

''بخاری باجی...... آپ کا حکم سر آنکھوں پر مگر میں سیدھی سادی بندی، میں بھلا کس کام کی......''

''ابھی وقت پڑا ہے...... تمہیں وقت بدل دے گا۔'' یہ فقرہ گہرا تھا، نخبہ ضرور سوچتی مگر صفہ نے متبسم کر بات کا رخ پلٹ دیا۔

''اب چائے کو بھول بیٹھی ہو......''

''او...... ہاں...... اچھا جی......'' شبانہ نے جلدی سے پاؤں چپل میں اڑسا۔

''میرے لیے نہ بنانا...... پھر میری نیند روٹھ جاتی ہے، میں ذرا سوتی ہوں۔'' نخبہ نے آنچل کا پلو منہ پر ڈال کر تکیہ کشن کو بنایا۔

''سونے سے پہلے سن لو...... اب جب تم کراچی جاؤ تو شبانہ کو ساتھ لے جانا......''

''کیوں......؟''

''اسے ہوائی سفر، بیرونی دنیا کی سوجھ بوجھ کرانا ضروری ہے۔''

''مگر......''

''ابھی تو کہہ رہی تھی تجھے مرشد مانا ہے...... جو فیصلے کروں گی قبول ہیں۔''

''اچھا...... ٹھیک ہے، لے جاؤں گی......'' صفہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

ململ کا چوڑا دوپٹا کتنی دیر سے سرمست جھوم رہا تھا۔ یہ صفہ کی پشت تھی وہ سپارے پڑھنے والے بچوں کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ مگر سفید کرتا شلوار میں تجوید قرآن سیکھنے کے لیے جاتے عبد اللہ کو اس نے جانے کیسے دیکھ لیا۔ منہ موڑ کر اسے اشارے سے بلایا۔

''آپ کے ذمے ایک کام لگایا تھا عبد اللہ...... آپ کو یاد ہے؟'' وہ قریب آیا تو کہا۔

''جی صفہ خالہ، میں بھلا کیسے بھول سکتا ہوں، امی کے لیے انگلش کی ٹیوٹر ل گئی ہیں، ہمارے میتھس کے سر نے کسی کا بتایا ہے، وہ کل آئیں گی۔''

''شاباش، جزاک اللہ......'' اسے جانے کا اشارہ کر کے وہ معمول میں منہمک ہوگئی۔

☆☆☆

طارم اسمارٹ، خوش شکل اور فیشن ایبل لڑکی تھی۔ چھیالیس سالہ شبانہ ایسی اچھی ٹیوٹر پا کر نہال ہوگئی۔ تراشیدہ بال، آدھی آستین کی شرٹ، گلے میں مفلر سا دوپٹا، ٹائٹس اور ہیل والا جوتا، ہاتھوں کے بڑھے ہوئے ناخن جن پر سرخ نیل پالش لگی تھی۔ اس کو آتا دیکھ کر بے سوچے شبانہ کے منہ سے نکلا۔

''ہائے اللہ...... بالکل جیسے نخبہ باجی آتی تھی۔'' نخبہ وہیں بیٹھی تھی۔ اس نے دیکھا تو عجیب موہوم سے تاثرات پھیل گئے رنج تھا یا ملال...... یا انجام تک جھانک لینے کا حل شدہ سوال تھا۔ طارم نے نخبہ کو اپنا تعارف کرایا۔ وہ متوسط گھرانے کی خود کفیل ہونے کی خواہش مند لڑکی تھی جس نے انگلش لٹریچر اور لنگوئسٹک linguistic میں ماسٹرز کر رکھا تھا۔

''مس طارم...... شبانہ ہماری بہن ہے، اس کو چند ماہ کے اندر ہم انگلش بول چال پر عبور دینا چاہتے ہیں، میرا مطلب ہے چھ ماہ یا اس سے بھی پہلے یہ انگلش ایسے سمجھ اور بول سکے جیسے آپ یا جیسے کوئی انگریز خاتون، یہ آپ نے کرنا ہے، اب آپ یہ کیسے کریں گی یہ آپ سوچو...... اور ہاں پیکج ایسا ہوگا کہ آپ خوش ہو جائیں گی۔''

''اوکے میم، میں کر لوں گی، شبانہ نے کتنی تعلیم حاصل کی ہے؟''

''میٹرک ہے، کتابیں نہیں پڑھانی اسے۔''

''میں کتابوں سے نہیں پڑھاؤں گی، میں آڈیوز، وڈیوز، اسٹوریز، سونگز، پلیز، کارٹونز سے کروں گی۔ I know, I can'' وہ پُرجوش یقین سے بولی۔

''گڈ...... مس طارم کس وقت آنا مناسب رہے گا؟''

''صرف طارم......'' طارم نے مسکرا کر کہا۔ ''آج کل شامیں کافی لمبی ہیں، میں ایوننگ میں آؤں گی۔''

وقت طے ہونے کے بعد کچھ رسمی باتیں ہوئیں، تعارف کی مزید گرہیں کھلیں، پہلے دن طارم کی صفہ بخاری سے کوئی ملاقات نہ ہوئی۔

''صفہ خالہ، شبانہ امی کی ٹیچر آگئی ہیں، آپ کو پتا ہے؟ اب وہ پڑھیں گی۔'' عبد اللہ فٹ بال اچھالتے ہوئے بتا رہا تھا۔ پھر ہنسنے لگا۔

''آپ نے ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ حدیث نہیں سنی کہ مہد سے لحد تک علم حاصل کرو...... from birth to death۔''

''لیکن امی کی ٹیچر اُن سے چھوٹی ہیں، آپ نے

Digitized by Google

ان کو دیکھا ہے؟"
"دیکھا تو نہیں ہے، سیکھنے یا سکھانے والے کی کوئی عمر مقرر نہیں، عمر میں چھوٹی ہیں تو علم میں بڑی ہیں۔"
"صفہ خالہ، آپ کا جواب پرفیکٹ ہوتا ہے، آپ بھی علم میں بہت بڑی ہیں۔"
"آپ کی مما کیا کررہی ہیں عبداللہ......؟" صفہ نے اپنے دھلنے والے کپڑے باسکٹ میں ڈالے۔
"وہ سورہی ہیں، صفہ خالہ...... مما کو کیا بیماری ہے؟ کبھی رات، رات بھر نیند نہیں آتی، کبھی دن بھر سوئی رہتی ہیں، میڈیسن کھاتی رہتی ہیں۔" پھر خود کو بتانے کے انداز میں بولا۔" ان کا stomach اسٹامک خراب رہتا ہے۔"
"ٹھیک ہوجائیں گی ان شاء اللہ......"
"خالہ...... میں اگر جامعہ الازہر چلا گیا تو مما اور آپ اکیلی کیسے رہیں گی، مما تو بیمار بھی ہیں، آپ کے کام کون کرے گا، میں سوچتا رہتا ہوں۔"
"بیٹا اللہ نے سب سوچ رکھا ہوتا ہے، ہم جب کوئی اچھا قدم اٹھاتے ہیں...... اس سے وابستہ چھوٹے، چھوٹے مسائل حل ہوتے چلے جاتے ہیں۔" تسلی دلائی گئی، عبداللہ فٹ بال لے کر باہر چلا گیا۔

اب معمول میں یہ تبدیلی آگئی کہ شبانہ ظہر انے کے بعد نماز اور قیلولہ کرتی پھر نہا دھو کر باہر آتی تو عصر کے سایے ڈھل رہے ہوتے، سپارہ پڑھنے والے بچوں کی دُہرائی اس وقت ہوتی، صبح کے دور میں وہ نئے اسباق لیتے تھے، عبداللہ عصر کی نماز ادا کرکے پینتالیس منٹ فٹ بال کھیلنے چلا جاتا، اس کے بعد اس کی تجوید قرأت کی مسجد میں کلاس ہوتی، اوقات کار منظم طریق سے تقسیم ہوگئے تھے، اس دوران طارم آجاتی۔ طارم، شبانہ سے دانستہ انگلش ملا کر بولتی تھی تاکہ شبانہ کی زبان پر انگلش... بلا جھجک آئے، اسے صفہ بخاری کو ملنے اور دیکھنے کا اشتیاق تھا، وہ دو تین بار شبانہ سے پوچھ چکی تھی۔
"کیا وہ کسی سے ملنا لائک نہیں کرتیں؟"
"وہ، لائک تو نہیں کرتیں...... but اگر you کہتی ہو تو وہ مل لیں گی۔"

طارم کو ایسی انگلش پر ہنسی تو آتی تھی مگر وہ سنجیدہ رہتی، وہ اپنی شاگرد کی حوصلہ افزائی کرنا جانتی تھی۔

پھر ایک دن طارم کی یہ خواہش پوری ہوگئی۔ صفہ بخاری ہلکے آسمانی کھلے اور سفید چوڑے اسکارف میں (ہمیشہ کی طرح) ملبوس اپنے کمرے کے دروازے پر رکی سامنے تکتے جانے کس سوچ میں گم تھی کہ شبانہ اور طارم آگے پیچھے چلتی آگئیں، شبانہ نے جلدی سے تعارف کرایا۔ طارم نے سلام کیا۔ صفہ نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا۔ طارم رکی، وہ کچھ بات بڑھانا چاہتی تھی مگر ایسی تمکنت تھی کہ بات بن نہ پائی، صفہ اپنے کمرے میں چلی گئی، طارم نے شبانہ کو بتایا کہ ان کے پُرنور چہرے اور آنکھوں میں غیر معمولی چمک ہے اور وہ ان کو دیکھ کر ان سے محبت کرنے لگی ہے بلکہ ان سے امپریسڈ ہے۔ شبانہ، صفہ بخاری کی عبادات اور اخلاقیات کا بتانے لگی۔ اس کے بعد وہ اکثر کہتی کہ وہ صفہ بخاری سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہے مگر اسے یہ بھی معلوم ہے وہ یہ نہیں کرسکے گی۔

"ماما نے پرسوں کراچی جانا ہے۔" عبداللہ نے سر سے ٹوپی اتار کر بالوں کو انگلیوں سے ٹھیک کرتے ہوئے صفہ خالہ کو بتایا۔
"اچھا کیا آپ نے مجھے بتادیا۔"
"خالہ، اس بار امی بھی ساتھ جائیں گی؟ اچھا بھوک لگی ہے، فریج میں انگور ہیں کیا؟" بات کرتے کرتے اس کو کچھ کھانے کا دل چاہا۔
"مجھے معلوم نہیں، آپ خود دیکھ لو۔"
"شبانہ امی کو سب کچھ معلوم ہوتا ہے، وہ چلی گئیں تو میرا کھانا کون بنائے گا۔ آپ ان کو نہ بھیجیں ناں......"
"چند دن کی تو بات ہے، کھانا ملازمہ بنالے گی...... آپ خود بھی فریج کھول کر جو لینا ہو لے لیا کرو...... اپنا کام خود کرنا اچھی بات ہے۔" عبداللہ فریج کی طرف بڑھ گیا۔
"دو ٹکٹ کرائے ہیں ناں......؟" صفہ نے نخبہ

سے پوچھا۔
وہ کراتو چکی تھی مگر عبداللہ کے بارے میں فکرمند تھی۔
"تم کہو تو موذن کو بلا لیتے ہیں۔"
"وہ کیوں؟"
"بس ویسے ہی، عبداللہ لگا رہے گا اس کے ساتھ۔"
"کیا پتا یہ میرا آخری چکر ہو......" نخبہ کے لہجے میں اداسی تھی۔
"اللہ کرے یہ تمہارا آخری ہی چکر ہو۔"
"اور...... اس کے بعد......؟" نخبہ اس کو شانے سے پکڑ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے پرسا کیوں نہیں دیتی؟ تم ہی تو میری سہیلی، میری پیر، سرکار اور دیوار ہو جس پر سر لگا کر میں روتی ہوں، جس کو آڑ بنا کر میں دھوپ، دنیا سے بچتی ہوں، جس کو آس بنا کر میں پناہ لیتی ہوں، ایک لمبی سیاہ زندگی میرے پیچھے ہے، وہ کون سا گناہ تھا جو میں نے نہ کیا۔"
"خاموش......" صفہ نے حلمیہ کہا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔
"مت گواہ کرو، وہ علیم اور خبیر ہے اور...... ستار العیوب ہے، مت مایوس ہو اس کی رحمت سے، تمہارے گناہ گنے جاسکتے ہیں، اس کی رحمت گنی، تولی، ناپی نہیں جاسکتی۔ جمی رہو، تم جمی نہیں رہ سکتیں تو مجھے جے رہنے دو، ہٹ کے مانگنا ہو تو ہٹ سے مانگنا پڑتا ہے۔"
"میں کم اعتماد ہوں، میں جمی نہیں رہ سکتی...... مجھے حقائق نظر آتے ہیں، میرا تو لڑکھڑاہٹ پر تسلسل ہے۔" وہ کمرے کی کھڑکی سے آسمان دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔
"بہت حسین تھی کبھی یہ دنیا، مرے مطابق
مگر رہا اب نہ اس کا چہرہ، مرے مطابق
میں اس لیے اک درخت سے بات کررہی ہوں
رہے گا چپ یا جواب دے گا مرے مطابق"
پھر کھڑکی چھوڑ کر اپنی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں صفہ پر مرکوز کردیں۔
"ترے مطابق میں تری روداد سن چکی ہوں
نہیں ہے کردار اس میں میرا، مرے مطابق"

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے
امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: فون نمبر 0301-2454188
سرکولیشن منیجر 0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

"جو ترے مطابق ہے، وہ کیونکر اٹل ہو گیا.....
جاؤ شبانہ کو کراچی جانے کے لیے تیار کرو..... جاؤ نخبہ۔"
نخبہ نے انگلیوں کی پوروں سے آنکھوں کو صاف کیا، بے مقصد مسکرائی اور بڑبڑاتی ہوئی نکلی۔ "خوش فہمی پیدا کیسے کروں، میں جانتی ہوں، میں کیسے مطمئن ہو جاؤں۔"

"نخبہ باجی..... کس سے باتیں کر رہی ہو؟ تم بھی میری طرح خود سے باتیں کرنے لگی ہو۔" شبانہ نے دیکھا تو ہنسنے لگی۔

"یہاں ہم تینوں ایک دوسرے کی طرح ہیں۔" نخبہ صوفے پر بیٹھ رہی۔

"تیسری کون؟ بخاری باجی؟ توبہ کرو جی..... ان کا مقام کہاں..... ہم کہاں؟"

"شبانہ..... میں یہ کہنے آئی ہوں کہ تمہیں میرے ساتھ کراچی جانا ہے..... تیری بخاری باجی کا حکم ہے..... پرسوں ہماری فلائٹ ہے۔" شبانہ کی حیرت کو دیکھ کر مکمل بات بتائی۔

"ہائے اللہ..... نخبہ جی، میں اڑو پلین میں نہیں بیٹھ سکتی..... مجھے بہت ڈر لگتا ہے، میری تو چیخیں نکل جائیں گی، آپ کی بے عزتی ہوگی۔ وہ کیا کہتے ہیں، انسلٹ..... عبداللہ کیسے رہے گا یہاں۔ کھانا پکانا کون کرے گا؟" اس کے پے در پے سوالات شروع ہو گئے تھے۔

"ذرا حوصلہ کر، بہن تجھے اس اڑو پلین کا سفر تو ایک نہ ایک دن کرنا ہوگا ہی، اپنے پتر کے ساتھ معصر نہیں جائے گی۔ اور ہاں کھانا پکانا وہ ملازمہ کر لے گی۔ چل بس تیار ہو، دو جوڑے رکھنا زیادہ نہیں، اور ہاں بات سن....."

"ہاں جی.....!"

"میں کراچی میں اسپتال جایا کرتی ہوں، وہاں غیر ضروری لوگ بلکہ مکھی تک کو اندر نہیں جانے دیتے، سمجھا دوں گی تجھے سارا کچھ..... کہاں بیٹھو گی، دھیان سے رہنا، گھبرانا مت....."

شبانہ جان چکی تھی کہ جانا کہہ دیا ہے تو اب جانا ہی ہوگا۔

☆☆☆

عصر ڈھل رہی تھی، چھوٹا گیٹ کھلا، طارم داخل ہوئی، جینز، ٹی شرٹ جو کولھوں کو آدھا ڈھانپتی تھی، کاندھے پر بیگ، سر پر اسکارف، اپنی ہی دُھن میں آ رہی تھی اسے توقع نہ تھی کہ صفہ بخاری سے سامنا ہو جائے گا، صفہ چھت کی طرف چڑھنے والی سیڑھیوں کے پہلے زینے پر اپنی ہزاری تسبیح لیے سفید لبادے میں ڈھکی بیٹھی تھی۔ یوں تو طارم ہمیشہ صفہ سے ملاقات کی خواہاں رہتی تھی مگر سامنا ہوا تو جیسے پسینے چھوٹنے لگے، سلام کیا تو آواز میں لرزش تھی۔

"وعلیکم السلام طارم....." صفہ نے متبسم جواب دیا۔ طارم کی سماعتوں میں ملائم گھنٹیاں بجی، دل موم کی طرح پگھلنے لگا۔ وہ بات کرنا چاہتی تھی مگر جیسے ذہن خالی ہو گیا تھا۔ کچھ اپنا حلیہ نادم کر رہا تھا پھر بھی نظریں جھکا کر بولی۔

"مجھے کوئی نصیحت فرمائیں۔" (لو جی آبیل مجھے مار) صفہ کی آنکھوں کی تابش، نظریں چرانے پر مجبور کر دیتی تھی۔ حالانکہ صفہ ہمیشہ نرمی اور تبسم سے بولتی تھی۔

"بندے کا نفس بہت ضدی اور خود پرست، ازلی خود پرست ہوتا ہے۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "اس کو والدین، استاد، مرشد سیدھا نہیں کر سکتے، یہ تو بندے کو خود روز سدھارنا پڑتا ہے، سیدھا رکھنا پڑتا ہے، اس نے واویلا بھی بڑا ڈالنا ہے، جواز، دلائل منہ پھٹ نفس کے پاس بہت ہوتے ہیں، جاؤ طارم فاروق، اللہ کی رحمت ہو تم پر....."

"طارم فاروق؟" وہ کانپ گئی، یہ نام اس کا صرف سرٹیفکیٹ میں تھا۔ وہ خود کو طارم شفق کہلواتی تھی۔ پھر نصیحت بھی دل میں تیر کی طرح چبھ رہی تھی۔ اضطرابی کیفیت میں چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں پہنچی جہاں شبانہ اسے ہی چلا کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"گڈ ایوننگ میم، طارم شفق۔" شبانہ سیکھے ہوئے انداز میں بولی۔

طارم کے چہرے پر روز مرہ والی بشاشت نہ دکھائی دی۔ کچھ دیر بعد شبانہ نے سوچ کر انگلش میں

پوچھ لیا۔ اب اسے بولنے پر گرفت ہو رہی تھی۔

"you look distrbed, what happend?"

"شبانہ نفس کیا ہوتا ہے؟" طارم بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

پھر خود کو سنبھالا اور بتایا کہ وہ ابھی بخاری بی بی سے ملی ہے، ان کی آنکھوں میں ایسی چمک ہے جو اس دنیا کی نہیں لگتی، اس کے سامنے اپنا آپ نادم لگتا ہے پھر اس نے تمام بات کہہ سنائی۔

"شبانہ! آپ کتنے عرصے سے ان کے ساتھ ہیں؟ مجھے آج صفہ بخاری کے بارے میں بتاؤ۔"

اور شبانہ نے اپنے بچپن سے لے کر آج تک کے ساتھ کے بارے میں اسے بتایا۔ طارم بغور سنتی رہی.....

اس کے بعد طارم میں رفتہ، رفتہ تغیر آنے لگا، وہ چوڑا دوپٹا لے کر آنے لگی جو اسے کمر کے نیچے تک ڈھانپتا، اس کے چھوٹے چھوٹے ناخن دیکھ کر تو وہ کہہ ہی اٹھی تھی۔

"آپ کے نیل تو اچھے لگتے تھے..... کیوں کاٹ ڈالے؟"

"امی نے بھی روکا تھا کہ تمہاری منگنی ہو جائے تو بعد میں کاٹ ڈالنا مگر..... بخاری بی بی نے کہا تھا کہ نفس کو خود اپنا آپ سیدھا کرنا پڑتا ہے۔ نفس کو استاد، ماں باپ، مرشد سیدھا نہیں کر سکتے۔ یہ تو مجھے پتا نہیں یہ نفس ہوتا کیا ہے، شاید ہماری خواہشات کا نام نفس ہو۔"

شبانہ نے سوچا کہ یہ تو بڑی فیشنی لڑکی تھی، ایک بار بخاری باجی سے کیا ملی ان جیسی باتیں کرنے لگی ہے۔ دوپٹا سر پر لے لیا۔ ناخن کٹوا دیے پھر بالوں کی ٹیل سمیٹ کر باندھنا شروع کر دیں پہلے کچھ ہلکا میک اپ کر لیتی تھی اب وہ بھی ختم ہو گیا، پڑھانے، سکھانے کا کام البتہ پہلے کی طرح جاری تھا۔

☆☆☆

نخبہ اور شبانہ کراچی روانہ ہوئیں تو گھر ایک دم سنسان سا لگنے لگا، عبداللہ کے بہلاوے کو موذن ایک رات ٹھہرایا گیا تھا مگر اس کی عبداللہ سے بے تکلفی نہ تھی۔ وہ منشی ماما کے کمرے میں رہتا۔ وہ بیس سال کا ہو رہا تھا۔ کالج میں پڑھتا تھا۔ شبانہ تو ان کی پھوپی تھی سو اس کے لیے بھتیجے، بچے ہی تھے مگر بچے اب بڑے ہو چکے تھے۔ دوسرے دن موذن چلا گیا۔ ملازم کے آنے سے ناشتا کھانا تو بن جاتا۔ صفہ نے اپنے کھانے کی مطلق پروا چھوڑ دی تھی کیونکہ ایک عرصے سے یہ ذمے داری شبانہ نے سنبھال رکھی تھی۔ وہ جانتی تھی کیا دینا ہے کیا رد و بدل کرنا ہے رتی، رتی کا خیال رکھتی تھی۔ صفہ تو بیشتر اوقات روزہ رکھتی تھی۔ عبداللہ اسکول سے آیا خود سے کھانا نکالا، کھا پی کر برتن رکھ کے پاس آ بیٹھا۔

"صفہ خالہ..... موبائل پر فیس بک ہوتا ہے، واٹس ایپ ہوتا ہے، آپ کے موبائل پر ہے؟"

"وہ کیا ہوتا ہے؟" صفہ کو کیا معلوم کہ دنیا میں کیا چل رہا ہے۔

"صفہ خالہ..... یہ رابطے کے means (ذرائع) ہیں۔ گناہ نہیں ہیں۔ جب میں جامعہ الازہر میں داخل ہو جاؤں گا تو آپ مجھ سے کیسے رابطہ کریں گی۔ ہماری کلاس کے سب بچوں کے پاس موبائل ہیں۔"

"جب آپ جاؤ گے تو آپ کو بھی موبائل دلوا دیں گے۔"

"آپ مجھ سے باتیں کریں ناں، امی کب آئیں گی؟ مجھے وہ یاد آتی ہیں۔"

"تین دن کی تو بات ہے۔"

"مما ٹھیک کیوں نہیں ہو جاتیں..... پتا نہیں مما یہاں چیک اپ کیوں نہیں کرا لیتیں..... بڑے شہر کے ڈاکٹرز زیادہ کوالیفائڈ ہوتے ہیں؟" وہ الجھ رہا تھا۔

"عبداللہ بچے..... کچھ بیماریوں کے اسپیشل ڈاکٹر اور اسپتال ہوتے ہیں، دعا مانگا کرو..... مما ٹھیک ہو جائیں..... بچوں کی دعا قبول ہوتی ہے۔"

"بچوں کی دعا قبول کیوں ہوتی ہے؟" وہ بھول پن سے پوچھنے لگا۔

"کیونکہ ان کے گناہ ابھی بہت کم ہوتے ہیں۔"

Digitized by Google

"آپ کی افطاری کے لیے کچھ لے آؤں؟"
اس نے اچانک پوچھا۔

"افطاری......؟ ابھی تو ظہر ادا کی ہے، ہنوز دلی دوراست۔" صفہ مسکرا پڑی۔

"اس کا کیا مطلب خالہ......؟"

"یہ محاورہ ہے، تب بولا جاتا ہے جب بظاہر منزل قریب لگے مگر حقیقت میں دور ہو۔"

"مگر اس کی تشریح کیا ہے؟"

"اس کے پیچھے ایک تاریخی واقعہ ہے۔"

"آپ کو معلوم ہے تو ضرور بتائیں۔" وہ تو بچپن سے کہانیاں سننے کا شوقین تھا۔ اب بھی بچپن رخصت کب ہوا تھا۔

"اچھا...... چلو میں کوشش کروں گی کہ مختصر طور پر تمہیں بتا سکوں۔"

"صفہ خالہ...... کیا ہر proverb کی اسٹوری ہوتی ہے؟"

"اسٹوری نہ بھی ہو کوئی نہ کوئی سچائی ضرور ہوتی ہے۔" اسی طرح وہ اس سے معلومات بھری گفتگو کرتی رہتی۔

شبانہ اور نخبہ کی عدم موجودگی میں صفہ کو انفرادی طور پر کمی محسوس ہوئی یا نہ ہوئی مگر عبداللہ کو زیادہ وقت دینے کی وجہ سے اس کی توجہ تقسیم رہی۔ شبانہ کی عدم موجودگی میں طارم کو چھٹی تھی مگر ایک شام وہ آگئی...... ملازم نے آکر بتایا کہ طارم آپ سے ملنا چاہتی ہے۔

طارم، صفہ کے سامنے آئی تو اسے دیکھ کر صفہ کو دھچکا لگا...... ایک تو اس نے عبایا لے لیا تھا جس سے وہ بالکل ہی کوئی اور شخصیت لگ رہی تھی اس کے علاوہ اس کا چہرہ ویران اور آنکھیں متورم تھیں جیسے روتی رہی ہو۔

"طارم فاروق، آؤ بیٹھو، خیریت سے ہو؟" صفہ کے لفظ، لفظ میں اپنائیت کا رس تھا۔ وہ فاصلے پر بیٹھنے لگی تو کہا۔ "آؤ اِدھر...... میرے پاس بیٹھو۔" وہ اٹھ کر صفہ کی بان کی چارپائی پر آبیٹھی۔ صفہ نے اپنا دایاں ہاتھ اس کے شانے پر رکھا ہی تھا کہ وہ بلک، بلک کر روپڑی۔ ایسا روئی کہ اس کا جسم لرز رہا تھا اور سانس سینے میں نہ سماتی تھی۔ صفہ نے گویا اسے رونے کی اجازت دے دی۔

"بس، طارم......بس......" اس رونے کی شدت کچھ کم ہوئی تو تھپک کر نرمی سے کہا۔

"دل نہیں لگتا، میرا دل نہیں لگتا، کچھ اچھا نہیں لگتا۔" وہ سانس بحال کرکے چہرہ صاف کرتے ہوئے یہی کہہ پائی۔ "مما میری منگنی کر رہی ہیں۔"

"تو کیا تم وہاں پر شادی نہیں کرنا چاہتی؟"

"یہ بات نہیں ہے...... مجھے اچھے نہیں لگتے دنیا والے کام...... پارلر جاؤ، فوٹو سیشن بناؤ، مردوں کے سامنے رہو، یہ سب اب اچھا نہیں لگتا...... بابا، مما ناراض ہوتے ہیں، وہ لوگوں کی باتوں سے ڈرتے ہیں، میری مما کہتی ہیں تم اپنا چہرہ دیکھو...... پارلر جاتی ہو نہ تھریڈنگ کراتی ہو، نمازوں پر زور ہے، مجھے تو لگتا ہے تم پر جن آگئے ہیں پتا نہیں کس کے ہتھے چڑھ گئی ہو۔ آپ نے کہا تھا کہ نفس پر قابو پاؤ مگر میرا نفس ہی دشمن نہیں، میرے گھر والے میرے دشمن کے ساتھ ہیں۔ میں تنہا، کس، کس کا مقابلہ کروں...... تین سال پہلے میری جوان خالہ فوت ہوئی تھیں...... وہ مجھ سے صرف نو سال بڑی تھیں۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ خوب صورت تھیں...... عنبرین خالہ اپنا اتنا خوب صورت چہرہ لے کر مٹی میں چلی گئیں۔ جو باتیں مجھے تب محسوس نہ ہوتی تھیں اب ہونے لگی ہیں، اب دل نہیں لگتا ان کاموں میں جن میں پہلے لگتا تھا۔"

"طارم...... تمہارے باطن کی آنکھ کھل گئی ہے۔ انسان کا مقصدِ حیات تم پر آشکارا ہو رہا ہے مگر تمہارا بدلا ہوا انداز تمہارے آس پاس والوں کے لیے الجھن اور پریشانی ہے، لوگوں کی پروا بے شک نہ کرو مگر ماں جو کہتی ہے اسے رد مت کرو...... درمیانی راستہ پکڑو۔"

"میں نے یہ خریدا......" برقع کی طرف اشارہ کیا۔ "مما...... نے کہا ملانی بن گئی ہو، اب دستانے، جرابیں بھی پہنو گی، بابا کہنے لگے تمہارا منگیتر براڈ مائنڈڈ

ہے، وہ یہ پسند نہیں کرے گا، رشتہ بگڑ سکتا ہے، سب ہی فکرمند ہیں کہ میں نے غلط کر دیا ہے۔"

"غلط تم نے کچھ نہیں کیا ہے مگر تمہاری باطنی رفتار کی تیزی کی وجہ سے زمین سے جڑے رہنا مشکل ہو رہا ہے، میری بات توجہ سے سنو طارم...... آئندہ ان باتوں پر دل تنگ کر کے رونا نہیں ہے، گھر میں غصے اور ردِعمل کی سنجیدگی کا اظہار نہیں کرنا، اللہ کو ظاہر سے، بندے کے ظاہر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بال لمبے کرلے، چھوٹے کرلے، قمیص شلوار کے ٹرینڈ بدل لے، یہ بہت معمولی باتیں ہیں، ماں، باپ کے دلوں کو ٹھنڈا رکھو...... مگر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ سمجھ رہی ہو ناں...... چلی جاؤ پارلر اور جو کرنے والے کام ہیں کرلو...... اللہ یار تے بیڑے پار......"

صفہ نے طارم کو سمجھا کر بھیجا مگر وہ ابھی گھر نہیں پہنچی تھی کہ اس کی ماں اسے تلاش کرتی صفہ بخاری کے گھر آپہنچی...... ملازم سے پوچھا کہ طارم آئی ہے؟ اس نے بتایا کہ آئی تھی اب چلی گئی ہے، ماں کا اندازہ درست نکلا بھڑک کر بولی۔

"مجھے تمہاری صفہ بی بی سے ملنا ہے۔"

"باجی، میں پوچھ کے آتی ہوں، وہ ہر کسی سے نہیں ملا کرتیں......" ملازمہ اندر گئی تو وہ پیچھے، پیچھے چل دی، ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی، اسے خدشہ ہوا کہ کہیں اسے انکار نہ کر دیا جائے، دروازہ کھول کر گھس آئی، ملازمہ روکنے کو بڑھی تھی کہ صفہ نے کہا۔

"امیر بی بی، انہیں آنے دو......"

وہ اونچی اور غصے سے بھری آواز میں بولنے لگی۔

"میری بیٹی کو...... تم نے پتا نہیں کیا کر دیا ہے، اچھی بھلی کا ستیاناس ہو گیا ہے۔ ہم ان کا رشتہ کر رہے ہیں، اس کی ساس فیشن ڈیزائنر ہے، بوتیک چلاتی ہے۔ اس کا منگیتر اچھا بزنس کر رہا ہے، ایسا رشتہ ہم ایسوں کو قسمت سے ملتا ہے، اب یہ بی بی ملانی بن گئی ہے، ساس کے ڈیزائن کیے ہوئے سلیولیس سوٹ اٹھا کر ایک طرف ڈال دیتی ہے، چوڑا دوپٹا لیا، اسکارف لیا ہم چپ رہے، اب تو برقع آگیا ہے، ایسی ملانی کو کیوں کوئی لے کر جائے...... لڑکیوں کی کمی تو ہے نہیں...... آپ لوگ عورتوں کو چودہ سو سال پہلے کا بنانا چاہتے ہیں، میری دو اور بیٹیاں ہیں، ڈرتی ہوں کریلے کو دیکھ کر کریلا...... وہ کیا ہوتا ہے، خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ...... نہ پکڑ لے، ہم بی بی جی بنا کر انہیں بٹھا نہیں سکتے۔ اللہ کے واسطے بی بی...... تم سے التجا کرتی ہوں، زندہ لوگوں کو مردہ زندگی کا درس نہ دیا کریں۔"

وہ نان اسٹاپ بولتی چلی گئی اور صفہ مدھم مسکراہٹ لیے سنتی رہی...... پھر اک سرگوشی سرسرائی۔

"ناؤ کا حجم دیکھ کر وزن ڈالا جاتا ہے۔" صفہ کی مسکراہٹ ایک دم غائب ہوگئی، وہ نادم اور دکھی سی ہوگئی۔

"آپ کی بیٹی آپ کی بات مانے گی...... میں نے اسے سمجھا دیا ہے، آپ کی بیٹی کا رشتہ نہیں بگڑے گا مگر ایک بار سوچیے گا ضرور جس کی ہم مانتے نہیں جوابی دلائل دیتے ہیں اگر وہ ہم پر بگڑے تو کیا ہوگا۔"

"ہم بھی مسلمان ہیں، اللہ غفور الرحیم ہے، اولاد کو پڑھانا، لکھانا دستور مطابق شادیاں کرنا پڑتی ہیں، دنیا سے کٹ کر رہیں تو دنیا منہ نہ لگائے۔" وہ اب سنبھل کر بولی۔

"معذرت خواہ ہوں۔"

"بس اللہ کرے اب ٹھیک ہو جائے۔" جیسے کہ وہ بیمار ہوگئی ہو...... ماں کو ابھی تک یقین نہیں تھا، غصہ بھی تھوڑا کم ہوا تھا۔ ختم نہیں ہوا تھا، وہ چلی گئی تو ملازمہ کانوں کو ہاتھ لگاتی دروازہ بھیڑ کر نکل گئی، صفہ تادیر ساکت بیٹھی رہی۔

عبداللہ اس وقت اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ مغرب کی نماز ہو چکی تھی۔ مگر صفہ ابھی تک مصلے پر تھی جیسا کہ وہ مغرب کے بعد تادیر رہتی تھی۔ باہر سے بولنے چالنے کی آوازیں ابھرنے لگیں، ملازمہ نے آنے والیوں کے بیگ سنبھالے، آوازوں پر عبداللہ نے کمرے سے باہر جھانکا۔

Digitized by Google

"صدقے جاؤں میرا بیٹا، کیسا ہے تو....." شبانہ بانہیں پھیلائے اس کی طرف لپکی۔

"السلام علیکم امی..... آپ آگئیں....." عبداللہ کھل اٹھا۔

نخبہ اسٹول پر بیٹھی دیکھ کر مسکراتی رہی۔ شبانہ کا پیار ختم ہوا تو نخبہ نے گلے لگایا، گال چومے۔

"کیسے دن گزرے جانو..... صفہ خالہ کہاں ہے؟"

"میں جھانک کر آئی ہوں، نوافل پڑھ رہی ہیں۔" شبانہ نے پانی پیتے ہوئے بتایا۔

صفہ فارغ ہوئی تو دعا سلام کے بعد سب اپنے کمروں میں چلے گئے، لگتا تھا وہ دونوں تھکی ہوئی ہیں۔

اگلی صبح پُر رونق سی تھی۔ نخبہ متحرک نظر آرہی تھی۔ صفہ نے اسے دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ شبانہ نے بالوں میں مہندی لگائی تھی۔ نہا دھو کر ہلکی سردی محسوس کی تو کافی بنانے کا ارادہ کیا، پہلے سب سے پوچھ لیا اکتوبر کا اختتام تھا مگر موسم خزاں کی اداسی ابھی فضا میں نہیں گھلی تھی۔ شبانہ اب انگلش بول چال کے ساتھ نئے نئے کھانے اور ڈرنکس بھی بنانے لگی تھی۔

وہ تینوں اپنے، اپنے کافی کے مگ لیے بیٹھی تھیں۔ صفہ سیڑھیوں کے تیسرے قدم پر نخبہ نشی ماما کے کمرے کی دیوار کے ساتھ جہاں پرانی کرسی رکھی تھی۔ بیٹھ گئی تھی، جہاں رنگ برنگے طوطوں کا پنجرہ ہوتا تھا مگر اب خالی پنجرہ تھا، نشی ماما کے پاس کوئی بزرگ رشتے دار آیا ہوا تھا، وہ وقفے، وقفے سے بولنے یا کھانسنے لگتے۔ شبانہ، صفہ اور نخبہ کی درمیانی جگہ میں صاف فرش پر بیٹھی پہلی بار ہوائی سفر کا تجربہ سنا رہی تھی۔

"بخاری باجی، سچ پوچھو تو مجھے اندر، اندر بہت ڈر تھا، کیسے ہوگا کیا ہوگا۔ مگر جہاز اڑا تو ڈر نہیں لگا، محسوس ہی نہیں ہوا۔"

"ہاں، میں بھی تمہیں دیکھ رہی تھی..... تو شیشے سے باہر ایسے دیکھ رہی تھی جیسے بس میں بیٹھی ہو، اتنی بلندی سے کیا نظر آتا ہے۔"

"آپ نے کہا تھا، نہ دیکھو، چکر آئے گا۔" وہ ہنسنے لگی پھر صفہ سے دوبارہ مخاطب ہوئی۔

"ائرپورٹ اتنا بڑا ہوتا ہے اور صاف ستھرا اگر جو اسپتال تھا ناں اوہ گاڈ..... ایسا چمکتا اجلا، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

"تم لوگ رات کہاں رہے؟" صفہ نے سوال کیا۔

"ہوٹل میں کمرا لے لیا تھا۔" شبانہ نے نخبہ کو دیکھا، وہ انگلش سیکھنے کے باوجود اندر سے وہی بھولی بھالی دیہاتن تھی۔ "اسپتال میں نخبہ باجی نے دس گھنٹے گزارے..... مجھے سمجھا کر ویٹنگ ہال میں بٹھا گئی تھیں، میں وہیں کی رہیں رہی..... وہاں اور لوگ بھی تھے، مرد عورتیں، کوئی لیٹ جاتا کوئی بیٹھا رہتا..... اسلام آباد سے ایک فیملی آئی ہوئی تھی۔ اب مجھے بھی تھوڑی بہت گٹ مٹ کرنی آتی ہے، وہ مجھے educated سمجھ رہی تھیں۔"

"دیکھ صفہ..... تیری شبانہ کو پر لگ گئے ہیں، قاہرہ بھی جاسکتی ہے۔"

"جائے گی..... ان شاء اللہ....."

"ان شاء اللہ.....!" نخبہ نے تائید کی۔

"نخبہ، انسان بدل جاتے ہیں، زمانہ بدل جاتا ہے، تقدیر بدل جاتی ہے، ثبات صرف فنا کو ہے۔"

"سچ کہہ رہی ہو۔"

"لو جی..... میری ٹیوٹر آگئی....." شبانہ گیٹ سے داخل ہوتی طارم کو دیکھ کر بولی۔

صفہ نے دیکھا۔ طارم نے شوخ کڑھائی چھپائی کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس پر میچنگ چادر لپٹی ہوئی تھی۔ (بس چادر تھی ناں کافی ہے) صفہ کی آنکھیں بولیں۔ طارم نے نخبہ اور شبانہ سے مصافحہ کیا مگر صفہ کو احتراماً دور سے سلام کیا۔ حالانکہ اس کی آنکھوں کی اصل وابستگی صفہ کی جانب تھی۔ صفہ دایاں ہاتھ بڑھایا تو دونوں ہاتھوں سے بڑھا

ہاتھ تھام کر آنکھوں سے مس کیا۔ ایک شفیق مسکراہٹ نے سوال کیا۔

"ماں اب تو ناراض نہیں؟"

"میں ویسے ہی کروں گی جیسے آپ نے کہا..... مما سے ایکسکیوز کرلیا۔"

شبانہ کو کرید ہوئی پھر سوچا طارم سے پوچھوں گی، طارم ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ نخبہ اپنے دوپٹے کا اُدھڑا ہوا کونہ دیکھتے بولی۔

"شبانہ..... کچھ نئے کپڑوں کی ضرورت ہے، تمہارے بھی سوٹ پرانے ہو رہے ہیں، تین سالوں سے میں نے کوئی خریداری نہیں کی..... میں یہاں کے بازار نہیں جانتی، میں چاہتی ہوں ہم ایک چکر لگالیں..... عبداللہ کے لیے بھی کپڑے لینے ہیں۔"

"اچھا میں کلاس لے کر آتی ہوں تو بات کرتے ہیں مگر آپ کیسے جاؤ گی، پیدل آپ سے چلا نہیں جاتا۔"

"کرنا تو ہوگا....."

"اسرا کی امی نے بتایا تھا قریب ہی ایک عورت نے کلاتھ ہاؤس کھولا ہے، کافی بڑا اور اچھا ہے وہیں چلیں گے۔" شبانہ بتا کر اندر چلی گئی۔ صفہ دونوں کو سن رہی تھی۔ پھر نخبہ کو دیکھا صحت کی جانب قدم نے شوق کے راستے کھولے، اس کے تبسم نے کہا۔ "الحمدللہ.....!"

رات کا برائے نام کھانا صفہ کے لیے رکھتے ہوئے شبانہ نے بتایا کہ طارم کی منگنی ہو رہی ہے اور ٹیوشن کا سلسلہ بھی اب ختم ہو جائے گا۔

"بخاری باجی..... آپ فکر نہیں کریں۔ بے شک نخبہ باجی میرا ٹیسٹ لے لیں۔ میں اب انگلش بول سکتی ہوں، سمجھ سکتی ہوں، طارم شفق مجھے کچھ سی ڈیز دے جائے گی، میں اپنا سلسلہ جاری رکھوں گی۔"

"اگر تم انگلش کی طرف سے مطمئن ہو تو اب عربی بول چال کا اہتمام کرتی ہوں۔"

"عربی مشکل لگتی ہے مگر میں کرلوں گی..... ان شاء اللہ۔" لاؤنج میں کپڑے استری کرتے ہوئے شبانہ نے نخبہ کو مخاطب کیا۔

"جیبی..... شاپنگ چلنا ہے؟"

"ڈیر، ڈارلنگ سے..... جیبی کی چھلانگ..... تو لانگ جمپ کی چیمپئن ہے یا ہائی جمپ کی....."

"ہائی جمپ..... اھلاً وسھلاً مرحبا۔" شبانہ نے نہلے پر دہلا مارا..... دونوں ہنسنے لگیں۔

"کتنی دور ہے؟"

"مین روڈ تک تو گاڑی میں چلیں گے آگے ایک گلی ہے۔"

"چلو پھر..... اللہ کا نام لے کر آج نکلتے ہیں۔"

"طبیعت سیٹ ہے؟ یہ دیکھ لو، جیبی....."

"تیرے اس جیبی کہنے سے مجھے جلیبی یاد آجاتی ہے۔" نخبہ وقتی بہتری محسوس کر کے خریداری کے لیے تیار تو ہوگئی مگر دکان تک پہنچتے اسے چکر آنے لگے گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ بس اس کے بعد تو وہ ایک صوفے پر بیٹھی رہی، شبانہ ہی اوپر کے فلور پر گئی اور کپڑے پسند کر کے نخبہ کو لا کر دکھاتی رہی۔ جیسے تیسے خریداری مکمل کی گھر آتے ہی لاؤنج کے صوفے پر نخبہ گر گئی۔

"اُف اللہ..... میں نے سمجھ لیا تھا، میں ٹھیک ہوگئی ہوں۔"

"آپ سیدھی ہو کے لیٹ جائیں، میں آپ کو دبا دیتی ہوں۔" شبانہ نے صوفے سے شاپر اٹھا کر جگہ بنائی۔

"نہیں، شبانہ..... دبانے والا درد نہیں ہوتا، اندر سے جان نکل جاتی ہے۔ ہڈیاں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔" پھر اس نے اپنے کمرے میں رکھی دوا کا نام بتایا۔ شبانہ اب پڑھ لیتی تھی۔ اس نے فوراً۔ دوا لا کر دے دی۔ دوا لے کر وہ لیٹ رہی۔ شبانہ خریداری کے شاپرز اٹھا کر صفہ کو دکھانے لگی۔ نخبہ نے صفہ کے لیے ہلکے گلابی رنگ میں سوٹ لیا تھا۔ شبانہ جانتی تھی کہ وہ سفید کے سوا کچھ نہیں پہنتی، جب نکال کر سامنے رکھا تو اس نے پرے ہٹا دیا۔

"مجھے اتنے کپڑوں کی ضرورت نہیں ہے، میرے پاس تو تین جوڑے ہیں۔" (جیسے بہت زیادہ ہیں)

Digitized by Google

''یہ تحفہ ہے......تحفہ تو قبول کرنا چاہیے۔'' وہ دبی، دبی بولی۔

''اچھا رکھ دو......'' پھر چونکی۔ ''یہ آواز کیسی ہے؟''

''نخبہ باجی......شبانہ بھاگ پڑی۔

''کیا ہوا نخبہ کو......؟'' صفہ پیچھے آئی۔ نخبہ واش بیسن پر جھکی اللیاں کر رہی تھی۔ خوش فہمی کو کاری ضرب لگی۔ شبانہ سہارا دے کر بیڈ تک لائی، اس نے پھر کوئی دوا بتائی، وہ لا کر دی اور پھر نخبہ غنودگی میں چلی گئی۔ شبانہ پھر سے کپڑے سنبھالنے لگی۔ صفہ سرکتے، سرکتے اپنے کمرے میں پلٹ گئی۔

دل پر کیوں بوجھ تھا، طبیعت میں بے چینی تھی، تسبیحات میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ عصر کی سنتیں ادا کیں، دعائے سنت العصر پڑھی۔ فرض ادا کیا۔ ذکر اذکار تمام ہوئے اس دوران شبانہ چائے رکھ گئی۔ دھری کی دھری رہی، وہ سر تھامے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ وہ قانع تھی، صابر اور راضی تھی تو اندر ایک بے چینی کا سبب کیا تھا۔ ''سنا تھا کہ خشوع کی کمی اور بے چینی گھر پر جمع متاع پر عابدین کو ہوتی تھی۔ پھر اٹھ کر ٹٹولتے کوئی گٹھڑی ٹٹولتے سیر سوا سیر اجناس، چند سکے جو پڑا ہوتا اسی وقت بانٹ کے خالی کر دیتے، ہاتھ اور جیب خالی کر کے دل کو سکون سے بھر لیتے......ایسا درجہ کہاں ملا، رکھا تو بہت کچھ ہے، کیسے بانٹ دوں......میرا ہی تو نہیں سارا......'' بلا عنوان اضطراب کو اچانک عنوان ملا۔ وہ تو اب بھی بہت بیمار ہے، کیا دعا ہار رہی ہے؟

''بہت حسین تھی کبھی یہ دنیا، میرے مطابق۔ نخبہ تو سچ مچ بہت حسین ہوا کرتی تھی۔ اس کی دنیا بھی اس کے مطابق حسین ہوگی...... ویسے دنیا کبھی کسی وقت' زمانہ اور عمر میں حسین نہیں......یہ تو ہماری دید کی بینائی کی کوتاہی اس بھونڈی، بدصورت، داغ دار کو چمکتا دکھاتی ہے۔ کہیں پڑھا تھا، اے موت جشن منا......خوب صورت لڑکی تری گرفت میں ہے۔'' صفہ ٹہلنے لگی۔ چار پائی پر بیٹھتی، پھر اٹھ جاتی۔ ''کوئی آواز ہے؟ کیوں لگتا ہے کہ کوئی آواز آنی ہے، کس کی آواز آنی ہے۔'' ٹہلتے، ٹہلتے پھر کھڑکی کے پاس جا رکی......عبداللہ بجتا ہوا موبائل لے کر بھاگا آ رہا تھا۔

''صفہ خالہ......آپ کے لیے کال ہے، مما کے فون پر......''

''بیٹا کون ہے؟''

''افشاں نصیر رضوی صاحبہ......آپ سے بات کرنی ہے۔''

صفہ نے فون لیا، بات ختم ہوئی تو موبائل عبداللہ کو دیتے ہوئے دعائیں دیں۔

وہ آواز آ گئی تھی جس کا انتظار تھا، صفہ کی بے چینی اطمینان میں بدل گئی۔

صفہ نے شبانہ کو بلوا بھیجا۔ وہ اس کے کمرے سے نکلی تو نخبہ کا ناشتا لے کر گئی۔ دن کے گیارہ بجے تھے، نخبہ کچھ دیر پہلے ہی جاگی تھی۔ ناشتا رکھ کر بولی۔

''بخاری باجی نے مجھے بلوایا تھا۔''

''کوئی خاص بات تھی؟ اگر بتانے سے منع کیا ہے تو نہ بتانا۔''

''نہیں، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ اِدھر اُدھر پھیلاوا سمیٹنے لگی۔

''اسے رہنے دو......بعد میں کر لینا۔''

''بات یہ ہے کہ بخاری باجی اپنی مرشد بی بی کو ملنے تھر جانا چاہتی ہیں۔''

''تھر......؟ کیا کہا؟ تھر پارکر؟ یہ کیسے ممکن ہے؟''

''انہوں نے مرشد بی بی کا پتا لے لیا ہے، وہ مجھے اور ماما جی کو ساتھ لے کر جانا چاہتی ہیں مگر فکر مند ہیں کہ آپ تین چار دن کیسے رہیں گی؟''

''میری چھوڑو، وہ یہ مشکل سفر کیسے کر سکتی ہے؟ بہت مشکل ہے۔''

''نخبہ باجی، وہ مدتوں بعد کہیں جانے کا ارادہ کر رہی ہیں تو بے سود نہیں ہوگا۔ کوئی مقصد ہوگا جسے ہم نہیں جانتے......ہمیں ان کے لیے سفر آسان بنانا چاہیے۔ وہ تو آپ کی فکر کر رہی ہیں۔''

''تم نے منشی ماما سے بات کی؟''

''ابھی تو کسی سے بھی نہیں کی۔''

''ان سے تو پوچھو......بزرگ بندے ہیں، اتنے مشکل لمبے سفر کی ہمت رکھتے ہیں؟ ویسے صفہ منشی، ماما کو کیوں لے جانا چاہتی ہے، ڈرائیور تو محمد مشتاق ہے۔'' نخبہ نے پوچھا۔

''منشی ماما نے ہی محمد مشتاق کی جگہ اذان کو ڈرائیونگ کے لیے چنا ہے......'' شبانہ ڈسٹنگ کرتے ہوئے بولی۔

''اذان کے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہے؟''

''ہاں جی...... ماشاء اللہ......''

''تو یہ صفائی کیوں کر رہی ہے، ملازمہ نہیں آئی؟''

''ہاں جی ملازمہ کا میسج آیا ہے اس کی بیٹی بیمار ہے۔'' شبانہ برتن لے کر چلی گئی۔ نخبہ کا ذہن اسی خیال میں لگا رہا۔ رات کو صفہ کو تلاش کرتی سیڑھیوں تک گئی۔ اوپر چڑھنے کی ہمت نہیں تھی۔ یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اوپر ہی ہے، نخبہ ماربل کی سیڑھیوں پر بیٹھ رہی، عبداللہ عشا پڑھ کر سامنے گیٹ سے آ رہا تھا، اس کا سپید چہرہ اندھیرے میں چمکتا تھا، قد کاٹھ نکال رہا تھا، آواز میں جوانی کی دستک تھی۔ نخبہ نے زیرِ لب ماشاء اللہ کہا۔ اس کی نظر نخبہ پر پڑی تو گھبرا کر پوچھا۔

''مما جی، خیر؟ اِدھر کیوں بیٹھی ہیں؟ سردی نہیں لگ رہی؟'' نماز والی ٹوپی اتار کر وہ ساتھ آ بیٹھا۔ ''آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں میری جان۔'' وہ پیار سے مسکرائی۔

''نانو کا فون آیا تھا؟'' وہ عموماً جرمنی کا فون سننے کھلی فضا میں آ جاتی تھی۔

''میں صفہ کے انتظار میں بیٹھی ہوں......وہ اوپر ہے، فون بھی کرتی ہوں۔''

''آپ اِدھر آ جائیں......'' شیڈز کے نیچے پرانا صوفہ رکھا تھا، وہ نخبہ کو اٹھا کر وہاں بٹھا کر اندر چلا

نعت رسول مقبول

سب کچھ خدا سے مانگ لو عشق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ڈوب کر
دونوں جہاں سنوار لو عشق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ڈوب کر

پھول کھلیں چمن، چمن مہکے ہر اک کلی، کلی
نعت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لکھوا کر عشق نبیؐ میں ڈوب کر

دل کی سیاہی ڈھل گئی شامِ الم بھی ڈھل گئی
روشن حیات ہوگئی عشق نبیؐ میں ڈوب کر

وہ اِک نگاہِ شوق تھی لمحوں میں سرنگوں ہوئی
روضے پہ جب پڑی نظر عشق نبیؐ میں ڈوب کر

دل کو سرور مل گیا روح بھی پُرسکوں ہوئی
صلی علی کہا تھا جب عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر

نور کی اک کرن ملی روشن ہوئی تھی کائنات
ساری حیات جب کٹی عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر

سجدے کروں میں رات دن بھیجوں درود اور سلام
جان بھی دوں تو کچھ نہیں عشق نبیؐ میں ڈوب کر

غیر خدا کے سامنے کرنا کبھی نہ سر کو خم
دل میں رہے نہ کوئی غم عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر

اے دلِ مضطرب تجھے کیوں نہ سکھاؤں ایک بات
سیرتِ مصطفیٰ پہ چل عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر

موت ہے کیا، حیات کیا، عُقدہ کبھی نہ کھل سکا
پالے تو رازِ زندگی عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر

کیسی ملی حیات لو میرا نصیب دیکھیے
چپکے سے آنکھ موند لی عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

URDU TUBE
Digitized by Google

گیا..... نخبہ نے اپنی ماں کو فون ملایا..... کافی لمبی بات ہوئی، اس کی ماں وڈیو پر بات کرنے کو کہتی تھی مگر نخبہ اس لیے ٹال دیتی کہ وہ اس کا حال دیکھ کر فکر مند ہونے لگتیں۔ اب انہوں نے بیٹی کو جرمنی آنے کا کہنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کبھی نہیں آئے گی۔ ''عبداللہ صفہ ٹرسٹ.....'' کے تحت یتیموں کے لیے بہت اچھا کام ہو رہا تھا اور یہ نخبہ کی امی کا پسندیدہ موضوع گفتگو ہوتا۔

نخبہ فون بند کر کے فارغ ہوئی تو سفید ہیولے کی طرح سیڑھیوں سے صفہ اترتی دکھائی دی۔ وہ قریب آئی تو نخبہ نے کہا۔

''کچھ دیر اِدھر بیٹھو..... بات کرنے کو دل کرتا ہے۔'' وہ ہمیشہ کی طرح ہلکے تبسم کے ساتھ بیٹھ رہی۔ پھر اپنا تسبیح پہ لپٹا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ پر دھیرے سے رکھ دیا۔

''کیسی ہو نخبہ.....؟''

''کیا بتاؤں..... کبھی لگتا ہے ٹھیک ہو رہی ہوں..... ہمت آجاتی ہے پھر زیرو پہ چلی جاتی ہوں..... شبانہ نے بتایا کہ تم تھر کے شہر مٹھی جانا چاہتی ہو۔''

''مٹھی سے آگے..... دور ہے، تمہیں پریشانی تو ہوگی۔''

''میں اپنی پریشانی کے حوالے سے بات نہیں کر رہی ڈیئر..... مجھے کیا پریشانی ہونی ہے، گھر میں بیٹھی ہوں، ملازمہ آتی ہے، مجھے تو تمہاری فکر ہوگی، ریگستان، پانی نہیں ہوتا، راستوں کا اذان کو کیا پتا... یہ ناتجربہ کار 25,26 سالہ لڑکا..... منشی ماما بوڑھا بندہ..... وہ بیمار پڑ گیا تو مسئلہ.....''

''مگر جانا ضروری ہے، اللہ آسانی دے گا۔''

''جانا، کیوں ضروری ہے؟'' جو سوال وہ نہیں کرنا چاہتی تھی وہی لبوں پر آ گیا۔ ''صفہ، تم میرے لیے بہت قیمتی ہو، میں تمہاری امین ہوں۔''

صفہ کی وضاحت بس یہی تھی..... باقی اس کی مسکراہٹ تھی جس میں غم، خوشی ہر جذبے کا اظہار ہو جاتا، عجیب تھی صفہ..... چند سال پہلے گریہ ہی گریہ تھی اور اب مسکراہٹ ہی مسکراہٹ، نخبہ کو ابھی تک متردد پا کر کہا۔

''اللہ مددگار ہے۔''

''کس سے ملنا ہے؟''

''محترمہ عائشہ صبیحہ جی..... اب وہ پانی والی اماں کے نام سے مشہور ہیں۔ پروفیسری، سربراہی اور اب صرف اماں..... میرے اندر کے سوالوں کا جواب وہی دیتی ہیں..... میں شبانہ کے بجائے تمہیں ساتھ لے جاتی اگر تمہاری صحت ٹھیک ہوتی مگر تمہیں ساتھ لے کر آؤں گی۔'' نخبہ کو آدھی بات سمجھ آئی..... آدھی اوپر سے گزر گئی یونہی بولی۔

''ہاں، شبانہ ہوشیار ہو گئی ہے۔''

''شبانہ تابعدار ہے، اس کی یہی ایک صفت اس کی فلاح کو کافی ہے۔''

وہ جان گئی کہ اسے جانا ہے اور مان گئی۔

''کب تک جاؤ گی؟''

''تمہاری اجازت ہے؟''

''کم آن پیاری بہنا..... اجازت کا کیا سوال۔ تم نے جو سوچا ہوگا بہتر سوچا ہوگا۔ میں تمہاری سوچ کی اپروچ سے بہت پیچھے ہوں..... پر وعدہ کرو..... جلدی لوٹنا.....'' نخبہ نے ہاتھ بڑھایا، صفہ نے ہاتھ تھاما اور پھر انگشت شہادت اوپر کھڑی کی۔

اذان پہنچ گیا تھا۔

''تھر؟ بخاری بی بی کو یہ خیال کیسے آ گیا؟ اللہ خیر کرے.....'' شبانہ اپنے ماموں، منشی ماما کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس کا کبرو بھتیجا آیا تھا جس کی چمچماتی موٹر سائیکل کمرے کے باہر تھی جس کے اطراف خریداری کا سامان شاپرز میں لٹکا تھا..... اب تو اذان کے ابو (لالہ) کا کاروبار جم چکا تھا۔ پکا بڑا گھر ڈلوا لیا تھا۔ کبھی کبھار شبانہ کو ملنے آ لگتا..... یہ موقع سال میں ایک آدھ بار آتا۔ اذان کا اپنی پھپھو سے قلبی ناتا کمزور نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کا خیال رکھتا اور بخاری بی بی کا بھی حکم

مانتا البتہ موذن کا مزاج اپنے بھائی سے مختلف تھا۔ وہ سندری (ماں) کا پرتو تھا۔ بڑبولا، فضول خرچ اور فیشن کرنے والا جو عبداللہ کو مولوی قرار دیتا۔

اذان نے تھر کے سفر کا حل نکال لیا۔

''ماموں..... وہ جو سندھ کا ناری نواز منگریو ہے ناں..... اس سے بات کروں گا۔ نواز منگریو تو بوڑھا ہے مگر راستے جانتا ہے۔''

''وہ بڈھا..... وہ تو مجھ سے بھی بڑا ہے، کہیں جانے آنے کا نہیں.....'' منشی ماما نے کھانستے ہوئے کہا۔

''نواز منگریو..... بھانویں نہ جائے..... گائڈ تو کر سکتا ہے۔''

''اذان..... پگلے، گھر بیٹھے کیا گائڈ کرے گا۔''

''ہاں یاد آیا..... اس کا پوتا شہریار منگریو کالج میں مجھ سے دو سال سینئر تھا اب جاب کر رہا ہے..... اس سے بات کروں؟''

''بخاری بی بی کبھی انجان غیر کو لے جانا پسند نہ کرے شاید.....'' منشی ماما نے قیاس آرائی کی۔

''ماما جی..... آپ اپنا تو بتائیں..... آپ چلیں گے؟'' شبانہ نے پوچھا۔

''پتری..... میری طبیعت، لمبا سخت سفر سہار نہیں سکتی..... بی بی دھی کو انکار نہ کرتا مگر مجبور ہوں..... ایسے ہی تم لوگوں پہ بڈھے بیمار کا بوجھ پڑ جائے۔''

''جیپ لے کر جانا ہوگا..... منگریو جیپ چلا لیتا ہے، ہم دونوں باری، باری چلا لیں گے۔ شہریار منگریو شریف بندہ ہے، شادی شدہ بچوں والا ہے۔''

''پردے کا مسئلہ نہ ہوگا..... ہم پیچھے بیٹھیں گے.....'' شبانہ کی وضاحت بچکانہ سی تھی۔

''ہاں، ہاں، وہ تو ظاہر ہے۔''

''اچھا چلو..... پھر میں بخاری باجی سے ڈسکس کرتی ہوں، اب شہریار منگریو کا کنفرم ہے ناں؟''

''واہ شبانہ پھپھو..... تم تو میم بن گئی ہو۔''

''ہاں جی بیٹا جی..... اب میں arabic سیکھ رہی ہوں۔''

''ترقیاں کرو.....'' اذان ہنستے ہوئے منشی ماما کی دوائی نکال کر انہیں دینے لگا۔

شبانہ خوشخبری لے کر صفہ کے پاس پہنچی۔

''لو جی..... بخاری باجی..... ہمارا بندوبست ہو گیا ہے، اب آپ سوٹ سلوا ہی لیں۔'' پھر وہ منگریو کے بارے میں بتانے لگی سب کچھ بتا کر پھر پوچھا۔

''میں سوٹ سلنے دے آؤں؟''

''شبانہ..... سوٹ کو رکھ دو..... بلکہ ایسا کرو لے آؤ، میں اُدھر کسی کو دے دوں گی.....'' (لو جی شبانہ کی امید پہ پانی پھر گیا) صفہ نے پھر ملامت سے کہا۔

''شبانہ..... جمعہ کو ہم نے جانا ہے ان شاءاللہ..... پانی کے بڑے کین جتنے جیپ میں آسکیں اور کھانے پینے کا خشک سامان منگوالو۔ میری پیاری بہن، وہ کام کرو جن کی ہمیں ضرورت ہے اور یہ وراز میں رقم رکھی ہے..... پانچ، پانچ ہزار کے لفافے بنا دینا، یہ ساتھ لے کر جانے ہیں ہمیں.....''

''جی، اچھا۔'' خیال آیا کہ کھانے پینے کے بندوبست کے بارے بات کرے مگر ہمت نہ پڑی۔ سوچا جہاں سب کھائیں گے میں بھی کھا لوں گی۔

''کتنے دن کا قیام ہوگا..... آنے جانے سمیت؟''

''پانچ دن یا اس سے بھی کم..... باقی جو اللہ کو منظور.....''

شبانہ کمرے سے نکلی تو نخبہ کے پاس جا بیٹھی، پہلے تو سوٹ کا ڈکٹرا رویا پھر نخبہ کی حالت پہ فکر مند ہونے لگی۔

''آپ اکیلی کیسے رہو گی؟ کوئی مسئلہ ہو گیا تو ڈاکٹر کے پاس کون لے جائے گا؟''

''ویسے تم لے جاتیں یا صفہ.....؟'' وہ ہنسی۔

''میں اکیلی نہیں ہوں، بیٹا ہے میرے ساتھ..... اب تو منشی ماما بھی یہیں ہیں، فکر نہ کر..... جو جیسے ہونا ہوتا ہے ویسے ہی ہوتا ہے۔ خیر ہوگی۔''

''اس گھر میں سب فلسفہ بولتے ہیں.....'' شبانہ چڑ کر بولی۔

Digitized by Google

"فلسفہ اور میں نادان......؟ البتہ ترا اپا نہیں......
عربی کے بعد منطق پڑھنے لگے۔"
"منطق......؟"
"فلسفے کی بہن ہے۔"
"کون بہن؟"
"شبانہ......تو شبانہ ہی رہے گی۔"
"اچھا تو کیا شبانہ سے کیا بن جاؤں......میں ذرا پانی میں نئے کپڑے شرنک کرلوں......"
"بتانے کی ضرورت ہے پانی میں......نہ تو ویسے کیا کمی میں شرنک ہوتے ہیں؟"
"نخبہ جی......بس ایسے ہنستی بولتی رہو......مجھے بہت اچھی لگتی ہو......"
شبانہ ہنستی ہوئی کپڑے سمیٹ کر چلی گئی۔
تمام تیاریاں رفتہ، رفتہ مکمل ہوگئیں...... جمعہ آگیا۔ شہریار منگریو، اذان، شبانہ اور صفہ بخاری کا قافلہ تیار تھا۔ صفہ سفید ڈھیلے ڈھالے لبادے میں سر سے پاؤں تک لپٹی ہوئی تھی۔ شہریار منگریو نے چہرے پر بڑا رومال کا گھونگٹ نکالے صفہ بخاری کے سامنے مؤدبانہ جھک کر سلام عرض کیا اور الٹے قدموں سے پیچھے ہٹا، اذان نے فاصلے پر کھڑے ہوکر دونوں ہاتھ جوڑ کر آنکھیں جھکائے سلام پیش کیا۔
گاؤں کے لوگ جہاں صفہ کے والدین کی جاگیریں تھیں۔ صفہ بخاری کا احترام کرتے تھے۔ جیپ کی ٹنکی پٹرول سے فل اور جیپ کے اندر سامان سے فل تھی۔ مگر شبانہ سیاہ عبایا اور اسکارف لپیٹے مسلسل ہدایات میں مصروف تھی۔ ملازمہ امیر بی بی اپنی بھابی شبو کو نخبہ کی خدمت کے لیے لائی تھی۔ وہ دونوں بھی وہی موجود تھیں......شبانہ بار، بار اس کو سمجھاتی، تلقین کرتی، شبو نے پھر وعدہ دُہرایا۔
"شبانہ باجی، فکر نہ کریں......میں صبح آٹھ بجے سے پہلے آجاؤں گی اور جب نخبہ باجی کہیں گی جاؤں گی۔"
"اری......تو نے واپس جانا نہیں ہے، جب تک ہم نہ آجائیں تو اِدھر ہی رہے گی۔" شبانہ کو غصہ آگیا۔
"ہاں باجی، میں بھول کے کہہ گئی ہوں میرا مطلب ہے تب سوؤں گی۔" شبو نے جلدی سے تصحیح کی۔
نخبہ جب صفہ کو ملنے بڑھی۔ دائیں اور پھر بائیں معانقہ کر کے پیشانی پر بوسے کا ہلکا سا اشارہ کر کے مسکراہٹ لاتے ہوئے پوچھا۔
"کیا محسوس کر رہی ہو؟"
نخبہ کا ہاتھ تھامے پس منظر میں سبز سائے کے نیچے بکھری ہوئی کرسیاں جہاں بچے قرآن کے سپارے پڑھنے آتے تھے۔ بڑے گملوں اور شیڈ کے نیچے سیڑھیوں پر مجموعی نگاہ ڈالنے کے بعد صفہ بولی۔
"پیچھے کی کھچ آگے کا تجسس......پلٹ کر اپنے ٹھکانے میں جا بیٹھنے کی لپک......ایک بڑی ملاقات کی کشش......کچھ پا لینے کی بے تابی......موت بھی ایسے ہی ہوتی ہے ناں......روحانی سطح پر۔" چند ثانیے دونوں ساکت رہیں۔
"پیچھے والوں کی خیر ہو......" شبانہ نے سکوت توڑا۔
"سفر پر جانے والوں کی خیر ہو......" نخبہ نے لمبی سانس چھوڑی۔
"عبداللہ کہاں گیا ہے؟" شبانہ کی نظروں میں تلاش اُبھری۔
"ابھی آتا ہے، کچھ لینے گیا تھا۔"
"عبداللہ کا خاص خیال رکھنا......" شبانہ کی تاکید، ماں کو بیٹے کے خیال رکھنے کی تلقین عجیب تھی۔ وہ پھاٹک سے نکل کر جیپ میں ابھی نہیں بیٹھی تھیں کہ...... عبداللہ سائیکل پر سوار نزدیک آکر رکا۔ شبانہ اسے بھینچ کر ملنے لگی۔ یہ منظر خاصا جذباتی تھا، گیٹ کے چھوٹے دروازے میں امیر بی بی، شبو اور نخبہ تھیں، صفہ نے...... عبداللہ کے سر پہ ہاتھ رکھا زیرِ لب دعا دی......سامنے ایک خاتون جس نے خریداری کے شاپرز اٹھائے ہوئے تھے، سیاہ چشمہ اور سر پہ دوپٹا تھا۔ اِدھر دیکھتے ہوئے رک گئی۔ وہ طارم کی امی تھی۔ اس نے سڑک کراس کر کے اُدھر آنے کی جلدی کی۔ صفہ جیپ میں سوار ہو چکی

تھی۔ شبانہ جو بیٹھنے کو تھی، اس سے پوچھا۔
"بخاری بی بی کہاں جا رہی ہیں؟" یقیناً آس پاس والوں کا تجسس برحق تھا، بخاری بی بی کو کبھی کسی نے گھر سے باہر نکلتے نہ دیکھا تھا، جانے شبانہ نے کیا جواب دیا، وہ مطمئن ہوئی یا نہیں مگر جیپ کے آگے بڑھنے تک پیچھے دیکھنے والوں میں وہ بھی شامل رہی۔
سفر کا آغاز ہوگیا۔ میدانی علاقے کے مناظر مانوس اور خوشگوار تھے۔ شہریار منگریو وقفے، وقفے سے تھر کی خشک سالی و دیگر معلومات دیتا رہا۔ اس کی نالج کافی تھی، کہہ رہا تھا۔
"سندھ کے 29 ضلعوں میں سے ایک تھرپارکر ہے، اصلی لفظ تھل پار کر تھا۔" اذان معلومات میں... بھرپور دلچسپی لے رہا تھا۔ شبانہ کو بھی دلچسپی تھی، اس کی فطرت سیکھنے، جاننے کی تھی مگر صفہ کا اندازِ فکر جدا ہوتا۔ وہ ہر عمل کو کائناتی سطح پر رکھ کر سوچتی تھی......عرصہ بیس سال بعد وہ باہر نکلی اور اس طرح لمبا سفر کر رہی تھی۔ بہت کچھ اچھوتا، نیا سبق آموز، کچھ سکھانے، سمجھانے والا، غور کروانے والا لگ رہا تھا۔ آبادیاں، گھر، بازار، انسانوں کی مصروفیات، گاڑیوں کی ہر نوع کی آمدو رفت، چہروں کے انبار اور ان کے پیچھے کہانیوں کے انبار...... مسجدیں جو سب کی سب خاموش اسرار جیسی لگتی تھیں، دیواروں پر لکھے جملے، بل بورڈ، عورت کی عریانی کی داد طلبی، انسان اور وقت کا آپس میں ٹکراؤ، عدم نبھاؤ، دونوں کی خود غرضی آشکار تھی......پھر کہیں، کہیں قبرستان آجاتے، وہ تو پل میں گزر جاتے مگر ان کا پیغام دور تک ساتھ رہتا، یہ وہی لوگ ہوں گے جو اس قریبی آبادی میں کسی نہ کسی گھر میں رہتے ہوں گے، آبادی، گھر، گلیاں موجود ہوں گی اور ان کا ناموجود ہونا کسی کے لیے تنکے برابر زوال کا باعث نہ ہوا ہوگا، جب فرعون جیسا طاقتور، صدیوں کا حکمران مرا تو قرآنی الفاظ ہیں۔ "زمین روئی نہ آسمان" یعنی نیچے والے غمگین ہوئے نہ فرشتے اور ارواح......
"او جی...... پانی میں کیڑے، مینڈک کے بچے، چھان لینے سے کیا جراثیم مرجاتے ہیں......ایسی، ایسی بیماریاں ہوتی کہ جن کا علاج نہیں......علاج تو وہاں بخار کا بھی میسر نہیں......"
منگریو کی آواز مسلسل آئے جا رہی تھی پھر اذان نے درمیانی شیشے کھینچ دیے اور شبانہ اور صفہ کے درمیان کی خاموشی نمایاں ہونے لگی وہ جمعے کی نماز ادا کر کے روانہ ہوئے تھے، مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں جب میرپور خاص پہنچے۔ مٹھی ابھی دور تھا، انہیں تو مٹھی سے بھی آگے جانا تھا۔ خیرپور میں رات کا قیام تھا، کسی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے منگریو نے بندوبست کروا رکھا تھا۔
"ویسے ہم کیوں جا رہے ہیں؟ جانا ہی تھا تو سیر والے علاقوں میں جاتے۔" یہ سوال شبانہ کے ذہن سے کود کر زبان پر بارہا آتا مگر وہ روک لیتی۔ اسے ایسا سوال کرنا تھا تو تب کر لیتی جب صفہ نے پہلی بار بتایا کہ انہیں تھر جانا ہے۔
کھانا کھا کر عشا کی نماز ادا کر کے سب سو گئے۔
صبح کا سفر جلد آغاز کرنا تھا۔ صبح ہوئی سب نے باری، باری غسل کیا......نماز اور ناشتے کے بعد جیپ میں جا بیٹھے جوں ہی جیپ چلی اندازہ ہونے لگا کہ اب مناظر کی فلم بدل گئی تھی۔ زیادہ تر خشک اور بنجر میدان، اِکا دُکا سرسبز جھاڑیاں، ببول کے درخت، کھجوریں، بھیڑ بکریوں کے ریوڑ، گدھا ریڑھے، اونٹوں کی قطاریں......مٹھی تک پہنچتے گول چھتوں والی جھونپڑیاں اور گھونگٹ کاڑھے محنت کش عورتیں دکھائی دینے لگی۔
کہاں اکتوبر اور نام کی حد تک اختتام گرما اور کہاں جوبن پر پڑنے والی یہ گرمی......جس کا اکتوبر سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ گرمی اور پانی کی قلت کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار تھے، شبانہ عورتوں کو دیکھ، دیکھ کر بڑبڑانے لگی۔
"ایک تو گرمی اوپر سے بازو بھر سفید چوڑیاں کیوں چڑھائے رکھتی ہیں۔ موٹے شوخ رنگوں کے کپڑے......انہیں کیا مصیبت ہے؟" وہ بالآخر بول اٹھی تھی۔

''وہ دیکھیں جی..... درخت پر عورت کلہاڑی لیے چڑھی ہے اب یہ کام بھی عورت نے کرنا ہے۔''

''پھپھو، یہاں عورت مرد ہوتی ہے مرد.....'' اذان نے لقمہ دیا۔

''اور مرد زنانی ہوتے ہیں۔'' وہ چڑ کر بولی۔ اذان ہنس پڑا۔ ''منگریو بھائی یہاں پر سولر بجلی بہ آسانی بن سکتی ہے۔''

''ہاں کچھ علاقوں میں ہوا ہے یہ کام..... بس دعا کریں آندھی کی شدت سے پالا نہ پڑے۔'' گاڑی چلاتے منگریو نے کہا۔

''صحرا کی آندھیاں بندے اڑا لے جاتی ہیں، بخاری باجی! زندگی اتنی مشکل بھی ہوتی ہے، میں سوچ رہی ہوں۔''

''ہاں..... ایک آرام دہ کمرے میں پاس سے تازہ پانی لے کر وضو کر کے نمازیں پڑھنا، ہم اسے کیونکر مشکل سمجھ لیتے ہیں.....'' صفہ نے پہلی بار گفتگو میں شرکت کی۔

''بات تو سولہ آنے سچ ہے..... جسے کہتے ہیں ہنڈرڈ پرسنٹ.....''

''نگر پار کر تفریحی علاقہ ہے وہاں لوگ سیر کرنے آتے ہیں.....'' منگریو کی آواز پھر کان پڑی۔

''لوجی اس لق ودق میں بھی تفریحی مقام ہیں۔''

شبانہ بولی۔

''ہاں پھپھو جی..... نخلستان بہت خوب صورت ہوتے ہیں، جہاں سبزہ ہے، پانی ہے مور اڑتے دکھائی دیتے ہیں.....'' منگریو ان کے حوصلے بلند رکھنا چاہتا تھا..... پھر وہ بائیں جانب موڑ کر جیپ کو روکنے لگا..... اذان سے کہا۔

''چائے پیتے ہیں.....'' کوئی معمولی سا چھپر ہوٹل تھا یعنی ابھی زندگی اور زندگی کے معمولات کے نشان ساتھ تھے، سب نے چائے پینے سے انکار کر دیا تھا مگر اذان اور منگریو نیچے اتر گئے تھے۔ مٹکے میں لسی رکھی تھی۔ اس پر پانی میں بھگویا ہوا لال کپڑا لپٹا تھا، شبانہ کے لیے لسی کا کوزہ لاتے اذان نے اس سے بخاری بی بی سے پوچھ کر بتانے کا کہا۔ صفہ نے انکار کر دیا۔

چائے کے گاہک کمیاب تھے۔ فرد واحد کے لیے تیار کرتے وقت لگا اس دوران مقامی بولی میں علاقے کی مشکلات زیر بحث رہیں۔ صفہ کے لیے سب سے بڑی کٹھنائی وضو، نماز کی پُرسکون ادائی کا نہ ہونا تھا۔

مٹھی تو ضلع تھا، یہاں بازار، سڑکیں، گلیاں۔ بینک، کسی عام پسماندہ ضلع کے معیار کی موجود تھیں، یہاں سے تازہ دم ہو کر اور پانی کا تازہ اسٹاک لے کر وہ ٹیڑھے میڑھے راستوں پر روانہ ہوئے، آگے جہان دیگر تھا، بے آب و گیاہ ریگ کے میلوں پر میل کم رفتاری سے طے ہو رہے تھے، پانی والی اماں تک کے سفر میں اب پانی کے سوا سوچ تھی نہ خیال نہ موضوع سخن تھا۔ وہ بولتے تو پانی کا ذکر ہوتا، فکر ہوتا، ملال ہوتا، سوال ہوتا، اب اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں عید برات شادی سب بارش ہے، یہاں بولنے والا بچہ جو پہلی بات سیکھتا ہوگا پانی ہوگا، پانی ایک جاری دعا..... ایک زندہ امید..... نہ ختم ہونے والا انتظار، بارش جو محبوبہ تھی مگر روٹھی ہوئی محبوبہ..... جس کے ہجر کی فصل بنا بوئے کاٹی جاتی، روہی کی بارش کے گیت نئے تھے، مطلب اب سمجھ آ رہے تھے، روہی کی سانولی (ساون) کتنی من چاہی، من موہنی اور من ٹھار، دھرتی کا دھن، دھرتی کا نکھار..... فضا، ہوا، صبا، نباتات، حشرات، حیوانات، حیات کی سانس، جی اٹھنے کی بشارت وہ شیشے سے باہر دیکھتے تھے اور آنکھوں میں دھوپ بھرتے تھے۔ فصلوں کا کیا سوال تھا، درخت سخت جان تھے کہ کہیں، کہیں جی رہے تھے۔ یہ منظر جگہ، جگہ نظر آتا کہ سر پر مٹی کے مٹکے رکھے عورتیں جا رہی ہیں، میلوں سنسان میں چل رہی ہیں، جتنا پانی یہ مٹکوں میں بھر کر میلوں دور سے گھر لاتی ہیں اس سے کئی گنا ہم بہا کر ضائع کر دیتے ہیں اور اسے کوئی زیاں نہیں گردانتے۔

''بخاری باجی..... میں تو اب یہ سوچنے لگی ہوں کہ یہاں کا ایک چکر ہم سب کو لگا لینا چاہیے تاکہ صحیح معنوں میں پتا چلے کہ پانی ایک نعمت ہے، اسے ضائع کرنا نقصان تو ہے ہی گناہ بھی ہے۔''

ریت کے ایک میدان میں منگریو نے جیپ روک لی۔ وہاں کچھ ہو رہا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' چہرے پر پسینے کی بہتی لکیریں صاف کرتے ہوئے اذان نے قیافہ دوڑایا۔

''یہاں کوئی کنواں ہوگا۔''

ایک رسہ تھا جسے مرد عورتوں کی قطار، رسہ کشی کے کھیل کی طرح کھینچ رہی تھی۔

''ہوالگوالو..... گڈی کو ٹھنڈا ہونے دو، نیچے اتر آؤ۔'' منگریو ببول کی چھدری چھاں میں جیپ لگا کر اترتے ہوئے بولا۔ صفہ اور شبانہ بھی نیچے اتر آئیں..... بس سائے کا ایک ٹکڑا تھا مگر وہ قطار تو دھوپ میں لگی زور آزمائی کر رہی تھی۔

''پانی کے کین ان بیچاروں کو دے دیں۔'' شبانہ نے چہرہ کھول کر سر کو ہوالگواتے ہوئے اذان کو مشورہ دیا۔

''دو کین سے ان کا کیا بننا ہے..... ہمارے پاس پانی ختم ہو جانا ہے، آگے کتنی دیر لگے کوئی پتا نہیں.....'' وہ درست کہہ رہا تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی ریت کی لہریں تھیں، اکا دکا جھاڑیاں.....

''یہاں آ کر..... ایک اور احساس بھی ہوا ہے شبانہ.....'' صفہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''وہ کیا جی.....؟'' شبانہ نے ہاتھ میں تھامی پنکھیا کا رخ صفہ کی طرف موڑا۔

''پانی..... ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔''

''میں سمجھی نہیں.....''

''پانی کا ہونا نعمت ہے، ٹھنڈا ہونا اضافی ہے، نعمت ہے..... بہ آسانی حاصل ہونا چوتھی نعمت ہے۔''

''سبحان اللہ..... بالکل سچ کہا..... راستے میں، ہم جو پانی پیتے رہے..... ٹھنڈے کا تو تصور ہی بھول گیا تھا..... بس پانی مل جائے..... لہو میں تیرتا رہے..... دل دھڑکتا رہے۔''

لوگ ان کو دور ہونے کے باوجود مڑ، مڑ کر دیکھنے لگے تھے، شاید وہ انہیں مدد گار سمجھ رہے تھے۔ منگریو انہیں اشاروں میں انکار کر رہا تھا۔

''بخاری باجی..... پانی کو ترستے مرجانا کتنا اذیت ناک ہوتا ہوگا ناں.....'' پاؤں کو جوتے کے اندر جھاڑتے شبانہ کو عجیب خیال آیا۔

''اس کے لیے صحرا ضروری نہیں.....'' کس قدر گہرا جواب تھا۔

صفہ جیپ کا دروازہ کھلا رکھ کر اندر جا بیٹھی، شبانہ ہنوز سائے میں کھڑی تھی ہاتھ کا چھجا بنا کر اوپر دیکھتے ہوئے بولی۔

رئیل اسٹیٹ ایڈوائزر
DHA. KARACHI
DHA. City Karachi
BAHRIA TOWN KARACHI
پلاٹ، مکان، دکان، بنگلوز اور فلیٹ کی خرید و فروخت کے لیے مستند نام
ریاض حسین
ایڈریس: راحت کمرشل لین 2
DHA PHASE 6 KARACHI
فون نمبر: 0300-3658964

Digitized by Google

"حکومت یہاں مصنوعی بارش کیوں نہیں برساتی..... UAE میں تو برسائی جاتی ہے۔" منگریو کو بے ساختہ ہنسی آگئی..... حالانکہ وہ صفہ بخاری کی تکریم میں گاڑی کے اندر کم آواز میں بولتا اور دھیما ہنستا تھا۔ مگر ایک چھوٹے والا یہ قہقہہ ایسا تھا جیسے سارا صحرا اس کے ساتھ مل کر ہنسا ہو..... سورج کی شعاعیں اسی ہنسی پر کچھ اور تپیں، ریگ زار نے تڑپ کر آہ بھری..... ریت کے اندر مرے ہوئے اونٹ کا ڈھانچا دبا تھا جو ابھری ہوئی ریت سا لگتا تھا۔ اس پر اب نظر پڑی تھی..... وہ ڈھانچا ہنسی کی مردہ تصویر تھا..... پانیوں کے سیراب دیس سے آنے والوں کی ہنسی کو سکتہ چھا گیا۔ کھلے ہونٹ ساکت رہ گئے، دید اس پر ٹھہر گئی۔ تو یوں پیاس جسموں کو ریت کر دیتی ہے، ایک آسمان تلے دھرتی ایک جیسی نہیں ہے۔ صحرا کا مور خود کو ریت ہوتے نہیں دیکھتا مگر جو بگولے ریت کا رقص کرتے ہیں وہ پیاسے مور کے ترستے ریزے ہوتے ہیں، دھوپ میں جل کر ہر شے دھوپ ہو جاتی ہے۔

وہ متبرک سائے ریت کے دیس میں حکم کا علم لے کر اترے تھے۔ جلتی ریت میں قیام ریت کر دیتا ہے، ہوا میں ریگ اڑتی ہے، ریگ خود کبھی نہیں مرتی، وہ ایک جگہ سے معدوم ہو کر دوسری جگہ تجسیم کر لیتی ہے مگر ریگ مارنے کا فن خوب جانتی ہے، کونپل جیسے بچے، کلیوں جیسی بی بی بچیاں، جنت کے دلبر جوان، ریت اچھالتے، ریت پر نقشِ پا ثبت کرتے، ریت کو لہو سے سیراب کرتے تھے۔ وہ منظر کب کسی عاشق غلام عشق کے دل سے محو ہوتا ہے؟ صفہ کی آنکھوں کے آنسو پیاسوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے تھے۔

☆☆☆

کھانے کی خشک اشیا کا ایک کارٹن اس نے نکلوایا اور شبانہ کو کہہ کر منگریو کو دے دیا کہ کسی سمجھدار آدمی کو سمجھا کر سب میں بٹوا دے۔ سمجھدار کی تلاش سے پہلے ان کی جانب دوڑتے ہوؤں کا ہجوم ہو گیا۔ جیسے تیسے منگریو یہ کام نمٹا کر آیا اور جیپ اسٹارٹ کر دی۔

ساری بستیاں ایک سی تھیں۔

پانی والی اماں کی بستی کب آئے گی؟ وہ کوئی ایسی ہستی ہو گی جس میں پانی کی مہک ہو گی جس کے چہرے زندہ ہوں گے جس میں پرندے بولتے ہوں گے مگر منگریو تو ہار، ہار خبردار کر رہا تھا۔ "آگے جیپ نہیں چل سکتی..... اونٹ ملے تو غنیمت ورنہ پیدل چلنا ہو گا۔"

اور "پیدل چلنا.....؟" ریت میں دبی ڈھیریاں یاد آئیں، رونگٹے کھڑے ہو گئے، الٰہی مدد..... الٰہی مدد..... میرے مددگاروں کی مدد کر....." راستہ کھونے کا خوف ہولناک تھا۔ پانی جو ہمراہ تھا کم ہو رہا تھا۔

صفہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ ہلتی رہی، پڑھتی رہی مناجات کرتی رہی، شبانہ لیٹی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔ شبانہ کے سر میں درد تھا۔ وہ سب اب خاموش ہو چکے تھے۔ کہنے کو کچھ رہ نہیں گیا تھا۔ امید اور دعا اور پھر امید..... صفہ کو دیکھ کر لگتا شاید وہ اس حالت میں جامد ہو گئی ہے۔

"ساول ہے..... ساول نظر آ رہی ہے، سبزہ نظر آ رہا ہے۔" منگریو کی آواز نے سب کے تنِ مردہ میں جان ڈال دی۔

"الحمد للہ..... صحیح پہنچ گئے ہیں، کھوہ والی وستی ہے۔ میں جیپ کھجوروں کے جھنڈ تلے لگاتا ہوں، انجن تپ گیا ہے۔ تھوڑا ہوا لگا کے پیدل چلتے ہیں..... اب دن ڈھلنے لگا ہے..... دھوپ کی شدت میں کمی ہو گی....." جیپ رک گئی، سب باری باری اترے، جیپ لاک کر کے وہ سامنے دیکھتے ہوئے مسافت کا اندازہ کر رہے تھے..... وہیں سائے میں ایک گدھا کھڑا تھا، جاندار کو دیکھ کر انہونی خوشی ہوئی۔ عصر کا سا وقت تھا مگر گرمی (کم از کم ان کے لیے) اب بھی کم نہ تھی۔ صحرا کی شام ایک دم ہوتی ہے جب سورج افق کے پار چھپ جاتا ہے۔ دونوں مرد آگے اور دونوں عورتیں پیچھے چل رہی تھیں۔ چاروں کے ہاتھوں میں پانی کی بوتلیں تھیں۔ باقی سب کچھ جیپ میں تھا۔ اس وقت صفہ ان تینوں کو دل میں دعائیں دے رہی تھی جو

اس کی خاطر تھک رہے تھے، نڈھال ہو رہے تھے صفہ اگر چہ مدتوں سے پیدل چلی نہ تھی اور ایسے راستوں سے تو کبھی پالا نہ پڑا تھا۔ مگر کوئی امنگ تھی جو ہاتھ تھامے ہوئے چل رہی تھی حوصلہ دلا رہی تھی۔ اس کا حوصلہ سب کا حوصلہ بنتا تھا۔ منگریو کا ساتھ بہت غنیمت تھا، وہ مقامی بولی سمجھ لیتا تھا، بول لیتا تھا، اب انہیں درخت اور پرندے دکھائی دے رہے تھے کنویں کے آثار واضح ہو رہے تھے مگر ایک خدشہ تھا، ہو سکتا ہے یہ بستی مطلوبہ بستی نہ ہو لیکن اذان بات کر رہا تھا۔

"شہریار بھائی..... مجھے یقین ہے بخاری بی بی ہمارے ساتھ ہے تو سب ٹھیک ہو جائے گا..... اللہ ہمیں کسی بڑی مصیبت میں نہیں ڈالے گا۔"

"حسبنا اللہ و نعم وکیل نعم مولا و نعم النصیر۔" صفہ کی آواز کان پڑی۔

ایک دم دونوں چونکے وہ اللہ کو کافی کیوں نہیں کر رہے اور کسی بندے کی طرف آس کیوں باندھ رہے ہیں، دل میں اللہ سے معافی مانگی۔

"میرا تو جی چاہ رہا ہے کنواں نظر آئے تو پانی میں نہالوں....." اذان بدن کھجاتا جا رہا تھا۔

"بلکہ پانی میں چھل ماردوں۔" (چھلانگ لگا دوں) منگریو نے ٹکڑا لگایا۔ دور مگر سامنے ایک پھونس کی جھونپڑی دکھائی دے رہی تھی۔ جیسی وہاں عام تھیں۔ مگر یہ الگ تھلگ ایک ہی جھونپڑی تھی..... اس کے آس پاس کچھ درخت تھے۔ جھونپڑی کے دروازے میں کوئی تھا جو اُن کو آتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ان کا تو یہ عالم تھا کہ اب بھوت پریت بھی مل جاتا تو کسی ذی روح کے نظر آنے کی تسلی ہوتی۔ انسانوں سے ملاقات تو بڑی خوشی تھی، یہ احساس بھی کم و بیش سب کے دلوں میں اتر رہا تھا کہ مندر ہو یا مسجد اللہ کے بندے کا اذیت میں مبتلا ہونا تکلیف دہ تھا۔ مندر یا مسجد تو تہذیبی علامتیں ہوتی ہیں۔

"بخاری باجی..... مجھے عجیب سا خیال آیا ہے، انسان کا ہر انسان سے ایک رشتہ ہے۔"

"یہ تو زمین پر پہلا رشتہ تھا....." صفہ نے جواب دیا۔

"یہ اتنا خوب صورت تھا۔ اتنا بدصورت کیسے ہو گیا؟"

"یہ شروع سے ہی خوب صورت اور بدصورت کے دونوں رخ لے کر آیا تھا۔"

"میرا خیال ہے، بدصورت اسے انسان نے کیا۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔"

"بخاری باجی، آپ کے جوتے گرم ہو رہے ہوں گے....." خود کو گھسیٹتی ہانپتی شبانہ کے اندر اس رشتے کا خوب صورت عکس تھا۔

"میں تری احسان مند ہوں پیاری..... میں یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔" صفہ نے محبت سے کہا۔

"یوں نہ کہو، احسان کیا؟ آپ تو ہماری سردار ہو، عمر بھر آپ کی محبت پائی ہے بخاری باجی! وہ سامنے آبادی قریب آ گئی ہے ان شاء اللہ وہاں پہنچ کے آپ آرام کرنا....."

"ان شاء اللہ..... اور آپ کیا وہاں پہنچ کے دھلائی صفائی پر لگ جاؤ گی۔" صفہ مسکرائی۔

"ھووو....." کسی نے دور سے تان لگائی تھی۔ پل بھر کو تو وہ سب ڈر گئے۔ چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر منگریو نے حوصلہ دلایا۔

"خیر ہے..... خیر ہے، کوئی گا رہا ہے۔" صفہ کی نگاہ ان دونوں پر پڑی، گرد سے اٹے ہوئے، جوتے ریت میں چھپے ہوئے، موٹی چادر سے سر ڈھانپے، کبھی کھول لیتے، کبھی اوڑھ لیتے، تھکن ان کے بشرے سے ہویدا تھی۔ بے آب و گیاہ صحرا ایسا پھیلا ہوا تھا کہ طے نہ ہوتا تھا۔

تھر کا مشہور گیت جو سب نے سنا ہوا تھا۔ "کھڑی نیم کے نیچے ہوں میں، ہیکلی....." ساعتوں میں گانے والی آواز کے ساتھ گونج رہا تھا۔ وہی نغمہ نہ تھا بول اور الفاظ ملتے جلتے تھے۔

"یہاں ہماری طرح کے بندے رہتے ہیں،

Digitized by Google

عورتیں بھی ہیں، بچے بھی ہیں۔ ہماری طرح گانے والے، ہنسنے، رونے والے، ہماری طرح روٹی پانی کے طلبگار...... یہ ہم سے اتنے پسماندہ کیوں رہ گئے؟“
شبانہ بولتی تھی، اذان تائید کرتا تھا۔
الٹی ٹوپی، جیسے پھونس کے مزید جھونپڑے، کھجوروں کے جھنڈ، بکریاں، بھیڑیں......اور اب مقامی بندے، بندیاں جوان کو حیرت سے دیکھتے تھے۔ رک کے دیکھتے تھے۔ منگریوان کے پاس پہنچ گیا تھا۔
وہ ان سے پوچھتا تھا”پانی واری اماں......“
وہ لوگ ڈھاٹکی بولی بولتے تھے بہت سی بولیوں کا مرکب بولی، اس کا مفہوم منگریو کے علاوہ باقیوں کو کچھ نہ کچھ سمجھ آجاتا تھا۔ انہوں نے کہا تھا ہاں، وہ یہی رہتی ہے، وہ سامنے ہے، آجاؤ تم ہمارے مہمان ہو......عورتیں شبانہ اور صفہ کی طرف راہنمائی کو بڑھیں۔ کچھ عورتوں نے کہنی کے اوپر تک سفید پلاسٹک جیسی چوڑیاں چڑھائی ہوئی تھیں اور کچھ کی صرف کلائی میں بھری ہوئی تھی۔ وہ اُدھر کو لیے جاتی تھیں جو جھونپڑی ان کو بہت دور سے دکھائی دی تھی۔ یہ وہی تھی جو کبھی اوجھل ہو جاتی اور کبھی نزدیک لگتی۔ جس کے دروازے پر سفید ہیولا دکھتا تھا جو کبھی مرد لگتا کبھی عورت......

جاتر و باتر و ماتا سی منی دیکھ لے

ترجمہ (پگڈنڈی سے گزرنے والو، میری جھونپڑی کی طرف دیکھ لو) کیا یہ آواز جھونپڑی میں رچی ہوئی تھی، اس میں سے پھوٹتی تھی۔ اس کے گردو نواح رہتی تھی، یہ عورتیں حیران کیوں نہیں ہوتیں، وہ ہیولہ اب چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہ مٹیالا ڈھیلا لبادہ اور سر پر بڑا رومال، نہ مرد معلوم ہو نہ عورت، عیسائی معلوم ہو نہ مسلم...... بس انسان، وہ اب بھی وہی اِستادہ تھی۔
جھونپڑی کی بالشت بھر چھاں میں کوئی میلی بکھری جٹاؤں والی عورت تھی۔ رنگین گھا گھرا اور خالی چٹا ہوا گاگر گود میں رکھے۔ کوئی عورت تھی، مقامی عورتوں کی ظاہری حالت سے عمروں کا صحیح اندازہ نہ ہوتا تھا وہی اس کا حال تھا۔ راستہ دکھانے والیوں میں سے ایک نے اس کو شانے سے ہلا کر کچھ کہا تھا جس کا مفہوم یہی ہوگا کہ جیپ کر جا تجھے پردیسی مہمان نظر نہیں آتے، اس نے گھونگٹ کی اوٹ سے آنے والیوں کو دیکھا پھر گود سے گاگر اتار کر دونوں کلائیاں اونچی کر کے تالی ماری۔ اس کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی، وہ اٹھ کر کدھر گئی یا نہ گئی......صفہ کی توجہ مطلق اُدھر نہ تھی شبانہ بھی ڈھیلے مٹیالے لبادے والی بڑھیا کو دیکھنے لگی تھی...... صفہ اب بالکل سامنے تھی مقابل رک گئی تھی......زمین و آسمان کے بیچ لمحوں کے کچھ ٹکے گرے، گرتے رہے، ایک طرف سوال تھا، دوسری طرف استعجاب تھا، ایک طرف شانت تھی دوسری طرف اضطراب تھا، ایک طرف ایقان تھا، دوسری طرف کرید تھی، بالآخر دوسری طرف جھک گئی۔
”مرشدی......استاذیِ من آدم...... من آدم......“
”مرحبا......مرحبا......سلام فراموش؟“
شبانہ آنکھیں پھاڑے مرشدی کو دیکھنے لگی......یہ بڑھیا جس کے بال سفید اور اُلجھے ہوئے تھے۔ سر پر دوپٹا نما بڑا رومال تھا جو کندھے کے پیچھے اطراف میں لٹک رہا تھا۔ لباس کا رنگ بدرنگ تھا۔ وقت کی دھول میں چھپ گیا تھا وہ ایک غریب، کمزور مگر پُراعتماد پُروقار بڑھیا تھی۔ وہ دوسری عورتوں سے مختلف تھی۔ اس نے گھا گھرا نہیں پہن رکھا تھا۔ لمبے چوغے اور شلوار کا لباس تھا۔ اس کی کلائیوں میں آدھی نہ پوری سفید چوڑیاں نہیں تھیں اس کے تو لمبی آستین کے چوغے میں ہاتھ بھی بہ مشکل دکھائی دیتے تھے۔
صفہ جب قدم بوسی کے لیے جھکی تو اسے بازو سے پکڑ کر سامنے کرتے ہوئے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جلال سے پوچھا۔
”میری ساری تلقین بھول گئی۔“
تو وہ پرنسپل محترمہ عائشہ صبیحہ الزہری تھی؟
(باقی آئندہ)

ناولٹ

تیرے آس پاس

عائشہ تنویر

...مول جوڑے کی ...وہ قالین پر بیٹھی ...پر کتابیں پھیلائے لکھ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے ذرا سی نظر اٹھائی۔ سامنے سے آتے قازان کو دیکھ کر بے اختیار تیزی سے چلتا قلم رک گیا۔ سلام کے الفاظ اس کے لبوں پر اٹکے رہ گئے۔ وہ ٹھٹکنی کے بعد پہلی بار اسے نظر آیا تھا۔ رملہ اسی شش و پنج میں رہ گئی کہ بچپن کی عادت کے مطابق اب بھائی کہے یا نہیں جبکہ وہ ہمیشہ کے بے پروا انداز میں تیزی سے عبید بھائی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اسے جاتا دیکھ کر وہ بھی چائے بنانے اٹھ گئی۔ وہ چائے کا شوقین تھا۔ ہر وقت پینے کو تیار رہتا۔
کچن میں جا کر ہلکی آنچ پر چائے کے لیے پانی چڑھاتے اس نے فریزر سے کباب اور نگٹس نکالنے

چاہے پھر خود ہی ارادہ بدل دیا۔ رات کے کھانے کے بعد پُرتکلف چائے پیش کرتے اسے عجیب لگ رہا تھا تو اپنے بدلتے رشتے کا سوچ کر صرف چائے لے جانا بھی بہتر نہیں لگ رہا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے امی کے خصوصی میدہ جات ڈال کر بنائے گئے خشک حلوے کا جار ٹرے میں رکھ لیا۔

امی کو ایسے حلوہ جات بنا کر رکھنے کی عادت تھی۔ جو ناشتا نہیں کرتا، اسے جاتے، جاتے حلوے کا ٹکڑا پکڑا دیتیں۔ فاران بھی اکثر آتے جاتے ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لیتا۔

چائے کی طرف سے دھیان ہٹا تو اپنے اول جلول حلیے کو بیزاری سے دیکھا۔ جب تک چائے تیار ہوئی وہ منہ دھو کر، بال سمیٹے، دوپٹا طریقے سے سر پر جمائے کچھ بہتر نظر آنے لگی۔ اس کا ذاتی خیال تھا کہ ہمہ وقت نک سک سے درست لڑکیوں کے ساتھ پڑھنے، کام کرنے والے لڑکوں کو والدین کے طے کردہ رشتے اور خاندان کی لڑکیاں عام سی لگتی ہیں۔ وہ خود کو خاص ہی رکھنا چاہتی تھی۔

کم عمری تھی یا ناتجربہ کاری..... جو وہ سب کو ظاہر سے متاثر کرنا چاہتی تھی ورنہ یقیناً جان جاتی کہ عام یا خاص ہونے کا تعلق نظر سے نہیں دل سے ہوتا ہے۔ جو دل کو بھا جائے، وہ ہر روپ میں جچتا ہے۔ جو دل کو اچھا نہ لگے، وہ کبھی نظروں سے پسندیدگی کی سند نہیں لے سکتا۔

چائے کی ٹرے اٹھائے وہ عبید کے کمرے کی طرف بڑھی تو کافی نروس تھی۔ یوں تو فاران کا آنا، جانا اور چائے پینا عام بات تھی لیکن اب انگلی میں پہنی پرانے ڈیزائن کی انگوٹھی اسے مسلسل نئے رشتے کی یاد دلاتی تھی۔ نیا رشتہ، نئے احساسات جو اندر ہی اندر اسے زیر کر گئے تھے۔ لاکھ سر جھٹکتی لیکن سوچوں کی تان بالآخر اسی نام پر ٹوٹتی۔ تائی امی نے چند دن پہلے ہی یہ انگوٹھی اپنی انگلی سے اتار کر اسے دی تھی، جسے مستقل پہننے کے لیے رملہ کو بہت سارا دھاگا لپیٹنا پڑا تھا۔

دھڑکتے دل سے وہ دروازہ ہلکا سا بجاتی اندر داخل ہوئی تو عبید اور فاران لیپ ٹاپ پر جھکے تھے۔ کسی نے اسے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ چپ چاپ چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر باہر آ گئی۔

''افسوس تمہاری سوچ پر رملہ، جو تمہیں لگا کہ جیسے ہی تم پہنچو گی فاران بھائی سگنل نہ ملنے کے بہانے سیل فون کان سے لگائے کمرے سے نکلیں گے اور افسانوی تصادم ہو گا یا عبید بھائی واش روم میں ہوں گے اور فاران بھائی موقع پا کر رومانس جھاڑیں گے۔'' خود کو ملامت کرتی وہ دوبارہ لاؤنج میں بکھری کتابوں تک پہنچی تو اپنی ہی بات پر بے اختیار ہنسی آئی۔

''بھائی بول کر ڈائیلاگز کی امید.....؟ کوئی حال نہیں میرا۔''

''تمہاری کتابوں میں لطیفے لکھے ہیں؟'' اسے اکیلے بیٹھے ہنستا پا کر اندر آتی رامین نے ٹوکنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

''لطیفہ پڑھ کر نہیں، دیکھ کر ہنسی آئی ہے۔'' رملہ نے تسلی سے چوٹ کی۔ نیا رشتہ اب تک ان کی دوستی پر اثر انداز نہیں ہوا تھا۔

''شرم کرو، تمہاری اکلوتی نند ہوں۔ گن، گن کر بدلے لوں گی۔'' وہ منہ بنا کر دھمکاتے ہوئے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

''اوہ..... تمہیں پتا ہے یہ۔ مجھے تو لگا تایا ابو نے ابھی گھر میں بتایا ہی نہیں۔'' اس نے آنکھیں پھیلاتے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا تو رامین بے اختیار ہنس دی۔ اسے رملہ کی مایوسی کا اندازہ تھا۔ تایا ابو نے جتنا اچانک اور فوری یہ فیصلہ کیا تھا۔ رسم کرنا تو دور کی بات ابھی تو خاندان بھر کو معلوم بھی نہیں ہوا تھا۔ اب بھی بڑوں کا کوئی تقریب کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ نسبت طے ہو گئی، کافی ہے۔ گھر کی ہی بات ہے۔

رملہ کی امیدوں پر اوس نہیں گری تھی بلکہ ٹھنڈے پانی کی بوچھاڑ ہوئی تھی۔ کالج، یونیورسٹی میں منگنی، نکاح کی تصاویر اکثر فرمائش کر کے منگوائی جاتیں۔

ایک لڑکی البم لاتی اور آدھی کلاس کی لڑکیاں اس پر جھکی ہوتیں۔ کپڑے، میک اپ، دولھا ہر چیز زیر بحث آتی۔ اسے اچھا منگیتر تو مل گیا لیکن لڑکیوں کو دکھانے کا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ منگنی کی تصاویر، سسرال سے آئے تحائف، منگیتر کے نام پر وہ بچپن سے نظر آتا کزن جسے اس بدلتے رشتے کا خیال بھی نہ تھا۔ اس کا قلق گھر کے بڑے نہیں محسوس کر سکتے تھے۔ گھر میں چھوٹی اور لاڈلی ہونے کی وجہ سے معمولی باتیں بھی اسے بڑی محسوس ہوتی تھیں۔

تائی امی نے شایان بھائی کی منگنی، شادی سب بہت دھوم دھام سے کی تھی۔ گھر کی پہلی خوشی تھی۔ سب نے خوب ارمان نکالے۔ رامین کا رشتہ پھپھو کے گھر ہوا تو دور اور بھائی کے دوھیال کے بہانے، رسم کے نام پر پورا خاندان جمع ہو گیا۔ اس کی باری آئی تو مٹھائی تک نہیں کھلائی۔ امی سے اس فیصلے کا پتا چلا اور پھر بعد میں تائی امی نے پیار کر کے شادی پر سب کسر نکالنے کے وعدے کے ساتھ اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر پہنا دی۔ اس کھلی ناانصافی پر وہ بس دل مسوس کر رہ گئی۔ تایا ابو کے سامنے کسی کی نہیں چلتی تھی۔

''ویسے سچ بتاؤ، فاران بھائی کو تایا ابو کے اس فیصلے کا پتا ہے؟''

کچھ خیال آنے پر رملہ، رامین کے قریب ہو کر مدھم آواز میں پوچھنے لگی۔

''ظاہر ہے، اب اتنے ظالم ابو بھی نہیں ہیں میرے کہ بنا پوچھے، بتائے رشتہ طے کر دیں۔'' رامین نے گویا اس کی عقل کا ماتم کیا۔

''بس ایسے ہی، ابھی گئے ہیں ناں عبید بھائی کے کمرے میں، تو دیکھ کر خیال آ گیا۔'' اس کی شرمندہ سی نظروں پر وہ خفیف سی ہو کر بولی تھی۔

''بے فکر رہو، امی نے اسی مقصد کے لیے اگلے ہفتے گھر میں قرآن خوانی رکھی ہے۔ سب کو باضابطہ طور پر بتا دیں گی۔''

رامین کو اچانک اپنے آنے کی وجہ یاد آئی تو اس کی تسلی کروانے پوچھ بھی لیا۔

''میں آئی بھی اسی لیے تھی۔ چچی اور امی وہاں قرآن خوانی کا دن فائنل کر کے بیٹھی ہیں۔ میں نے سوچا تمہیں بھی بتا دوں کہ کوئی کلاس یا پریکٹیکل وغیرہ نہ ہو۔''

''جب فائنل ہی کر لیا تو اب جو بھی ہو، آ ہی جاؤں گی۔''

رملہ نے کچھ جل کر جواب دیا تھا۔ باہر سے دو نظر آتے یہ گھر اندر سے ملے ہوئے تھے۔ سب گھر والے ادھر سے اُدھر گھومتے رہتے۔ اب بھی کافی رات ہو گئی تھی لیکن امی، تایا کے گھر تھیں تو فاران بھائی اور رامین ادھر تھے۔ صرف ابو اور تایا ابو جلدی سونے کے عادی تھے۔ حصہ بھابی اور شایان بھائی کی اپنی روٹین تھی۔ کبھی گھومنے چلے گئے، موڈ ہوا تو سب کے ساتھ بیٹھ گئے۔

''منہ اٹھا کر نہ چلی آنا۔ ویسے تو قرآن خوانی ہی ہے لیکن امی نے پھپھو کی سسرال تک کو بلا لیا ہے۔ ڈھنگ سے تیار ہونا۔'' رامین نے تنبیہ کی۔

''اچھا۔ اُسی لیے اتنی فکر ہو رہی ہے۔ تم تیاری کرو، وہ تمہاری سسرال ہے۔'' رملہ نے شوخی سے اچھا کو کھینچ کر لمبا کر دیا۔ اتنے میں فاران، عبید کے کمرے سے نکلا تھا۔ کام ہو گیا، کہیں جانے کی جلدی نہیں تھی سو انہیں دیکھ کر وہیں بیٹھ گیا۔

''تم لوگ اتنی رات کو کیا میٹنگ کرنے بیٹھ گئے۔'' صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے اس نے آرام سے پوچھا تھا۔ اس کا انداز پہلے جیسا ہی تھا۔ رملہ کی طرح اس نے نئے رشتے کو سر پر سوار نہیں کیا تھا۔

''آپ کی منگنی کی قرآن خوانی رکھ رہی ہیں امی۔'' رامین نے چہک کر اطلاع دی۔

''منگنی کی قرآن خوانی؟ یہ کیا ہوتی ہے۔'' فاران پہلے بھونچکا رہ گیا پھر شرارت سے جگمگاتی آنکھوں سے کہا۔

''شاید امی کو لگتا ہے، ابو نے کسی بلا سے میرا رشتہ طے کر دیا ہے جو قرآن پڑھ کر حفاظت کی دعا مانگ رہی ہیں۔''

رامین زور سے ہنسی تھی جبکہ غصے میں تمام لحاظ

Digitized by Google

بھلائے رملہ میدان میں اتری۔

"جی نہیں، تائی امی نیک روح کی آمد کے قابل بنا رہی ہیں اپنا گھر۔"

"واہ، واہ..... تمہیں اپنے بارے میں ہمیشہ ہی اتنی خوش فہمیاں رہتی ہیں یا کچھ مخصوص اوقات ہیں۔" فاران نے اس کے سرخ چہرے سے محظوظ ہوتے بظاہر سادگی سے پوچھا تھا۔

وہ "ہونہہ" کر کے رہ گئی۔

لاؤنج کے دروازے سے امی نے اندر آتے ہوئے ان سب کو جلدی سونے کا مشورہ دیا تھا۔ یوں یہ محفل تتر بتر ہو گئی۔

☆☆☆

"تم چھٹی ہی کر لینا یونیورسٹی کی۔"

حفصہ آپی نے سکون سے مشورہ دیا۔ امی نے بھی سر اثبات میں ہلایا تھا، گویا وہ آپی سے متفق تھیں۔ صبغہ نے جھک کر پلیٹ سے مونگ پھلی اٹھائی۔ بلاوجہ چھٹی اس کی عادت نہیں تھی لیکن اپنی بہن اور ماں کے مزاج سے واقف تھی۔ اس کا صاف انکار انہیں خصہ دلا دیتا۔ اس کی امن پسند طبیعت بلاوجہ کی بحث سے الجھتی تھی سو مسکرا کر تسلی کروائی۔

"چھٹی سے کیا فائدہ، میں یونیورسٹی سے جلدی آ جاؤں گی بلکہ سیدھی آپ کے گھر ہی آ جاؤں گی پھر تو رات تک ہی واپس آئیں گے ناں۔"

"ویسے بھی فاران کا رشتہ تو آپ نے کر دیا، اب ان کی خدمتیں کرنے کا کیا فائدہ۔" امی کی بات پر صبغہ نے قدرے چونک کر افسوس سے سر ہلایا۔

"امی، فاران بھائی کے رشتے سے میرے جانے کا کیا تعلق؟ خالہ کا اور بہن کا گھر ہے، میری دوست ہے، اس لیے جاتی ہوں۔ رشتہ لینے نہیں جاتی۔ پھر پورے خاندان کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں ایک گھر میں دو بہنیں نہیں بیاہتے، رشتہ تو کبھی ممکن ہی نہیں تھا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تیز ہوا۔ آپی نے اسے گھورا تھا۔

"تمہارے بھلے کے لیے ہی کہہ رہی ہیں، پتا ہے یہ رشتہ نہیں ہو سکتا، نہ تمہارے لیے رشتوں کی کمی ہے لیکن ابو نے اپنے بہن بھائیوں میں سے کسی کے ہاں کر دیا تو ساری زندگی مکان کے کرایوں اور آٹے، دال کی قیمت میں الجھی رہو گی۔" انہوں نے تیز لہجے میں یاد کروایا تھا۔

"پیسہ خوشی کا ضامن نہیں ہوتا۔" صبغہ نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔

"چھوڑو بھی، بلاوجہ دونوں آپس میں الجھ رہی ہو۔ میں نے تو یوں ہی ایک بات کہہ دی تھی، اتنی حسین اور ذہین میری بیٹی ہے، چھان پھٹک کر رشتہ کروں گی۔"

امی نے بیزاری سے بات ختم کی، بلاوجہ ماضی کے ورق الٹے جاتے، دودھیال اور ننھیال کا مقابلہ ہوتا، یہ موضوع ختم کرنا بہت مشکل تھا۔ یہ سچ ہی تھا کہ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرتی صبغہ کی موہنی صورت کے طلبگار بہت تھے۔ بھانجا تھا تو ایک بات کہہ دی ورنہ ان کا مزاج بہت اونچا تھا۔ سچ ہی ہے، خون کی کشش بہت سی چیزوں کو بھلا دیتی ہے۔

☆☆☆

قرآن خوانی کا دن رملہ کو معلوم ہو گیا تھا۔ ارادہ تھا کہ اس دن یونیورسٹی سے چھٹی کی لیکن ایک دن پہلے ہی سر نے مڈٹرم کا ٹیسٹ کلاس ٹائمنگ کے بعد آخر میں لینے کا اعلان کر دیا۔ ٹیسٹ نہ دینے کی صورت میں امتحان میں نمبر کٹتے سو طوعاً و کرہاً اسے جانا ہی پڑا۔

ٹیسٹ سے ایک دن پہلے وہ ٹیسٹ کی تیاری سے زیادہ اپنی تیاری میں مصروف تھی۔ قرآن خوانی میں پہننے کے کپڑے نکال کر اچھی طرح استری کر کے رکھے۔ یونیورسٹی کی تیز دھوپ میں خوار ہو کر کھلی ہوئی جلد پر ملتانی مٹی لگائی۔

اگلے دن جس وقت وہ یونیورسٹی سے تھکی ہاری گھر آئی تو سہ پہر ہو رہی تھی اس نے بیزار نظر تایا ابو کے گھر میں کھیلتے بچوں پر ڈالی، جن کی مائیں اندر بیٹھی تلاوت کر رہی تھیں اور وہ شرارتیں کرنے کو آزاد تھے۔ بچ کا

دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے ان کے گھر میں بھی آرام سے دندناتے پھر رہے تھے۔ اس کا سر بری طرح دکھ رہا تھا، بھوک سے حشر خراب تھا۔ ایسے میں اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے بچوں کو نکال کر دروازہ بند کیا پھر کچن میں جا کر اپنے پیٹ میں دوڑتے چوہوں کا علاج دریافت کیا۔ کمرے میں آئی تو آنکھوں پر بس نیند سوار تھی۔ رات سوتے، سوتے کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس نے حسرت سے اپنے صاف ستھرے بستر کو دیکھا، پانچ منٹ بھی آرام کرنے لیٹ جاتی تو دو گھنٹے سے پہلے آنکھ کھلنے والی نہ تھی۔

شاور کے نیچے کھڑے ہو کر ٹھنڈے پانی کی بوچھاڑ سے اس نے خود کو فریش کیا اور کپڑے بدل کر جانے کو تیار ہوئی۔ میرون رنگ کا خوب گھیر دار کلیوں والا فراک پہن کر وہ سج گئی تھی۔ ریشمی، سیدھے بالوں میں برش کرتے خود کو آئینے میں دیکھا۔ اچھی خاصی لگ رہی تھی۔ مزید کسی تیاری کا موڈ نہیں ہوا تو وہ ایسے ہی دوپٹا سر پر ٹکائی باہر نکل آئی۔

دروازہ کھول کر باہر نکلی تو پہلا سامنا فاران سے ہی ہوا۔

"تم اب آ رہی ہو؟ سپارہ پڑھا نہیں اور سولہ سنگار پورے۔"

اس نے فوراً ٹوکا۔ یہ میرون رنگ کا اثر تھا یا فراک کے گھیر کا جو اسے وہ باقاعدہ تیار لگی۔

رملہ نے تنک کر اسے دیکھا۔ اتنی تھکی ہونے کے باوجود وہ شرکت کرنے آ رہی تھی، اس پر یہ طنز و تشنیع۔ اگر اچھی ہی لگ رہی تھی تو بندہ ڈھنگ سے تعریف ہی کر دیتا ہے۔

"ابھی آئی ہوں یونیورسٹی سے میں، سپارے کی فکر نہ کریں۔ پڑھ کر ہی جاؤں گی۔" نروٹھے پن سے کہتا وہ اندر چلی گئی، فاران نے بھی زیادہ نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ کب آتی ہے، کب جاتی ہے۔ اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ پر تو سامنے نظر آئی تو بول دیا۔

رملہ بیرونی دروازے سے ہی تائی امی کے بڑے سے ڈرائنگ روم کی طرف آئی تھی۔ صوفے دیواروں کے ساتھ لگا کر فرش پر چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ قرآن پاک مکمل پڑھا جا چکا تھا۔ چند خواتین کے ہاتھ میں سپارے اور کچھ کے ہاتھ میں یٰسین شریف تھیں۔ بعض فارغ بیٹھی دھیمی آواز سے باتوں میں مصروف تھیں۔ مسکرا کر سب کو زیر لب سلام کرتے وہ اندر آ کر ایک یٰسین شریف لے کر پڑھنے بیٹھ گئی۔ تمام عزیز، رشتے دار موجود تھے۔ اس کے بنا کسی سے ملے یوں پڑھنے بیٹھ جانے پر شاید کچھ لوگ معترض بھی ہوتے۔ مگر وہ فرداً فرداً سب کو سلام کرتی تو پڑھنے والی خواتین تنگ ہوتیں اور آوازوں سے محفل کا تقدس پامال ہوتا۔ لوگوں کو مطمئن کرنے سے ضمیر مطمئن کرنا بہتر تھا۔

عصر کی اذانیں ہونے ہی والی تھیں۔ تائی اماں نے سب سے تلاوت جلدی ختم کرنے کا کہہ دیا تا کہ نماز کے بعد مغرب تک میلاد بھی پڑھ لیا جائے۔ مغرب کی نماز کے بعد کھانا لگا دیا جاتا۔ یہ تایا ابو کا حکم تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں اسے آواز دے کر تائی اماں اور امی نے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ اپنے میکے والوں سے اس کا تعارف فاران کی منگیتر کے طور پر کروا رہی تھیں۔ یوں تو سب ہی سے واقفیت تھی لیکن اب بالخصوص پیاری ہے، کیا پڑھ رہی ہے، شادی کب ہے قسم کی باتیں اسے الجھن میں مبتلا کرنے لگیں تو رامین کی مدد کا بہانہ کر کے وہاں سے کھسک گئی۔ رامین حسب توقع بہت اطمینان اور فرصت سے لاؤنج میں بیٹھی صبغہ سے باتوں میں مصروف تھی۔

"تم کب آئیں؟"

اسے دیکھ کر رامین نے وہیں بیٹھے ہوئے پوچھا تھا جبکہ صبغہ کھڑے ہو کر تپاک سے گلے ملتے اس سے اتنی دیر سے آنے کی وجہ دریافت کر رہی تھی۔

صبغہ ان کی ہی ہم عمر تھی۔ رامین کی خالہ کی بیٹی اور حفصہ بھابی کی بہن ہونے کی وجہ سے رملہ اسے بخوبی جانتی تھی۔

"آج یونی ضرور جانا تھا۔ ابھی ہی آئی ہوں۔ تم

Digitized by Google

دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟“

آرام سے نرم صوفے میں دھنستے اس نے جوابی سوال کیا۔

”امی نے میلاد پڑھنے کا کہا ہے۔ اب میں نعتوں والی ڈائری دیکھ رہی تھی۔“ رامین نے گود میں دھری ڈائریوں اور کتابوں کا ڈھیر دکھایا۔

”تم بہت سی نعتیں پڑھنا صبغہ، تمہاری آواز بہت پیاری ہے۔“ رملہ نے فرمائش کی، صبغہ کھل کر مسکرائی۔ رملہ نے بغور اس کے دائیں گال پر پڑتا بھنور دیکھا تھا۔

وہ اپنی امی طلعت آنٹی کی طرح بہت حسین تھی۔

تائی امی، دادی کی بھانجی تھیں۔ ان کے خاندان میں بہت خوب صورتی تھی۔ جبکہ تایا ابو اور ابو، دادا کی طرح عام سی صورت شکل کے مالک تھے۔ دادی کا ارادہ تائی امی کے بعد چھوٹی بہن طلعت کو بھی بہو بنانے کا تھا۔ باقاعدہ منگنی کے بغیر بھی سارا خاندان طلعت کو رملہ کے ابو حسن کی نسبت ہی مانتا تھا۔ کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ ان ہی دنوں ان کے محلے میں ایک نیا خاندان آکر آباد ہوا۔ صغیر کو دیکھا تو طلعت کو اندازہ ہوا، مرد بھی اتنے وجیہہ ہو سکتے ہیں کہ نظر ہٹانا مشکل ہو جائے۔ ان کی حسن پرست طبیعت عجیب سی بے چینی کا شکار ہو گئی۔ حسن سے بچپن کی دوستی پر معمولی صورت حاوی ہو گئی۔ صغیر کا رشتہ طلعت کے لیے آیا تو شاید دروازے سے لوٹا دیا جاتا...... شریف، باکردار، خوشحال اور رشتے دار حسن کے مقابلے میں ان کا پلڑا بہت ہلکا تھا۔ جب کمزور معاشی حیثیت کے ساتھ ذمے داریوں کا بوجھ بھی ہو تو مرد کی وجاہت کوئی معنی نہیں رکھتی مگر بیٹی کی ضد نے والدین کو مجبور کر دیا۔

انہوں نے طلعت کا رشتہ صغیر سے کر دیا۔ دادی سے معذرت کر لی۔ بظاہر سب کو یہی کہا کہ ایک گھر میں دو بیٹیاں دیتے کیا، کیا وہم آ رہے ہیں لیکن حقیقت سب کو معلوم تھی۔

دادی کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ انہوں نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کر کے اس بات کو ہنسی خوشی پی جانا چاہا لیکن دل میں گڑا کانٹا نہ نکلا۔ صغیر کو دیکھ کر وہ جان گئی تھیں کہ ظاہری حسن ان کی خالص محبت کو ہرا گیا۔

اگرچہ خاندان سے باہر شادی کا رواج نہ تھا لیکن انہوں نے دل سے کسک نکالنے کے لیے کنوئیں میں بانس ڈلوا دیے۔ حسن کے لیے طلعت کی ٹکر کی حسین دلہن ڈھونڈی اور اس کی شادی سے پہلے اپنے گھر بہو لے آئیں۔ رملہ کی امی آمنہ بیگم خوب صورت ہی نہیں، خوب سیرت اور خوش اخلاق بھی تھیں۔ دنوں میں سب کے دل میں گھر کر لیا۔

حسن اور طلعت کی نسبت کی بابت بھی انہیں معلوم ہوا لیکن شوہر کی محبت اور اعتبار نے زیادہ سوچنے کا موقع نہ دیا۔ دادی جان نے شروع سے ہی دونوں بھائیوں کے الگ، الگ پورشن کروا دیے تھے تاکہ کوئی چپقلش پیدا نہ ہو اور محبتیں قائم رہیں۔

طلعت بہن کے گھر آتیں تو ان کا آمنہ یا حسن سے کم ہی سامنا ہوتا۔ بس تقاریب میں آنا جانا باقی تھا۔ ان کے شوہر، صغیر بہت وجیہہ، تہذیب یافتہ مگر مزاجاً سخت انسان تھے۔ کم، کم ہی سسرال والوں کو لفٹ کرواتے۔

گزرتے وقت کی دھول تلے یہ بات بیٹھ گئی تھی۔ دادی جان کے انتقال کے بعد تو کوئی گھر میں اس کا تذکرہ بھی نہ کرتا لیکن رملہ جب بھی صبغہ کو دیکھتی تو اسے دادی سے سنی باتیں یاد آ جاتیں۔ یہی خیال آتا کہ پریوں جیسی حسین لڑکی کے لیے شہزادہ کہاں سے آئے گا۔ مزاجاً وہ اپنی والدہ کے برعکس بہت دھیمی، عاجز اور خوش اخلاق تھی۔ غرور نام کو نہیں تھا۔ رملہ کو وہ بہت پسند تھی۔ اب بھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رملہ اس کی بلیچ بے داغ جلد پر غور کر رہی تھی کہ فاران نے اندر داخل ہوتے ہوئے صبغہ کو پکارا تھا۔

وہ اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ رامین ساری کتابیں اندر رکھنے گئی تو اکیلی بیٹھی رملہ کی پوری توجہ صبغہ اور فاران کی طرف ہو گئی۔

فاران اب جاب کر رہا تھا لیکن صبغہ اسی کی یونیورسٹی میں، اسی ڈیپارٹمنٹ میں پڑھ رہی تھی تو اکثر

مدد لے لیتی۔ فاران کے جونیئرز، صبغہ سے سینئر تھے، وہ ان سے کہہ دیتا تو کتابوں اور اسائنمنٹ کے سلسلے میں کافی مدد مل جاتی۔ یہ سب رملہ جانتی تھی لیکن اس وقت کم از کم ان کا موضوع نوٹس نہیں تھا۔ عبید، فاران اور صبغہ ہنستے مسکراتے جانے کون سے لطیفے ڈسکس کر رہے تھے۔ عبید اور صبغہ کو شرارت سے کچھ کہتے فاران کی آنکھوں کی شوخی وہ اتنی دور سے محسوس کر رہی تھی۔ دل بے وجہ غصے سے بھرنے لگا۔ منگیتر کی فکر نہیں اور کزن سے گپیں لگا رہے ہیں۔ افسوس ہو رہا ہوگا کہ اتنی حسین کزن کو چھوڑ کر ابو نے اپنی پسند سے منگنی کر دی۔ ہونہہ......

رامین کی آواز پر اندر جاتے اس نے ایک نظر دوبارہ اس کونے پر ڈالی تھی۔ وہ تینوں ابھی تک محوِ گفتگو تھے۔

میلاد پڑھنے کے بعد کھانا کھا کر سب اپنے گھروں کو جانے لگے۔ طلعت آنٹی اور صبغہ ابھی یہیں تھیں۔ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد تسلی سے چائے پیتے انہوں نے شایان بھائی کو گھر ڈراپ کرنے کا کہا تھا۔ شایان بھائی نے کسلمندی سے گھڑی دیکھی اور انگڑائی لے کر تھکاوٹ کا اظہار کیا۔ اندھیرا ہو رہا تھا، اس وقت تائی امی کبھی انہیں رکشا، ٹیکسی سے نہ جانے دیتیں۔ فاران نے بھائی کے موڈ کا اندازہ کرتے خود ہی آفر دی۔

”آپ رہنے دیں بھائی، میں اور عبید چھوڑ آتے ہیں۔“

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، شایان بھائی خوش ہو گئے۔ حصہ بھابی نے قدرے ناگواری سے میاں کا جان چھڑانے والا انداز دیکھا لیکن چپ ہی رہیں۔

”بھائی، ہم بھی چلتے ہیں، راستے سے آئس کریم کھائیں گے۔“ آنٹی اور صبغہ سے پہلے رامین جوش سے کھڑی ہوئی اور ساتھ ہی رملہ کا ہاتھ کھینچا۔

”مہربانی آپ کی، کوئی نہیں جا رہا۔“

حصہ بھابی کو دوپٹا ٹھیک کرتے دیکھ کر فاران کو امیدواروں کی تعداد کا اندازہ ہوا اور اس نے فوراً ہری جھنڈی دکھائی۔

”چچ، چچ جیسی نیت، ویسا پھل۔ آئس کریم کھانے کے بجائے مجھے چھوڑنے جاتیں تو میں ہی آئس کریم کھلا دیتی۔“ صبغہ نے شوخی سے کہا تھا۔ رامین برا سا منہ بنا کر حسبِ عادت ”ہونہہ“ کر کے رہ گئی۔

راستہ خوشگوار ماحول میں کٹا تھا، اترتے ہوئے صبغہ نے ان دونوں کو آئس کریم آفر کی تو وہ بخوشی اندر آ گئے۔

طلعت کو قدرے حیرت ہوئی تھی۔ خاندان میں ان کے علاوہ سب ہی کے پاس سواری تھی، ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی گھر چھوڑنے آ جاتا لیکن صغیر صاحب کے پُرتکلف رویّے کے باعث اندر آنے سے گریز ہی کرتا۔ یوں تو وہ کوئی بدمزاج شخص نہ تھے لیکن معاشی تفاوت اور رشتوں کا فرق تھا کہ وہ طلعت کے رشتے داروں سے رسمی انداز میں ملتے۔ دوسری طرف سے بھی کوئی ایسی گرمجوشی نہ دکھائی جاتی کہ تکلف کی دیوار گرتی۔

وہ سب اندر داخل ہوئے تو صغیر انکل سامنے ہی بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ فاران اور عبید کے ساتھ طلعت بھی وہیں بیٹھ گئیں۔

صبغہ نے آئس کریم نکال کر کانچ کی خوب صورت پیالیوں میں ڈالی، چاکلیٹ سیرپ سے ٹاپنگ کی، ٹرے سجا کر سرونگ سے پہلے شرارت ذہن میں آئی تو تصویر لے کر رامین کو بھیج دی۔

تصویر رامین کے ساتھ بیٹھی رملہ نے بھی دیکھی۔ اپنے خیالات وہ خود نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ صبغہ اور باقی سب سے لاکھ دوستی و محبت کے باوجود آج اسے دادی جان کی کہی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ صبغہ کا بے پناہ حسن اور فاران سے بڑھتی دوستی اسے ماضی کا ٹوٹا رشتہ یاد دلا رہی تھی۔ کبھی خیال آتا کہ اچھا ہی ہے کہ باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی اگر رشتہ ختم ہوا تو برداشت کرنا آسان ہوگا، پھر اپنی منفی سوچوں پر خود کو سرزنش کرنے لگتی۔

فاران کو صبغہ سے ہی شادی کرنی ہوتی تو اسے کون منع کرتا۔ مشکل یہ تھی کہ اپنی الجھن وہ کسی سے بیان بھی نہیں کر سکتی تھی۔ تصویر دیکھتے سرسری سا تبصرہ کیا۔

”اب صبغہ آنے جانے لگی ہے تو فاران بھائی سے بھی اچھی دوستی ہو گئی ہے۔“ سیل پر انگلیاں چلاتے صبغہ کو

Digitized by Google

جواب دیتے، رامین نے اس کی بات بے پروائی سے سنی۔
''ہمیشہ سے تو پڑھائی کے پیچھے پاگل ہے وہ، اب انجینئرنگ یونیورسٹی میں چلی گئی ہے تو سکون ملا ہے۔ حفصہ بھابی کی شادی کے بعد سے ہی آنے لگی ہے۔''
منہ بنا کر اس نے جواب دیا تھا۔ یہ حقیقت تھی، وہ تینوں ہم عمر اور ہم جماعت تھیں لیکن اپنے کیریئر کے لیے سب سے سنجیدہ صبغہ ہی تھی۔ رملہ بھی اچھا پڑھتی تھی جبکہ رامین کو تو کوئی شوق ہی نہیں تھا۔ شروع سے آرٹس مضامین رکھ کر اب وہ بی اے کر رہی تھی۔ کہنے کو ریگولر تھا لیکن ہفتے کے تین دن چھٹی کرتی رملہ نے بہت زور لگایا کہ اپنی پسند کے مضامین میں ہی اس کے ساتھ آنرز کے لیے آجاتی، ڈیپارٹمنٹ الگ سہی، یونیورسٹی تو ایک ہوگی لیکن اس کی اپنی دلچسپیاں بہت تھیں۔ رامین کا بے نیاز انداز دیکھ کر اس نے بھی فالتو خیال ذہن سے جھٹکے اور اپنی باتیں کرنے لگی۔
تھوڑی دیر کمپنی دینے کے خیال سے طلعت ساتھ بیٹھیں لیکن جب سیاست، تعلیم، کاروبار سے ہوتے ہوئے امن وامان کے تمام مسائل تک وہ تمام مرد حضرات بات کرتے چلے گئے تو وہ بھی بور ہو کر اٹھ گئیں۔ فاران جم کر بیٹھا تھا۔ بات سے بات نکالتے ان تینوں کے درمیان سے اجنبیت کی دیوار کافی حد تک گر گئی تھی۔ گویا صغیر انکل کا تو فاران اور عبید سے باقاعدہ تعارف آج ہی ہوا۔ فاران، طلعت کا بھانجا ہے اور عبید اس کا کزن، یہ تو وہ جانتے تھے لیکن اب فاران کی ڈگری سے لے کر جاب تک سب جان گئے تھے۔
ان کزنز کا فرنیچر بنانے کا خاندانی کاروبار تھا۔ جسے ترقی دے کر اب کارخانے کے ساتھ شوروم تک پھیلا لیا تھا۔ کارخانے میں شایان بھائی، تایا ابو کے ساتھ ہوتے جبکہ شوروم عبید، ابو کے ساتھ چلا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ ایم بی اے بھی کر رہا تھا۔ سالوں کی معلومات گھنٹوں میں ملی تھیں۔ صبغہ بظاہر اپنے کاموں میں مصروف تھی لیکن تھوڑی دیر بعد لاؤنج کا چکر لگا لیتی۔ اپنی بے ساختہ مسکراہٹ پر قابو پانے پر اسے کافی جتن کرنے پڑ رہے تھے۔ آج ہی تو فاران نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ جب چاہے کسی کا بھی بہترین دوست بن سکتا ہے۔ وہ صغیر انکل کے خاندان والوں سے فاصلے کم کروائے گا۔ پہلے ہی دن ایسی شاندار کارکردگی دیکھ کر اس نے بڑا سا انگوٹھا کھڑا کر کے اسے سراہنے کو پیغام بھیجا تھا۔

☆☆☆

''دیکھ لے، تیری خاطر مجھے کیا، کیا کرنا پڑ رہا ہے۔'' رات گئے اپنے گھر کی طرف گاڑی دوڑاتے فاران نے احسان جتلایا۔ ریڈیو ٹیون کرتے عبید پر چنداں اثر نہ ہوا۔
''داغ تو اچھے ہوتے ہیں'' سے وہ ''تجھے یاد نہ میری آئی، کسی سے اب کیا کہنا'' پر پہنچا تھا۔
''جب کچھ کر لو تو بتانا، اصل محاذ باقی ہیں ابھی۔'' عبید نے بے نیاز انداز میں کان سے مکھی اڑائی۔
''اس اصل مورچے میں کون ہے، جس کا تمہیں ڈر ہے۔'' کچھ نہ سمجھتے ہوئے فاران نے طنز سے پوچھا تھا۔ عبید کی بے پروائی اسے کھل رہی تھی۔
''ایک تو تیری طلعت آنٹی سے خدشہ ہے، دوسرا تیری چچی جو اپنی بھتیجی کو ہی بہو کے روپ میں دیکھ رہی ہیں۔''
عبید نے بدستور مصروف رہتے ہوئے نشاندہی کی۔ بدلتے چینل پر اب ''اے دل کسی کی یاد میں ہوتا ہے بے قرار کیوں'' نشر ہو رہا تھا۔ عبید نے چند لمحے رک کر گانا سنا تھا۔ فاران نے تپ کر ریڈیو آف کرتے اسے گھورا۔
''سچ کہا، میری ہی آنٹی، چچی ہیں۔ تمہیں تو کچرے سے اٹھایا تھا، تمہاری سنے گا کون؟''
اس کے چڑ کر بولنے پر عبید زور سے ہنسا تھا۔ اس کے ہنسنے پر فاران مزید چڑ گیا۔
''بس کر یار، تجھ جیسے بندے کو تو اس کھڑاگ میں الجھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ خود تو کچھ کرتا نہیں، مجھے خوار کروا دیا ہے۔''
''کروں گا یار، وقت آنے پر سب کروں گا۔ ابھی

ہمارے پلان پر چل۔ پتا ہے ناں کون ہوں میں؟''
''سالا کہیں کا۔'' بے اختیار بولتے فاران کو ہنسی آگئی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے دوستوں کی محفل میں یہ لفظ اس کی زبان پر کثرت سے چڑھ گیا۔ آپس میں اکثر ہی بول دیتا۔ ایک دن غلطی سے تایا ابو نے سن لیا پھر تو جو دونوں کی کلاس ہوئی۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ بہ مشکل جان بچا کر نکلے تھے۔ آئندہ کے لیے اس لفظ سے توبہ کر لی۔ رملہ سے رشتہ ہوتے ہی فاران نے عبید کو بانگ دہل کہا تھا۔
''اب تو تم میرے سالے ہی ہو گے ناں۔''
''بس کہتے وقت یہ خیال رکھ لیا کر کہ کوئی سن نہ رہا ہو۔''
''تم رملہ سے بات کیوں نہیں کرتے، وہ راہ ہموار کرے۔'' فاران کو خیال آیا تھا۔ عبید نے سر جھٹکا۔
''پہلے تو وہ رامین کو بتائے گی، رامین، تائی امی کو اور وہ حفصہ بھابی کو، رائے ہموار نہیں ہوگی، بڑے، بڑے پہاڑ آ کھڑے ہوں گے۔''
اس کے کڑی سے کڑی جوڑ کر زنجیر بنانے پر فاران ہنسا۔
''اب ایسا بھی حال نہیں، تم اچھے بھلے سیٹ ہو، چچی جان کے کسی کا نام لینے سے پہلے اپنی پسند پہنچا دو، انہوں نے خود کچھ فائنل سوچ لیا تو منع کرنا اچھا نہیں ہوگا۔''
اب فاران کا ذہن دوسرے ٹریک پر چل رہا تھا۔ عبید نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر سر سیٹ کی پشت سے لگا کر آنکھیں موند لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے نظر آتے ایک منظر نے چہرے کو خوب صورت مسکراہٹ سے روشن کر دیا تھا۔

☆☆☆

شایان بھائی کی شادی کیا تھی، ایک جشن تھا۔ سارا خاندان خوش تھا۔ عبید اور فاران نے مل کر خوب رونق لگائی تھی۔ ایک ہی گھر تھا۔ شایان سب کا بڑا بھائی تھا لیکن مہندی کی رسم میں لڑکی والوں کے گھر پہنچ کر عبید کو بھائی کہنے اور ہونے کا فرق معلوم ہوا تھا۔ صغیر صاحب، تایا ابو اور ابو سے ملے تو حفصہ کے کزنز نے

خوب صورت دھوکا
عشق کی فسوں گری اور عاشقوں کے درمیان دلچسپ معرکہ آرائی آخری صفحات پر **نشور ہادی** کا پُرفکر انداز
روایت گزیدہ
ماضی کے پوشیدہ گوشوں......اور بند دریچوں میں پنہاں راز د نیاز...... تاریخی صفحات پر **زویا اعجاز** کے قلم کی روانی
رنگ آسماں
زہریلے سانپوں اور گہری چالوں پر مشتمل خوفناک اور عبرت ناک واقعات کا سنگم......**اے آر راجپوت** کے خیالات کی پرواز
وقت
خوشگوار مستقبل کی آس اور کربناک ماضی کی بھول بھلیوں میں گم شدہ لمحات کا احاطہ کرتے وقت کی مکاریاں۔ **حسام بٹ** کے قلم کا جادو

اس کے علاوہ
تنویر ریاض، شاہ زین رضوان اعتزاز سلیم وصلی، جاوید مرتضیٰ، علی اختر، منظر امام، سلیم انور کی خوبصورت کہانیاں

شایان و فاران کا استقبال کیا۔ عبید سے ان کا مکمل تعارف تھا نہ عبید شکل سے ان کا بھائی لگتا تھا۔ ہر جگہ حفصہ کے اکلوتے دیور کی وجاہت کے چرچے تھے۔

عبید اپنے ددھیال کی طرح عام سی صورت کا مالک تھا۔ ماں کا حسن نہیں لیا تھا۔ شایان اور فاران اپنے ننھیال کی طرح وجیہہ تھے۔

نکاح مہندی کے دن ہی کر کے شایان اور حفصہ کو اسٹیج پر لا کر بٹھایا گیا تو رسمیں شروع ہوئیں۔ وہ سب اسٹیج پر ہی ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ عبید، تائی امی کی بات سننے نیچے آیا تھا۔ اسٹیج پر اب حفصہ کی سہیلیاں جا رہی تھیں۔ وہ ایک طرف کھڑا تھا، جب کانوں سے کسی کی آواز ٹکرائی۔

''جوڑی تو ماشاء اللہ بہت شاندار ہے، بہت خوب صورت داماد ڈھونڈا ہے تم نے۔''

عبید نے ذرا سا رخ پھیرا تھا۔ طلعت آنٹی اور صبغہ کسی خاتون کے ساتھ کھڑی تھیں۔ صبغہ نے اس کا پلٹنا نوٹ کیا تھا۔ عبید نے فوراً نظروں کا رخ بدلا۔ گو صبغہ کے لیے اس کے دل میں شروع سے ہی نرم گوشہ تھا لیکن وہ نظر باز نہ تھا۔ ایسے گفتگو سننا بہت معیوب تھا مگر اتنے رش میں آگے پیچھے کہاں ہوتا۔ وہ خواتین خود اتنی بلند آواز میں بات کر رہی تھیں کہ اسے صاف سنائی دے رہا تھا۔

''بس اللہ کا شکر ہے، مجھے تو یوں ہی جوڑی اچھی لگتی ہے۔ یہ کیا کہ لنگور کے پہلو میں حور ہو۔ ان شاء اللہ ...اپنی صبغہ کے لیے بھی شہزادہ ہی ڈھونڈوں گی۔''

زبان سے اللہ کا شکر ادا کرتے بھی طلعت آنٹی کا لہجہ تفاخرانہ تھا۔ ساتھ والی خاتون نے بھی محسوس کیا تو دل جلانے والے انداز میں نصیحت کی۔

''یہ تو نصیب کی بات ہے۔ شکل سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اللہ بچیوں کو خوش رکھے۔ اب حسن اور آمنہ کو ہی دیکھ لو۔ شکل کا عام سہی لیکن بیوی پر جان دیتا ہے۔ صغیر بھائی جیسا رو کھے مزاج کا یونانی دیوتا ڈھونڈنے کا فائدہ؟''

صبغہ نے ناگواری سے آنٹی کو دیکھا۔ عبید کی موجودگی کا احساس تھا اور اپنے والد پر تبصرہ بھی برا لگا مگر لحاظ میں چپ رہ گئی۔ الفاظ چابک کی طرح طلعت کے دل پر لگے تھے۔ جانے لوگوں کی یادداشت اتنی تیز کیوں ہے۔ دل دکھانے والی بات سات نسلوں کو سنائیں گے۔ حسن اور آمنہ کا تقابل ان سے کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ مزاج ان کا بھی تیکھا تھا، غصے کی لہر نے عقل پر قابو پالیا اور وہ تڑپ کر بولیں۔

''رہنے دو اب، ایسی شکل پر حسین بیوی مل گئی تو واری صدقے ہی ہونا ہے۔ ٹکر کا جوڑ ہو تو پتا چلے۔''

شیطان قہقہے لگانے لگا، غیبت، بدکلامی، دل آزاری، بدگمانی.....ایسی محافل سے ایسے ہی تحفے ملتے تھے۔ مہندی جیسی غیر شرعی رسم کو نکاح کا شرعی لباس پہنا دیا تھا۔ اس مخلوط محفل میں شیطان اپنی کارستانیوں کے لیے آزاد تھا۔

صبغہ کی ساری ناگواری، شرمساری میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کی اپنی ماں کسی کو موضوعِ گفتگو بنا رہی تھی۔

اتنے برے انداز میں اپنے والدین کی ذاتی زندگی کا ذکر ٹھنڈے مزاج عبید کو بھی طیش دلا گیا تھا۔ وہ غصے سے پلٹا مگر بدمزگی کے خیال سے لب بھینچ لیے۔ صبغہ نے بوکھلا کر اس کا رنگ بدلتا چہرہ دیکھا تھا۔ ہتھیلی پر دوسرے ہاتھ سے مکا مارتے وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔

صبغہ نے شرمندگی اور تشویش سے اسے جاتے دیکھا تھا۔ اگر اس وقت وہ جذباتی ہو جاتا تو کوئی بھی مسئلہ بن سکتا تھا۔ وہ اسے ڈھونڈتے پیچھے آئی تھی۔

''عبید بھائی، بات سنیں۔'' صبغہ نے سامنے آ کر انگلیاں چٹخاتے مخاطب کیا۔

''جی فرمائیں۔''

اس کی طرف دیکھے بنا عبید نے روکھے لہجے میں کہا۔

''آئم سوری پلیز، میں معذرت کرتی ہوں۔ وہ دراصل آنٹی نے یوں انکل اور ابو کا موازنہ کیا تو امی ایسا کہہ بیٹھیں، ورنہ ہم سب انکل، آنٹی کی بہت عزت کرتے ہیں۔ آپ پلیز بھول جائیں اسے۔'' نظریں جھکائے، سوچ، سوچ کر بولتے اس نے کسی اچھی بیٹی کی

طرح اپنی ماں کا دفاع کیا تھا۔

عبید نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ سیاہ بالوں کے ہالے میں اس کا حسین چہرہ دمک رہا تھا۔

عبید کی نظریں محسوس کر کے اس نے پلکیں اٹھائی تھیں۔ سیاہ آنکھوں میں امید و بیم کا تاثر تھا۔ ہزار بار کا دیکھا چہرہ آج نیا لگ رہا تھا۔ عبید نے بے اختیار سر جھٹک کر خود کو اس ساحرہ کے سحر سے آزاد کروانا چاہا۔

''ہم.....م، ٹھیک، تم جاؤ یہاں سے۔'' بہ مشکل ہم سے الفاظ کہتے عبید نے اسے ٹہلایا تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے مڑ گئی تھی۔ یہ پہلی نظر کی محبت نہیں تھی۔ وہ بچپن سے اسے رامین اور رملہ کے ساتھ دیکھتا آ رہا تھا یہ سوچ سمجھ کر اس کی خوبیوں سے کی جانے والی محبت یہ نہیں تھی۔ یہ لمحوں کا جادو تھا۔ وہ اپنے چہرے پر تکی سیاہ آنکھوں میں مقید ہو گیا تھا۔ اس پل کا سحر توڑنا آسان نہ تھا۔ اسے اسیر کر دینے والی اپنے قیدی سے انجان تھی۔

اس کے بعد شادی، ولیمے میں بھی صبغہ اسے دیکھ کر سادگی سے مسکرائی تھی مگر اس کا ذہن اس مسکان کے نت نئے معنی اخذ کر کے اسے بہلاتا رہا۔ ایک طرف وہ تازہ تازہ حادثہ تھا۔ دوسری طرف کل دیکھا گیا آئینہ، وہ صبغہ جیسی حسین لڑکی کے مقابلے میں کچھ نہ تھا۔

عبید نے دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا۔ حفصہ بھابی کی شادی اور صبغہ کے یونیورسٹی میں ایڈمیشن نے اس کا آنا جانا زیادہ کر دیا تھا۔ بار، بار اسے دیکھ کر عبید کے دل کی جوت جھل اٹھتی۔

ایک دن شام میں وہ اسے اپنے گھر کے مشترکہ لان میں اکیلی نظر آئی۔ رامین شاید اندر چائے لینے گئی تھی۔ موتیے کے پودے پر جھکی، وہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی۔

''آپ کو بھی خوب صورتی متاثر کرتی ہے؟'' عبید نے پاس آتے سرسری سا کہا تھا۔ وہ سیدھی کھڑی ہو گئی۔

''خوب صورتی کسے اچھی نہیں لگتی مگر موتیے کی خوشبو پسند ہے، جو تمام پھولوں کے حسن پر حاوی ہے کردار و عادات کی خوب صورتی انسان کے ظاہر پر حاوی ہو جاتی ہے۔''

موتیے کی کلیاں چنتے، مسکرا کر اس نے تفصیلی جواب دیا تھا۔ اس دن والی بات وہ بھولی نہیں تھی۔

''اور محبت، میرا مطلب ہے شریکِ حیات محبت کرنے والا ہو تو اس کی شکل صورت کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے ناں۔''

عبید نے تصدیق چاہی، پچھلی باتوں کے پردے میں وہ اپنے دل کی تسلی چاہ رہا تھا۔

''محبت میں شکل صورت ثانوی نہیں ہوتی بلکہ محبوب کی صورت ہی اچھی لگتی ہے۔ جیسے ہر ماں کو اپنا بچہ اچھا لگتا ہے۔ حسن کے پیمانے سب کے الگ ہیں۔ آپ کو گلاب پسند ہے، مجھے موتیا تو فرق صورت کا نہیں ہمارے پیمانے الگ ہیں۔''

موتیا کے پھول چہرے کے پاس لے جا کر ایک طویل سانس لے اس نے خوشبو اندر تک اتاری اور اپنی طرف سے تشفی بخش جواب دیا تھا۔ وہ انکل کے یوں موضوعِ گفتگو بننے پر اب تک شرمندہ تھی۔ عبید نے پورے دل سے اسے دیکھا تھا۔

''میں بہت عام سا ہوں مگر آپ کو کیسا لگتا ہوں؟ آپ کے پیمانے پر پورا اترنا چاہتا ہوں۔''

یوں اظہار صبغہ کو ششدر کر گیا تھا..... شرمانا، گھبرانا، غصہ کرنا کچھ یاد نہیں آیا تھا۔ وہ پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھ رہی تھی۔ ٹھیک ہے بات چیت نہیں ہوتی تھی، قریبی تعلق نہیں تھا لیکن آمنا سامنا تو ہو ہی جاتا تھا۔ یہ بچپن سے نظر آنے والے عبید بھائی کا انداز تو نہ تھا۔ چند لمحے کے لیے دل کی دھڑکن رک گئی تھی پھر دل کے زور، زور سے دھڑکنے کی آواز پر وہ گھبرا کر اندر بڑھ گئی تھی۔ ہاتھوں کے پیالے میں بھری ساری کلیاں زمین پر گر گئیں۔ عبید نے گردن موڑ کر اسے جاتے دیکھا اور پنجوں کے بل بیٹھ کر تمام کلیاں اکٹھی کر کے صبغہ کے انداز میں خوشبو اندر تک جذب کی تھی۔ محبت تھی یا نہیں لیکن ایک تعلق قائم ہو گیا تھا۔ خوشبو کا تعلق، خوشبو جو بنا نظر آئے روح تک میں تازگی

Digitized by Google

بھر دیتی ہے۔

☆☆☆

صبغہ اس رات گھر آ کر دیر تک عبید کے جملوں میں الجھی رہی۔ اس نے ہمیشہ تعریف ہی سنی تھی مگر سادہ سے الفاظ میں یوں تعریف کی چاہ نہیں سنی تھی۔ سادگی جو پوری شدت کے ساتھ اپنی سچائی کا ثبوت دیتی ہے۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا، نیت میں کھوٹ نہیں۔ محبت صورت، ذہانت یا فطرت سے متاثر ہونے کا نام نہیں۔ محبت کا طوفان پسند، ناپسند کے سارے پیمانے توڑ دیتا ہے۔ محبوب کی خامیاں دل کی نظروں سے اوجھل ہی رہتی ہیں۔ یہ ممکن اور ناممکن کا کھیل نہیں تھا۔ وہ عبید کے بے ریا لہجے میں ڈوب گئی تھی۔ کونپل پھوٹ گئی تھی۔ دل سرمستی سے آنکھیں موندے اس نئے احساس کے خمار سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا، دماغ ہوشیار پہریدار کی طرح ''فاصلہ رکھنے'' کا درس دے رہا تھا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی، راہ کی کٹھنائیاں گنواتے دماغ کی بھی اس نے سن لی۔ محبت کر لی مگر صحنِ دل کے ایک کونے میں چھپا لی، اس کی خوشبو بھی باہر نہیں نکلنے دی مگر آنکھوں کا کیا کرتی جو دل کا ہر منظر منعکس کر کے بھانڈا پھوڑنے کے درپے تھیں۔ آخر نظریں جھکا کر، کترا کر گزر جانا ہی حل ٹھہرا۔

☆☆☆

اس کے بعد بھی صبغہ اسے کئی بار نظر آئی مگر بات کا موقع نہ ملا۔ وہ خود بھی خاموشی سے اندر شور مچاتے جذبوں کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ کچھ ہی عرصے میں اسے یقین آ گیا تھا، یہ وقتی کشش نہ تھی۔

اب اسے قدم بڑھا کر محبت حاصل کرنی تھی۔

صبغہ کا گریز اسے برا نہیں لگا تھا۔ اس نے [illegible]

سے کتنے ہی چکر اس کی یونیورسٹی کے لگا لیے۔ پہلے آنکھیں بولیں پھر لبوں کا قفل ٹوٹا۔ عام سی باتوں کے دوران بہت کچھ ان کہا بھی سمجھا گیا۔

صبغہ کو والدین کی خوشی کا پاس تھا تو عبید نے بھی اسے اپنی عزت ہی جانا تھا۔ مکمل اکرام کے ساتھ اس کے ہمراہ چلنا چاہتا تھا اور اپنے پیاروں کی خوشی بھی عزیز تھی۔ یوں قدم بہ قدم چلتے پہلے وہ دونوں گھرانوں کے درمیان قائم ان دیکھی خلیج پاٹنا چاہتے تھے۔

☆☆☆

اتوار کے دن دوپہر کا کھانا بنانا رملہ کی ذمے داری تھا۔ اسی لیے کھانا اکثر سہ پہر کو ہی ملا کرتا۔ اس وقت بھی تین بج گئے تھے۔ وہ اب بریانی دم پر رکھ کر رائتہ، سلاد تیار کر کے کچن میں چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ لاؤنج میں سبزیاں پھیلائے امی کی ڈانٹ بیک گراؤنڈ میوزک کی طرح جاری تھی۔ پورے ہفتے کی سبزی وہ اتوار کو صاف کر کے رکھ لیتیں۔ اس نے اور عبید بھائی نے گیارہ بجے ناشتا کیا تھا، ابو گھر میں نہیں تھے۔ سو اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ سکون سے کام میں لگی تھی۔ فاران آدھا گھنٹے پہلے ہی عبید کے کمرے میں گیا تھا۔ جاتے، جاتے راستے میں امی سے ملا تو رملہ کو کچن میں دیکھ کر معصومیت سے کھانے کے بارے میں پوچھ لیا اور شرارت سے چمکتی آنکھیں لیے سنجیدگی سے بتایا کہ وہ عبید کے بلانے پر دوپہر کا کھانا ہی کھانے آیا ہے۔ بس یہی غضب ہوا، امی کا مزاج برہم ہو گیا۔ رملہ کی سستی انہیں بری طرح کھلنے لگی۔ تیزی سے ہاتھ چلاتے کام تقریباً پورا ہو گیا تھا، جب اسے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

ایسا انہونا بھی نہیں تھا کہ وہ شاک میں آ جاتی۔ اپنا کام پورا کر کے اس نے ٹرے میں جوس کا پیک اور گلاس سجائے اور باہر نکل آئی۔

''السلام علیکم، کیسی ہو؟ آج تم لوگ کیسے اِدھر نکل آئیں؟''

تپاک سے ملتے وہ اپنی حیرت ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

''تمہاری باکمال کوکنگ کے جوہر دیکھنے آئے تھے، تم یہ بازاری جوس اٹھا لائیں۔ فریش جوس ہی پلا دیتیں۔''

رامین مزے سے کہتی خود آگے بڑھ کر جوس گلاسوں میں ڈالنے لگی۔ خود اس کے لیے تو کھانا پکانا مشغلہ تھا۔ دن رات نت نئے تجربے کرتی رہتی جبکہ رملہ مارے باندھے ہی کھانا بناتی۔

''بے فکر رہو، آج تمہاری قسمت کھل گئی ہے۔ میرے آرٹسٹک ہاتھوں کا ذائقے دار کھانا بالکل تیار ہے۔'' صبغہ کے ساتھ بیٹھتے رملہ نے اسی انداز میں جواب دیا۔ رامین سے گلاس لے کر صبغہ کو دیا پھر میز پر بکھری سبزی دیکھ کر کچھ خیال آنے پر بولی۔

''تم لوگ میرے کمرے میں چلی جاؤ، میں کھانا وہیں لے آتی ہوں۔ کیا بھائی لوگوں کو بھی کمرے میں ہی دے دوں؟'' آخر میں امی کی طرف رخ کر کے اس نے سوالیہ پوچھا تھا۔

تیزی سے کریلے کاٹتے امی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''نہیں، ہم یہیں ٹھیک ہیں۔ مجھے دراصل فاران بھائی سے کام تھا۔ تم انہیں بتا بھی دو کہ میں پڑھنے آ گئی ہوں۔''

صبغہ نے جلدی سے کہا تو رامین نے جوس کی چسکیاں لیتے سر ہلایا۔

رملہ لمحے بھر کو ٹھٹکی، صبغہ اور فاران کی بڑھتی دوستی دوبارہ یاد آئی۔

''پھر میں ڈائننگ ٹیبل پر ہی کھانا لگا لیتی ہوں۔ سب اکٹھے کھا لیں گے۔''

اس نے لمحوں میں فیصلہ کیا۔ جب وہ فاران کے لیے ہی آئی تھی تو وہ کیوں دو، دو جگہ دسترخوان سجا کر مردانہ، زنانہ الگ کرتی۔ رامین اس کی مدد کے خیال سے ساتھ ہی آ گئی جبکہ صبغہ وہیں امی سے باتیں کرنے لگی۔

میز پر کھانا لگا کر رامین لڑکوں کو بلانے گئی اور وہ لاؤنج کی طرف آ گئی۔

''کھانا لگ گیا، آپ لوگ بھی آ جائیں۔''

اس کی پکار پر امی نے صبغہ کو دیکھا۔

''جاؤ بیٹا کھانا شروع کرو، ٹھنڈا ہو جائے گا۔ بالکل تکلف نہ کرنا۔ میں آ رہی ہوں ابھی۔''

امی کے پیار بھرے انداز پر رملہ کو ہنسی آئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ اس ننھی سی بچی کو میلے میں نہ ڈرنے کا سبق پڑھا رہی ہیں۔ ہاتھ دھو کر وہ میز پر بیٹھے ہی تھے کہ فاران اور عبید بھی چلے آئے۔

''آہا صبغہ بی بی آئی ہیں۔''

اس کے پُرجوش نعرے میں صبغہ کا مدھم سا سلام دب گیا تھا۔

''قسمت دیکھو صبغہ کی، پہلی بار ہی کیا شاہکار مل رہا ہے کھانے کو، کسی اور دن آنا... پھر پتا چلے گا ہماری چچی کتنے مزے کے کھانے پکاتی ہیں۔''

بے تکلفی سے کھیرا اٹھاتے فاران نے خوشبو اڑاتی خوش رنگ بریانی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ رملہ برا منائے بغیر ہنس دی تھی۔

''خیر اتوار کو بریانی تو رملہ بہت اچھی بناتی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ باقی پورا ہفتہ فاران بھائی کیا کریں

رملہ نے سب کی موجودگی کے خیال سے چپ رہنا مناسب جانا لیکن صبغہ برجستگی سے بولی۔

''اچھی بات ہے ناں، صبر کا پھل تو میٹھا ہوتا ہے۔''

''زیادہ میٹھا بھی صحت کے لیے اچھا نہیں۔'' عبید نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ اتنے میں امی بھی آ گئیں۔ خوشگوار ماحول میں ہنستے مسکراتے کھانا کھایا گیا تھا۔

☆☆☆

اس دن حفصہ بھابی اور رامین نے شاپنگ پر جانے کے لیے فاران کو راضی کیا تھا۔ عبید اور شایان بھائی اس معاملے میں اکثر کورا جواب دے دیتے۔ اب جیسے ہی پلان فائنل ہوا، رامین رملہ کو بھی بتانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ سب محوِسفر تھے۔

''میرا ارادہ ہے، اس بار صبغہ کو اس کی سالگرہ پر سرپرائز دوں۔ کیک لے کر جاؤں گی امی کی طرف۔''

باتوں کے دوران حفصہ بھابی نے مسکرا کر بتایا۔ ان کے خاندان میں سالگرہ وغیرہ نہیں منائی جاتی تھی۔ حفصہ بھابی عادتاً صبغہ کو ہر سال تحفہ دے دیتیں۔ اس سال انہیں نیا خیال آیا۔

''پھر میں بھی چلوں گی اچھی سی سیلیبریشن ہی ہو جائے گی، تم بھی چلنا رملہ......'' رامین نے فوراً ہی ہامی بھرتے رملہ کو بھی راضی کرنا چاہا، حفصہ بھابی کی موجودگی کا لحاظ کر کے وہ صاف منع نہ کر سکی اور ''دیکھوں گی'' کہہ کر ٹال گئی۔

مال میں شاپنگ کرتے بھابی اور رامین جب بہت دیر کپڑوں کی شاپس سے ہی باہر نہ آئیں تو وہ انہیں بتا کر برابر میں جیولری شاپ پر چلی آئی۔ بیزار کھڑا فاران بھی اس کے ساتھ ہی چلا آیا۔ رملہ نے قدرے حیرت سے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔ عموماً وہ انہیں ڈراپ کر خود فوڈ کورٹ میں بیٹھ جاتا تھا۔

''تم بھی کوئی گفٹ لے لو صبغہ کے لیے، چلی جانا اس کی سالگرہ پر۔''

اس کے ساتھ جیولری اور بیگز پر نظر دوڑاتے فاران نے بظاہر سرسری سا کہا تھا۔ رملہ بات کی گہرائی تک تو نہیں جا سکی لیکن صبغہ کی اتنی فکر اسے ایک بار پھر غصہ دلا گئی۔

''میں کیوں بلاوجہ اسے تحفہ دوں، اتنے پیسے نہیں ہوتے میرے پاس۔'' رملہ نے رکھائی سے جواب دیا۔ فاران اندر ہی اندر قدرے جھنجلا گیا۔ عقل کے پورے ہیں دونوں بہن بھائی۔

''محبت بڑھتی ہے تحفہ دینے سے، تمہاری نہ سہی میری تو کزن ہے۔ کیسے کنجوسوں کی طرح پیسے کے رونے ڈال رہی ہو، عبید سے لے لینا بلکہ مجھ سے لے لو تم۔''

اس نے قدرے تندی سے کہا تھا۔ رملہ کا موڈ مزید خراب ہو گیا۔

''آپ سے کس خوشی میں لوں پیسے، میری سالگرہ پر تو کبھی تحفہ دینے کا خیال نہیں آیا۔ اپنی کزن کو خود تحفے بانٹیں، میرے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانے کی ضرورت نہیں۔'' بگڑ کر کہتی وہ دکان سے باہر کی طرف بڑھی۔ فاران نے تعجب سے اس کا انداز دیکھا، اس کی سالگرہ کا حوالہ...... یوں صبغہ پر بگڑنا، لمحے بھر کی بات تھی، بہت کچھ منکشف ہوا تھا۔ وہ بھی تیزی سے اس کے ساتھ ہی باہر نکلا۔

''رملہ چلو اوپر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' فاران نے ساتھ چلتے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ رملہ منع نہ کر سکی۔

تنے تنے تاثرات کے ساتھ وہ اس کے ساتھ ٹاپ فلور پر واقع فوڈ کورٹ تک چلی آئی۔ فاران اس دوران موبائل نکال کر رامین کو بتا چکا تھا کہ وہ دونوں اوپر جا رہے ہیں۔ فارغ ہو کر وہیں آ جانا۔

فوڈ کورٹ میں اسے کونے کی ٹیبل کی طرف جانے کا اشارہ کرتے فاران کاؤنٹر پر چلا گیا۔ جب تک وہ کھانے کو کچھ لایا، رملہ کافی مضطرب ہو چکی تھی۔ ایسی کیا بات تھی جو وہ اسے یہاں لایا۔ اسے رملہ کا صاف انکار برا لگا تھا یا واقعی اس کے دل میں چور تھا۔

''یہ لو تمہارا پسندیدہ میل (meal) ہے۔ دیکھو مجھے یاد ہے ناں! پہلی غلطی معاف کر دو، آئندہ سے ہر سال سالگرہ کا تحفہ بھی دوں گا۔'' ٹرے اس کے آگے رکھتے کرسی سنبھالتے ہوئے وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔ تر و تازہ سے چہرے پر چمکتی مسکراہٹ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ رملہ نے سرسری سا دیکھ کر نظریں چرانا بہتر سمجھا۔ اس کی باتوں کا فوری جواب نہ ملا تو اس نے وقت لینے کو بے تکلفی سے کھانا شروع کر دیا۔ فاران نے دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔ جو اسے آفر کیے بنا اتنی رغبت سے کھا رہی تھی جیسے اسی کام کے لیے آئی ہو۔

''تم صبغہ سے اتنا جلتی کیوں ہو؟'' اس نے شوخی سے اسے چھیڑا۔

''میں کیوں اس سے یا کسی سے بھی جلوں، اب اتنی بھی حسینۂ عالم نہیں ہے۔'' حسبِ توقع وہ تڑخ کر بولی تھی۔

اندر چھپا احساسِ کمتری خود بخود باہر آیا۔ فاران نے بہ مشکل ہنسی روک کر شرارت سے اظہارِ پسندیدگی کیا۔

''واقعی، اتنی بھی خاص نہیں ہے۔ ٹھیک ہے، تمہاری رنگت تھوڑی کم ہے یا ناک قدرے موٹی ہے تو کیا ہوا، مجھے تو تم ہی پسند ہو۔''

رملہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اب اس پر غصہ کرنا ہے یا شرمانا ہے۔ فوری طور پر اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تو خاموش ہی رہی۔

''صبغہ کو تحفے دینے کے لیے مجھے تمہارے کندھے کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ تمہارے بھائی کو ضرورت ہے۔ عبید، صبغہ کو پسند کرتا ہے لیکن چچی جان شاید اپنی بھتیجی وغیرہ کا سوچے بیٹھی ہیں پھر باقی خاندانی مسائل...... تمہیں تو کم از کم اپنے بھائی کی راہ صاف کرنے میں مدد کرنی چاہیے۔''

اب اس نے سیدھی بات کی تھی۔ منہ تک برگر لے جاتی، رملہ کا منہ کھلا رہ گیا۔ کیا دن آ گئے تھے، اپنے بھائی کے بارے میں بھی اسے فاران سے پتا چلنا تھا؟

جانے کیا، کیا سوچتی رہی اور نکلا کچھ اور......

''منہ بند کر لو، مکھی چلی جائے گی۔'' فاران نے اس کے سامنے ہاتھ ہلایا۔ اس نے منہ بند کرتے ہاتھ میں تھاما برگر نیچے رکھ دیا۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ فاران نے تحمل کا عظیم مظاہرہ کرتے گردن اثبات میں ہلائی۔

''یہ ایسی انہونی تو نہیں جو تم یوں ری ایکٹ کر رہی ہو۔ تم چچی جان سے بات کر لو، صبغہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بس ہماری فیملی میں یوں پسند کا نام سنتے ہی طوفان اٹھ آتا ہے۔ اس لیے عبید تھوڑا ہچکچا رہا ہے۔''

اس نے معاملے کو سلجھا کر سامنے رکھا۔

''وہ لوگ ......وہ راضی ہو جائیں گے۔ میرا مطلب ہے......'' رملہ نے جملہ ادھورا چھوڑ کر جو جاننا چاہا، فاران کو بخوبی سمجھ آیا۔ اس نے تسلی کروائی۔

''عبید میں کیا کمی ہے جو راضی نہیں ہوں گے، یوں بھی یہ صبغہ کا مسئلہ ہے۔ پہلے یہاں سے تو بات بڑھے۔''

رملہ نے بس سر ہلایا تھا۔ تصدیق ہو گئی کہ معاملہ دوطرفہ ہے۔ برائی تو کوئی نہ تھی لیکن اچھائی بھی نہ تھی۔ اس کے لیے یہ بالکل غیر متوقع سی بات تھی۔ ابھی کچھ سمجھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ سب سے پہلے تو عبید بھائی سے دو، دو ہاتھ کرنے تھے۔ اکلوتی بہن کو ایسی بات باہر سے پتا چلے تو کتنے افسوس کا مقام ہے۔ ہوگا بچپن کا دوست، یار، کزن، ہونے والا بہنوئی وغیرہ، وغیرہ لیکن فاران سے زیادہ حق اس کا تھا۔ پھر امی، ابو کے ردِعمل کا اندازہ کرنا بھی مشکل تھا۔ صرف رمشہ کے لیے منع کرنا ہوتا تو الگ بات تھی، امی نے کون سا عبید بھائی کا رشتہ طے کیا تھا مگر خاندانی رشتوں کی کھچڑی میں اس چٹپٹے اضافے کی خواہش جانے کیا رنگ لانے والی تھی۔ وہ سوچوں میں مگن تھی، فاران اس کے بدلتے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ جبھی ہنستے بولتے، رامین اور حفصہ بھابی نے آ کر نشستیں سنبھال لی تھیں۔

''آپ دونوں ہمیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ میں نے بھابی سے کہا، یہ اچھا موقع ہے فاران بھائی کی جیب خالی کروانے کا، شاپنگ چھوڑیں اور چھاپا مارنے چلیں۔'' رامین مزے سے بول رہی تھی۔

''چھوڑتے، چھوڑتے اتنا کچھ خرید لیا اگر

رملہ نے سب کی موجودگی کے خیال سے چپ رہنا مناسب جانا لیکن صبغہ برجستگی سے بولی۔
"اچھی بات ہے ناں، صبر کا پھل تو میٹھا ہوتا ہے۔"
"زیادہ میٹھا بھی صحت کے لیے اچھا نہیں۔" عبید نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ اتنے میں امی بھی آگئیں۔ خوشگوار ماحول میں ہنستے مسکراتے کھانا کھایا گیا تھا۔

☆☆☆

اس دن حفصہ بھابی اور رامین نے شاپنگ پر جانے کے لیے فاران کو راضی کیا تھا۔ عبید اور شایان بھائی اس معاملے میں اکثر کورا جواب دے دیتے۔ اب جیسے ہی پلان فائنل ہوا، رامین، رملہ کو بھی بتانے لپکی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ سب محوِ سفر تھے۔
"میرا ارادہ ہے، اس بار صبغہ کو اس کی سالگرہ پر سرپرائز دوں۔ کیک لے کر جاؤں گی امی کی طرف۔"
باتوں کے دوران حفصہ بھابی نے مسکرا کر بتایا۔ ان کے خاندان میں سالگرہ وغیرہ نہیں منائی جاتی تھی۔ حفصہ بھابی عادتاً صبغہ کو ہر سال تحفہ دے دیتیں۔ اس سال انہیں نیا خیال آیا۔
"پھر میں بھی چلوں گی اچھی سی سیلیبریشن ہی ہو جائے گی، تم بھی چلنا رملہ......" رامین نے فوراً ہی ہامی بھرتے رملہ کو بھی راضی کرنا چاہا، حفصہ بھابی کی موجودگی کا لحاظ کر کے وہ صاف منع نہ کر سکی اور "دیکھوں گی" کہہ کر ٹال گئی۔
مال میں شاپنگ کرتے بھابی اور رامین جب بہت دیر کپڑوں کی شاپس سے ہی باہر نہ آئیں تو وہ انہیں بتا کر برابر میں جیولری شاپ پر چلی آئی۔ بیزار کھڑا فاران بھی اس کے ساتھ ہی چلا آیا۔ رملہ نے قدرے حیرت سے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔ عموماً وہ انہیں ڈراپ کر کے خود فوڈ کورٹ میں بیٹھ جاتا تھا۔
"تم بھی کوئی گفٹ لے لو صبغہ کے لیے، چلی جانا اس کی سالگرہ پر۔"
اس کے ساتھ جیولری اور بیگز پر نظر دوڑاتے فاران نے بظاہر سرسری سا کہا تھا۔ رملہ بات کی گہرائی تک تو نہیں جا سکی لیکن صبغہ کی اتنی فکر اسے ایک بار پھر غصہ دلا گئی۔
"میں کیوں بلاوجہ اسے تحفہ دوں، اتنے پیسے نہیں ہوتے میرے پاس۔" رملہ نے رکھائی سے جواب دیا۔ فاران اندر ہی اندر قدرے جھنجلا گیا۔ عقل کے پورے ہیں دونوں بہن بھائی۔
"محبت بڑھتی ہے تحفہ دینے سے، تمہاری نہ سہی میری تو کزن ہے۔ کیسے کنجوسوں کی طرح پیسے کے رونے ڈال رہی ہو، عبید سے لے لینا بلکہ مجھ سے لے لو تم۔"
اس نے قدرے تندی سے کہا تھا۔ رملہ کا موڈ مزید خراب ہو گیا۔
"آپ سے کس خوشی میں لوں پیسے، میری سالگرہ پر تو کبھی تحفہ دینے کا خیال نہیں آیا۔ اپنی کزن کو خود تحفے بانٹیں، میرے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانے کی ضرورت نہیں۔" بگڑ کر کہتی وہ دکان سے باہر کی طرف بڑھی۔ فاران نے تعجب سے اس کا انداز دیکھا، اس کی سالگرہ کا حوالہ...... یوں صبغہ پر بگڑنا، لمحے بھر کی بات تھی، بہت کچھ منکشف ہوا تھا۔ وہ بھی تیزی سے اس کے ساتھ ہی باہر نکلا۔
"رملہ چلو اوپر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" فاران نے ساتھ چلتے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ رملہ منع نہ کر سکی۔
تنے تنے تاثرات کے ساتھ وہ اس کے ساتھ ٹاپ فلور پر واقع فوڈ کورٹ تک چلی آئی۔ فاران اس دوران موبائل نکال کر رامین کو بتا چکا تھا کہ وہ دونوں اوپر جا رہے ہیں۔ فارغ ہو کر وہیں آجانا۔
فوڈ کورٹ میں اسے کونے کی ٹیبل کی طرف جانے کا اشارہ کرتے فاران کاؤنٹر پر چلا گیا۔ جب تک وہ کھانے کو کچھ لایا، رملہ کافی مضطرب ہو چکی تھی۔ ایسی کیا بات تھی جو وہ اسے یہاں لایا۔ اسے رملہ کا صاف انکار برا لگا تھا یا واقعی اس کے دل میں چور تھا۔
"یہ لو تمہارا پسندیدہ میل (meal) ہے۔ دیکھو مجھے یاد ہے ناں! پہلی غلطی معاف کر دو، آئندہ سے ہر سال سالگرہ کا تحفہ بھی دوں گا۔" ٹرے اس کے آگے

[illegible] ٹرے سنبھالتے ہوئے وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔ [illegible] کے چہرے پر چمکتی مسکراہٹ بہت بھلی لگ رہی [illegible] رملہ نے سرسری سا دیکھ کر نظریں چرانا بہتر سمجھا۔ [illegible] باتوں کا فوری جواب نہ ملا تو اس نے وقت لینے کو [illegible] سے کھانا شروع کر دیا۔ فاران نے دلچسپی سے [illegible] تھا۔ جو اسے آفر کیے بنا اتنی رغبت سے کھا رہی تھی جیسے اسی کام کے لیے آئی ہو۔
"تم صبغہ سے اتنا جلتی کیوں ہو؟" اس نے شوخی سے اسے چھیڑا۔
"میں کیوں اس سے یا کسی سے بھی جلوں، اب اتنی بھی حسینہ عالم نہیں ہے۔" حسب توقع وہ تڑخ کر بولی تھی۔
[illegible] اندر چھپا احساس کمتری خود بخود باہر آیا۔ فاران نے بمشکل ہنسی روک کر شرارت سے اظہار پسندیدگی کیا۔
"واقعی، اتنی بھی خاص نہیں ہے۔ ٹھیک ہے، تمہاری رنگت تھوڑی کم ہے یا ناک قدرے موٹی ہے تو کیا ہوا، مجھے تو تم ہی پسند ہو۔"
رملہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اب اس پر غصہ کرنا بے جا [illegible] فوری طور پر اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تو خاموش ہی رہی۔
"صبغہ کو تحفے دینے کے لیے مجھے تمہارے کندھے کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ تمہارے بھائی کو ضرورت ہے۔ عبید، صبغہ کو پسند کرتا ہے لیکن چچی جان شاید ابھی [illegible] وغیرہ کا سوچے بیٹھی ہیں پھر باقی خاندانی مسائل...... تمہیں تو کم از کم اپنے بھائی کی راہ صاف کرنے میں مدد کرنی چاہیے۔"
اب اس نے [illegible] کی بات کی تھی۔ رملہ کا منہ کھلا رہ گیا۔ منہ تک برگر [illegible] کیا دن آگئے تھے، اپنے بھائی کے بارے میں بھی اسے فاران سے پتا چلنا تھا؟
"[illegible] کیا سوچتی رہی اور نکلا کچھ اور...... منہ بند کر لو، مکھی چلی جائے گی۔"
فاران نے اس کے سامنے ہاتھ ہلایا۔ اس نے [illegible] ہاتھ میں تھاما برگر نیچے رکھ دیا۔

URDU TUBE

"آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ فاران نے تحمل کا عظیم مظاہرہ کرتے گردن اثبات میں ہلائی۔
"یہ ایسی انہونی تو نہیں جو تم یوں ری ایکٹ کر رہی ہو۔ تم چچی جان سے بات کر لو، صبغہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بس ہماری فیملی میں یوں پسند کا نام سنتے ہی طوفان اٹھ آتا ہے۔ اس لیے عبید تھوڑا ہچکچا رہا ہے۔"
اس نے معاملے کو سلجھا کر سامنے رکھا۔
"وہ لوگ ......وہ راضی ہو جائیں گے۔ میرا مطلب ہے......" رملہ نے جملہ ادھورا چھوڑ کر جو جاننا چاہا، فاران کو بخوبی سمجھ آیا۔ اس نے تسلی کروائی۔
"عبید میں کیا کمی ہے جو راضی نہیں ہوں گے، یوں بھی یہ صبغہ کا مسئلہ ہے۔ پہلے یہاں سے تو بات بڑھے۔"
رملہ نے بس سر ہلایا تھا۔ تصدیق ہو گئی کہ معاملہ دوطرفہ ہے۔ برائی تو کوئی نہ تھی لیکن اچھائی بھی نہ تھی۔ اس کے لیے یہ بالکل غیر متوقع سی بات تھی۔ ابھی کچھ سمجھ بھی نہیں آرہا تھا۔ سب سے پہلے تو عبید بھائی سے دو، دو ہاتھ کرنے تھے۔ اکلوتی بہن کو ایسی بات باہر سے پتا چلے تو کتنے افسوس کا مقام ہے۔ ہوگا بچپن کا دوست، یار، کزن، ہونے والا بہنوئی وغیرہ، وغیرہ لیکن فاران سے زیادہ حق اس کا تھا۔ پھر امی، ابو کے ردِعمل کا اندازہ کرنا بھی مشکل تھا۔ صرف رمشہ کے لیے منع کرنا ہوتا تو الگ بات تھی، امی نے کون سا عبید بھائی کا رشتہ طے کیا تھا مگر خاندانی رشتوں کی کھچڑی میں اس بیٹھے اضافے کی خواہش جانے کیا رنگ لانے والی تھی۔ وہ سوچوں میں مگن تھی، فاران اس کے بدلتے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ جبھی ہنستے بولتے، رامین اور حفصہ بھابی نے آکر نشستیں سنبھال لی تھیں۔
"آپ دونوں ہمیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ میں نے بھابی سے کہا، یہ اچھا موقع ہے فاران بھائی کی جیب خالی کروانے کا، شاپنگ چھوڑیں اور چھاپا مارنے چلیں۔"
رامین مزے سے بول رہی تھی۔
"چھوڑتے، چھوڑتے اتنا کچھ خرید لیا اگر

Digitized by Google

شاپنگ کرتے تو کیا پورا مال گھر لے جاتے۔"

قدموں میں ایک طرف ڈھیر ہوئے سامان کو دیکھتا فاران پوچھ رہا تھا۔ اس کے مصنوعی تحیر کا کسی پر اثر نہ ہوا۔ رامین نے بے تکلفی سے رملہ کے سامنے سے سافٹ ڈرنک کا گلاس اٹھایا تھا۔ جبکہ حفصہ بھابی حیرت انگیز طور پر بہت خوشگوار موڈ میں فرائز ٹونگتے بھوک کی دہائی دے رہی تھیں۔ گہری سانس بھرتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

"امی مجھے صبغہ بہت پسند ہے۔ میرا دل چاہتا ہے اسے ہی بھابی بنا لوں۔" خوشگوار ماحول بنا کر موضوع تک آنے اور اتنا سا جملہ کہنے کے لیے رملہ کو کتنے دن تک انتظار کرنا پڑا تھا۔ آج بالآخر اسے موقع مل ہی گیا۔ الماری کے سامان کو سیٹ کرتے امی نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

"نہیں بھئی، میں نے تو رمشہ کو سوچا ہے۔ اکلوتی بھتیجی ہے میری۔" انہوں نے حسبِ توقع صاف انکار کر دیا۔

"رہنے دیں امی، رمشہ بھابی بن گئی ناں تو ماموں بھی بھائی نہیں رہیں گے صرف بہو کے ابا بن جائیں گے۔ آپ نے کیوں اپنا میکا ختم کرنا ہے۔"

رملہ نے اپنی طرف سے زوردار دلیل دی تھی۔ یہ جملہ تائی اماں، امی کو کثرت سے کہتیں کہ خالہ، ماں سے بڑھ کر ہوتی ہے لیکن جب ساس بن جائے تو خالہ رہتی ہے نہ ماں۔

دادی سے لے کر حفصہ بھابی تک ان کا یہی تجربہ تھا۔ اس وقت تو امی بھی زور شور سے سر ہلا دیتیں مگر اب دہل کر اسے دیکھا۔

"اللہ نہ کرے۔ بس فضول ہی بولنا تم۔ کپڑے تہ کرو جلدی۔"

انہوں نے اسے ڈپٹ دیا تو مجبوراً سست روی سے ہاتھ چلاتے بھی وہ بولنے سے نہ رکی۔

"میرا مطلب ہے کہ یہ رشتہ ہی ایسا ہے، کھٹ پٹ ہو ہی جاتی ہے۔ کوئی باہر کی لڑکی ٹھیک رہے گی۔ یہاں رمشہ کو کوئی مسئلہ ہوا تو ہمارا رشتہ ہی خراب ہو گا۔ اپنی محبتیں قائم رکھیں پھر صبغہ جیسی خوب صورت لڑکی ملنا مشکل ہے۔"

اس نے اپنے طور پر مدبر بنتے ہوئے سارا زور لگا دیا لیکن امی پر چنداں اثر نہ ہوا۔

"تو صبغہ کون سی باہر کی ہے۔ بھابی کی بھانجی لانے سے میں اپنی بھتیجی نہ لے آؤں۔ رمشہ بھی اچھی بھلی ہے۔"

"اف.....ف....." وہ زچ ہو گئی۔

"میرا خیال ہے کہ عبید بھائی بھی صبغہ کو پسند کرتے ہیں۔"

اس نے تنگ آ کر کہہ ہی دیا۔ امی نے بغور اسے دیکھا۔

"تمہیں عبید نے کہا ہے؟"

سخت لہجہ سن کر رملہ کو کچھ اور نہیں سوجھا تو سارا دھیان کپڑوں کی تہ پر لگا دیا۔ گھنٹے سے پڑا ڈھیر منٹوں میں سمٹنے لگا۔ اس کی چپ نے امی کو جواب سے آگاہ کر دیا تھا۔

انہیں افسوس سا ہوا۔ صبغہ جیسی خوب صورت، خوب سیرت لڑکی پر انہیں اعتراض نہ تھا۔ مگر مسئلہ لوگوں کی باتیں برداشت کرنا تھا۔ برسوں پہلے کی دبی باتیں بھی اُدھڑ جاتیں۔ انہیں یاد تھا کہ ان کے ولیمے والے دن طلعت خوشگوار موڈ میں مبارک باد دینے آئی تھی۔

"بہت پیاری لگ رہی ہیں بھابی، نیا گھر مبارک ہو۔"

"بھابی تو نہ بولو، حسن کے دل پر بجلی گرے گی۔" کسی نے جملہ کسا۔

"اب کیا حسن کو بھی بھائی بولو گی؟"

"حسن بھی طلعت کی ٹکر پر بیوی لایا ہے تاکہ بھائی بننے کا غم جاتا رہے۔"

فضول فقرے بازی نے دلہن بنی آمنہ کو پریشان کیا تھا تو طلعت کو غصہ دلا دیا تھا۔ بہ مشکل وہ خود کو قابو کرتے ایک طرف جا بیٹھی تھیں۔ اس کے بعد سے ان دونوں نے ہی فاصلے پر رہنے میں بھلائی جانی۔

اب اس نئی صورتِ حال نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

انہوں نے سنجیدگی کے عالم میں شوہر سے یہ مسئلہ بیان کیا۔ انہوں نے تسلی سے بات سن کر ساری سنجیدگی ہوا میں اڑا دی اور بڑے خوشگوار موڈ میں بولے۔

"عبید نے لڑکی تو اچھی پسند کی ہے۔ خاندان کی ہے پھر کب لے جا رہی ہیں رشتہ آپ؟"

آمنہ بیگم نے چڑ کر انہیں دیکھا۔ ان کی پریشانی کوئی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔

"آپ کو تو بہت خوشی ہوئی ہے۔ پرانے تعلقات بحال ہو رہے ہیں۔ لوگ کہیں گے کہ حسن نے بیٹے کی صورت اپنی حسرت نکال لی۔" انہوں نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے طعنہ بھی مار دیا تھا۔ حسن صاحب یک بیک سنجیدہ ہوئے۔

"کون سی حسرت؟ آپ کو اگر کوئی احساسِ عدم تحفظ ہے تو بات کریں۔ لوگوں کا نام مت لیں۔"

ان کا سنگین لہجہ آمنہ بیگم کو اپنی غلطی کا احساس دلا گیا۔ گزرے وقت کے طعنے مرد کی عزتِ نفس پر کوڑے کی طرح لگتے ہیں پھر وہ بے لگام گھوڑے کی طرح اندھا دھند ردِعمل دیتے ہیں۔ وہ فوراً سنبھل کر بولیں۔

"مجھے کچھ نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے اچھی زندگی گزار دی ہے۔ میں تو بس۔"

وہ شکر گزاری سے کہتی چاہ کر بھی اپنے دل میں پلتے وسوسے بیان نہ کر سکیں۔

حسن صاحب کے چہرے کے تنے ہوئے تاثرات نرم پڑے۔

"عبید ہمارا بہت سمجھدار بچہ ہے۔ کم عمری سے کام سنبھال رہا ہے۔ کبھی کسی بات پر تنگ نہیں کیا۔ ہمیشہ ہماری خوشی کا خیال کیا۔ اب ہمارا بھی فرض ہے کہ اس کے دل کی خواہش پوری کریں۔ لوگوں کا مت سوچیں۔ ویسے آپ کو کسی بات پر اعتراض ہے تو منع کر دیں۔ شایان کا رشتہ ہوا تو سب نے بھائی صاحب کو احساس دلایا کہ بھابی، بھانجی لے آئی ہیں جبکہ گھر میں بھتیجی موجود ہے۔ انہوں نے مجھ سے بات کی۔ فاران کا رملہ سے اچھا جوڑ بنا تو ہم نے رشتہ طے کر دیا پھر ہمارے ایک پرانے جاننے والے فرمانے لگے کہ آپ لوگوں نے کاروبار کی خاطر بچی کا رشتہ کر دیا۔ اب ایسے اگر لوگوں کی باتیں ہی سنتے رہیں تو ہم کبھی خوش نہ رہیں۔"

آمنہ بیگم نے حیرانی سے اپنے کم گو شوہر کی مدلل گفتگو سنی۔ یہ کچھ تو ان کے علم میں ہی نہ تھا۔

"آپ نے پہلے تو مجھے کبھی یہ سب نہیں بتایا۔" وہ بے اختیار شکوہ کر بیٹھیں۔

شایان آور حفصہ کا، رامین اور داور کا رشتہ طے ہونے پر انہیں بھی احساس ہوا تھا بلکہ کئی لوگوں کی طرف سے دلوایا گیا تھا کہ آپ خاندان کی نہیں، اس لیے آپ کے بچوں کو الگ کر دیا۔ انہوں نے کسی سے گلہ تو نہیں کیا لیکن دل میں سوچ لیا کہ وہ بھی بہو اپنی ہی بھتیجی بنائیں گی۔ یہ بات ان کے شوہر کے علم میں بھی آئی اور بھائی صاحب کے اچانک رشتہ طے کرنے کی وجہ بھی بنی۔ اس کا انہیں ابھی ہی علم ہوا تھا۔

"اس میں بتانے والی کیا بات تھی فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے کا فائدہ۔ مجھے فاران پسند نہ ہوتا تو میں کبھی رملہ کا رشتہ نہ کرتا۔ چاہے بھابی اپنی بھانجی لاتیں یا خاندانی بزنس باہر جاتا۔" انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ اپنی بیگم کے مزاج آشنا تھے سو زور دیے بنا مزید بولے۔

"بھئی آپ کی بہو، آپ کا اور آپ کے بیٹے کا دردِ سر ہے۔ مجھے تو فارغ ہی رکھیں۔"

انہیں معلوم تھا کہ سختی سے کچھ کہنے سے بہتر تھا کہ انہیں سوچنے سمجھنے کا وقت دیا جاتا۔ بیٹے کی محبت بہرحال جیت ہی جاتی۔

☆☆☆

ایک طرف رملہ کا اصرار دوسری طرف متنوع سوچوں میں الجھے انہوں نے ایک دن عبید کو جا لیا۔

"تمہیں صبغہ پسند ہے؟ رملہ کے بجائے تمہیں مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی ناں۔"

Digitized by Google

شاپنگ کرتے تو کیا پورا مال گھر لے جاتے۔"

قدموں میں ایک طرف ڈھیر ہوئے سامان کو دیکھتا فاران پوچھ رہا تھا۔ اس کے مصنوعی تحیر کا کسی پر اثر نہ ہوا۔ رامین نے بے تکلفی سے رملہ کے سامنے سے سافٹ ڈرنک کا گلاس اٹھایا تھا۔ جبکہ حفصہ بھابی حیرت انگیز طور پر بہت خوشگوار موڈ میں فرائز ٹونگتے بھوک کی دہائی دے رہی تھیں۔ گہری سانس بھرتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

"امی مجھے صبغہ بہت پسند ہے۔ میرا دل چاہتا ہے اسے ہی بھابی بنا لوں۔" خوشگوار ماحول بنا کر موضوع تک آنے اور اتنا سا جملہ کہنے کے لیے رملہ کو کتنے دن تک انتظار کرنا پڑا تھا۔ آج بالآخر اسے موقع مل ہی گیا۔ الماری کے سامان کو سیٹ کرتے امی نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

"نہیں بھئی، میں نے تو رمشہ کو سوچا ہے۔ اکلوتی بھتیجی ہے میری۔" انہوں نے حسبِ توقع صاف انکار کر دیا۔

"رہنے دیں امی، رمشہ بھابی بن گئی ناں تو ماموں بھی بھائی نہیں رہیں گے صرف بہو کے ابا بن جائیں گے۔ آپ نے کیوں اپنا میکا ختم کرنا ہے۔"

رملہ نے اپنی طرف سے زوردار دلیل دی تھی۔ یہ جملہ تائی اماں، امی کو کثرت سے کہتیں کہ خالہ، ماں سے بڑھ کر ہوتی ہے لیکن جب ساس بن جائے تو خالہ رہتی ہے نہ ماں۔

دادی سے لے کر حفصہ بھابی تک ان کا یہی تجربہ تھا۔ اس وقت تو امی بھی زور شور سے سر ہلا دیتیں مگر اب دال کرا سے دیکھا۔

"اللہ نہ کرے۔ بس فضول ہی بولنا تم۔ کپڑے تہ کرو جلدی۔"

انہوں نے اسے ڈپٹ دیا تو مجبوراً سست روی سے ہاتھ چلاتے بھی وہ بولنے سے نہ رکی۔

"میرا مطلب ہے کہ یہ رشتہ ہی ایسا ہے، کھٹ پٹ ہو ہی جاتی ہے۔ کوئی باہر کی لڑکی ٹھیک رہے گی۔ یہاں رمشہ کو کوئی مسئلہ ہوا تو ہمارا رشتہ ہی خراب ہو گا۔ اپنی محبتیں قائم رکھیں پھر صبغہ جیسی خوب صورت لڑکی ملنا مشکل ہے۔"

اس نے اپنے طور پر مدبر بنتے ہوئے سارا زور لگا دیا لیکن امی پر چنداں اثر نہ ہوا۔

"تو صبغہ کون سی باہر کی ہے۔ بھابی کی بھانجی لانے سے میں اپنی بھتیجی نہ لے آؤں۔ رمشہ بھی اچھی بھلی ہے۔"

"اُف.....ف....." وہ زچ ہو گئی۔

"میرا خیال ہے کہ عبید بھائی بھی صبغہ کو پسند کرتے ہیں۔"

اس نے تنگ آ کر کہہ ہی دیا۔ امی نے بغور اسے دیکھا۔

"تمہیں عبید نے کہا ہے؟"

سخت لہجہ سن کر رملہ کو کچھ اور نہیں سوجھا تو سارا دھیان کپڑوں کی تہ پر لگا دیا۔ گھٹنے سے پڑا ڈھیر منٹوں میں سمٹنے لگا۔ اس کی چپ نے امی کو جواب سے آگاہ کر دیا تھا۔

انہیں افسوس سا ہوا۔ صبغہ جیسی خوب صورت، خوب سیرت لڑکی پر انہیں اعتراض نہ تھا۔ مگر مسئلہ لوگوں کی باتیں برداشت کرنا تھا۔ برسوں پہلے کی دبی باتیں بھی اُدھڑ جاتیں۔ انہیں یاد تھا کہ ان کے دیبے والے دن طلعت خوشگوار موڈ میں مبارک باد دینے آئی تھی۔

"بہت پیاری لگ رہی ہیں بھابی، نیا گھر مبارک ہو۔"

"بھابی تو نہ بولو، حسن کے دل پر بجلی گرے گی۔" کسی نے جملہ کسا۔

"اب کیا حسن کو بھی بھائی بولو گی؟"

"حسن بھی طلعت کی ٹکر پر بیوی لایا ہے تاکہ بھائی بننے کا غم جاتا رہے۔"

فضول فقرے بازی نے دلہن بنی آمنہ کو پریشان کیا تھا تو طلعت کو غصہ دلا دیا تھا۔ بہ مشکل وہ خود کو قابو کرتے ایک طرف جا بیٹھی تھیں۔ اس کے بعد سے ان دونوں نے ہی فاصلے پر رہنے میں بھلائی جانی۔

اب اس نئی صورتِ حال نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

انہوں نے سنجیدگی کے عالم میں شوہر سے یہ مسئلہ بیان کیا۔ انہوں نے تسلی سے بات سن کر ساری سنجیدگی ہوا میں اڑا دی اور بڑے خوشگوار موڈ میں بولے۔

"عبید نے لڑکی تو اچھی پسند کی ہے۔ خاندان کی ہے پھر کب لے جا رہی ہیں رشتہ آپ؟"

آمنہ بیگم نے چڑ کر انہیں دیکھا۔ ان کی پریشانی کوئی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔

"آپ کو تو بہت خوشی ہوئی ہے۔ پرانے تعلقات بحال ہو رہے ہیں۔ لوگ کہیں گے کہ حسن نے بیٹے کی صورت اپنی حسرت نکال لی۔" انہوں نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے طعنہ بھی مار دیا تھا۔ حسن صاحب یک بیک سنجیدہ ہوئے۔

"کون سی حسرت؟ آپ کو اگر کوئی احساسِ عدم تحفظ ہے تو بات کریں۔ لوگوں کا نام مت لیں۔"

ان کا سنگین لہجہ آمنہ بیگم کو اپنی غلطی کا احساس دلا گیا۔ گزرے وقت کے طعنے مرد کی عزتِ نفس پر کوڑے کی طرح لگتے ہیں پھر وہ بے لگام گھوڑے کی طرح اندھا دھند ردِعمل دیتے ہیں۔ وہ فوراً سنبھل کر بولیں۔

"مجھے کچھ نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے اچھی زندگی گزار رہی ہے۔ میں تو بس۔"

وہ شکر گزاری سے کہتی چاہ کر بھی اپنے دل میں پلتے وسوسے بیان نہ کر سکیں۔

حسن صاحب کے چہرے کے تنے ہوئے تاثرات نرم پڑے۔

"عبید ہمارا بہت سمجھدار بچہ ہے۔ کم عمری سے کام سنبھال رہا ہے۔ کبھی کسی بات پر تنگ نہیں کیا۔ ہمیشہ ہماری خوشی کا خیال کیا۔ اب ہمارا بھی فرض ہے کہ اس کے دل کی خواہش پوری کریں۔ لوگوں کا مت سوچیں۔ ویسے آپ کو کسی بات پر اعتراض ہے تو منع کر دیں۔ شایان کا رشتہ ہوا تو سب نے بھائی صاحب کو احساس دلایا کہ بھابی، بھانجی لے آئی ہیں جبکہ گھر میں بھتیجی موجود ہے۔ انہوں نے مجھ سے بات کی۔ فاران کا رملہ سے اچھا جوڑ بنا تو ہم نے رشتہ طے کر دیا پھر ہمارے ایک پرانے جاننے والے فرمانے لگے کہ آپ لوگوں نے کاروبار کی خاطر بچی کا رشتہ کر دیا۔ اب ایسے اگر لوگوں کی باتیں ہی سنتے رہیں تو ہم کبھی خوش نہ رہیں۔"

آمنہ بیگم نے حیرانی سے اپنے کم گو شوہر کی مدلل گفتگو سنی۔ یہ کچھ تو ان کے علم میں ہی نہ تھا۔

"آپ نے پہلے تو مجھے کبھی یہ سب نہیں بتایا۔" وہ بے اختیار شکوہ کر بیٹھیں۔

شایان اور حفصہ کا، رامین اور داور کا رشتہ طے ہونے پر انہیں بھی احساس ہوا تھا بلکہ کئی لوگوں کی طرف سے دلوایا گیا تھا کہ آپ خاندان کی نہیں، اس لیے آپ کے بچوں کو الگ کر دیا۔ انہوں نے کسی سے گلہ تو نہیں کیا لیکن دل میں سوچ لیا کہ وہ بھی بہو اپنی ہی بھتیجی بنائیں گی۔ یہ بات ان کے شوہر کے علم میں بھی آئی اور بھائی صاحب کے اچانک رشتہ طے کرنے کی وجہ بھی بنی۔ اس کا انہیں ابھی ہی علم ہوا تھا۔

"اس میں بتانے والی کیا بات تھی فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے کا فائدہ۔ مجھے فاران پسند نہ ہوتا تو میں کبھی رملہ کا رشتہ نہ کرتا۔ چاہے بھابی اپنی بھانجی لاتیں یا خاندانی بزنس باہر جاتا۔" انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ اپنی بیگم کے مزاج آشنا تھے سو زور دیے بنا مزید بولے۔

"بھئی آپ کی بہو، آپ کا اور آپ کے بیٹے کا دردِ سر ہے۔ مجھے تو فارغ ہی رکھیں۔"

انہیں معلوم تھا کہ سختی سے کچھ کہنے سے بہتر تھا کہ انہیں سوچنے سمجھنے کا وقت دیا جاتا۔ بیٹے کی محبت بہر حال جیت ہی جاتی۔

☆☆☆

ایک طرف رملہ کا اصرار دوسری طرف متنوع سوچوں میں الجھے انہوں نے ایک دن عبید کو جا لیا۔

"تمہیں صبغہ پسند ہے؟ رملہ کے بجائے تمہیں مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی ناں۔"

Digitized by Google

عبید دل ہی دل میں کراہ کر رہ گیا۔ فاران نے اپنے طور پر بھلائی ہی کی تھی مگر ایک اچھے بڑے بھائی کے طور پر بچپن سے رملہ کے نخرے اٹھاتے، احمقانہ فرمائشیں بھی جی جان سے پوری کرتے وہ اس کی صلاحیتوں پر بالکل بھروسا نہیں کرتا تھا۔ اب بھی یہی خیال آیا کہ اس نے معاملہ گڑبڑ کر دیا ہوگا۔ امی کا براہ راست حملہ سن کر وہ تسلی سے مسکرا کر پاس آ بیٹھا۔

''آپ کو اچھا نہیں لگا؟ مجھے یہی خدشہ تھا۔''

وہ امید و بیم کے ہنڈولوں میں جھول رہا تھا۔ اکلوتا اور ایک نرم مزاج، فرمانبردار بیٹا ہونے کی وجہ سے اس نے بھی بے تحاشا محبت سمیٹی۔ توقعات کا گراف ہمیشہ محبت سے راست تناسب ہوتا ہے۔ وہ ان کی دل آزاری کے خیال سے بات شروع کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ دوسری طرف اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ اس کی خوشی کا خیال رکھیں گی۔

''تم کوئی بھی لڑکی پسند کر لیتے بیٹا لیکن صبغہ، وہ اچھی لڑکی ہے۔ بس طلعت کا مزاج بہت روکھا ہے۔ بیٹیاں تو ماؤں پر ہی جاتی ہیں۔'' انہیں ایک دم منع کرنا اچھا نہیں لگا تو گول مول بات کی۔

''بیٹے، وہ اپنی ماؤں پر نہیں جاتے؟ صبغہ ہو رملہ ہو یا کوئی بھی تیسری لڑکی، آپ اپنی تربیت پر، اپنی اولاد پر بھروسا کریں امی۔'' اس نے ان کے ہاتھ تھامتے تیقن سے کہا۔ آمنہ بیگم لاجواب ہو گئیں تو فوراً دوسرا سوال کر ڈالا۔

''صبغہ کے والدین مان جائیں گے؟ پھر لوگ کیا، کیا باتیں نہ بنائیں گے۔ تمہیں اچھی طرح پتا ہے تمہارے ابو کی نسبت ٹوٹی تھی طلعت سے۔''

ان کا اندیشہ گو اتنا بھی غیر حقیقی نہ تھا مگر اس نے سر پیٹ لیا۔

''امی لوگ ووگ کچھ نہیں ہوتے، ہم ہی لوگ ہیں۔ جب ہمیں اعتراض نہیں تو کسی اور کو کیوں ہوگا۔ اس نسبت کی حیثیت ہی کیا ہے، ابو نے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اچھی زندگی گزاری، وہ اپنے گھر میں خوش ہیں۔ لوگوں کو چھوڑیں اپنی بات کریں۔ لوگوں کی باتیں اپنے اخلاق کا صدقہ سمجھ کر درگزر کر دینی چاہیں۔ آپ نے ہی سمجھایا تھا ناں۔''

قدرے تیزی سے بات شروع کرتے اختتام تک وہ اپنے ازلی پُرسکون انداز میں آ چکا تھا۔ آمنہ بیگم نے زچ ہو کر اسے دیکھا۔ ان کے میاں اور بچے یوں ہی انہیں قائل کر لیتے تھے۔

''اچھا، اگر میں نہ مانوں تو پھر بھی ضد کرو گے؟''

انہوں نے اپنی اتھارٹی استعمال کرنی چاہی۔

''کبھی نہیں، تھوڑا اصرار کروں گا۔ پھر بھی آپ منع کریں گی تو مان جاؤں گا۔ بس ہمیشہ کے لیے دل میں بات آ جائے گی کہ میری امی کو مجھ سے زیادہ لوگوں سے پیار ہے۔''

اس نے شرارت سے کہا۔ ابو نے عبید کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا، اس معاملے کو پیار سے ہی حل کیا جا سکتا ہے وگرنہ ضد کرو گے تو تمہاری امی کی بھی انا کا مسئلہ بن جائے گا۔

وہی ہوا اس کی تابعداری آمنہ بیگم کو نہال کر گئی۔ انہوں نے ایک چپت اس کے سر پر رسید کی تھی۔

یہ بات تو طے تھی کہ بیٹے کی خوشی سے بڑھ کر انہیں کچھ عزیز نہیں تھا۔ بس ایک کانٹا ان کے دل میں گڑا تھا کہ ابھی سے بیٹا مقابل آ گیا۔ پر وہ بھی عبید کے جواب سے نکل گیا۔ ان کے بیٹے اور شوہر نے آخری فیصلہ ان پر ہی چھوڑا تھا۔ جب وہ سب ان کی خوشی کا احترام کر رہے تھے تو وہ کیوں بے جا اکڑتیں۔ زبردستی کہیں اور شادی کر دیتیں تو ساری زندگی ایک خلش دل میں رہتی۔ اسی لیے سارے خدشے اور واہمے ذہن سے جھٹک کر انہوں نے دل سے بیٹے کی پسند اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

صبغہ اور عبید والدین کی صرف رضامندی نہیں بلکہ خوشی چاہتے تھے۔ ان دونوں کی نیک نیتی ہی تھی جو تمام معاملات اتنی خوش اسلوبی سے حل ہوتے چلے گئے۔

سرپرائز

مریم شہزاد

سارہ نے رو، رو کر آنکھیں سجالی تھیں۔ وہ میری کوئی بات سننے پر راضی نہیں تھی۔ میں نے کہا ہی کیا تھا، صرف ایک جملہ، وہ بھی اس نے پورا نہیں سنا اور وہ دیوانی پہلے ایک گھنٹے تک کمر بند کیے بیٹھی رہی اور اب منتیں کر کر کے دروازہ کھولا بھی تو روئے جا رہی ہے، میں جتنا بات کرنے کی کوشش کرتا، وہ اتنا ہی زور شور سے رونا شروع کر دیتی، جذباتی ہے یہ تو معلوم تھا مگر یہ تو سراسر بچپنا تھا۔

Digitized by Google

''میری بات تو سنو، میں تو.....'' میں نے ایک بار پھر کچھ کہنا چاہا۔

''نہیں سننی مجھے آپ کی کوئی بات.....'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''بات پوری تو.....'' میں نے ایک کوشش اور کی۔

''ہاں، ہاں یہی کہیں گے ناں..... تھوڑے دن کی بات ہے گزر جائیں گے چٹکی بجاتے۔''

''ارے اللہ کی بندی، روؤ تو نہیں، چپ تو کرو.....''

''نہیں، نہیں نہیں۔'' اس نے ٹشو سے اپنی ناک رگڑی۔

''یا اللہ کس مشکل میں پھنس گیا ہوں۔'' ابھی ہماری شادی کو سال بھر بھی نہیں ہوا تھا، ہم ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے مگر وہ بہت شدت پسند تھی اور جذباتی بھی مگر اس قدر بچپنے اور جذباتی پن کی مجھے امید نہیں تھی۔

اس موسم سرما میں ہم نے snowfall دیکھنے کے لیے بھوربن جانے کا پروگرام بنایا تھا، ٹکٹ کنفرم تھے 25 کو ہماری روانگی تھی 24 کو مجھے ایک آئیڈیا آیا ابھی اس سے ڈسکس کرنے بیٹھا تھا کہ آدھا جملہ سن کر ہی وہ آپے سے باہر ہوئی اور میرے سارے پلان کا ستیاناس کردیا۔

''اب کیسے سمجھاؤں اسے۔ اس کا رونا ختم ہی نہیں ہو رہا تھا، صرف اتنا ہی کہا تھا کہ ''مہینے کے آخر میں روانگی ہے اب اگلے سال ملاقات.....'' اور جملہ پورا ہونے ہی نہیں دیا زوجہ محترمہ نے۔ نہ یہ پوچھا کہ کہاں جانے کی ... بات کر رہا ہوں بیوقوفی کی بھی حد ہے۔'' مجھے بے تحاشا غصہ آرہا تھا۔

میں کمرے سے باہر آکر لاؤنج میں ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا اور آواز اونچی کرلی، آدھے، ایک گھنٹے میں ٹی وی دیکھتا رہا پھر مجھے لگا کہ شاید اب سدھر گئی ہوگی، میں کمرے میں واپس آیا تو وہ خاموش ہوچکی تھی۔ میں نے دوبارہ سمجھانے کا ارادہ کیا مگر کچھ سوچ کر خاموش رہا۔

''کھانا ملے گا یا وہ بھی کچن سے لے کر اکیلے ہی کھالوں، بھوک لگ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ خاموشی سے اٹھی اور کمرے سے باہر آگئی اور کھانا لگانے لگی۔ انتہائی خاموشی سے ہم دونوں نے کھانا کھایا، اس نے میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، میں مستقل اسے دیکھ رہا تھا اور سوچے جارہا تھا کہ کیا، کیا جائے۔

ایک دل کہتا کہ خاموشی بہتر ہے، کل روانگی ہے خود ہی ٹھیک ہوجائے گی۔ مگر دماغ کہتا، اتنا سہانا سفر اور اتنا بے مزہ گزرے.....؟ کھانا کھا کر وہ واپس کمرے میں چلی گئی۔ آخر مجھے ایک آئیڈیا آیا، میں نے موبائل اٹھایا اور اپنے دوست کو فون ملایا۔ مگر اس کو پہلے میسج کردیا کہ جو بھی بولتا جاؤں بس سنتے جانا۔ جیسے ہی اس نے فون اٹھایا، میں بات کرتے، کرتے کمرے میں آگیا، وہ مجھے دیکھ کر سوتی بن گئی۔

''ہاں یار نکل کی فلائٹ ہے بھوربن کی بلکہ اب تو یہ سمجھ کہ تھی، تمہاری بھابی کے مزاج ہی نہیں مل رہے۔''

''کچھ بھی نہیں، بس ایک پلان بنایا تھا کہ سب کے ساتھ ہنسی مذاق کریں گے مگر یہاں تو اپنا مذاق بن گیا آدھی بات سن کر ہی.....''

''ارے بھائی پتا تو ہے تمہیں میری سرپرائز والی عادت کا۔ بس اب نہیں جارہے ہم، تمہیں دے دوں ٹکٹ یا کینسل کرادوں؟''

''نہیں اب اور نہیں مناؤں گا ویسے بھی سوگئی ہے اور ایسے خراب موڈ سے جانے کا فائدہ.....؟''

''ہوتی رہے برف باری، یہاں بھی تو ہمارے ارمانوں پر برف ہی پڑ گئی۔'' (مجھے معلوم تھا اب تو ضرور بول پڑے گی، برف باری اس کو بہت پسند ہے)

''چلو تم کہتے ہو تو دیکھ لیتا ہوں ورنہ تم اپنی تیاری رکھو، ہاں، ہاں کل دوپہر کے ٹکٹ ہیں۔ اوکے..... اللہ حافظ۔''

میں نے فون بند کیا اور لیٹتے، لیٹتے اس کی طرف

کن انکھیوں سے دیکھا۔ آنکھیں بند کیے وہ انگلیاں مروڑ رہی تھی، کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر میں نے بھی دوسری طرف کروٹ لے لی۔

''سوگئے.....؟'' سارہ کی دبی، دبی سی آواز آئی۔ میں نے دھیان نہیں دیا۔

''سعد۔'' اس نے پھر پکارا۔

سوچا ذرا میں بھی تو نخرے دکھاؤں مگر پھر سوچا کہ پہلے ہی بیگم صاحبہ اتنا ٹائم ضائع کرچکی ہیں اور ابھی پیکنگ بھی باقی ہے، بدلہ پھر کبھی.....

''جی، فرمائیں جاگ رہا ہوں۔'' میں بول اٹھا۔

''آپ کو معلوم تو ہے کہ میں آپ کے بغیر ایک دن نہیں رہ سکتی اور آپ ایک سال.....'' پہلے بھی تو رہتی تھی ناں، میں نے دل میں سوچا۔

''کیا ایک سال؟''

''آپ کہہ رہے تھے ناں اگلے سال ملاقات.....'' اس نے ڈرتے، ڈرتے کہا۔

''پورا جملہ بتاؤ ناں کیا کہا تھا۔'' اب میں بھی پوری طرح فارم میں تھا۔

''اب مجھے ٹھیک طرح سے یاد تھوڑی ہے۔'' اس نے کہا۔

''اب مجھے ٹھیک طرح سے یاد تھوڑی ہے۔'' میں نے اس کی نقل اتاری۔

''بس یہ یاد ہے کہ جارہا ہوں اگلے سال ملاقات ہوگی اور ڈھیر سارا رونا ہے ناں.....؟ اگر بات پوری سن اور سمجھ لیتیں تو کیا بگڑتا تمہارا.....؟'' میں نے رسان سے پوچھا۔

''میں نے یہ کہا تھا کہ مہینے کے آخر میں جارہے ہیں، اگلے سال ملاقات ہوگی سب سے۔''

اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''بھئی ہم کل جارہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی!'' اس نے جواب دیا۔

''مہینے کا آخر ہے؟''

''جی.....''

''کون سا مہینہ ہے؟ اب ایچ H نہیں کہہ دینا کہ G کے بعد H آتا ہے۔'' وہ ہنس دی۔

''دسمبر۔''

''اب ہم مہینے کے آخر میں جارہے ہیں تو اگلے سال یعنی جنوری 2019ء میں آئیں گے ناں واپس ابھی تو 2018ء کا دسمبر ہے ناں تو ہماری اور سب سے یعنی دونوں کے گھر والوں سے اگلے سال ہی ملاقات ہوگی، سوچا تھا کہ ان سب سے یہ کہیں گے تو مزہ آئے گا مگر آپ نے ہی چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا اور کسی کو کیا خاک سرپرائز دیں گے۔ آپ نے ہی ہمیں سرپرائز دینے کی ٹھان لی۔'' میں نے اس کو تفصیلاً سمجھایا۔

وہ ہکا بکا میری شکل دیکھ رہی تھی اور یقیناً دل ہی دل میں اپنی عقل پر ماتم کررہی ہوگی۔

میں نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

''میڈم، ہوش میں آجائیں، کان پکڑ رہا ہوں، آئندہ مذاق کی جسارت نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ میری بیوقوف بیوی کو مذاق سمجھ ہی نہیں آتا۔'' وہ جھینپی، جھینپی سی ہنسی ہنس دی مگر بیوقوف کہنے پر تھوڑی آنکھیں بھی دکھائی تھیں۔

''سوری، پتا نہیں کیوں، میں کیوں.....'' وہ ... بے ربط بول رہی تھی۔

''آپ ناراض تو نہیں ہیں ناں، ہم چل رہے ہیں ناں بھوربن، آپ اپنے دوست کو ٹکٹ تو نہیں دیں گے ناں.....''

''مگر تم تو سو رہی تھیں ناں.....'' میں نے اسے اور چھیڑا تو وہ منہ بنا گئی۔

''سوچ لو، یہ نہ ہو کہ تم پر پھر جذباتی پن کا دورہ پڑ جائے پھر تو واپسی اگلے سال ہی ہوتی ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں، نہیں بالکل نہیں۔'' اس نے کان پکڑ لیے۔

بھلا وہ snowfall کی قربانی کیسے دے سکتی تھی، وہ تو اس کا بچپن کا خواب تھا۔

Digitized by Google

"میری بات تو سنو، میں تو....." میں نے ایک بار پھر کچھ کہنا چاہا۔

"نہیں سننی مجھے آپ کی کوئی بات....." اس نے روتے ہوئے کہا۔

"بات پوری تو....." میں نے ایک کوشش اور کی۔

"ہاں، ہاں یہی کہیں گے ناں..... تھوڑے دن کی بات ہے گزر جائیں گے چٹکی بجاتے۔"

"ارے اللہ کی بندی، روؤ تو نہیں، چپ تو کرو....."

"نہیں، نہیں نہیں۔" اس نے ٹشو سے اپنی ناک رگڑی۔

"یا اللہ کس مشکل میں پھنس گیا ہوں۔" ابھی ہماری شادی کو سال بھر بھی نہیں ہوا تھا، ہم ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے مگر وہ بہت شدت پسند تھی اور جذباتی بھی مگر اس قدر بچپنے اور جذباتی پن کی مجھے امید نہیں تھی۔

اس موسم سرما میں ہم نے snowfall دیکھنے کے لیے بھوربن جانے کا پروگرام بنایا تھا، ٹکٹ کنفرم تھے 25 کو ہماری روانگی تھی 24 کو مجھے ایک آئیڈیا آیا ابھی اس سے ڈسکس کرنے بیٹھا تھا کہ آدھا جملہ سن کر ہی وہ آپے سے باہر ہوئی اور میرے سارے پلان کا ستیاناس کردیا۔

"اب کیسے سمجھاؤں اسے۔ اس کا رونا ختم ہی نہیں ہو رہا تھا، صرف اتنا ہی کہا تھا کہ "مہینے کے آخر میں روانگی ہے اب اگلے سال ملاقات....." اور جملہ پورا ہونے ہی نہیں دیا زوجہ محترمہ نے۔ نہ یہ پوچھا کہ کہاں جانے کی ... بات کر رہا ہوں بیوقوفی کی بھی حد ہے۔" مجھے بے تحاشا غصہ آرہا تھا۔

میں کمرے سے باہر آکر لاؤنج میں ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا اور آواز اونچی کرلی، آدھے، ایک گھنٹے میں ٹی وی دیکھتا رہا پھر مجھے لگا کہ شاید اب سدھر گئی ہوگی، میں کمرے میں واپس آیا تو وہ خاموش ہوچکی تھی۔ میں نے دوبارہ سمجھانے کا ارادہ کیا مگر کچھ سوچ کر خاموش رہا۔

"کھانا ملے گا یا وہ بھی کچن سے لے کر اکیلے ہی کھالوں، بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے کہا۔

وہ خاموشی سے اٹھی اور کمرے سے باہر آگئی اور کھانا لگانے لگی۔ انتہائی خاموشی سے ہم دونوں نے کھانا کھایا، اس نے میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، میں مستقل اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔

ایک دل کہتا کہ خاموشی بہتر ہے، کل روانگی ہے خود ہی ٹھیک ہوجائے گی۔ مگر دماغ کہتا، اتنا سہانا سفر اور اتنا بے مزہ گزرے.....؟ کھانا کھا کر وہ واپس کمرے میں چلی گئی۔ آخر مجھے ایک آئیڈیا آیا، میں نے موبائل اٹھایا اور اپنے دوست کو فون ملایا۔ مگر اس کو پہلے میسج کردیا کہ جو بھی بولتا جاؤں بس سنتے جانا۔ جیسے ہی اس نے فون اٹھایا، میں بات کرتے، کرتے کمرے میں آگیا، وہ مجھے دیکھ کر سوتی بن گئی۔

"ہاں یار نکل کی فلائٹ ہے بھوربن کی بلکہ اب تو یہ سمجھ کہ تھی، تمہاری بھابی کے مزاج ہی نہیں مل رہے۔"

"کچھ بھی نہیں، بس ایک پلان بنایا تھا کہ سب کے ساتھ ہنسی مذاق کریں گے مگر یہاں تو اپنا مذاق بن گیا آدھی بات سن کر ہی....."

"ارے بھائی پتا تو ہے تمہیں میری سرپرائز والی عادت کا۔ بس اب نہیں جارہے ہم، تمہیں دے دوں ٹکٹ یا کینسل کرادوں؟"

"نہیں اب اور نہیں مناؤں گا ویسے بھی سوگئی ہے اور ایسے خراب موڈ سے جانے کا فائدہ.....؟"

"ہوتی رہے برف باری، یہاں بھی تو ہمارے ارمانوں پر برف ہی پڑ گئی۔" (مجھے معلوم تھا اب تو ضرور بول پڑے گی، برف باری اس کو بہت پسند ہے)

"چلو تم کہتے ہو تو دیکھ لیتا ہوں ورنہ تم اپنی تیاری رکھو، ہاں، ہاں کل دوپہر کے ٹکٹ ہیں۔ اوکے..... اللہ حافظ۔"

میں نے فون بند کیا اور لیٹتے، لیٹتے اس کی طرف

کن انکھیوں سے دیکھا۔ آنکھیں بند کیے وہ انگلیاں مروڑ رہی تھی، کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر میں نے بھی دوسری طرف کروٹ لے لی۔

"سوگئے.....؟" سارہ کی دبی، دبی سی آواز آئی۔ میں نے دھیان نہیں دیا۔

"سعد۔" اس نے پھر پکارا۔

سوچا ذرا میں بھی تو نخرے دکھاؤں مگر پھر سوچا کہ پہلے ہی بیگم صاحبہ اتنا ٹائم ضائع کرچکی ہیں اور ابھی پیکنگ بھی باقی ہے، بدلہ پھر کبھی.....

"جی، فرمائیں جاگ رہا ہوں۔" میں بول اٹھا۔

"آپ کو معلوم تو ہے کہ میں آپ کے بغیر ایک دن نہیں رہ سکتی اور آپ ایک سال....." پہلے بھی تو رہتی تھی ناں، میں نے دل میں سوچا۔

"کیا ایک سال؟"

"آپ کہہ رہے تھے ناں اگلے سال ملاقات....." اس نے ڈرتے، ڈرتے کہا۔

"پورا جملہ بتاؤ ناں کیا کہا تھا۔" اب میں بھی پوری طرح فارم میں تھا۔

"اب مجھے ٹھیک طرح سے یاد تھوڑی ہے۔" اس نے کہا۔

"اب مجھے ٹھیک طرح سے یاد تھوڑی ہے۔" میں نے اس کی نقل اتاری۔

"بس یہ یاد ہے کہ جارہا ہوں اگلے سال ملاقات ہوگی اور ڈھیر سارا رونا ہے ناں.....؟ اگر بات پوری سن اور سمجھ لیتیں تو کیا بگڑتا تمہارا.....؟" میں نے رسان سے پوچھا۔

"میں نے یہ کہا تھا کہ مہینے کے آخر میں جارہے ہیں، اگلے سال ملاقات ہوگی سب سے۔"

اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"بھئی ہم کل جارہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی!" اس نے جواب دیا۔

"مہینے کا آخر ہے؟"

"جی....."

"کون سا مہینہ ہے؟ اب ایچ H نہیں کہہ دینا کہ G کے بعد H آتا ہے۔" وہ ہنس دی۔

"دسمبر۔"

"اب ہم مہینے کے آخر میں جارہے ہیں تو اگلے سال یعنی جنوری 2019ء میں آئیں گے ناں واپس ابھی تو 2018ء کا دسمبر ہے ناں تو ہماری اور سب سے یعنی دونوں کے گھر والوں سے اگلے سال ہی ملاقات ہوگی، سوچا تھا کہ ان سب سے یہ کہیں گے تو مزہ آئے گا مگر آپ نے ہی چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا اور کسی کو کیا خاک سرپرائز دیں گے۔ آپ نے ہی ہمیں سرپرائز دینے کی ٹھان لی۔" میں نے اس کو تفصیلاً سمجھایا۔

وہ ہکا بکا میری شکل دیکھ رہی تھی اور یقیناً دل ہی دل میں اپنی عقل پر ماتم کررہی ہوگی۔

میں نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

"میڈم، ہوش میں آجائیں، کان پکڑ رہا ہوں، آئندہ مذاق کی جسارت نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ میری بیوقوف بیوی کو مذاق سمجھ ہی نہیں آتا۔" وہ جھینپی، جھینپی سی ہنسی ہنس دی مگر بیوقوف کہنے پر تھوڑی آنکھیں بھی دکھائی تھیں۔

"سوری، پتا نہیں کیوں، میں کیوں....." وہ ... بے ربط بول رہی تھی۔

"آپ ناراض تو نہیں ہیں ناں، ہم چل رہے ہیں ناں بھوربن، آپ اپنے دوست کو ٹکٹ تو نہیں دیں گے ناں....."

"مگر تم تو سو رہی تھیں ناں....." میں نے اسے اور چھیڑا تو وہ منہ بنا گئی۔

"سوچ لو، یہ نہ ہو کہ تم پر پھر جذباتی پن کا دورہ پڑ جائے پھر تو واپسی اگلے سال ہی ہوتی ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں، نہیں بالکل نہیں۔" اس نے کان پکڑ لیے۔

بھلا وہ snowfall کی قربانی کیسے دے سکتی تھی، وہ تو اس کا بچپن کا خواب تھا۔

Digitized by Google

سلسلے وار ناول

نار

سحر ساجد

نار کہانی ہے محبت کی مگر اس میں آپ کو محبت ہوتی نظر نہ آئے گی... سمجھ نہ آئے گی گر سمجھ آگئی تو سلجھ نہ پائے گی...

نار کہانی ہے اِک راز کی... اور راز اِک چنگاری سے کم نہیں ایسی چنگاری جو سلگی تو بھڑکے گی، گر بھڑکی تو... شاید دل بچیں گے نہ وجود...

نار کہانی ہے دو ناآسودہ لوگوں کی جو مردہ دلوں کو زندگی کی ڈور سے باندھے گھسیٹتے ہیں اور پھر خود ہی گھسٹتے چلے جاتے ہیں... زندگی کا تنفس برقرار رکھنے کی بدترین کوشش میں...

نار اک پہیلی ہے یا کسی کی سہیلی ہے مگر نار تو نار ہے... سہیلی کیسی؟

ایک چپ رہنے کے سب الزام مجھ پر ہی نہ تھے
خامشی پر بھی تو تہمت لب کشا ہونے کی تھی
میں خود اپنی آگ ہی میں جل بجھا تو یہ کھلا
شرط جلنے کی نہیں تھی کیمیا ہونے کی تھی

نار پڑھیے، الجھیے اور پھر سلجھایئے......

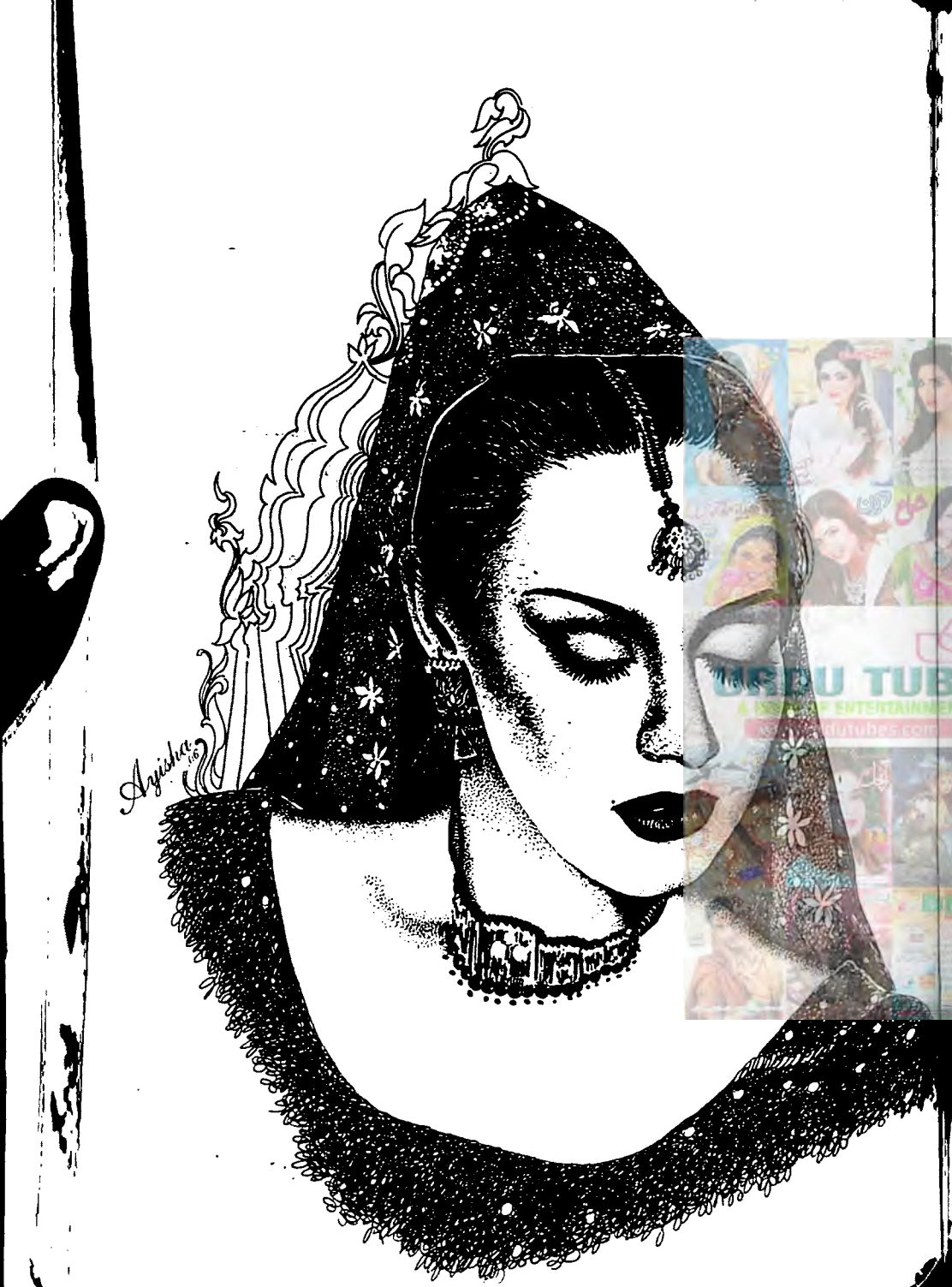

URDU TUBE
A HOUSE OF ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com

Digitized by Google

گزشتہ قسط کا خلاصہ

احمد صاحب کی دو بیٹیاں تھیں۔ خولہ اور مزنہ..... احمد صاحب کی بہن فرخندہ کے شوہر اعجاز، مارکیٹ میں آگ لگنے کے سبب ہونے والے نقصان کو برداشت نہیں کر سکے اور ہارٹ اٹیک میں اپنی جان ہار بیٹھے۔ احمد صاحب اپنے بھانجے جہانگیر اور بہن فرخندہ کو اپنے گھر لے آتے ہیں۔ فرخندہ کا بی پی شوٹ کرتا ہے تو جہانگیر اپنی ہم عمر کزن خولہ سے کہتا ہے کہ وہ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جائے لیکن وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ ڈرائیونگ نہیں جانتی اس پر جہانگیر بہت غصہ ہوتا ہے۔ خولہ نے ایم ایس مکمل کیا اور جہانگیر نے ایم بی اے، وہ علیحدہ ایک کرایے کا گھر لے کر وہاں شفٹ ہو جاتا ہے۔ مس تبسم کی سالگرہ کی تقریب ان کے بھائی نے بصد اصرار کی اور وہ ساڑی اور ہلکے میک اپ میں اس کی سالگرہ میں آئی۔ تبسم کے بھائی کی یہ اس سے تیسری ملاقات تھی جس میں وہ اسے پرپوز کرتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ وہ میرڈ ہے۔ فرخندہ اپنے بھائی سے مزنہ اور جہانگیر کے رشتے کی بات کرتی ہیں تو وہ خولہ کو مجبور کرتے ہیں کہ مزنہ کیونکہ سمجھدار نہیں ہے اس لیے وہ اس رشتے کو قبول کر لے۔ خولہ سوچتی ہے کہ جو رشتہ مزنہ کے لیے صحیح نہیں وہ اس کے لیے کیسے صحیح ہے لیکن وہ ضد میں یہ رشتہ قبول کر لیتی ہے اور جہانگیر جس کا خواب جرمنی جا کر آگے پڑھنا تھا وہ شادی کر تو لیتا ہے لیکن اپنے حالات سے مطمئن نہیں ہوتا..... اور بالآخر وہ خولہ کو نوکری کرنے کا کہتا ہے۔ جس پر وہ حیران و پریشان رہ جاتی ہے۔

اب آگے پڑھیے

''جہانگیر بھائی کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟'' وہ مزنہ تھی جو اس کی بات سنتے ہی ناگواری سے بولی تھی۔ خولہ کے پاس جواب صرف خاموشی کی صورت میں ہی تھا۔

''ابو کو پتا چلا ناں تو وہ بہت غصہ ہوں گے، اب ایسے بھی حالات نہیں ہیں جہانگیر بھائی کے کہ وہ آپ کو جاب کے لیے فورس کریں.....'' خولہ کے پاس اب بھی خوشی ہی تھی۔

''آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ کچھ تو بولیں.....'' مزنہ نے چڑ کر اس کا کندھا ہلایا تھا۔ اس کے سر پر لیا دوپٹے کا پلو جھٹکے سے پھسلا اور پھسل کر اس کے شانوں پر آ رہا تھا۔

''نہیں..... یہ بالوں کو کیا، کیا آپ نے؟'' مزنہ ٹھیک ٹھاک شاکڈ ہوئی تھی۔

''جہانگیر نے کہا تھا.....'' بیزاری سے کہتے ہوئے اس نے دوپٹا دوبارہ سر پر لیا تھا۔

''ہائے اللہ آپی.....! اچھے خاصے لمبے بال ہوا کرتے تھے آپ کے اور اب دیکھیں ذرا۔'' مزنہ کا افسوس تھا کہ جاتا ہی نہیں تھا۔ اس کے یوں افسوس کرنے پر خولہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور دیکھتی رہی۔

''مزنہ.....'' پھر ہلکے سے پکارا۔

''ہوں.....''

''تم نے جہانگیر سے میری شادی کی مخالفت کیوں نہیں کی؟'' بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں کیا کہہ سکتی تھی بھلا؟'' مزنہ الجھی..... اور پھر لاجواب سی ہو گئی تھی۔

''میں نے تو کہا تھا مزنہ، میں نے اسٹینڈ لیا تمہارے لیے۔''

''آپ بڑی تھیں آپی..... آپ کہہ سکتی تھیں، آپ کر سکتی تھیں۔'' اور اس بہانے نما جواب پہ خولہ کے لبوں پر اِک طنزیہ مسکراہٹ ابھری تھی۔

''کیا ہے آپی! جہانگیر بھائی تھوڑے سے بد دماغ ہی تو ہیں اور تو اُن کے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی کوئی بھی لڑکی خواہش کرتی ہے۔ آپ ایسے ہی دل چھوٹا کرتی رہتی ہیں۔ ایسی عورتیں بھی ہیں جو پٹ کر بھی اپنے مرد کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔''

اچھا طریقہ تھا بات بدلنے کا..... کچھ اور نہ ہو تو لیکچر شروع کر دو۔ وہ اب فلاں، فلاں کر کے مثالیں پیش کر رہی تھی۔ بندہ پوچھے کہ بھئی وہ ''لڑکی'' تم کیوں نہ ہو گئیں۔

خولہ اس کے ہلتے لبوں کو دیکھتی تھی اور سوچتی تھی۔ سارے اس جیسے بیوقوف تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔

☆☆☆

جاب کرنے کی بات ایک ہی دن تک نہ رہی تھی۔ یہ پھر جہانگیر کا روزمرّہ کا ورد بن کر رہ گئی تھی۔ خولہ کی ہمت تھی جو برداشت کرتی تھی لیکن پھر بھی وہ جاب کرنے کے لیے رضامند نہیں تھی۔ وہ جہانگیر کو یہ لت نہیں لگانا چاہتی تھی۔ پیسہ کمانا اس کا فرض نہیں تھا، کوئی مشکل حالات ہوتے تو وہ کیوں نہ ساتھ دیتی..... لیکن یہ حالات اس نہج پر کسی طور نہ پہنچے تھے۔ اس نے پھپھو کا حوالہ دے کر دیکھ لیا، جہانگیر کا جواب تھا۔

''امی کے پاس تم سے پہلے بھی میڈ ہوا کرتی تھی اب بھی میڈ ہی رہے گی۔''

''لیکن جہانگیر..... جیسی کیئر میں پھپھو کی کرتی ہوں کوئی دوسرا تو نہیں کر سکتا ناں.....'' اس نے دلیل دی۔

''اوہ کم آن خولہ! بندے کو سپروائز کرنا آنا چاہیے بس..... ورنہ کون سا ایسا کام ہے جو نوکروں سے کروایا نہیں جا سکتا.....''

''یا خدا..... وہ کیسے اس شخص کو سمجھائے..... عقل کی ساری پٹیاں تو جیسے وہ حفظ کیے بیٹھا تھا۔'' خولہ نے..... بے ساختہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھاما تھا۔

''اب اس میں سر پکڑنے والی کون سی بات ہو گئی.....'' وہ بے طرح سے بگڑا۔

''جہانگیر..... ! میں جاب نہیں کرنا چاہتی.....'' اب کے وہ دوٹوک ہو کر بولی تھی۔

''تمہیں شرم نہیں آتی یہ بات کہتے ہوئے..... کبھی ان بھٹے پر کام کرتی عورتوں کو دیکھا ہے؟ دو، دو بچوں کو لیے کیسے وہ مزدوری کرتی ہیں اور تم..... تم شکر نہیں کرتیں کہ پڑھی لکھی ہو، کیا کرنا ہے تمہیں، محض اسکول میں چند بچوں کو پڑھانا ہی تو ہے۔ اس میں بھی نخرے ہیں، تم سے بہتر تو وہ جاہل عورتیں ہی ہیں جو کم از کم اپنے شوہر کا ساتھ تو دیتی ہیں۔'' وہ بھڑک ہی تو اٹھا تھا۔

خولہ نے بے ساختہ منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔ یہ تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یوں بھڑکے گا۔

''جہانگیر.....'' ہو سکتا تھا کہ وہ اسے دو چار اور کھری، کھری سناتا کہ یک دم فرخندہ نے مداخلت کی تھی۔ ان کی آواز سن کر خولہ نے بے ساختہ اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔

''وہ نہیں کرنا چاہتی جاب تو تم کیوں اسے مجبور کرتے ہو۔'' وہ بھی برہم تھیں، وہ بھی خولہ کی ہم نوا تھیں اور نہیں چاہتی تھیں کہ خولہ یوں خوار ہو۔

''آپ بھی اسی کا ساتھ دے رہی ہیں، میرا تو کسی کو کوئی خیال ہی نہیں.....'' پیر پٹختا طیش سے کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکلا تھا۔ دروازہ اس زوردار آواز سے بند ہوا کہ آواز دل پر جا کر لگی۔

فرخندہ نے خولہ کو دیکھا جس کی سفید ہوئی رنگت اس کی حالت کی بہترین ترجمان تھی لیکن فرخندہ کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ اسے تسلی دیں تو آخر کس زبان میں، کس طریقے سے دیں کہ تسلی واقعی... میں تسلی بن کر دل پر اترے..... اور آج کا ہونے والا معرکہ اس معرکے کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھا جو تب ہوا جب احمد صاحب کو اس مسئلے کا علم ہوا۔ بات کو ان کے علم میں لانے والی کوئی اور نہیں خود فرخندہ تھیں، اُن کا خیال تھا کہ وہ جہانگیر سے بہتر طریقے سے بات کر سکتے تھے اور یہ کہ وہ اس پر دباؤ ڈال کر، اس سے بات منوا بھی سکتے تھے اور یہ خیال کتنا خام ثابت ہو گا وہ گر جانتی ہوتیں تو کبھی..... ہاں کبھی یہ بات احمد صاحب کے علم میں نہ آتی۔

☆☆☆

''پھپھو آپ کو ابو کو نہیں بتانا چاہیے تھا۔'' خولہ سخت پریشان تھی۔ اس کی لاعلمی میں فرخندہ بھائی کو فون کر چکی تھیں۔

Digitized by Google

''کیوں، کیوں نہیں بتانا چاہیے تھا، وہ بھی تو بے تحاشا بزی ہو رہا ہے اور احمد بھائی بڑے ہیں ہمارے...... اُن کو نہیں بتائیں گے تو کیا پڑوسیوں کو بتائیں گے......'' پھپھو کو اس کی پریشانی نے تاؤ دلا دیا تھا۔

''آپ تو جیسے اپنے بیٹے کو جانتی ہی نہیں......؟'' وہ بھی بَل کھا کر بولی تھی۔ ''ابو کی بات ضرور ہی مانے گا وہ...... ہونہہ......'' لہجے میں ناراضی واضح تھی۔

''مانے یا نہ مانے...... اسے یہ تو معلوم ہوگا ناں کہ کوئی اسے پوچھنے والا، اس سے سوال کرنے والا ہے۔ ایسے کیسے وہ اپنی مرضی چلا سکتا ہے۔ گھر کا ماحول خراب کر کے رکھ دیا اس گدھے نے۔''

''پھپھو! آپ سمجھ کیوں نہیں رہیں...... اسے اور غصہ آئے گا۔ وہ بری طرح سے ری ایکٹ کرے گا۔ مجھے طعنے دیتا رہے گا اور گھر کا ماحول جو ذرا سا قابو میں ہے ناں، وہ بھی جاتا رہے گا...... پھر آپ کر لیجیے گا سارے مسائل حل......''

''اب وہ کیا ماموں سے منہ ماری کرے گا...... کچھ تو لحاظ کرے گا ہی ناں، میں ہوں ابھی...... زندہ ہوں، دیکھوں گی میں کیسے وہ تمہیں طعنے مارتا ہے......'' خولہ سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے بیٹھی تھی اور فرخندہ تیز، تیز بولے جا رہی تھیں۔

''ماموں سے تو جیسے اس نے پہلے کبھی منہ ماری کی ہی نہیں ناں......'' سر اٹھا کر وہ بیزار لہجے میں بولی تھی۔

''خولہ......!'' پھپھو نے اس پر ایک گھوری ڈالتے ہوئے سخت تنبیہی لہجے میں کہا تھا اور وہ ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو گئی تھی۔ وہ اُن کے بیٹے کو اُن سے زیادہ جانتی ہے...... یہ آج اس پر انکشاف ہوا تھا...... وہ جہانگیر کو انڈر اسٹیمیٹ کر رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ آفس سے گھر آیا تو ماموں کو دیکھ کر ہی اس کا ماتھا ٹھنکا تھا، رہی سہی کسر اس خاموشی اور سنگینی نے پوری کر دی تھی جو گھر کے تینوں افراد کے چہروں پر نیون سائن کی طرح چمک رہی تھی۔ ڈنر کے لیے اسی کا انتظار ہو رہا تھا۔ اور اسی نیون سائن کی طرح دمکتی خاموشی کے ساتھ کھانا تناول کیا گیا تھا۔ وہ کھانا کھاتے ہی اٹھ کر لاؤنج میں چلا گیا تھا۔ اس کے پیچھے، پیچھے ہی فرخندہ اور احمد صاحب بھی لاؤنج میں ہی آ گئے تھے۔ وہ بظاہر ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف تھے لیکن جہانگیر کوئی بچہ تھا بھلا؟ جو بات کو پک نہ کرتا مگر پھر بھی وہ خاموش تھا اور چاہتا تھا کہ بات کریں تو ماموں ہی کریں۔ خولہ اُن کو چائے سرو کرنے کے بعد وہاں رکی نہیں تھی اور جب وہ جہانگیر کو چائے دے رہی تو جہانگیر کی سرد...... گہری نظروں نے اسے بتلا دیا تھا کہ اب کیا ہونے والا تھا۔ وہ سرد نظریں، کپکپی میں بدل کر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی تھیں۔ وہ ٹھنڈے پڑتے ہاتھوں کے ساتھ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

''تمہیں کس چیز کی کمی ہے جہانگیر...... جو تم خولہ کو جاب کے لیے مجبور کر رہے ہو؟'' احمد صاحب نے نہایت سبھاؤ، تحمل مگر بنا تمہید کے بات شروع کی تھی...... اس سوال کو جہانگیر نے چائے کے ساتھ سرو کی گئی کوئی بدذائقہ چیز سمجھ کر حلق سے اتارا تھا۔ اس نے صوفے سے ٹیک لگائی، چائے کی پیالی سامنے موجود میز پر رکھی اور انہی ٹھنڈی نگاہوں سے ماموں کو دیکھا۔

''یہ میرا اور...... میری بیوی کا معاملہ ہے۔''

نگاہیں تو جو ٹھنڈی تھیں سو تھیں، الفاظ بھی ٹھٹھرا کر رکھ دینے کی صلاحیت سے مالا مال تھے۔ لہجہ گستاخ تھا، احمد صاحب کے چہرے نے یک دم رنگ بدلا تھا۔

''تمہاری بیوی...... میری بیٹی پہلے ہے۔'' ترنت جواب دیا گیا تھا۔

''تو وہ جب تک آپ کے گھر میں تھی جیسے آپ نے چاہا اور جیسے اس نے چاہا، اس نے زندگی گزاری۔ یہ میرا گھر ہے اور جیسا میں کہوں گا اسے ویسا ہی کرنا ہوگا۔'' غرور تھا تو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس بات کا تھا۔

''تمہاری بیوی ہے، زر خرید تو نہیں......'' احمد صاحب کو تکلیف ہوئی تھی۔ وہ ان کی اولاد تھی۔ ''اور ضروری تو

نہیں کہ تمہارا گھر ہے تو تمہاری ہی خواہشات پر عمل بھی ہوگا...... وہ ایک انسان ہے، اپنا الگ تشخص رکھتی ہے، اس کی ایک سوچ ہے اور......''

''خولہ...... خولہ......'' اس نے احمد صاحب کو بات مکمل نہ کرنے دی تھی اور زور سے خولہ کو آواز دی تھی۔

''جی......'' چند لمحوں بعد وہ نمودار ہوئی تھی۔ رنگ فق اور جسم، جان کو چھوڑتا ہوا۔

''اپنا بیگ پیک کرو اور اپنے باپ کے ساتھ اُن کے گھر چلی جاؤ...... جہاں پہ تم اپنے الگ تشخص کے ساتھ، آزادانہ زندگی گزار سکو۔'' لہجے میں طنز تھا نہ کاٹ، بے حد سہل سے انداز میں فرمان جاری کیا گیا تھا۔

''جہانگیر......!'' فرخندہ اس زور سے بولیں کہ گلے میں خراش پڑ گئی تھی۔

''بس......'' احمد صاحب تنتنا کر اٹھے تھے۔

''بیگ پیک کرنے کی بھی ضرورت نہیں...... میرے گھر میں میری بیٹی کے لیے ہر چیز موجود ہے۔'' جہانگیر کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھتے ہوئے انہوں نے سخت لہجے میں بات کی تھی۔

''چلو خولہ......'' اور آگے بڑھ کر خولہ کا ہاتھ تھاما تھا...... اور خولہ...... وہ اتنی بے یقینی کے ساتھ جہانگیر کو دیکھ رہی تھی کہ حد نہ تھی۔ ضرب، تقسیم، جمع، تفریق...... سب کر کرا کے یہ تھی اس کی وقعت...... اور بے یقینی کی آگ نے اس کے سارے آنسو جلا ڈالے تھے، وہ ہق دق اسے دیکھ رہی تھی اور فرخندہ...... وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے روئے جا رہی تھیں۔ انہوں نے بھی خولہ کو نہ روکا تھا، وہ جان گئی تھیں کہ خولہ اور جہانگیر...... دونوں مس میچ تھے۔ اور شادی کو بھلا عرصہ ہی کتنا ہوا تھا محض دس ماہ......

☆☆☆

رات معمول کے مانند سیاہ تھی، خاموش تھی...... تارے حسبِ عادت چمکتے تھے، چاند ہر روز کی طرح روشنی بکھیرتا تھا۔ تو پھر پھر...... اسے کیوں نہیں یہ چمک، یہ روشنی محسوس ہوتی تھی۔ اسے صرف رات کی سیاہی سب چیزوں پہ حاوی ہوتے ہوئے کیوں محسوس ہوتی تھی۔ اسے کیوں لگتا تھا کہ یہ خاموشی...... چاروں اور پھیلی خاموشی اسے کھا جائے گی، ہڑپ کر لے گی، نگل جائے گی۔ آج کے واقعے کے بعد سے اسے دکھ ہوا تھا...... اسے بے عزتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ خوفزدہ زیادہ تھی۔ وہ اس وقت زندگی کی مشکل اور بدنما کیفیات کا سامنا کر رہی تھی۔ اسے ایک dilemma درپیش تھا اور وہ برے طریقے سے اس کا شکار ہوئی تھی۔ جہانگیر کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی مگر طلاق جیسے بھاری لفظ کو بھی سننے سے انکاری تھی۔ تو یہ طے ہوا وہ خوفزدہ زیادہ تھی۔ جب سے احمد صاحب اسے لے کر آئے تھے پورے گھر میں سناٹا اپنی بانہیں پھیلائے چکر کاٹتا پھر رہا تھا۔ بھائیں، بھائیں کرتی خاموشی گھر کی راہداری میں، صحن میں، ہال میں حتیٰ کہ ان تین کمروں میں بھی جہاں وہ تین نفوس موجود تھے، سناٹا اپنے پورے معنوں کے ساتھ موجود تھا اور اس خاموشی میں سوئی کی ٹک، ٹک بھی گھڑیال کی ٹن، ٹن لگتی تھی۔ یہ جھوٹ نہیں تھا کہ اسے باپ کے گھر آ کر بے حد سکون ملا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ ہاں...... ایسا ہی ہونا چاہیے تھا تو اس کا انتقام جیت گیا...... ابو...... آج ہار گئے تھے اور خولہ کو اک کمینی سی تسلی اپنے پورے بدن پر اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''تو اب معلوم ہوا آپ کو...... اب پتا چلا کہ کس قدر غلط فیصلہ تھا یہ...... عزنہ کو گر بیچایا تھا تو میں...... میں کیا کسی کوڑے کے ڈھیر سے ملی تھی آپ کو......؟ جو ہوا بہت اچھا ہوا تھا۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔'' ایک گہری سانس بھر کر اس نے ہوا میں موجود آکسیجن کو ہی اپنے اندر نہیں کھینچا تھا...... اس نے جیسے سکون کشید کیا تھا، وہ خوف کی سی کیفیت جیسے اچانک زائل ہونے لگی تھی، معدوم سی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ صحن میں جانے کی غرض سے کمرے سے باہر نکلی...... اور جب باہر نکلی تو نظر کچن کی طرف اٹھی تھی۔ جہاں پر لائٹ آن تھی اور اس نے ابو کو دیکھا، وہ کچھ ڈھونڈ

رہے تھے۔ خولہ حیران ہوئی۔ انہوں نے مزنہ یا اسے کیوں نہ آواز دی تھی، بے اختیار وہ کچن کی طرف بڑھی تھی۔

''ابو.....!'' آواز میں حیرت تھی۔

احمد صاحب نے سر اٹھایا..... اسے دیکھا..... اور خولہ کو کچھ غیر معمولی سا محسوس ہوا تھا۔

''آپ کو کچھ چاہیے تھا؟'' وہ آگے بڑھ آئی۔

''ہاں، پانی لینے آیا تھا۔ دوا کھانی تھی.....'' اسے محسوس ہوا کہ وہ غائب دماغی سے بول رہے تھے، انہیں پانی لینا تھا تو وہ کیبنٹ کیوں کھولے کھڑے تھے..... خولہ نے انہیں حیرانی سے دیکھتے ہوئے پانی کا گلاس بھر کر دیا۔ وہ چونکے۔

''ہاں، پانی، پانی.....'' کچھ ہکلاتے ہوئے کہہ کر انہوں نے اس کے ہاتھ سے پانی لیا تھا۔ خولہ اب بھی... ناسمجھی سے انہیں دیکھ رہی تھی اور سمجھنے کی بہترین کوشش میں تھی۔

''دوا کہاں ہے آپ کی.....؟''

دوا لیے بنا پانی پیتے دیکھ کر اس نے پوچھا تھا۔

''دوا.....؟ اوہ..... میں بھول گیا، وہ تو کمرے میں ہے۔'' وہ پھر سے چونکے تھے۔ اور خولہ نے تکلیف سے انہیں دیکھا، وہ یقیناً بے حد پریشان تھے، اس نے بے بسی سے اپنی آنکھیں بند کیں..... ذرا سا توقف کیا اور پھر انہیں پکڑ کر ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بٹھایا ہاتھ سے گلاس لے کر سائڈ پر رکھا اور اُن کے قدموں کے پاس بیٹھی۔

''ابو.....!'' اس نے اُن کے سرد بوڑھے ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لیے تھے۔ ''ابو..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کیوں اس قدر پریشان ہیں، جانتے تو ہیں جہانگیر کو..... کیسے بھڑک اٹھتا ہے وہ، غصہ اترے گا ناں تو خود ہی عقل میں بات آجائے گی، یوں پریشان مت ہوں ابو.....'' اس نے لہجے کو ہشاش بشاش بنا کر بات کی تھی مگر پھر بھی..... پھر بھی معلوم نہیں کیوں لہجہ بیچارگی لیے ہوئے تھا، اسے یہ نہیں کہنا تھا مگر وہ کہہ رہی تھی۔

''بڑی زیادتی کی ناں میں نے تمہارے ساتھ خولہ بچے، ہے ناں.....'' احمد صاحب نے اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ نکال کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔

اور بس..... ان کا اعتراف، اعتراف نہ تھا..... تیز دھار آلہ تھا، کوئی خنجر تھا شاید یا پھر بھالا..... آر پار ہو گیا تھا۔

''نہیں ابو.....'' وہ آواز کی لرزش پہ قابو نہ پا سکی تھی۔ ''کسی اور سے شادی ہوتی تو بھی ممکن تھا کہ وہ جہانگیر سے زیادہ bitter ثابت ہوتا تو.....؟''

''اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ایک اچھا، بہت اچھا..... بہترین ساتھی ثابت ہوتا۔ میں جہانگیر کی طبیعت سے واقف تھا خولہ بچے پھر بھی..... پھر بھی.....'' انہوں نے بے بسی سے اپنا سر نفی میں ہلایا تھا۔ خولہ کے آنسو بہہ پڑے۔

''جو ہوا نہیں..... اس پر سوچیں کیوں ابو..... جو ہو رہا ہے اس کا حل تلاش کرنا چاہیے ناں.....'' اس نے بچوں کے سے لہجے میں کہا تھا۔

''نہیں خولہ! نہیں بچے..... اب اور نہیں، جہانگیر کو اگر تمہیں رکھنا ہے تو عزت سے رکھنا ہوگا۔ میں اب کمپرومائز نہیں کروں گا، میں پہلے ہی غلطی کر چکا ہوں، اب مزید نہیں..... مزید نہیں.....'' وہ کہہ کر رکے نہیں تھے، اٹھ کر چلے گئے تھے۔

اور خولہ کتنی ہی دیر وہ یوں ہی بچوں کے بل زمین پر بیٹھی رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر اب بھی ان بوڑھے ہاتھوں کا سرد لمس تازہ تھا۔ اور پھر اس نے مڑ کر ابو کے کمرے کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ تو ان کو بتانا چاہتی تھی، کہنا چاہتی تھی، ان کے سینے پر سوار ہو کر ہاتھ نچا، نچا کر طعنے دینا چاہتی تھی کہ انہوں نے اس کی زندگی برباد کر دی اور..... اور اب ہوا کیا؟ وہ کیا کہہ رہی تھی ان سے۔

نم چہرے پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ ابھری اور اگلے ہی لمحے اس نے بے بسی سے سر کو نفی میں جھٹکا تھا۔ چند لمحے اسی طرح سے گزرے تھے پھر وہ کرسی کا سہارا لے کر اٹھی۔ آہستہ قدموں سے، جھکے سر کے ساتھ چلتے ہوئے وہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر صحن میں نکل گئی تھی۔ اور یوں چلتے ہوئے وہ کوئی بھٹکی ہوئی روح لگتی تھی۔ اور جب صحن میں لگے جھولے پر بیٹھ کر اس نے آسمان کو دیکھا تو..... رات تو معمول کے مانند ہی سیاہ تھی، تارے حسب عادت چمکتے تھے، چاند ہر روز کی طرح روشنی بکھیر رہا تھا اور اسے لگتا تھا کہ سارے منظر پر حاوی، اندھیرے کی طرح چھائی یہ خاموشی اسے کھا جائے گی، نگل جائے گی، ہڑپ کر لے گی، سالم کا سالم، پورے کا پورا۔

جھولا آہستہ، آہستہ ہلتا تھا۔ چیں، چیں کی آواز سے ماحول کی خاموشی چیخ سی جاتی تھی اور اس پر بیٹھا وجود اتنا ساکت اور خاموش تھا کہ قریب، قریب مردہ لگتا تھا۔

☆☆☆

اس کے چہرے پر کچھ اور تھا یا نہیں..... مگر آنکھوں میں کاجل ضرور بھر، بھر کر ڈالا گیا تھا۔ معصوم چہرہ، آنکھوں میں کاجل اور مناسب لباس، وہ اچھی لگ رہی تھی۔ سب سے بڑھ کر معصوم.....

''آپی..... میں ٹھیک لگ رہی ہوں ناں.....'' مزنہ کا لہجہ ذرا سی گھبراہٹ لیے ہوئے تھا۔ آج اسے دیکھنے کچھ لوگ آرہے تھے پہلی بار تھی سو وہ ذرا سی گھبرائی ہوئی تھی۔ خولہ نے مسکراتے ہوئے اس کے پہلو میں گرا دوپٹے کا پلو اٹھا کر اس کے سر پر ٹکایا تھا۔ یہ کاجل بھی خولہ نے ہی لگایا تھا۔

''نہیں، بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہیں تم.....'' وہ شرارت سے بولی۔

''آپی.....'' وہ ہنسی تھی اور خولہ ہلکے سے ہنس دی۔

''اچھی لگ رہی ہو اور چلو اب جلدی کرو.....'' پھر اسے ساتھ لیے ہی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی۔ ماحول خوشگوار تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ مزنہ کو دیکھتے ہی ان لوگوں نے پسند کر لیا تھا۔

خولہ نے ہی سب کو چائے سرو کی تھی۔

''آپ میرڈ ہیں ناں.....؟'' اس نے لڑکے کی والدہ کو چائے پکڑائی تو انہوں نے سوال کیا تھا۔

''جی.....'' وہ ہلکے سے مسکرائی۔

''کیا کرتے ہیں آپ کے ہسبینڈ؟''

''ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتے ہیں۔'' اس نے اب۔ کبابوں کی پلیٹ ان کے آگے کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تو آپ یہاں ابو کے گھر چند دن رہنے آئی ہیں؟''

''جی.....'' وہ بہ مشکل کہہ پائی تھی۔

آنٹی کا سوال نامہ ہی ختم نہیں ہو رہا تھا۔ اور ان کے سادہ سے سوال خولہ کے گلے کا پھندا بنتے جا رہے تھے۔ چائے سرو کرنے کے بعد وہ وہاں رکی نہیں تھی۔ تیز، تیز قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے وہ کچن میں آگئی تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر معلوم نہیں اس نے کس چیز کو روکا تھا۔ وہ گھبرا گئی تھی۔ اسے یہاں آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہو چلا تھا اور معاملہ وہیں کا وہیں۔ ابو رابطہ کرتے تھے، نہ جہانگیر پوچھتا تھا۔ پھپھو کے فون کرنے پر بھی جہانگیر نے پابندی لگا رکھی تھی۔ وہ پھر بھی کبھی کبھار کر ہی لیتی تھیں۔ لیکن ان کی خواہش سے چاہنے نہ چاہنے سے کیا فرق پڑتا تھا اور اب..... اب ایک نیا مسئلہ درپیش تھا۔ اس پہلو سے، اس اینگل سے تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ ابو نے بھی سوچا نہیں ہوگا۔ لوگ تو اعتراض کرتے ہیں، شادی شدہ بیٹی گھر آکر بیٹھ جائے، چاہے وجہ کچھ بھی ہو، ان کی بلا سے لوگ تو اعتراض کرتے ہیں۔ اور جیسے آج پہلے ہی دن آنٹی نے سوالات کی بھرمار کر دی تھی۔

Digitized by Google

خولہ کو یقین تھا کہ یہ بات انہیں پسند نہیں آئے گی...... وہ آخر کب تک، کب تک جھوٹ بھول سکتے تھے، اگر بات طے ہوگئی، شادی تک جا پہنچی تو تب...... تب کیا ہوگا؟ اسے ایک دم ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے، بے اختیار اس نے آگے بڑھ کر اپنے لیے پانی کا گلاس بھرا تھا اور بیٹھ کر غٹاغٹ اسے چڑھا گئی تھی۔

اسے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ بات مسئلہ نہیں...... بہت بڑا مسئلہ بن کر سامنے آنے والی تھی۔

اس بات کی قوی امید تھی کہ مزنہ کی بات یہاں طے ہو جانی تھی یہ ان لوگوں کا احمد صاحب کے گھر پانچواں چکر تھا اور ہر دفعہ وہ آنٹی سے بچتی رہی تھی اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کا بچنا بھی آنٹی کی نظر میں آچکا تھا۔

''کیا بات ہے بھائی صاحب...... میں جب بھی آئی خولہ کو یہیں دیکھا......؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' انہوں نے سیدھے، سیدھے احمد صاحب سے سوال پوچھ ہی لیا تھا۔ احمد صاحب یک دم جواب نہ دے سکے۔ خولہ کا رنگ فق ہوا تھا اور مزنہ نے بے اختیار سر جھکایا تھا۔

''اب آپ سے کیا چھپاؤں...... تعلق داری ہونے والی ہے، میں جھوٹ بولنا گوارا نہیں کرتا...... بس اس کے شوہر کے ساتھ کچھ پرابلمز چل رہی تھیں تو میں اسے یہاں لے آیا۔'' احمد صاحب نے ٹھہر، ٹھہر کر بات مکمل کی تھی۔ آنٹی کا ماتھا ٹھنکا۔

''کیسی پرابلمز بھائی صاحب......؟''

''بس یوں سمجھیے کہ سیریس مسئلہ ہی ہے...... بس دعا کریں کہ بچی کے حق میں بہتر ہو......''

''آپ کی بہن کے گھر بیاہی ہوئی ہے نا خولہ......؟''

''جی، جی......''

''تو پھر بھی نوبت یہاں تک پہنچ گئی......''

''بس......! بھتیجا خر دماغ ہے، بات کو سمجھتا ہی نہیں...... اب وہ خولہ کو مجبور کرتا ہے کہ یہ جاب کرے...... حالانکہ کمی کسی چیز کی نہیں...... تو میں اسی بات پر لے آیا اسے۔ میری بچی کیا سڑکوں پر خوار ہونے کے لیے ہے؟''

''یہ تو اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ اس کے لیے یوں بیٹی کو گھر بٹھا لیا جائے۔ سسرال میں، شوہر کے ساتھ سو طرح کے سمجھوتے کرنے ہی پڑتے ہیں۔'' آنٹی کا لہجہ اب کے بدلا ہوا تھا۔ مزنہ اور خولہ نے ایک دوسرے کو بے اختیار دیکھا...... احمد صاحب اس بات پر یک دم کچھ کہہ نہ سکے تھے۔

''اب اگر خدانا خواستہ، کل کو مزنہ کو کوئی مسئلہ ہو گیا تو تب بھی آپ یہ ہی کریں گے کیا؟'' اور اب اُن کے لہجے کو صحیح طور پر لفظوں میں بیان کیا جا سکتا تھا۔ وہ سخت تھا۔

''ارے نہیں، نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ دراصل جہانگیر کو جانتی نہیں ہیں، وہ بے حد سخت مزاج ہے اور خولہ نے تو بہت کچھ سہا ہے۔ اب ہر غلط، ناجائز بات برداشت بھی تو نہیں کی جا سکتی ناں......'' احمد صاحب نے وضاحت دی تھی، دے تو دی تھی مگر رہی بے سود۔

''اب بات لگنے کو بری ہی لگے گی...... لیکن سسرال میں غلط، ناجائز برداشت کرنے کو ہی سمجھوتا کہتے ہیں۔ ہماری ساری عمر بھی ایسی ہی باتیں برداشت کرتے، کرتے گزری ہے۔'' وضاحت کو تو جیسے چٹکیوں میں اڑا دیا گیا تھا۔

اور ہاں...... بات واقعی ہی بری لگی تھی...... ایک کو نہیں سب کو...... وہاں ناگوار سی خاموشی سرعت سے پھیلی اور پھیل کر پورے ماحول پر چھا گئی تھی۔ یہ اچھا نہیں ہوا تھا۔ یقیناً یہ اچھا نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

''ابو کو یوں ساری بات کھل کر نہیں کرنی چاہیے تھی آپی......'' وہ مزنہ تھی جو کہ پریشان سی تھی، وہ خولہ کے گھٹنے

پر سر رکھے بیٹھی تھی۔ مہمانوں کے جانے کے بعد سے احمد صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ آج رات کا کھانا کسی نے بھی نہیں کھایا تھا، مزنہ کی اس بات پر خولہ نے آہستگی سے اس کے بالوں کی بکھری لٹوں کو سنوارا تھا۔

''چندا ابو کب تک ان لوگوں سے چھپاتے، کب تک......؟ بات تو آخر کھلنی ہی تھی......'' لہجہ دھیما مگر آنچ دیتا تھا۔

''میں یہ تو نہیں کہہ رہی تھی کہ ابو بات چھپاتے مگر یوں ساری بات کھل کر بھی نہ کرتے، اچھا تاثر تو نہیں لے کر گئے ناں وہ یہاں سے۔''

''ہم...... مم، ٹھیک ہے لیکن مزنہ جو لوگ کسی کی پرابلم کو سمجھ نہ سکیں۔ اصل بات کو جانے، سمجھے بغیر...... وہ کسی کی بیٹی کو ہی قصور وار ٹھہرائیں تو ان لوگوں کی ذہنیت کیا ہوگی؟ وہ تو یوں بات کر رہی تھیں جیسے مجھے کانٹا چبھا اور ابو نے مجھے لا کر گھر بٹھایا، اصل معاملہ کیا ہے، اس کی نوعیت کیا ہے' یہ جانے بغیر انہوں نے فتویٰ لگا دیا۔ اور کیا صرف لڑکی کو ہی کمپرومائز کرنا چاہیے، مرد کا یا اس کے گھر والوں کا کوئی شیئر نہیں ہوتا میریڈ لائف میں......؟'' وہ اب بھی اس کے بال سنوار رہی تھی اور لہجہ اب بھی وہی دھیما تھا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں......'' مزنہ ذرا سے توقف کے بعد بولی تھی۔ خولہ نے اسے اٹھایا...... شانوں سے پکڑ کر رخ اپنی طرف موڑا۔

''اور اب اگر ایسے لوگ پیچھے ہٹ جائیں، رشتے سے انکار کر دیں تو کیا ایسے لوگوں کا اپنے گھر رہنا ہی ٹھیک نہیں......'' خولہ بے حد پیار سے پوچھ رہی تھی اور وہ محض پوچھ نہیں رہی تھی۔ وہ اسے ذہنی طور پر اس دھچکے کے لیے تیار رہنے کا عندیہ بھی دے رہی تھی۔ مزنہ فوری طور پر بول نہ سکی تھی بس ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

خولہ نے تسلی والے انداز میں اس کے گال کو تھپتھپایا اور اٹھ کر چلی گئی تھی۔ مسئلے کا ایک مثبت پہلو گو کہ اس نے ڈھونڈ ہی لیا تھا لیکن پریشان وہ بھی تھی۔ ایسا گر پہلی بار ہوا تھا...... لیکن...... اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ یہ آخری بار ہی ہوا تھا۔ لوگوں کی ذہنیت اور ان کی زبانیں...... ان دونوں کا فی زمانہ کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

''جہانگیر......'' امی نے اسے اپنے کمرے میں آواز دی تھی اور آواز سنتے ہی اس کے چہرے پر ناٹ اگین جیسے تاثرات ابھرے تھے۔ وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ بیزار سا منہ بناتے ہوئے اس نے ٹی وی بند کیا، منہ کھول کر سانس باہر نکال کر سو دفعہ کی کہی بات کو پھر سے سننے کے لیے خود کو تیار کیا تھا اور اب یہ 101 ویں بار تھی۔

''جی......'' دروازے پر ہی کھڑے ہو کر بے حد ڈھیلے انداز میں جی بولا گیا تھا۔

''اِدھر آؤ......'' فرخندہ نے ڈپٹا۔

''امی پلیز......'' وہ بیزار ہوا۔

''جہانگیر کب تک، کب تک ایسا چلے گا آخر......؟ کچھ تو شرم کرو۔ ماموں کے احسانات کا ہی لحاظ کر لو......'' فرخندہ پریشان تو تھیں ہی وہ اب تپی ہوئی بھی تھیں۔

''ماموں کے احسانات کا لحاظ کر کے ہی ان کی بیٹی سے شادی کی تھی۔'' بے حد بے پروا انداز میں کہتے ہوئے، اس نے ڈرائی فروٹ کی پلیٹ میں سے کاجو اٹھا کر فضا میں اچھالا اور پھر منہ سے اسے کیچ کیا تھا۔ اور اب منہ ہلاتے ہوئے وہ ماں کو مزے سے دیکھ رہا تھا۔

''جہانگیر، کسی کی بچی کے ساتھ ایسا مت کرو۔ کل کو اگر تمہاری بھی بیٹی ہوئی اور......''

''اوہ، کم آن امی...... اچھا لے آؤں گا اسے...... ابھی میں بہت مصروف ہوں بہت لوڈ ہے کام کا، ٹائم نہیں ہے ابھی میرے پاس......'' بات کاٹ کر کہتے ہوئے، اس نے ایک اور کاجو فضا میں اچھال کر منہ سے کیچ کیا تھا۔ اور فرخندہ حیرانی

Digitized by Google

سے اسے تکنے لگیں..... بھلا خولہ کو گھر واپس لانے کے لیے بھی اسے ٹائم چاہیے تھا..... یہ بھی بھلا کوئی کرنے کی بات تھی۔

''جہانگیر.....'' انہوں نے حیرت سے ہی اسے پکارا۔

''امی پلیز.....'' اور وہ جان چھڑا کر باہر نکل آیا تھا۔ گرامی نے یہ بات 101 مرتبہ دُہرائی تھی تو اس نے بھی 101 مرتبہ واں بہانہ گھڑا تھا۔ وہ خولہ کو گھر لانے والا نہیں تھا، ماموں لے کر گئے تھے اچھا ہے سارے ارمان، سارے شوق پورے کرلیں اپنے..... پھر دیکھا جائے گا کہ اس مسئلے کا کچھ کرنا بھی ہے کہ نہیں اور اگر کرنا ہے تو کیا کرنا ہے آخر.....

جیبوں میں ہاتھ ڈالے، منہ چلاتا ہوا وہ اپنے کمرے میں آیا تھا۔

''بہت بے وفا ہو بیوی تم بھی..... مرد پر تو چلو بے وفائی سوٹ کرتی ہے لیکن عورت ہو کر بھی تم نے مڑ کر پوچھا تک نہیں.....'' وہ اب اپنی اور خولہ کی انلارج شادی کی فوٹو کے سامنے رک کر بڑبڑایا تھا۔ شکوہ کیا تھا..... تو وہ اندر خانے اسے مس بھی کرتا تھا۔

☆☆☆

معلوم تو پہلے سے تھا کہ یہی ہونا ہے مگر جب ہونی اپنی ہونی پر آئی تو سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

''جب بڑی بہن گھر نہیں بسا سکی تو چھوٹی کیا کرے گی؟'' انکار اس بات میں لپیٹ کر منہ پر مارا گیا تھا۔ مزنہ کا ری ایکشن شدید تھا۔ وہ کمرے میں بند تھی اور کھانا تک نہیں کھایا تھا۔ احمد صاحب اور خولہ..... وہ اس کے مقابلے میں سمجھدار تھے اور وہ یوں ری ایکٹ بھی نہیں کرسکتے تھے البتہ احمد صاحب کو ایک نئی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔

''خولہ اس کو سمجھاؤ..... یہ کوئی دنیا کا آخری پروپوزل تو نہیں تھا۔''

''ابو مجھے شرم آتی ہے، میری وجہ سے.....''

''کیسی بات کرتی ہو خولہ..... وہ لوگ ہی چھوٹی ذہنیت کے تھے۔'' احمد صاحب نے تکلیف سے اس کی بات کاٹی۔

''ابو.....'' خولہ نے اپنا سارا حوصلہ جمع کر کے انہیں پکارا تھا۔

''میں، واپس.....'' اور جملہ ادھورا رہ گیا۔

''خولہ.....'' ابو نے یک دم اس کا سر اپنے سینے سے لگایا تھا۔ ''نہ بچے..... تم بھاری نہیں ہو مجھ پر.....'' وہ دکھ سے بولے تھے اور خولہ نے اتنا سارا..... ڈھیر سارا، کڑوا، زہر ملا پانی اپنے اندر خود ہی اتارا اور خود ہی اس میں ڈوب کر ایک بار پھر سے مرگئی۔

☆☆☆

یہ ایک ہوٹل کا بڑا اور پُرتعیش کمرا تھا اور اس وقت نسبتاً نیم تاریک سا دمکتا تھا۔ قطار میں بنی کھڑکیوں پر پردے برابر تھے۔ ان برابر کیے ہوئے سفید پردوں کے پار اندھیرا، رات کی گواہی تھا۔ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر ایک cylindrical لیمپ دھرا تھا۔ جس کی مدھم سفید روشنی کمرے کو مکمل تاریک ہونے سے بچائے ہوئے تھی۔ کمرے میں کوئی خوشبو سی تھی جو بل کھا کر چکراتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ روشنی کی طرح ہی مدھم مگر اپنا پتا دیتی ہوئی..... شاید وہ اس بیگ سے اٹھ رہی تھی جو کہ لیمپ کے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ چنبیلی اور گلاب کے پھول..... اس نیم تاریک کمرے میں آنکھیں جب دیکھنے کے قابل ہوں تو معلوم ہوتا تھا کہ وہاں، خوشبو، مدھم، ٹھنڈی روشنی اور خنکی ہی نہیں تھیں۔ وہاں کوئی اور بھی تھا۔ اِک وجود..... نیم جاں سا..... کسی خوف میں مبتلا مغربی دیوار کے ساتھ یوں کھڑا تھا کہ جیسے ابھی کے ابھی ڈھے پڑے گا۔ وہ کوئی دلہن تھی شاید..... نہیں..... وہ یقیناً اِک دلہن ہی تھی لیکن اس کا لباس سرخ نہ تھا۔ وہ نیوی بلو کلر کے گھیر دار فراک میں ملبوس تھی کہ جس کے گھیر پہ کوئی قریب چار انچ چوڑی پٹی کی صورت سلور گرے کام ہوا ہوا تھا۔ باقی سارا فراک سادہ تھا۔ دوپٹے پہ جا بجا ٹکے سلور گرے موتی اور قریب کوئی دو انچ چوڑی پٹی کی صورت کام تھا۔ وہ میک اپ اور جیولری سے آراستہ دلہن نہ تھی۔

وہ منفرد تھی۔ گلے میں وائٹ گولڈ کی چین اور کانوں میں وائٹ گولڈ کے ہی ذرا بڑے چوکور شکل کے ٹاپس اس کی اسکن گلو کر رہی تھی۔ روز پنک cheeks کے ساتھ وہ ہونٹوں پر کورل پنک لپ اسٹک لگائے ہوئے تھی۔ آنکھوں پر اسموکی میک اپ اور کاجل کی گہری دھار..... بالوں کا اسٹائل side bun اور bun کے بالکل اوپر چند کلیاں اٹکی ہوئی تھیں۔ لمبی پلکوں کو مسکارے سے سجا رکھا تھا۔ وہ بہت دل کش دکھتی تھی ابھی ٹھیک اسی پل میں اس کی دل کشی کو خوف ڈھانپتا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ سہمی ہوئی تھی۔ ابھی ذرا دیر پہلے ہی تو نکاح ہوا تھا اور.....

''یہ..... یہ میں نے کیا کر دیا کیا؟'' وہ منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے گھسٹتی ہوئی بے دم سے انداز میں نیچے بیٹھتی چلی گئی تھی۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

''کیا کر دیا یہ میں نے.....'' اور اب کی بار اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما تھا۔ تکلیف ایسی تھی جیسے سانس نکلتی نہ ہو جو اسے کبھی نہیں کرنا تھا۔ اور یہ طے تھا کہ ایسا نہیں کرنا تھا اسے۔ وہ ہو گیا تھا۔

''یہ..... یہ کیا ہو گیا.....؟'' اس کے گلے سے پھنسی مگر بھرائی ہوئی آواز نکلی اور اس کے ساتھ ہی آنسو آنکھوں سے لڑھک کر ٹھوڑی تک آگئے۔ اور پھر وہ ٹپ، ٹپ قطروں کی صورت گرنے لگے، بہنے لگے اور یوں گر کر، بہہ کر وہ اس تکلیف کو پوری طرح سے بیان کرتے تھے جو کہ اس وقت، اس چہرے پر موجود تھی۔ اور پھر یک دم وہ چونکی اور چونکانے والی چیز..... دروازہ کھلنے کی آواز تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس کی حالت اور خراب ہوئی تھی۔ وہ مزید سہمی تھی..... وہ منہ پر ہاتھ رکھے، بے یقینی سے دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی۔ ایک ہیولہ سا نمودار ہوا اور اس ہیولے کے سائے نے اس کے سارے وجود کو چھپا کر رکھ دیا تھا۔ جوتوں کی چاپ ابھری اور سایہ گھسٹتا، گھسٹتا بالکل معدوم ہوا اور عین اس کے سامنے آرکا۔ وہ خود میں اتنی ہمت نہ پاتی تھی کہ نظر اٹھا کر اس کی سمت دیکھ سکے..... وہ اپنی نظروں کو اس کے جوتوں پر گویا چپکی پاتی تھی۔ وہ اس کے سامنے اکڑوں بیٹھا اور اس نے بیچارگی سے آنکھیں بند کی تھیں۔ وہ اس کے چہرے پہ بہنے والے آنسو اس کی گیلی لرزتی پلکوں اور کانپتے ہونٹوں کو دیکھتا رہا..... اور پھر انگلی بڑھا کر اس کے چہرے کی نمی کو محسوس کیا۔ جیسے ہی انگلی نے اس کے چہرے کو چھوا، اس کے رونے میں شدت آئی تھی۔ اس نے دانتوں تلے ہونٹوں کو دبا کر، انہیں کانپنے سے روکنا چاہا مگر ناکام رہی۔

''ہمایوں.....'' اور اس کے منہ سے ازحد لاچاری، بے بسی سے کانپتا ہوا فقط یہ نام نکلا تھا۔

☆☆☆

جو کام جہانگیر کرنے پر راضی نہ تھا اور جس اِک کام کے لیے احمد صاحب بھی اپنی انا کا بت کھڑا کر کے اڑ گئے تھے۔ وہ اِک کام، وہ فیصلہ تقدیر نے کروا چھوڑا تھا۔ ایک بار پھر سے اسے مزنہ کے لیے، مزنہ کی وجہ سے ہی مار کھانی پڑی تھی۔ معلوم نہیں دنیا کم ظرف لوگوں سے بھر گئی تھی یا کہ ایسے لوگوں نے ان کا ہی گھر دیکھ لیا تھا۔ مزنہ کے لیے جو کوئی بھی پروپوزل آتا انہیں خولہ کی موجودگی آنکھ کا کنکر بن کر چبھنے لگتی، کھٹکنے لگتی یوں جیسے خولہ کوئی آسیب تھی۔ کوئی متعدی بیماری تھی۔ زیادہ تر لوگ اسی ایک وجہ پر پیچھے ہٹے تھے اور مزنہ..... وہ روز بروز خاموش سی ہوتی جا رہی تھی گو کہ خولہ کے ساتھ اس کا رویہ بدلا نہ تھا مگر وہ پہلے جیسا بھی نہیں رہا تھا۔ وہ اس سے بہت کم بات کرتی اور خولہ..... ایک بار پھر سے زندگی کے اس مقام، اس رستے پر آ کھڑی ہوئی کہ جہاں سے رستہ دو راہے میں بدل جاتا ہے، اِدھر یا اُدھر..... فیصلے کی گٹھڑی اِک بار پھر اسی کے سر تھی..... مجبوری تھی اور یہ ہی مجبوری احمد صاحب کی انا پر ضرب بن کر پڑتی تھی۔ وہ کمزور پڑ رہے تھے تو اس سے پہلے کہ کوئی خود منہ بول کر اس سے کہتا..... اور اس سے پہلے کہ مزنہ مداشت کرتے، کرتے بالآخر ایک روز اس کے سامنے پھٹ پڑتی، اسے طعنہ مارتی، وجہ قرار دیتی اور اس کی خود

Digitized by Google

کی عزت، دھڑام سے خود اسی کے پیروں میں آن گرتی تو یہ کہ سمجھ کا استعمال کر لینا چاہیے تھا۔ عقل کا دروازہ کھول کر دیکھ لینا چاہیے تھا کہ بقا کا کوئی ایک آدھ رستہ بچا ہے یا نہیں..... چاہے اس رستے پر چلنا کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہوگا مگر یہ خود کی عزت سے زیادہ پیارا تو نہیں تھا..... میاں، بیوی میں اک پردہ ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے اور وہ ہے عزتِ نفس..... خولہ نے خود ہی اپنی عزتِ نفس کے پردے کو تار، تار کر دیا تھا۔ بڑا مشکل کام تھا، محبت میں منہ چڑھے دریا پار کرنے آسان ہوتے ہیں اور اگر بن محبت کے ایسا کوئی دریا پار کرنا پڑ جائے تو؟ اترنا آسان ہرگز نہیں ہوتا اور پاؤں ڈالنا سخت کام..... اور اس نے یہ بھی کر لیا..... کر دکھایا۔

''میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں خولہ.....'' اس کی تیاری دیکھ کر احمد صاحب نے کہا تھا۔ تو سارے اعتراضات کے باوجود، وہ ایک بار پھر مزنہ کی محبت میں اسے ہار رہے تھے۔

''نہیں ابو.....'' وہ تکلیف سے مسکرائی۔

''یہ راستہ..... طے ہونے کے واسطے میرے پاؤں مانگتا ہے۔ آپ کب تک ساتھ دیں گے؟ آپ کو کیوں خود کے ساتھ تھکاؤں.....؟'' اس نے نرمی سے ان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر کہا تھا..... وہ بے بسی سے اسے دیکھتے رہے۔ اور پھر ان کا ہاتھ اپنی جیب تک گیا اور جب باہر آیا تو اس میں ایک چیک تھا۔

''نہیں ابو.....!'' وہ بدکی۔

''خولہ بچے..... مجھے یہ کرنے دو..... اس سے تو انکار مت کرو.....'' وہ بھیگی آواز میں بولے تھے۔

''ابو..... مجھے جب ضرورت ہوگی تو میں مانگ لوں گی..... لے لوں گی، میری امانت سمجھ کر آپ اپنے پاس ہی رکھیے۔'' اس نے ان کا چیک والا ہاتھ دوبارہ انہی کی جیب کے اندر کر دیا تھا۔ اور جب وہ مزنہ سے ملی تو وہ رو رہی تھی۔

''جب میری شادی ہو جائے گی تو آپ پھر سے اِدھر آ جانا آپی!'' روتے، روتے ایک بچکانہ سی بات اس نے کہی تھی اور خولہ زور سے ہنس دی تھی۔ اک بھیگی سی ہنسی.....

''ٹھیک ہے.....'' اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے، اپنے آنسو اندر اتارتے ہوئے خولہ نے جواب دیا تھا۔ مزنہ کو دیکھتے ہوئے اسے معلوم نہیں کیوں یہ یاد آیا تھا۔ ''ابو نے کہا تھا کہ مزنہ چھوٹی ہے، برداشت نہ کر پائے گی۔'' ابو نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ واقعی برداشت نہ کر پاتی..... اس کے اپنے ساتھ جواب ہو رہا تھا۔ وہ کون سا اس سے برداشت ہو سکا تھا۔ لیکن سوال یہ کہ..... اسے کون سی برداشت کی گھٹی پلا دی گئی تھی..... آخر کون سی.....؟

☆☆☆

اس کے ہاتھ سے سامان چھوٹ کر زمین پر جا گرا تھا۔ شدید دھچکا تھا یہ..... وہ بے حد شاک سے انہیں دیکھتی رہی۔

''پھپھو!'' چیخنے کے سے انداز میں وہ اُن کی طرف بھاگی تھی۔

''کیا ہوا ہے آپ کو.....؟'' اور جب وہ گھر آئی تو پھپھو کی حالت دیکھ کر وہ اِک صدمے کا شکار ہوئی تھی۔

''خولہ.....'' فرخندہ نے بچوں کی طرح بازو پھیلائے اور خولہ نے انہیں بانہوں میں لے لیا..... وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اُن کی تو شکل ہی بدل چکی تھی۔ بے حد کمزور نظر آ رہی تھیں وہ۔

''جہانگیر نے ذرا بھی پروا نہیں کی آپ کی.....؟ آپ دوائیں نہیں لیتی رہیں؟'' وہ دکھ، حیرانی اور پریشانی سے روتے، روتے پوچھ رہی تھی۔

''دوائیں تنہائی اور غموں کا علاج نہیں کرتیں بیٹا۔'' روتے ہوئے فرخندہ نے جواب دیا تھا۔ خولہ یک دم لاجواب ہو گئی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہی..... اُن کو سنتی رہی، وہ کبھی ہچکیوں سے رونے لگتیں، کبھی جہانگیر پر غصہ کرنے لگتیں، کبھی خولہ کے آنے پہ خوشی کا اظہار کرتیں تو دوسرے ہی لمحے ناخوش بھی نظر آنے لگتیں۔

''بس کریں پھپھو.....!'' آخر یہ میرا گھر تھا، مجھے یہیں آنا تھا۔''

''وہ پھر سے تمہیں مجبور کرے گا خولہ.....''

''دیکھی جائے گی.....'' اک گہری سانس بھر کر اٹھتے ہوئے کمر کے گرد دوپٹا کستے ہوئے وہ بولی تھی۔ پھپھو تو پھپھو، گھر کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی.....

''تم کیا کرنے لگی ہو؟'' اسے یوں کھڑا ہوتے دیکھ کر فرخندہ اچنبھے سے بولیں۔ وہ نام کا مسکرائی۔ اور پھر ان کے قدموں کے پاس بیٹھ کر چہرہ اونچا کر کے پھپھو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''گھر سنبھالنے لگی ہوں پھپھو.....''

☆☆☆

اپنے پاس موجود چابی سے وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تھا اور آتے ہی صحن کو دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔ معمول سے ہٹ کر کچھ تھا کیا.....؟ وہ سمجھ نہیں پایا..... (صفائی انسانوں والے طریقے سے کی گئی تھی۔) وہ ذرا سا الجھا..... رکا اور پھر ''فار گیٹ اِٹ'' والے انداز میں سر جھٹک کر اندر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ اس نے چابیاں کارنس پر رکھیں اور ایک نظر سارے گھر پر دوڑائی۔ یہاں بھی کچھ غیر معمولی تھا، کیا..... پھر سے سمجھ نہ آیا تھا۔

وہ امی کو آواز دیتے دیتے رکا تھا۔ یک دم اسے خیال آیا تھا کہ عموماً وہ اس کے آنے تک جاگ رہی ہوتی تھیں۔ آج لگتا تھا کہ سو گئی ہیں اور یہ بھی خلافِ معمول تھا..... وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ان کے کمرے تک آیا..... آہستگی سے دروازہ کھول کر دیکھا..... وہ بے سدھ سو رہی تھیں۔ جہانگیر نے اسی نرمی کے ساتھ دروازہ بند کر دیا..... کہ جس نرمی سے کھولا تھا، ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے وہ اپنے روم میں آیا۔ ٹائی اتار کر بیڈ پر پھینکی، خود بھی گرنے کے سے انداز میں بیڈ پر بیٹھا اور جوتے اتارنے لگا۔ جوتے اتار کر جب وہ انہیں شوریک میں رکھنے لگا..... تو جیسے اِک اور بات گرفت میں آئی تھی۔ جوتوں کے جوڑے سارے ترتیب سے بالکل سیدھے، بنا گرد کے رکھے ہوئے تھے اور ایسا آج خولہ کے جانے کے بعد پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ وہ اب کی بار چونکا..... سیدھا ہو کر اس نے بے اختیار بیڈ کی طرف دیکھا تھا۔ بیڈ شیٹ ملازمہ روزانہ ٹھیک کر کے جاتی ہی تھی لیکن کوئی نہ کوئی کونہ لٹک رہا ہوتا تھا اور آج..... بنا سلوٹ کے اک ترتیب سے، مناسبت سے بیڈ شیٹ ٹھیک کی گئی تھی۔ کوئی کونہ لٹک نہیں رہا تھا۔ اس نے فوراً بیڈ کراؤن کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی روزانہ کی طرح ڈسٹ موجود نہیں تھی۔

''ویٹ آ منٹ.....!'' وہ بڑبڑایا اور آنکھیں سکیڑ کر کچھ سوچنے لگا۔ اِک خیال سا ذہن میں چکر کھانے لگا تھا، وہ چند لمحے تذبذب کا شکار ہو کر اپنے خیال کو ''خوش فہمی'' کا نام دیتا رہا اور پھر چیک کرنے کے واسطے خیال پر یقین کا ٹھپا لگانے کے واسطے وہ کچن کی طرف گیا۔

''ہا.....'' اور کچن کو دیکھ کر، بے ساختہ خوشی سے اس کے منہ سے نکلا تھا۔

''تو آپ آ ہی گئیں.....'' دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال کر وہ مسرت سے بولا تھا۔ اِک سرشار کر کے رکھ دینے والی خوشی نے پورے جسم میں تیز رفتاری سے چکر کھایا تھا۔

''لیکن آپ ہیں کہاں؟'' دوسری بات یہ ہی ذہن میں آئی تھی، صحن میں نہیں تھی۔ یہاں بھی کہیں نہ تھی تو پھر.....؟ اور بے ساختہ اس نے وال کلاک دیکھا..... تو پھر وہ چھت پر ہی تھی۔ اس ٹائم وہ چھت پر واک کیا کرتی تھی۔ جہانگیر مسکراتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھا تھا۔

☆☆☆

وہ جانتی تھی وہ گھر آ چکا ہے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ اس کی موجودگی سے بے خبر بھی نہیں رہے گا۔ دونوں ہاتھ گرل پہ سختی سے جمائے وہ اِک بیچارگی کی سی کیفیت میں کھڑی تھی۔ اذیت جسم کے بخیے اُدھیڑ رہی تھی

Digitized by Google

جسم کو ریشوں میں بدل رہی تھی۔ آسان نہ تھا اس کا سامنا کرنا۔ وہ رونا چاہتی تھی لیکن دل کو ایک سخت خوف نے جکڑ رکھا
تھا۔ وہ اب، اب کیا کرے گا اس کے ساتھ طعنے...... زہریلی باتیں...... بے عزتی...... وہ اس پر ہنسے گا، اس طرح کہ
مرجانے کو جی چاہے گا، وہ عزت کا ایک احساس بھی اس کے پاس نہ رہنے دے گا۔ کوئی اک ایسی بات بھی نہیں کہ جس
سے اس کا جھک جانے والا سر کبھی اٹھ سکے اور پھر...... پھر یک دم اس کا دل دھک کر کے رہ گیا تھا۔ جسم پر اک کپکپی سی
دوڑی تھی۔ اس کی پشت پر موجود سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ ابھر رہی تھی۔ اور وہ چاپ لحہ بہ لحہ واضح سے واضح تر ہوتی
جا رہی تھی۔ ساعت بہ ساعت قریب سے قریب تر...... اور وہ...... اس نے آنکھیں بند کر کے سانس روک لی۔
کتنے اور کڑوے جملے؟ کتنی اور تکلیف......؟ کتنا زہر......؟ کتنی اذیت......؟ کتنی اور بے عزتی......؟ جیسے، جیسے
قدموں کی چاپ ابھر رہی تھی، ویسے، ویسے اس کے ہاتھوں کی گرفت کستی جا رہی تھی۔ اور پھر...... پھر چاپ قریب ترین
واضح ترین ہو کر عین اس کی پشت پر ساکت ہو گئی تھی۔ اس قدر قریب کہ وہ اپنی پشت پہ، کسی دوسرے وجود کی حدت محسوس
کر سکتی تھی...... بے اختیار اس نے آنکھیں کھولی تھیں، اس کا گلا خشک ہو رہا تھا اور وہ اسے تر بھی نہیں کر پا رہی تھی۔
''تھینک گاڈ کہ تم آ ہی گئیں......'' جہانگیر نے یہ کہتے ہوئے یک دم اس کا رخ اپنی جانب کر کے اسے گلے سے لگایا
تھا۔ اور وہ......؟ بھک سے اس کا ذہن اڑ گیا تھا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ دو قدم اس سے دور ہوتے ہوئے اس نے
کچھ کہنا چاہا مگر حلق جواب دے گیا تھا۔ وہ اب بھی بے یقینی سے ہی اسے دیکھ رہی تھی اور وہ یوں دور ہٹی تھی جیسے کرنٹ لگا ہو،
جہانگیر اس کی حالت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر...... وہ سر جھکا کر ہنس دیا تھا۔ اور پھر آہستگی سے
اس نے دو قدم کا فاصلہ عبور کیا...... اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیا...... اس کی حیرانی سے لبریز آنکھوں میں دیکھا۔
''میں نے تمہیں بہت مس کیا خولہ......!'' وہ سچ کہہ رہا تھا۔ یہ اس کے لہجے، اس کے چہرے سے عیاں تھا،
اور یہ ایک اور وار تھا۔ خولہ کے پیٹ میں گھونسا سا پڑا تھا۔ اس نے منہ کھول کر پھر سے کچھ کہنا چاہا اور ایک بار پھر سے
ناکام رہی...... ہونٹ بھینچتے ہوئے اس نے رخ موڑا تھا۔ وہ ابھی، اس وقت، یوں اس شخص کے سامنے کم از کم آنسو
تو ہرگز نہیں بہانا چاہتی تھی، رخ موڑے کچھ کڑوا، کڑوا سا پیتے ہوئے وہ یونہی کھڑی رہی۔
''خولہ!'' جہانگیر نے اس کے ہاتھوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اور اس نے چہرہ موڑ کر سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ
اس کو دیکھا...... اور دیکھتی رہی، یوں جیسے اس کی کہی بات کا یقین کرنا چاہتی ہو۔
''تو تم نے مجھے مس کیا؟''
''ہاں......''
''اور جن کو مس کیا جاتا ہے، ان کے ساتھ یہ کیا جاتا ہے جہانگیر؟ چھ ماہ، چھ ماہ......'' دکھ اور غصہ جمع ہو کر لہجے
سے چھلکا اور وہ بات مکمل نہ کر سکی...... اس سوال پر جہانگیر نے اِک گہری سانس بھری۔
''خولہ، میں ماموں کے سامنے جھک نہیں سکتا تھا۔ جب وہ کسی معاملے میں دخل اندازی کرتے ہیں تو مجھے
یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مجھے نیچا دکھانا چاہتے ہوں، احسانات جتا کر اپنی مرضی مجھ پر مسلط کرنا چاہتے ہوں۔''
وہ اسے حقیقت بتا رہا تھا، واقعی میں وہ ایسا محسوس کرتا تھا۔ خولہ نے بے اختیار آنکھیں بند کر کے تکلیف سے سر کو جھٹکا۔
وہ کیا اب اس شخص کو...... اس شخص کو بتائے چھ ماہ کی تکلیف...... اذیت......
''ٹھیک ہے ابو کو نہ سہی...... تم مجھے تو کہہ سکتے تھے ناں واپس آنے کے لیے......''
''تم آنا نہیں چاہتی تھیں تو میں کیوں کہتا......''
''جہانگیر تم نے خود مجھے بھیجا تھا...... ان فیکٹ نکالا تھا، میں اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی......'' اس کا بس نہیں چلتا
تھا کہ وہ اس کا گریبان پکڑ لیتی، کیا کرتا اس طرح کی چاہت کا۔

''میں تمہارے سامنے بھی جھکنا نہیں چاہتا تھا۔''
اور اس جواب پہ خولہ یک دم ٹھنڈی پڑی تھی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔ یوں جیسے آج کے بعد اسے اس
شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا کلیہ سمجھ میں آ گیا، وہ نیم وا ہونٹوں اور تعجب سے بھری آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔
''بھوک لگ رہی ہے۔'' چند لمحوں بعد جہانگیر نے سر کھجا کر کہا تھا۔ وہ ایک بار پھر سے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔
''تم چلو میں آتی ہوں۔'' خولہ نے ہاتھ نرمی سے چھڑوائے۔
''ساتھ کیوں نہیں چلتی ہو؟'' وہ جاتے، جاتے یک دم مڑا تھا۔
''آتی ہوں جہانگیر......'' اور وہ زچ نظر آئی تھی۔
ساتھ کیسے چلتی؟ اس کا مقام متعین کر دیا گیا تھا اور اسے وہ سارے آنسو بھی تو بہانے تھے جو اندر غبار کی طرح
چھاتے ہی چلے جا رہے تھے۔ گر اچھا نہیں تھا تو اتنا برا اور دردناک بھی نہیں تھا جو تب ہوتا گر جہانگیر طعنے دے، دے
کر اس کی زندگی اجیرن کر دیتا...... اس تکلیف کے مقابلے میں یہ، یہ کچھ بھی نہ تھا۔ وہ ہنس کر برداشت کرنے کو تیار
تھی۔ خولہ نے آسمان کی طرف دیکھا۔
''مصلحتوں کو سمجھا نہیں جا سکتا میرے اللہ...... لیکن یہ سچ ہے، حقیقت ہے کہ بساط سے زیادہ آزمائش نہیں
اترتی آسمان سے......'' چند آنسو گال پر لڑھکے اور پھسل کر اس کا چہرہ بھگو گئے۔
نفرت کے مقابلے میں یہ مشروط سی محبت کافی تھی... زندگی بھر کے لیے۔

☆☆☆

جہانگیر نے سی وی بنانے کے لیے اس سے ڈاکومنٹس مانگے تو اس نے بنا کچھ کہے، ڈاکومنٹس دے دیے تھے..
جہانگیر خود ہی اپلائی کرتا رہتا۔ اس کے نمبر پر کالز آتیں تو اسے معلوم ہوتا تھا، جاب انٹرویو کی اس سے زیادہ جہانگیر کو
فکر ہوتی تھی۔ اس کے ڈریس کی، گفتگو کی، accent کی، انگلش کی، کس سوال کا کیا جواب دینا ہے اور کس طرح دینا
ہے۔ وہ اسے گائیڈ کرتا رہتا، معلوم نہیں یہ اس کی ناکامی تھی یا قسمت...... ابھی تک وہ کامیاب نہ ہو سکی تھی۔
''یار خولہ کیا ہے؟ کہاں بیٹھ کر ایم ایس کیا ہے تم نے......'' جہانگیر جھنجلا جاتا اور وہ سوائے دل جلانے کے اور
کچھ نہیں کرتی تھی۔
یہ انہی دنوں کی بات تھی کہ ایک ملکی اور غیر ملکی اشتراک سے چلنے والے اسکول میں ویکنسیز اوپن ہوئی تھیں اور
جہانگیر کی قسمت اسے سفارش مل گئی تھی۔ اس کے باس کے ایک دوست اسکول کے director تھے، خولہ کا کام بس
ایک اچھا انٹرویو دینا تھا اور بس...... اور پھر جس دن اسے اپائنٹمنٹ لیٹر ملا تو جہانگیر بے حد خوش تھا۔ وہ اسے ڈنر پر لے گیا
تھا۔ لیکن...... لیکن یہ کہ وہ اس کی خوشی اور اس ڈنر کا کیا کرتی...... اس کا دل بجھ چکا تھا۔ یہ مجبوری تھی اور بس...... وہ تو
سوچ، سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی کہ کس طرح سے وہ گھر اور جاب کو سنبھال پائے گی۔ یہ مشکل تھا اور وہ عادی نہ تھی۔ کینڈل
لائٹ ڈنر تھا، ماحول پر خوشگواریت تھی۔ میز پہ بہترین نعمت کھانے کی شکل میں موجود تھی۔ اس کا لائف پارٹنر سامنے بیٹھا
رغبت اور تیزی سے کھاتا ہوا، بولتا جا رہا تھا۔ ایک پرفیکٹ ماحول، پرفیکٹ سچویشن...... لیکن وہ، وہ کیا کرتی، اس ماحول
کا...... اس پُرتکلف کھانے کا، ایک مکمل رومینٹک منظر کا، جب دل ہی بیزار ہو چکا تھا تو اس سب کا کیا، کیا جاتا؟ آخر کیا؟

☆☆☆

''مزنہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ اتنا سیریس ایشو تو نہیں ہے جس پر یوں ری ایکٹ کیا جائے۔'' وہ آج بطورِ
خاص اتنے عرصے بعد اسے سمجھانے، بات کرنے آئی تھی۔ احمد صاحب نے ہی اسے بلوایا تھا۔
''مجھ سے ابو کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی آپی......!''

URDU TUBE
Digitized by Google

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تمہاری حالت ان سے زیادہ خراب ہے۔" اور اس سوال کا جواب مزنہ کے پاس نہیں تھا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ خولہ کے جانے کے بعد بھی مزنہ کو ابھی تک ریجیکشن کا سامنا تھا۔ سمجھ نہیں آتی تھی کہ کمی کوئی نہ تھی۔ خوب صورت وہ خولہ سے زیادہ تھی، پڑھی لکھی تھی۔ خاندانی نجابت بھی تھی پھر بھی..... پھر بھی اسے ریجیکشن کا سامنا تھا۔ کوئی کہہ جاتا لڑکی پڑھی لکھی مگر کم عمر چاہیے۔ بندۂ خدا جو لڑکی پوسٹ گریجویٹ تک جائے گی وہ منہ میں چوسنی تو نہیں لے کر جائے گی..... کوئی اس کے بے حد مناسب قد کو چھوٹا کہہ کر ریجیکٹ کر جاتا..... غرض کہ کسی شہزادے کی ماں کے معیار پہ وہ ابھی تک اتری نہ تھی اور کبھی یہ ہوتا کہ احمد صاحب کو ہی پروپوزل پسند نہیں آتا۔ سو اب یہ بات پریشان کن ہو چلی تھی۔ احمد صاحب تو جو پریشان تھے سو تھے ہی..... مزنہ کی حالت کو بجا طور پر ڈپریشن کا نام دیا جا سکتا تھا۔

"شادی اِک مسئلہ ہے مزنہ..... لیکن اتنا بھی بڑا نہیں کہ اس کے لیے یہ حالت بنائی جائے۔ ایک وقت مقرر ہے اور جب وہ مقررہ وقت کو کن کا حکم ملے گا تو اس ساعت سے ایک گھڑی کم..... نہ ایک گھڑی زیادہ..... وہ اسی مقررہ وقت پر ہو کر رہے گا، کوشش تو کر رہے ہیں تو اب اللہ پر توکل کرنا چاہیے ناں..... یقین رکھو اللہ بہت اچھا کرے گا تمہارے لیے....." مزنہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے وہ بے حد پیار اور نرمی سے اسے سمجھا رہی تھی۔ اور مزنہ کا جواب..... آنسو تھے۔ خولہ نے ایک گہری سانس کھینچ کر اپنے ہاتھ ہٹائے تھے۔ وہ اب سسکیوں سے رو رہی تھی۔

"آئی ایم سوری آپی! میں نے آپ کو ہرٹ کیا تھا ناں کہ میں نے آپ کو یہاں سے چلے جانے کو نہیں کہا تھا لیکن میں نے رکنے پر بھی مجبور نہیں کیا..... سو میرے ساتھ یہ تو ہونا ہی تھا۔"

"کیا بکواس ہے مزنہ..... ! کیسی فضول سی سوچ ہے، میرا یہاں سے جانا اسی طرح سے ہی لکھا تھا، وہ بات تو محض اِک بہانہ تھی، تم..... تم نے ایسا کیسے سوچ لیا۔" اس نے خفا ہوتے ہوئے فوراً کہا تھا۔

"پھر بھی آپی....."

"شٹ اپ مزنہ....." اور مزنہ بے اختیار ہونٹ کاٹتے ہوئے خاموش ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے اس کا رویا رویا چہرہ دیکھتی رہی۔

"چلو اٹھو....." اور پھر یک دم کھڑے ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"کیا؟" وہ حیران ہوئی۔

"اٹھو..... کہیں باہر چلتے ہیں۔"

"میرا موڈ....."

"تھپڑ ماروں گی اب اگر انکار کیا تو..... I got my first pay" وہ اب کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے، چہرہ اس کے چہرے کے برابر لا کر بولی تھی۔ لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"پزا، شوارما، آئس کریم یا.....؟"

"پزا....." مزنہ نے بے اختیار کہا تھا اور کہہ کر یک دم کھسیا بھی گئی۔

"ہاہاہا....." خولہ دل کھول کر ہنسی تھی۔ پزا مزنہ کی شدید ترین کمزوری تھا۔

☆☆☆

"مسز جہانگیر آپ ذرا میرے آفس میں آئیں....." سخت لہجے میں کہہ کر مس مفتی وہاں سے چلی گئی تھیں۔ وہ تو کہہ کر چلی گئیں لیکن خولہ کی سانس خشک کر گئی تھیں۔ وہ چند لمحے اسی حالت میں بیٹھی رہی، اسٹاف روم میں اور بھی ٹیچرز موجود تھیں جو کہ اُس کی بدلی رنگت والے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ کوئی پہلی مرتبہ اس کے ساتھ ہونے نہیں جا رہا تھا بلکہ یہ معمول کا حصہ تھا۔ دن میں ایک بار، ایک مرتبہ تو لازمی ہی اسے پرنسپل کے آفس میں حاضری دینی پڑتی تھی اور ایسا ان غلطیوں کی وجہ سے تھا جو آئے روز اس سے معلوم نہیں کیسے..... بنا اسے بتائے بنا کوئی خبر

دیے ہی سرزد ہو جایا کرتی تھیں۔ کبھی کسی بچے کی ڈائری گم کر دی..... کبھی کسی کی نوٹ بک ان چیکڈ رہ گئی۔ کبھی copy checking میں غفلت، کبھی کلاس روم مینجمنٹ کے مسائل اور کبھی ٹائم مینجمنٹ کے۔ گو کہ اس قسم کے مسائل سے ہر اس شخص کو دوچار ہونا پڑتا ہے جو کہ پہلی مرتبہ اسکول ٹیچنگ کر رہا ہو مگر خولہ کا مسئلہ یہ تھا کہ ایک ماہ گزر جانے کے باوجود وہ ابھی تک اپنی غلطیوں پہ قابو نہ پا سکی تھی اور اسی چیز کی بنا پر وہ مس مفتی کی good book میں نہ تھی۔ مس مفتی ایسی منتظم اعلیٰ تھیں کہ جن کو محض اچھے کام اور devotion ہی سے متاثر کیا جا سکتا تھا۔ ایک تو خولہ کی سفارشی اپائنٹمنٹ اور اوپر سے اس کی پرفارمنس..... یہ سب کافی تھا اسے مس مفتی کی نظروں میں گرانے کے لیے..... اور ابھی ایک عدد کڑوا تلخ جام ڈانٹ کی شکل میں اسے پینا تھا۔ وہ مرے، مرے قدموں سے ان کے آفس تک گئی تھی۔ اس کے اجازت لینے پر مس مفتی نے اسے ایک نظر دیکھا اور جس نظر سے دیکھا تھا وہ اس کی ٹانگوں کو بے ہمت کر دینے کے لیے کافی تھا۔ قریب پہنچنے پر انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور اس کے بیٹھتے ہی انہوں نے ایک بچے کی ڈائری ٹیبل کی سطح پر سلائڈ کرتے ہوئے اس کے آگے کی تھی۔ اس نے ناسمجھی سے ڈائری کو دیکھا اور پھر پرنسپل کو..... اور مس مفتی کی نظروں نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ دوبارہ ڈائری کی طرف دیکھے۔ اس نے ڈائری کو الٹ پلٹ کر دیکھا..... صفحے آگے پیچھے کیے لیکن اپنی غلطی نظر نہیں آئی تھی۔

"ڈیٹس دیکھیے مسز جہانگیر ڈیٹس۔" اسے مس مفتی کی سخت آواز سنائی دی تھی۔ ان کی نظریں اسے ہی فوکس کیے ہوئے تھیں اور جب اس نے ڈیٹس دیکھیں تو..... تو اس کا دماغ بھک سے اُڑ گیا تھا۔ بچے کی ڈائری دو دن سے نہیں لکھی تھی۔ اور اب وہ ان سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ بچہ غیر حاضر رہا تھا۔ وہ یقیناً حاضر ہی رہا تھا۔ جبھی اس کی ڈائری یوں اس کے سامنے رکھی گئی تھی۔

بے ساختہ اس نے منہ پر ہاتھ رکھا تھا، یقیناً بچے کے گھر سے ہی شکایت آئی تھی۔

"مسز جہانگیر آپ کے گھر میں کوئی ٹینشن ہے کیا؟ کوئی اسٹریس؟ آئی ایم سوری..... اگر میں پرسنل ہو رہی ہوں تو لیکن آپ کی کارکردگی نے مجھے پرسنل ہونے پر مجبور کیا ہے؟" اب..... مس مفتی کا لہجہ نسبتاً نرم تھا..... خولہ کو سخت شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ کچھ دیر کے لیے ایسے ہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"میں آپ کو سوری نہیں بولوں گی مس مفتی..... میں اب اپنی پرفارمنس سے ثابت کروں گی کہ مجھے واقعی اس بات پر شرمندگی ہے۔ میں وضاحت بھی نہیں دوں گی کیونکہ میری وضاحت آپ کو بہانے سے زیادہ اور کچھ محسوس نہ ہوگی اور جہاں تک بات ہے اسٹریس کی تو میری کوشش ہوگی کہ اگر کوئی پریشانی ہے بھی تو اسے گھر ہی چھوڑ کر آؤں، اسکول تک نہ لے کر آؤں۔" اور جب وہ یہ بات کہتی تھی وہ سنجیدہ اور پُرعزم سی دکھتی تھی۔ پریشانیاں تو بہت تھیں اس کی زندگی میں۔ مس مفتی چند لمحے اسے دیکھتی رہیں یوں جیسے جانچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

"let's see" ایک گہری سانس بھر کر انہوں نے اسے کہا تھا۔

☆☆☆

"یہ کیا ہے؟" جہانگیر نے سالن کے ڈونگے سے چمچ بھر کر ذرا سا اونچا کیا اور پھر چمچ سے شوربہ ڈونگے میں گراتے ہوئے پوچھا تھا۔ خولہ کھانے کی میز پر چپاتیاں رکھ رہی تھی۔ اس نے جہانگیر کو ایک نظر دیکھا اور پھر بڑے سکون سے جواب دیا۔

"سالن....."

"سالن.....؟ یہ تو سالن جیسی کوئی چیز محسوس ہو رہی ہے۔" اس نے دوبارہ سے چمچ اٹھا کر شوربہ گراتے ہوئے کہا..... شوربہ بے حد پتلا تھا۔

"تو پھر آج یہ ہی سالن نما چیز کھانی پڑے گی۔" کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے وہ بولی تھی۔ سکون میں اب بھی

Digitized by Google

فرق نہیں آیا تھا۔
''کہاں گئے وہ چائنیز...... اٹالین اور اعلیٰ دیسی کھانے......؟'' وہ طنز کر رہا تھا۔
''اگر ایسے کھانے، کھانے کا شوق ہو رہا ہے تو کک رکھ لیں۔'' خولہ کا لہجہ بھی طنزیہ ہی تھا۔ فرخندہ خاموشی سے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھیں۔
''کیوں، تمہارے ہاتھ کے ذائقے کو کیا ہوا؟'' وہ اب... تلخ ہوا تھا۔ خولہ نے ہونٹ بھینچ کر اس بات پر اسے دیکھا۔
''وہ ہاتھ کا سارے کا سارا ذائقہ بورڈ مارکر کی سیاہی پی گئی جہانگیر......'' وہ تکلیف اور غصے سے بولی تھی اور بول کر رکی نہیں۔ اٹھ کر کھانا کھائے بنا ہی چلی گئی۔ جہانگیر نے پہلے تو حیرت سے اس کے جواب کو سنا اور پھر حیرت ہی سے اس کی حرکت کو دیکھا تھا۔
''کچھ زیادہ ہی زبان نہیں چلنے لگی اس کی......؟'' وہ ناگواری سے بڑبڑایا تھا۔
''وہ...... وہ، دوڑتے داریاں نہیں سنبھال پا رہی ہے جہانگیر...... جاب کے لیے تم نے اسے مجبور کیا، اب اس بات پر سمجھوتا کرو ناں تم......'' فرخندہ نے نرمی سے اسے سمجھایا تھا۔
''کرنے والے کر لیتے ہیں امی...... یہ ہے ہی ست، ماموں نے بھی بیٹیوں کو بس عیش کرنا ہی سکھایا ہے۔'' اس کے اس قسم کے جواب پر فرخندہ چپ ہو کر رہ گئی تھیں۔ کچھ کہا یا سمجھایا اسے جاتا ہے جو سمجھنے پر تیار ہو...... اسے نہیں جو ہر معاملے کو محض اپنی ہی نظر سے دیکھنے کا عادی ہو۔

☆☆☆

گاڑی سبک رفتاری سے بل کھاتی سڑکوں پہ چل رہی تھی۔ گاڑی کے باہر منظر بھاگتے تھے، دوڑتے تھے، زندگی چلتی تھی اور اندر...... اندر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی رک سی گئی ہو، ٹھہر سی گئی ہو، خولہ اور احمد صاحب، مزنہ کے لیے ایک پروپوزل دیکھنے گئے تھے۔ وہ لوگ مزنہ کو پسند کر چکے تھے اور احمد صاحب بے حد پُرامید ہو کر ان کے ہاں گئے تھے لیکن جتنے وہ پُرامید تھے اتنے ہی مایوس ہو کر لوٹے تھے۔ وہ لڑکا نہیں ''مرد'' تھا اور گھر جا کر انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک شادی بھگتا چکا تھا۔
''ابو......!'' خولہ نے نرمی سے پکارا...... ڈرائیو کرتے ہوئے احمد صاحب نے ایک سانس بھر کر اسے دیکھا۔
''سب ٹھیک ہو جائے گا ابو......'' اس نے اب کے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر تسلی دی تھی۔
''معلوم نہیں خولہ...... یہ سب ٹھیک ہونے کا وقت کب آئے گا۔ کیا تب کہ جب میں نہ رہوں گا۔''
''ابو...... اب ایسی بات تو نہیں کریں پلیز......'' خولہ کے دل پر ہاتھ پڑا تھا۔
''کیا کروں خولہ...... مزنہ کے لیے میں تمہاری جیسی غلطی دُہرانا نہیں چاہتا، وہ اتنی حوصلہ مند نہیں ہے، میں نہیں سننا چاہتا اس کے منہ سے کہ یہ ابو نے میرے ساتھ کیا، کیا؟ اور جتنا میں اس کے لیے اچھا کرنا چاہتا ہوں، اتنا ہی اسے برداشت کرنا پڑ رہا ہے گو کہ وہ یہ سب سہہ نہیں سکتی۔'' وہ اپنے دھیان میں مگن...... اپنی ہی پریشانی میں بولے جا رہے تھے یہ دیکھے بنا کہ ان کی بات پر کس طرح سے خولہ کی رنگت بدلی تھی۔ کس طرح دل کو پہنچنے والی تکلیف اس کے چہرے پر عیاں ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ چند لمحے باپ کا بوڑھا، پریشان چہرہ دیکھتی رہی اور پھر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر وہ شیشے سے باہر دیکھنے لگی کہ جہاں زندگی دوڑتی تھی۔ اور اس بھاگتی دوڑتی زندگی کو دیکھ کر وہ سوچتی تھی۔ وہ ابو سے ایک سوال پوچھنا چاہتی تھی کہ...... ''اسے کون سی برداشت کی گھٹی پلائی گئی تھی۔ بھلا بتائیں تو سہی......'' لیکن یہ سوال خاموشی کی زبان میں پوچھے جانے والا وہ سوال تھا کہ جسے کبھی آواز نصیب نہیں ہونا تھی۔

QALBI
قلبی
شہد+لہسن+ادرک+لیمن جوس+سرکہ سیب
دل کا علاج
NO SIDE EFFECT
قلبی بچوں اور بڑوں کیلئے یکساں مفید
خوشگوار ذائقے کے ساتھ
قلبی خون میں کولیسٹرول کو کم کرتا ہے
قلبی خون میں لوتھڑے بننے سے روکتا ہے
قلبی دل کے دورے سے محفوظ رکھتا ہے (ان شاء اللہ)
قلبی کے استعمال سے بائی پاس کی ضرورت نہیں رہتی
قلبی کے مسلسل استعمال سے دل کی بند شریانیں کھل جاتی ہیں
قلبی جوڑوں کے درد اور دائمی قبض کیلئے انتہائی مفید ہے
قلبی جسم کو خوبصورت اور اسمارٹ بناتا ہے
قلبی دل، دماغ اور جگر کو طاقت دیتا ہے
قلبی جسم کو خوبصورت اور اسمارٹ بناتا ہے
قلبی ہاضمے کو ٹھیک کرتا ہے (ان شاء اللہ)
فربینا کھائیے جان بنائیے
صحت بنائیں
خوبصورت نظر آئیں
فربینا سپر گولڈ
جسم کو مضبوط، طاقتور اور خوبصورت بنانیوالی غذا!
قدرتی طور پر قلیل عرصے کے استعمال سے جسمانی طور پر مضبوط طاقتور بنانے والی
حیرت انگیز غذا جو پھلوں کے مربہ جات، مغزیات اور غذائی قدرتی اجزاء سے تیار کردہ ہے
مرد و خواتین، بوڑھے جوان سب کیلئے مفید ایک ایک چمچ صبح، دوپہر، شام ہمراہ پانی یا دودھ لیں
اور ہمیشہ تندرست اور فٹ رہیں۔ فربینا سپر گولڈ بھرپور فوری قوت کیلئے
زرد چہرہ، خون میں سرخ ذرات کی کمی، غذا جزو بدن نہ بنتی ہو، صحت گرتی جاتی ہو، جسم ہڈیوں کا چلتا پھرتا
ڈھانچہ، دبلا پتلا، پچکے گال، گرتے بال، جسمانی کمزوری و دماغی ناطاقتی، جنسی کمزوری، تھکاوٹ، بھوک کی کمی
جیسے امراض کیلئے مفید و مجرب ہے۔
ڈیلرز ☆ خواجہ میڈیکل سٹور بالمقابل ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی ☆ عرفان قادری جڑی بوٹی 10 بابر مارکیٹ لانڈھی 3 کراچی ☆ رفیق ٹریڈرز اینڈ دواخانہ مصطفائی دواخانہ رسالہ روڈ حیدرآباد ☆ خالد برادرز مدنی سٹریٹ سکھر ☆ سندھ ہربل ہومیو قدیر روڈ تھلہ سکھر ☆ کلاسک ہومیو مسجد روڈ کوئٹہ ☆ راوی دواخانہ اوگی ☆ مونگا پنسار مین بازار لیاقت آباد ☆ لاہور ملت دواخانہ گھنٹہ گھر پشاور ☆ ضیا ہومیو سٹور سکندر پورہ پشاور ☆ ناصر دواخانہ 20 صدر لائن پشاور صدر ☆ سٹی ڈرگ سٹور جی ٹی روڈ مینگورہ ☆ الجنت پنسار مری روڈ ایبٹ آباد ☆ خالد دواخانہ صرافہ بازار ایبٹ آباد ☆ بادشاہ دی ہٹی بوہڑ بازار راولپنڈی ☆ زمان دواخانہ روہتاس روڈ جہلم ☆ الرحمن دواخانہ 2 نور باوا گوجرانوالہ ☆ قدیمی دواخانہ کچہری بازار سرگودھا ☆ شاہی طبی دواخانہ چنیوٹ بازار فیصل آباد
مشورہ V.P ڈیلر کے بارے میں معلومات کیلئے 0300-6389463
YouTube Deva Herbal Health Tip Catrain Y! Bdhdeva@vahoo.com

Digitized by Google

قسمت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو قسمت سے لڑنا، اس کے مخالف چلنا جانتے ہیں، ان کے لیے نہیں جو اس کے آگے سر جھکا دیتے ہیں..... مدد تو اُن کی خدا بھی نہیں کرتا..... جنہیں خود اپنی مدد کا خیال ہی نہیں ہو۔

☆☆☆

وہ اس دن ہونے والا پہلا جھگڑا تو ضرور تھا لیکن آخری ہرگز بھی نہیں..... آئے روز کے جھگڑے اب روز کا معمول تھا۔ managing skills ہر کسی میں نہیں ہوتیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو وہ اتنی شارپ نہیں ہوتیں کہ وہ دو، دو چیزوں کو ایک ہی وقت میں سنبھال سکے۔ خولہ کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ دونوں ذمے داریاں جیسے over lap کر رہی تھیں..... وہ جاب اور گھر کو سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ سو دونوں کام ہی خراب چل رہے تھے، خولہ بنیادی طور پر گھر، گرہستن تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جنہیں گھر کا کچن سب سے پیارا ہوتا ہے جو ایک وقت میں کئی کھانے بنانے کو ہی اپنی خاصیت گردانتی ہیں، اس کی ٹائپ وہ نہیں کہ جیسی جہانگیر چاہتا تھا، مانا کہ شوہر کے حقوق بہت سے ہیں لیکن کسی کی ذات کو، اس کے تشخص کو اپنے ہاتھ میں لینا..... یہ یقیناً اس کا حق نہیں ہے تو جب آپ کسی کو اس حد تک مجبور کر دیں کہ اپنی ہی ذات، اپنی ہی فطرت کے خلاف الٹ چلنا شروع کر دے تو پھر یہ تو ہونا ہی تھا۔

جھگڑا اور اصل اختلاف رائے یا پھر مزاحمت کا نتیجہ ہوتا ہے، خولہ ہر وقت tense رہنے لگی تھی اور اسی ٹینشن نے اسے وہ ہمت دی تھی کہ وہ بات بے بات جہانگیر کے سامنے پھٹ پڑتی تھی۔ اسکول، گھر، مزمہ کا مسئلہ، ذاتی مسائل اور اگر اس سے توجہ ہٹتی تو جہانگیر کوئی نہ کوئی ایشو کھڑا دیتا تھا۔ اسے بیوی سے جاب بھی کروانی تھی اور گھر میں ہر چیز پرفیکٹ بھی چاہیے تھی۔ خود وہ جب گھر آتا تو نکڑ والی دکان سے ایک پاؤ دہی لانا بھی عذاب لگتا تھا اور خولہ..... اس میں کیا جنات جیسی طاقت تھی۔ وہ انسان تھی اور پھر ایک عورت، وہ گھر بھی سنبھالے، جاب بھی کرے، ساری پریشانیاں بھی برداشت کرے اور آخر میں منہ پر ایک مسکراہٹ سجا کر اچھی، مزے دار، بھاپ اڑاتی خوشبو والی چائے بھی پیش کرے..... تو خولہ کو ایک نہ ایک دن جہانگیر کی باتوں سے تنگ آنا ہی تھا اور جس دن وہ تنگ آئی، وہ دن، وہ تاریخ آ چکی تھی۔ جھگڑے کی ابتدا ہو چکی تھی اور یہ ایک تواتر کے ساتھ مسلسل ہونے لگا تھا۔ لیکن خولہ یہ جانتی تھی کہ زندگی میں مشکلات بس یہیں تک نہیں تھیں۔ اسے کیا معلوم کہ زندگی نے تو ابھی اس کی ناک کی لکیریں نکلوا کر دم لینا تھا، زندگی نے اس کے لیے یوں بن جانا تھا کہ جیسے سیدھی راہ پر آگے کو جانے کے واسطے..... الٹی چال سے چلنا ہو۔

☆☆☆

وہ اسکول سے بچوں کی فائلز کا ڈھیر اٹھا کر لائی تھی جسے اسے چیک کرنا تھا۔ اسی فکر میں، اس نے شام کا کھانا بھی ڈھنگ سے نہیں کھایا تھا۔ جلدی سے برتن سمیٹے، میز صاف کی اور چائے بھی بنائی تھی اور ان فائلز کو لے کر بیٹھ گئی تھی۔ فرخندہ نماز کے لیے اٹھ گئیں اور جہانگیر ٹی وی لاؤنج میں تھا اور جب وہ قریب گیارہ بجے کمرے میں آیا تو وہ ابھی تک فائلز میں ہی غرق تھی۔ اس نے ایک نظر خولہ پر ڈالی اور پھر وارڈ روب کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ خولہ نے صبح کے لیے کون سے کپڑے استری کیے تھے اور جب اس نے الماری کھولی تو اس کا ذہن بھک سے اڑ گیا۔ وہاں ایک بھی لباس استری کیا ہوا نہیں تھا اور جس زور سے اس نے پٹ بند کیے تھے اس سے کہیں اونچی آواز میں وہ غرایا تھا۔

"what the hell is this" خولہ بری طرح سے ڈری اور قلم اور فائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرے..... صفحات بکھر گئے تھے۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"کیا آپ مجھے بتائیں گی کہ صبح کے لیے کون سا لباس شاہی پریس کر کے رکھا ہے آپ نے؟" غصے میں وہ اتنا تمیز دار ہو جایا کرتا تھا کہ اس کی یہ ہی تمیز الٹے ہاتھ کا جھانپڑ مارتی تھی۔

"اوہ نو....." خولہ نے آنکھیں میچ کر بے آواز کہا..... اور پھر اسے دیکھا..... دیکھا کیا بس یہ اندازہ لگاتی رہی کہ فیول کتنا ہے اور وہ مزید کتنا بھڑک سکتا ہے۔

"میں کر دوں گی ابھی جہانگیر....." اور پھر اپنے تئیں نرمی سے ہی کہا تھا۔ وہ الگ بات کہ نرمی کے بجائے، بیزاری زیادہ ٹپکتی تھی لہجے سے۔

"ہاں.....! کر دوں گی، رات گئے تک تم یہ فضول فائلز چیک کرتی رہو گی..... پھر نیند کا غلبہ اتنا شدید ہو گا کہ تم یہ کام صبح پر ڈال دو گی اور جب صبح ہو گی تو دوسرے کام تمہیں مجبور کریں گے کہ الٹی سیدھی استری پھیر کر کپڑے میرے منہ پر مار دو....." اس نے بہت اچھا تبصرہ پیش کیا تھا۔

"تو اور کیا کروں میں..... جہانگیر میں تھکنے لگی ہو..... مجھ سے، مجھ سے نہیں ہوتا یہ، ابھی تو بچے نہیں ہے کل کو فیملی ہو گی تو....."

"ہونہہ، بچے....." اس نے اتنے درشت انداز میں بات کاٹی تھی کہ وہ ہکا بکا ہو کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ کیا مطلب تھا آخر اس بات کا؟

"تو کیا فیملی نہیں ہو گی؟ ظاہر ہے ایک نہ ایک دن تو....."

"کان کھول کر میری بات سن لو خولہ....." جہانگیر کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ حقیقت میں وہ اس کے کان کھول کر ہی اسے یہ بات سناتا۔

"جب تک میرے پاس اسٹیٹس، گھر، گاڑی اور اتنے پیسے نہیں آ جاتے کہ میں اپنے بچوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ معیارِ زندگی دے سکوں..... تب تک، تب تک میں فیملی پلان نہیں کروں گا اور آج کے بعد..... آج کے بعد خبردار جو میں نے یہ بکواس سنی تمہارے منہ سے۔ پہلے ہی میچنگ نہیں ہو رہا اور اوپر سے اضافہ کر لو، ہونہہ....." بات کہہ کر اس نے دیکھا نہیں کہ سننے والے پر اثر کیا ہوا تھا۔ منہ تک چادر تان کر وہ کھولتے ہوئے انداز میں سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔

"لائٹ آف کر دو۔" اِک اور نیا حکم جاری ہوا تھا۔ خولہ میکانکی انداز میں اٹھی اور لائٹ آف کر دی۔ اس کے بعد وہ وہاں رکی بھی نہیں تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکلی اور پھر داخلی دروازہ کھول کر لاؤنج..... سے بھی باہر صحن میں نکل گئی تھی۔ وہ سیڑھیوں پر گرنے کے سے انداز میں آ بیٹھی تھی۔

چند لمحوں تک وہ بالکل خالی ذہن کے ساتھ بیٹھی رہی اور پھر اس نے مڑ کر اندر کی سمت دیکھا تھا، یوں جیسے یقین کرنا چاہا ہو کہ وہ سب..... سب اس سے ہی کہا گیا تھا۔

"تو کیا، تو کیا وہ زندگی کی اس خوشی سے بھی محروم کر دی گئی تھی۔" حالت ایسی تھی جیسے کمر پر زور کی ضرب پڑی ہو..... اس وقت تو سیدھا کھڑا رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ پھر بے یقینی، یقین میں ڈھلی اور تکلیف بن کر پورے جسم میں دوڑ گئی تھی۔

"یا اللہ.....!" وہ سسک اٹھی تھی۔ اس نے بے ساختہ آسمان کو دیکھا۔

"نہیں، نہیں، یہ..... یہ برداشت سے زیادہ ہے۔" اور وہ اپنی مناجات آنسوؤں کی سیاہی سے لکھ کر درج کروانے لگی تھی۔

"وھوالسمیع البصیر....."

"اور ہاں، بے شک وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔"

☆☆☆

وہ ساری رات اس نے کیسے گزاری.....؟ کیسے گزاری.....؟ یوں جیسے پیروں کے نیچے کی زمین یک دم اک

Digitized by Google

جلتا تو ابن گئی تھی۔ تکلیف اس قدر زور آور تھی کہ وہ پوری طرح سے تڑپ بھی نہ سکی تھی اور وہیں مر گئی، ہاں..... خولہ احمد جسے اب تک کوئی چیز ڈھا نہ سکی تھی، مار نہ سکی تھی..... وہ اس رات مر گئی..... مر ہی تو گئی تھی۔ بس جی لیا اس نے زندگی کو۔ جتنا بھی جینا تھا، گزار لی اور کیا ہونا رہ گیا تھا اس کے ساتھ اب.....؟ باقی بچا ہی کیا تھا۔ خوشی، خوشی کہاں تھی اس کے لیے.....؟ کہیں بھی نہیں..... اس نے سمجھ لیا، جان لیا اور پھر مان بھی لیا..... اس بھری دنیا میں، وسیع کائنات میں، بہت سے انسان یوں ہی پیدا ہوتے ہیں اور ایسے ہی مر جاتے ہیں، بنا یہ جانے بنا سمجھے بنا یہ ٹیسٹ کیے کہ خوشی، خوشی کیا ہوتی ہے، کہاں سے ملتی ہے؟ کب ملتی ہے اور جب ملتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟ کیسا لگتا ہے، کیسا محسوس ہوتا ہے؟ تو اس بھری، وسیع دنیا میں بہت سے انسان، ایسے ہی پیدا ہوتے ہیں اور ایسے ہی مر جاتے ہیں..... تو ایک وہ بھی سہی..... خولہ بھی سہی..... کیا فرق پڑتا ہے؟

زندگی سے خوشی چھیننی پڑتی ہے... اور چھیننے کے لیے ہمت چاہیے، حالات کے خلاف لڑنے کا حوصلہ چاہیے..... مشکلوں کے آگے سر جھکا دینے والوں کو کچھ نہیں ملتا..... دریا پار وہ ہی اترتے..... ساحلوں کی ریت پہ قدموں کے نشان وہ ہی ثبت کرتے ہیں کہ جن کے بازو جانفشانی سے پانی کا سینہ چیرتے ہیں اور یہ یونہی تو نہیں ہو جاتا ناں..... مر، مر کر جی اٹھنا ہی زندگی ہے، اپنی ہی خاک سے سو رنگوں والا پرندہ بن کر زندہ ہونا ہی زندگی ہے..... اپنے ٹوٹے ہوئے پروں کو قابلِ پرواز بنانا ہی زندگی ہے کہ دانہ، دانہ مل کر ہی کھیت بنتا ہے اور خوشی..... خوشی کس کا نصیب ٹھہرتی ہے؟ اس انسان کی آنکھوں کا کہ جس نے دانہ، دانہ بونے کی مشقت اٹھائی۔

☆☆☆

وہ اس رات کی صبح اسکول نہیں جا سکی تھی۔ اپنی سیڑھیوں پر بیٹھے، بیٹھے اس نے فجر کی اذان سنی تھی۔ اور وہ محض اذان نہیں تھی۔ اِک دروازہ تھا، راستہ تھا، امید کی کرن تھی..... حوصلے کا پہلا مطلب اور سہارے کا دوسرا نام تھا۔ وہ روشنی تھی، اس کے بازوؤں میں حالات کے خلاف لڑنے کی طاقت نہ تھی، قوت نہ تھی لیکن اس کے اٹھتے ہاتھوں میں اتنا دم ضرور تھا کہ پکار، دعا کی صورت آسمان کے مالک تک جا پہنچتی تھی۔ دعا، انسان کی سب سے بڑی طاقت، سب سے بڑا سہارا..... جو کہ گرنے نہیں دیتی، جینے پر مجبور رکھتی ہے، وہ اٹھی، نماز پڑھی اور جب دعا مانگنے لگی تو لفظ، سارے جیسے بھک سے اڑ گئے تھے۔ وہاں اب صرف آنسو تھے، شفاف، بے ریا، موتیوں کی سی صورت لڑھکتے، پھسلتے اور اس کے گالوں کو بھگوتے ہوئے آنسو..... وھو السمیع البصیر.....

☆☆☆

اسپتال کا کمرا تھا اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس کی شکل دیکھ کر ہی لگتا تھا کہ حواس تو کب کے رخصت ہو چکے، ارد گرد لوگوں کی آوازیں تھیں۔ لیکن وہ آوازیں، آوازیں نہیں محسوس ہوتی تھیں۔ یوں جیسے ہزاروں مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہو..... اور یہ واحد چیز تھی جو وہ محسوس کر رہی تھی۔

ابو کا شوگر لیول ہائی ہو گیا تھا۔ اور جب مزنہ نے اسے کال کی تو وہ اسکول میں تھی۔ اسکول سے ہی اس نے جہانگیر کو کال کی تھی اور جب وہ پہنچی تو سمجھ نہیں آتا تھا کہ کسے سنبھالے، ابو کو یا مزنہ کو..... اس کے آنے تک جہانگیر، احمد صاحب کو اسپتال لے آیا تھا اور اب وہ بھی اور ہزاروں مکھیوں کی بھنبھناہٹ.....

''خولہ..... خولہ.....'' بھنبھناہٹ واضح ہوئی۔ آواز میں ڈھلی اور سماعتوں میں یوں اتری جیسے ہزاروں میل کی دوری سے کسی نے پکارا تھا۔

''خولہ.....'' وہ کندھا ہلائے جانے پر چونکی تھی۔ وہ جہانگیر تھا۔

''ماموں، اب بہتر ہیں تم مل سکتی ہو۔'' وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔

وہ چند لمحے اس کے چہرے کو..... دیکھتی رہی، یوں جیسے اس کے منہ سے ادا ہونے والے الفاظ کو سمجھنا چاہ رہی ہو۔ اور پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا تھا۔ جہانگیر نے تسلی بھرے انداز میں ہلکے سے اس کے کندھے کو تھپکایا تھا۔ وہ اب مزنہ اور فرخندہ کی جانب مڑ گیا تھا۔ مزنہ کو فرخندہ نے بازوؤں میں لے رکھا تھا اور وہ ان کے کندھے پر سر ٹکائے روئے جا رہی تھی۔

''امی آپ ماموں کو دیکھ لیں۔'' جہانگیر نے ماں کو مخاطب کیا۔

''میں.....؟''

''نہیں.....'' فرخندہ کو کہنے پر مزنہ چونک اٹھی لیکن جہانگیر نے فوراً روکا تھا۔

''پہلے رونا بند کرو..... منہ صاف کرو، خود کو سنبھالو پھر جانا ماموں سے ملنے، اتنے میں امی دیکھ کر آتی ہیں اور امی..... آپ نے بھی کوئی سین کری ایٹ نہیں کرنا۔'' سختی سے مزنہ سے کہتے، کہتے وہ یک دم ماں کی طرف منہ کر کے بولا تھا۔ فرخندہ سر ہلا کر اٹھی تھیں۔

''جہانگیر بھائی پلیز.....'' مزنہ نے بیچارگی سے کہا..... اور اسے آرام سے دوبارہ سیٹ پر بٹھانے کے لیے جہانگیر کی نظریں ہی کافی تھیں۔

''جب تک تم رونا بند نہیں کرو گی..... اندر نہیں جاؤ گی۔'' اس نے سختی سے تنبیہہ کی اور مزنہ اور رونے لگی تھی۔ جہانگیر کے چہرے پر یک دم ''اُف'' والے تاثرات ابھرے تھے لیکن اب کی بار وہ خاموش ہی رہا تھا۔

☆☆☆

''مزنہ، ابو میڈیسن لے رہے تھے؟'' چائے کی پیالی پکڑاتی مزنہ سے اس نے پوچھا تھا۔

''ہاں، دوا تو وہ باقاعدگی سے لیتے ہیں، آپ کو معلوم تو ہے۔'' وہ جہانگیر کو بھی چائے دیتے ہوئے بولی اور پھر اپنا کپ لے کر وہیں بیٹھ گئی تھی۔ احمد صاحب گھر آ چکے تھے اور اب وہ سب ذرا حالتِ سکون میں تھے۔

''تو کیا کوئی بد پرہیزی کی تھی؟'' خولہ نے دوبارہ سوال کیا..... مزنہ نے سر نفی میں ہلا کر جواب دیا تھا۔

''جب دوا بھی لے رہے تھے، احتیاط بھی ابو بہت کرتے ہیں، واک بھی کرتے ہیں تو پھر شوگر لیول ایک دم اتنا ہائی کیسے ہو گیا..... کیسے؟'' خولہ سخت پریشان تھی۔

جہانگیر نے اِک گہری سانس بھر کر پیالی سامنے ٹیبل پر رکھی اور خولہ کے پریشان چہرے کو دیکھا۔

''ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ اسٹریس ہے، کسی بات کی پریشانی ہے۔'' اس نے بتایا تھا۔ خولہ نے بے اختیار لاشعوری طور پر مزنہ کو دیکھا۔ مزنہ نے یک دم ہونٹ بھینچے تھے اور جہانگیر مزید کہہ رہا تھا۔

''کوئی بات ہے خولہ.....؟ ایسی کون سی پریشانی ہے ماموں کو؟'' اس کے یوں پوچھنے پر مزنہ کا ردِعمل فوری تھا۔ وہ اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ جہانگیر نے حیرت سے اسے جاتے دیکھا اور پھر سوالیہ نظروں سے خولہ کو..... خولہ نے بے ساختہ پیشانی مسلی تھی۔

''ابو، مزنہ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں جہانگیر.....''

''مزنہ کی وجہ سے.....؟'' اس کی حیرت اور بڑھی..... خولہ نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا اور اسے بتانے لگی تھی۔

''ٹھیک ہے پریشانی والی بات ہے لیکن اب یوں سر پر سوار کر لی جائے۔'' بات ادھوری چھوڑ کر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''پہلے یہ بات میرے ذہن میں نہیں تھی جہانگیر لیکن آج میں بار، بار یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں کہ مزنہ کے بعد ابو کا کیا ہو گا؟ اتنے بڑے گھر میں اکیلے کیسے وہ رہ پائیں گے۔''

''خیر..... یہ بعد کی بات ہے، فی الحال تو اہم مسئلہ مزنہ کی شادی ہے، دوسرا مسئلہ اتنا بڑا نہیں کہ اس کا حل نہ

Digitized by Google

تلاش کیا جاسکے....." جہانگیر کے یوں کہنے پر خولہ نے ذرا حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔

"پھر بھی جہانگیر مسئلہ تو ہے ناں....."

"مجھے باہر جا کر پڑھنا ہے خولہ، جرمنی جاؤں گا ایک دو سال تک۔ مجھے وہاں جانا ہی ہے تو تب امی ابو ماموں کے پاس آجانا، تب تک مزنہ کی شادی ہوگئی تو ویل اینڈ گڈ..... نہ بھی ہوئی تو ایک دن ہونی تو ہے وقتی طور پر مسئلہ حل ہو جائے گا پھر بعد میں دیکھ لیں گے کہ کیا کرنا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا اور وہ منہ پر ہاتھ رکھے اسے سن رہی تھی۔

"تم نے کبھی ذکر نہیں کیا جہانگیر....."

"میرا خیال تھا کہ میرے پاس اتنی رقم جمع نہ ہو سکے گی سو یہ سال بھی ضائع ہی جائے گا۔"

"تو اب.....؟ اب کہاں سے؟" اور وہ خولہ کے سوال پر یوں مسکرایا جیسے کسی بچے کی بات پر مسکرایا جاتا ہے جواب اسی مسکراہٹ میں تھا۔ خولہ کی سیلری کہاں استعمال ہوتی تھی؟ کہیں پر بھی نہیں..... چند لمحوں کے لیے وہ خاموش سی ہوگئی تھی۔ احساس کچھ اچھا نہیں تھا۔

"اور جاب.....؟ اس کا کیا؟"

"ظاہر ہے چھوڑ دوں گا۔"

"جہانگیر یہ رسک ہے۔" وہ فوراً بولی تھی۔

"رسک تو ہے لیکن جب واپس آؤں گا تو اس سے بھی اچھی جاب مل جائے گی۔"

"اور وہاں جرمنی میں کیسے گزارہ کرو گے؟"

"ظاہر ہے پارٹ ٹائم جابز اور کیا.....؟" اس نے کندھے اچکا کر جواب دیا تھا۔

"بس تمہیں پیچھے مینیج کرنا ہوگا، میں تمہیں پریشان نہیں کروں گا اور کوشش کروں گا کہ کچھ نہ کچھ تمہیں بھی بھجوا دیا کروں لیکن اسٹارٹ میں یہ مشکل ہوگا، ہاں جب سیٹل ہو جاؤں گا پھر اور بات ہوگی۔ اور جب....."

"جہانگیر مجھ سے ایک ڈیل کرو گے؟" یک دم خولہ نے عجیب مسکراہٹ سے اس کے رواں لہجے کو کاٹا تھا۔ اس نے ناسمجھی سے خولہ کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے میں تمہیں کامیاب بنانے کے لیے تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں، ایسی محنت کرنے کے لیے بھی تیار ہوں جو کہ میری ہڈیوں تک کو بھی گھسا دے لیکن..... میں لائف ٹائم جاب نہیں کروں گی، جب تم پاکستان آؤ گے..... اچھی پوسٹ پہ ہو گے تو تب میں جاب نہیں کروں گی۔"

جہانگیر کچھ دیر تک تو اس کی شکل دیکھتا رہا۔

"تمہیں، کیوں اتنی چڑ ہے جاب کرنے سے؟" وہ حقیقتاً حیران تھا۔

"میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے جہانگیر....." اور وہ چونکا۔ چونکایا اسے خولہ کے لہجے نے تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"مجھے فیملی چاہیے جہانگیر....." اور پھر سر اٹھا کر وہ نم مگر اٹل لہجے میں بولی تھی۔

☆☆☆

مس مفتی اس کا بھیانک ترین خواب بن چکی تھیں۔ اس دن کے بعد سے کیا ہوا؟ کیا اس میں جتانی تبدیلیاں آگئیں؟ کیا راتوں رات اس نے وہ "عقل کل" وہ مہارت حاصل کر لی تھی کہ جس کی بنا پر وہ چار دن میں نہ صرف اپنی تمام تر غلطیوں پر قابو پا لیتی بلکہ مس مفتی کی good book میں بھی شامل ہو جاتی۔

اس بیماری کو تو کوئی گریڈ منگھی بھی دستیاب نہیں ہو سکی تھی کہ وہ اگلے دن ہی مس مفتی کو سپر ٹیچر بن کر دکھاتی۔ انسان اپنے دماغ کی زرخیزی کے مطابق ہی سیکھ پاتا ہے۔ بالکل اسی طرح سے کہ جس طرح برتن صرف اپنی

Digitized by Google

کے مطابق ہی بھرا جا سکتا ہے۔ لیکن کچھ لوگ محنت، ان تھک کوشش..... "never give up" کے اصول پہ چلتے ہوئے try try again کا کلیہ آزماتے ہوئے اور یہ ایمان رکھتے ہوئے کہ "نہیں ہے انسان کے لیے مگر جتنی وہ کوشش کرے" کام کرتے ہیں..... اور ایسے لوگ اگر غیر معمولی ثابت نہ بھی ہو سکیں تو وہ ناکام ہرگز نہیں ہو سکتے..... اور نہ ہی ہوتے ہیں۔ کامیابی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ خولہ کا شمار گو کہ ایسے لوگوں میں نہیں ہوتا تھا۔ وہ بہت جلد تھک جانے والوں میں سے تھی، ہار مان کر ڈھے جانے والوں میں سے تھی۔ اس میں professionalism نہیں تھی۔ کیونکہ وہ professional تھی ہی نہیں، اس کی ٹائپ ہی یہ نہیں تھی لیکن..... ہوا کیا..... کس چیز نے اسے اتنا مجبور کر دیا تھا کہ وہ ان تھک محنت کرنے والی کہلائی جائے، کس چیز نے اس کے اندر اتنی ہمت اور حوصلہ بھر دیا تھا کہ وہ اپنی پڑیاں تک گھس دینے پر تیار ہو گئی تھی۔ کون سی ایسی گھٹی تھی کہ جس کو چکھ لینے کے بعد وہ اپنے اندر ایسی طاقت موجود پاتی تھی۔

اور جواب بس ایک ہی..... جہانگیر نے اس سے ڈیل کر لی تھی تو اسے جہانگیر کے فیوچر کے لیے مرنا تھا اور جہانگیر نے بدلے میں اسے زندگی سے گلے ملوانے کا عہد کر لیا تھا۔

اس نے اس دن کے بعد بھی مس مفتی سے بہت سخت قسم کی جھاڑیں کھائی تھیں، بے عزتی برداشت کی تھی، طعنے سہے تھے اور طنز کو جام سمجھ کر پیا تھا لیکن..... لیکن ہمت نہ ہاری تھی۔ وہ یوں بن گئی جیسے کان نہ رکھتی ہو..... ایسی ہو گئی جیسے احساسات کہیں گروی رکھ آئی ہو۔ وہ سپاٹ سے چہرے کے ساتھ بے عزتی سہتی، طعنے کھاتی اور طنز کو پیتی تھی۔

حتیٰ کہ مس مفتی اس سے بے حد چڑنے لگی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ اسے it's your last chance تک بھی کہہ چکی تھیں اور خولہ..... وہ اندر تک دہل کر رہ گئی تھی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے، نہیں، بالکل بھی نہیں..... اسے تو ابھی زندگی سے خوشیاں چھیننی تھیں..... اسے ہنسنا تھا..... بے فکری کے خوب صورت پل بتانے تھے، اسے دیکھنا تھا کہ زندگی خوب صورت ہے..... اسے جینا تھا..... اسے یوں ہی مرنا نہیں تھا۔ اسے اپنی فیملی چاہیے تھی۔ اسے اک فیملی لائف گزارنی تھی اور مس مفتی کہتی تھیں۔

"Its your last chance" مگر..... کیسے..... کیسے؟ نہیں، یہ لاسٹ چانس نہیں ہو سکتا تھا اور اگر تھا بھی تو وہ اسے ضرور آزمائے گی..... ضرور..... اور پھر اس دن..... بات اتنی بڑی نہ تھی لیکن پے در پے سرزد ہونے والی غلطیوں اور کچھ مس مفتی کی نظر میں آجانے کی وجہ سے وہ بڑی بن گئی تھی۔

"مجھے سمجھ نہیں آتا کہ آپ کے دماغ میں کیا ہے؟ کیا بھوسا؟ کسی بچے کو بھی چار دن سمجھاؤ تو پانچویں دن اس کی عقل میں بات سما جاتی ہے۔ دو دن A لکھنا سکھاؤ تو تیسرے دن وہ A لکھ ہی لیتا ہے مگر آپ..... آپ..... مسز جہانگیر it's enough now" مس مفتی کا چہرہ سرخ تھا اور وہ سخت بیزار نظر آتی تھیں۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ امتحان ہونے والے تھے اور پرنسپل صاحبہ نے سب ٹیچرز کو ٹائم فریم دے رکھا تھا کہ اپنا کورس مقررہ مدت میں مکمل کر لیں۔ خولہ سے یہ ہو نہیں سکا تھا اور اس نے میٹنگ میں کہہ دیا کہ کورس مکمل ہے۔ خولہ نہیں جانتی تھی کہ بات چھپی نہیں رہنی تھی۔ ایک بچے کی ماں شکایت لے کر آگئی تھیں کہ "جو چیز آپ نے پڑھائی ہی نہیں..... وہ کورس میں کیوں شامل کر دی گئی۔" اور بس..... خولہ کو خاموشی سے ہی سننا تھا اور وہ سن رہی تھی۔ اور جب وہ بول، بول کر تھک گئیں تو..... تو کچھ دیر بعد بس یہ ہی جملہ ادا ہوا۔

"it was your last chance Mrs,khola" وہ جب دوبارہ بولیں تو آواز مدھم مگر سخت ہی تھی۔

"تو آپ مجھے فائر کر رہی ہیں؟" جھکے سر کے ساتھ کمزور لہجے میں کیے جانے والے اس سوال پر مس مفتی نے بے ساختہ ماتھا رگڑا تھا۔

"میں نے کبھی کسی ٹیچر کے ساتھ ایسا نہیں کیا لیکن....."

اور اس لیکن کے بعد پھر سے خاموشی تھی۔
''کیا میں ایک اور چانس لے سکتی ہوں میڈم......؟ صرف ایک اور...... پلیز......'' اس کا سر جھکا ہی تھا مگر اب کہ آواز بھاری سی تھی۔ وہ جہانگیر کو کیا کہے گی؟ کیسے سامنا کرے گی۔ اور وہ، وہ کیسے ری ایکٹ کرے گا؟ اس سوچ نے ہی اس کے رونگٹے کھڑے کردیے تھے۔ اور اسی چیز نے اسے سوال نما درخواست کرنے پر مجبور کیا تھا۔ مس مفتی چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہیں...... گو کہ وہ سخت مزاج تھیں لیکن بہت سے پرائیویٹ اسکولز کی منتظم اعلیٰ کی طرح ظالم ہرگز نہیں تھیں۔

"only for this time... Mrs khola... only for this time...mark my words."

اور پھر انہوں نے کہا تھا...... بے حد سخت اور اکھڑے انداز میں...... خولہ فوری ردِ عمل ظاہر نہیں کرسکی تھی۔ وہ یوں ہی سر جھکائے چند لمحوں کے لیے ٹھس ہو کر بیٹھی رہی اور پھر......
''جزاک اللہ......'' اس نے thank you نہیں بولا تھا کہ یہ اسے ''کم'' لگتا تھا۔ مس مفتی نے انجانے میں اس کی مدد کی تھی۔ لیکن خولہ تو جانتی تھی ناں...... اور اس دعا سے بہترین چیز اس کے پاس فی الوقت نہیں تھی...... بالکل بھی نہیں......

☆☆☆

دو ماہ بعد:
''مسز جہانگیر!'' آواز سن کر وہ یوں ہوگئی تھی کہ جیسے پکار کسی انسان کی طرف سے نہیں، ملک الموت کی طرف سے آئی تھی۔ بے اختیار اس نے اپنے یک دم خشک پڑنے والے حلق کو تر کرنا چاہا تھا اور بدقسمتی سے وہ ناکام رہی تھی۔ ہیل کی ٹک، ٹک اب اس کے قریب سے قریب تر ہوتی جارہی تھی اور اس کی سانس کہیں اوپر ہی اوپر گم ہوتی جارہی تھی۔
''السلام علیکم......!'' مس مفتی کے قریب آنے پر اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سلام کیا...... پھنسی ہوئی آواز میں۔ انہوں نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور بولیں۔
''میرے آفس میں آئیں مسز جہانگیر......'' اور بس...... خولہ کی باقی ماندہ ہمت بھی دھڑام سے زمین بوس ہوگئی تھی۔
''جی......'' اب تو آواز یوں محسوس ہوئی جیسے کسی کنویں سے آئی ہو، وہ چند لمحے ہارے ہوئے انداز میں وہیں کھڑی رہی اور پھر بے حد تھکے، تھکے سے انداز میں اس کی پیروی کی تھی اور ان کے آفس پہنچنے تک وہ رونے والی ہوگئی تھی۔
''ناٹ اگین...... ناٹ اگین......'' مسلسل سر ہلاتے ہوئے وہ بڑبڑا رہی تھی۔ تو ایک بار پھر سے...... ایک بار پھر سے وہ ناکام رہی تھی۔ اس نے ثابت کردیا تھا کہ وہ نہیں کرسکتی تھی۔ چند منٹ کے وقفے سے وہ ان کے آفس پہنچی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ کتنی ہی بار، کتنی مرتبہ وہ یوں ان کے سامنے، اسی کرسی پر بے عزت ہونے کے لیے بیٹھی تھی۔ تو کیا اب کی بار بھی......؟ تو کیا وہ دن کبھی آنا ہی نہیں تھا کہ جب وہ...... یہاں ان کے سامنے سر جھکا کر نہیں...... سر اٹھا کر بیٹھتی...... تو کیا اس نے آخری چانس...... آخری موقع بھی گنوا دیا؟ مس مفتی چند لمحے اس کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھتی رہیں اور پھر انہوں نے بے ساختہ اپنے تاثرات کنٹرول کیے تھے، ہاتھ بڑھا کر انہوں نے چار پانچ کاپیوں کا ایک بنڈل اٹھایا۔ خولہ نے ان کاپیوں کو دیکھا اور صحیح معنوں میں اسے دھچکا لگا تھا، تو کیا بس اتنی سی کاپیز وہ صحیح طور سے بنا کوئی غلطی کیے چیک کر پائی تھی؟ بس چار پانچ؟''
''یہ آپ کی ری چیک کی گئی کاپیز ہیں مسز خولہ......'' اور خولہ نے سانس روک کر ان کی بات کو سنا تھا۔
''اور مجھے یہ کہتے ہوئے بے حد......''
''افسوس ہو رہا ہے......'' خولہ نے جملہ اچک کر دل میں مکمل کیا۔

سر اٹھا کر اُن کا چہرہ دیکھا۔
''خوشی محسوس ہو رہی ہے۔'' مس مفتی نے کہا اور خولہ نے یک دم جھٹکے سے
''آپ نے اب کی بار واقعی امپروو کیا ہے؟'' وہ مسکرا رہی تھیں۔ خولہ کا منہ بے ساختہ کھلا تھا...... وہ حیرانی سے ان چار، پانچ کاپیز کو دیکھ رہی تھی۔
''تو...... تو یہ؟'' اس نے کاپیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔
''یہ وہ کاپیز ہیں جن میں آپ کی چیکنگ میں چند غلطیاں پائی گئی ہیں۔'' وہ نرم لہجے میں ہی بولی تھیں۔ خولہ ان کی بات کے دوران اپنی چیکنگ کی غلطیاں دیکھ رہی تھی۔
''مجھے امید ہے کہ آپ ان کاپیوں کی تعداد کو صفر تک لائیں گی۔'' وہ اب کہنیاں ٹیبل پر رکھے شگفتگی سے کہہ رہی تھیں۔
''میں پوری کوشش کروں گی مس مفتی...... پوری کوشش کہ آپ کو اپنا ہنڈرڈ پرسنٹ دے سکوں......'' عزم نے نئے سرے سے انگڑائی لی تھی۔
''مسز جہانگیر...... ٹیچر by birth ہوتا ہے بالکل اسی طرح سے کہ جس طرح سے آرٹسٹ by birth ہوتا ہے۔ سب میں معلم بننے کی طاقت ہوتی ہے نہ صلاحیت...... اور ہر کوئی اس قابل بھی نہیں ہوتا کہ وہ اشیا کے تصور کو ذہنوں میں اسی طرح سے اتار سکے کہ جس طرح وہ تصور حقیقت میں موجود ہے۔ ایسے لوگ یقیناً بہت کم ہوتے ہیں۔ آپ by birth ٹیچر نہیں لیکن آپ محنتی ہیں، ہمت نہیں ہاری آپ نے...... مجھے آپ پر جتنا بھی غصہ سہی لیکن میں کبھی آپ کو فائر نہیں کرنے والی تھی۔''
اتنی بات کہہ کر وہ مسکرائی اور جب مسکرائیں تو اُن کی آنکھوں میں شرارت سی ابھری تھی۔ خولہ زبردست طریقے سے حیران ہوئی۔ اس کا منہ کھلا...... لیکن کچھ کہہ نہ پائی۔ یہ tactics تھا کام لینے کا...... خولہ سر جھٹک کر ہنس دی تھی۔
''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی...... کبھی نہیں ان شاء اللہ......'' وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی اور مس مفتی نے مسکراتے ہوئے ہی سر ہلا کر جواب دیا تھا۔ اس دن وہ گھر بے حد طمانیت کے ساتھ لوٹی تھی تو اس نے کر دکھایا تھا۔
ہاں۔ کر تو دکھایا تھا مگر......

☆☆☆

ہم کو لازم ہے
درد کو زباں دینا
اور درد
پھٹ پڑے حرف کی صورت
اور حرف، گریۂ زخم کی صورت
جسم کے پتوں پر
نمودار ہوتے تو بتاتے
کہ......!
درد آخر ہے کیسا؟
کہ درد آخر ہے کیسا؟

اسے اسکول میں بھی کامیاب ہونا تھا اور گھر کو بھی خوش اسلوبی سے چلانا تھا اور مصیبت یہ کہ اس میں یہ طاقت نہ تھی اور جب اس نے یہ صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی تو...... نتیجہ سخت مشقت، ان تھک محنت، بے آرام دن اور بے چین نیند بھری راتیں...... اس کی نیند کا دورانیہ بھی کم ہوچکا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے سے نظر آنے لگے تھے کہ

URDU TUBE

اور اس لیکن کے بعد پھر سے خاموشی تھی۔

''کیا میں ایک اور چانس لے سکتی ہوں میڈم.....؟ صرف ایک اور..... پلیز.....'' اس کا سر جھکا ہی تھا مگر اب کہ آواز بھاری سی تھی۔ وہ جہانگیر کو کیا کہے گی؟ کیسے سامنا کرے گی۔ اور وہ، وہ کیسے ری ایکٹ کرے گا؟ اس سوچ نے ہی اس کے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے۔ اور اسی چیز نے اسے سوال نما درخواست کرنے پر مجبور کیا تھا۔ مس مفتی چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہیں..... گو کہ وہ سخت مزاج تھیں لیکن بہت سے پرائیویٹ اسکولز کی منتظم اعلیٰ کی طرح ظالم ہرگز نہیں تھیں۔

"only for this time... Mrs khola... only for this time...mark my words."

اور پھر انہوں نے کہا تھا..... بے حد سخت اور اکھڑے انداز میں..... خولہ فوری ردِعمل ظاہر نہیں کر سکی تھی۔ وہ یوں ہی سر جھکائے چند لمحوں کے لیے شل ہو کر بیٹھی رہی اور پھر.....

''جزاک اللہ.....'' اس نے thank you نہیں بولا تھا کہ یہ اسے ''کم'' لگتا تھا۔ مس مفتی نے انجانے میں اس کی مدد کی تھی۔ لیکن خولہ تو جانتی تھی ناں..... اور اس دعا سے بہترین چیز اس کے پاس فی الوقت نہیں تھی..... بالکل بھی نہیں.....

☆☆☆

دو ماہ بعد:

''مسز جہانگیر!'' آواز سن کر وہ یوں ہو گئی تھی کہ جیسے پکار کسی انسان کی طرف سے نہیں، ملک الموت کی طرف سے آئی تھی۔ بے اختیار اس نے اپنے یک دم خشک پڑنے والے حلق کو تر کرنا چاہا تھا اور بدقسمتی سے وہ ناکام رہی تھی۔ ہیل کی ٹک، ٹک اب اس کے قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی اور اس کی سانس کہیں اوپر ہی اوپر گم ہوئی جا رہی تھی۔

''السلام علیکم.....!'' مس مفتی کے قریب آنے پر اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سلام کیا..... پھنسی ہوئی آواز میں۔ انہوں نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور بولیں۔

''میرے آفس میں آئیں مسز جہانگیر.....'' اور بس..... خولہ کی باقی ماندہ ہمت بھی دھڑام سے زمین بوس ہو گئی تھی۔

''جی.....'' اب تو آواز یوں محسوس ہوئی جیسے کسی کنویں سے آئی ہو، وہ چند لمحے ہارے ہوئے انداز میں وہیں کھڑی رہی اور پھر بے حد تھکے، تھکے سے انداز میں اس کی پیروی کی تھی اور ان کے آفس پہنچنے تک وہ رونے والی ہو گئی تھی۔

''ناٹ اگین..... ناٹ اگین.....'' مسلسل سر ہلاتے ہوئے وہ بڑبڑا رہی تھی۔ تو ایک بار پھر سے..... ایک بار پھر سے وہ ناکام رہی تھی۔ اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ نہیں کر سکتی تھی۔ چند منٹ کے وقفے سے وہ ان کے آفس پہنچی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ کتنی ہی بار، کتنی مرتبہ وہ یوں ان کے سامنے، اسی کرسی پر بے عزت ہونے کے لیے بیٹھی تھی۔ تو کیا اب کی بار بھی.....؟ تو کیا وہ دن کبھی آنا ہی نہیں تھا کہ جب وہ..... یہاں ان کے سامنے سر جھکا کر نہیں..... سر اٹھا کر بیٹھتی..... تو کیا اس نے آخری چانس..... آخری موقع بھی گنوا دیا؟ مس مفتی چند لمحے اس کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھتی رہیں اور پھر انہوں نے بے ساختہ اپنے تاثرات کنٹرول کیے تھے، ہاتھ بڑھا کر انہوں نے چار پانچ کاپیوں کا ایک بنڈل اٹھایا۔ خولہ نے ان کاپیوں کو دیکھا اور صحیح معنوں میں اسے دھچکا لگا تھا، تو کیا بس اتنی سی کاپیز وہ صحیح طور سے بنا کوئی غلطی کیے چیک کر پائی تھی؟ ''بس چار پانچ؟''

''یہ آپ کی ری چیک کی گئی کاپیز ہیں مسز خولہ.....'' اور خولہ نے سانس روک کر ان کی بات کو سنا تھا۔

''اور مجھے یہ کہتے ہوئے بے حد.....''

''افسوس ہو رہا ہے.....'' خولہ نے جملہ اچک کر دل میں مکمل کیا۔

''خوشی محسوس ہو رہی ہے۔'' مس مفتی نے کہا اور خولہ نے یک دم جھٹکے سے سر اٹھا کر اُن کا چہرہ دیکھا۔

''آپ نے اب کی بار واقعی امپروو کیا ہے؟'' وہ مسکرا رہی تھیں۔ خولہ کا منہ بے ساختہ کھلا تھا..... وہ حیرانی سے ان چار، پانچ کاپیز کو دیکھ رہی تھی۔

''تو..... تو یہ؟'' اس نے کاپیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ وہ کاپیز ہیں جن میں آپ کی چیکنگ میں چند غلطیاں پائی گئی ہیں۔'' وہ نرم لہجے میں ہی بولی تھیں۔ خولہ ان کی بات کے دوران اپنی چیکنگ کی غلطیاں دیکھ رہی تھی۔

''مجھے امید ہے کہ آپ ان کاپیوں کی تعداد کو صفر تک لائیں گی۔'' وہ اب کہنیاں ٹیبل پر رکھے شگفتگی سے کہہ رہی تھیں۔

''میں پوری کوشش کروں گی مس مفتی..... پوری کوشش کہ آپ کو اپنا ہنڈرڈ پرسنٹ دے سکوں.....'' عزم نے نئے سرے سے انگڑائی لی تھی۔

''مسز جہانگیر..... ٹیچر by birth ہوتا ہے بالکل اسی طرح سے کہ جس طرح سے آرٹسٹ by birth ہوتا ہے۔ سب میں معلم بننے کی طاقت ہوتی ہے نہ صلاحیت..... اور ہر کوئی اس قابل بھی نہیں ہوتا کہ وہ اشیا کے تصور کو ذہنوں میں اسی طرح سے اتار سکے کہ جس طرح وہ تصور حقیقت میں موجود ہے۔ ایسے لوگ یقیناً بہت کم ہوتے ہیں۔ آپ by birth ٹیچر نہیں لیکن آپ محنتی ہیں، ہمت نہیں ہاری آپ نے..... مجھے آپ پر جتنا بھی غصہ سہی لیکن میں کبھی آپ کو فائر نہیں کرنے والی تھی۔''

اتنی بات کہہ کر وہ مسکرائی اور جب مسکرائیں تو اُن کی آنکھوں میں شرارت سی ابھری تھی۔ خولہ زبردست طریقے سے حیران ہوئی۔ اس کا منہ کھلا..... لیکن کچھ کہہ نہ پائی۔ یہ tactics تھا کام لینے کا..... خولہ سر جھٹک کر ہنس دی تھی۔

''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی... کبھی نہیں ان شاء اللہ.....'' وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی اور مس مفتی نے مسکراتے ہوئے ہی سر ہلا کر جواب دیا تھا۔ اس دن وہ گھر بے حد طمانیت کے ساتھ لوٹی تھی تو اس نے کر دکھایا تھا۔ ہاں کر تو دکھایا تھا مگر.....

☆☆☆

ہم کو لازم ہے
درد کو زباں دینا
اور درد
پھٹ پڑے حرف کی صورت
اور حرف، گریہ زخم کی صورت
جسم کے پنّوں پر
نمودار ہوتے تو بتاتے
کہ.....!
درد آخر ہے کیسا؟
کہ درد آخر ہے کیسا؟

اسے اسکول میں بھی کامیاب ہونا تھا اور گھر کو بھی خوش اسلوبی سے چلانا تھا اور مصیبت یہ کہ اس میں یہ طاقت نہ تھی اور جب اس نے یہ صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی تو..... نتیجہ سخت مشقت، ان تھک محنت، بے آرام دن اور بے چین نیند بھری راتیں..... اس کی نیند کا دورانیہ بھی کم ہو چکا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے سے نظر آنے لگے تھے کہ

Digitized by Google

جن کو چھپانے کے واسطے اسے پارلر کے چکر کاٹنے پڑتے تھے۔ اور اس کوشش نے، اس روٹین نے اسے خالی کردیا...... بے حس بنادیا۔ آسان لفظوں میں اسے مشین بنادیا تھا۔ روٹین روبوٹک ہو چکی تھی۔ دن چڑھتا، رات آتی اور پھر سے اگلا دن منہ پھاڑے آن کھڑا ہوتا...... ایک اور تھکان بھرا دن...... وہ کئی، کئی روز ابو کی طرف جا نہیں پاتی تھی۔ مزنہ سے اس کی کالز کا دورانیہ چند منٹس پہ آچکا تھا۔ ویک اینڈز پہ کاموں کا پہاڑ اس کا منتظر ہوتا کہ آؤ اور مجھے سر کرلو...... جہانگیر اور اس کی زندگی دو مختلف سمتوں میں بھاگنے لگی تھی۔

"leisure" کہاں تھا؟ کہیں بھی نہیں...... درحقیقت زندگی ہی کہیں نہیں تھی۔ بس اِک بھاگ دوڑ کی سی کیفیت تھی...... وہ مسکرانا بھول گئی۔ رشتوں کے تعلق میں جو لطف ہوتا ہے، وہ، وہ لطف بھول گئی تھی۔ بعض اوقات مزنہ یا ابو کا فون آتا تو اس کی نظریں گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ حرکت کرتی رہتیں۔ ذہن میں...... "ابھی یہ کرنا ہے، وہ کرنا ہے۔" یہ ہی چکر کھاتا رہتا تھا اور نتیجہ...... وہ ہوں، ہاں سے زیادہ بات نہ کر پاتی تھی۔ کبھی، کبھی تو اپنے لیے ایک کپ چائے بنانے کی عیاشی بھی میسر نہ پاتی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ اسمارٹ ہوگئی تھی۔ پارلر کے چکروں نے اس کے حلقے بھی چھپالیے تھے اور اسے اپ ٹو ڈیٹ بھی کردیا تھا۔ وہ اب طرح دار دکھتی تھی۔ جہانگیر کی وارڈ روب بھی اچھے طریقے سے استری شدہ کپڑوں سے بھری رہتی۔ ہاتھ کا ذائقہ بھی لوٹ آیا تھا۔ گھر بھی چمکنے لگا تھا اور اسے مسکرا، مسکرا کر بات کرنا بھی آگیا تھا۔ دراصل اسے سب کرنا آگیا تھا بس خود کی ذات کہیں مر گئی تھی، کھو گئی تھی یا پھر شاید دفن ہوگئی تھی۔ اس نے سمجھوتے کی پٹی آنکھوں پر باندھ کر چلنا سیکھ لیا تھا۔ اسے اب رونا نہیں آتا تھا بلکہ رونے کا وقت ہی کہاں تھا اب اس کے پاس...... کچھ محسوس نہ ہوتا تھا کہ محسوس کرنے کے لیے بھی کچھ فارغ وقت چاہیے...... جہانگیر کو ٹیکل کرنا بھی وہ سیکھ گئی تھی۔ جس دن گھر میں اچھا کھانا نہ بنتا، وہ بازار سے ہی کچھ منگوا لیتی۔ اسے غصہ آتا یہ چپ کر کے سن لیتی، وہ خود ہی بول، بول کر عاجز آجاتا اور جب عاجز آجاتا تو خولہ اِک مسکراہٹ چہرے پر سجا کر اسے یوں دیکھتی جیسے کسی بچے کو اس کی نادان حرکت پہ دیکھا جاتا اور سب سے حیرت کی بات...... اسے سب کچھ طریقے سے سنبھالنا آگیا تھا۔ جاب بھی اور گھر بھی...... لیکن یہ کہ خولہ احمد، کہیں نہ رہی تھی۔ وہ مسز جہانگیر تھی...... ماڈ، طرح دار، بات کرنے کے فن سے آشنا اور مسئلے حل کر لینے کی صلاحیت سے مالا مال، وہ اب مسز جہانگیر سے زیادہ اور کچھ نہ تھی۔

☆☆☆

ہر چند سہارا ہے تیرے پیار کا دل کو
رہتا ہے مگر اک عجب خوف سا دل کو

معلوم نہیں کس موڈ میں اس نے سیل فون پر یہ غزل پلے کر رکھی تھی۔ سیل فون منڈیر پر دھرا تھا اور اس کے پاس ہی چائے کا خالی مگ...... اور وہ...... دور افق پار کچھ ڈھونڈنے میں معروف تھی۔ غائب دماغی کی سی کیفیت تھی۔ مغنیہ کے ادا ہونے والے الفاظ بھی سماعتوں میں ڈھل کر ذہن میں آکر الجھ سے جاتے تھے اور پھر اک بگڑی ہوئی شکل بن کر تصور میں ابھرتے تھے...... وہ کچھ سوچنا چاہتی تھی مگر سوچ نہیں پارہی تھی۔ عجب سی ہی کیفیت تھی۔ سمجھ میں آتی تھی نہ پکڑ میں......

"ہر چند......" مغنیہ ایک بار پھر مصرعہ دُہرانے لگی تھی کہ یک دم آواز بند ہوگئی۔ اس نے بے ساختہ گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ جہانگیر تھا...... اک گہری سانس بھر کر خولہ نے چہرہ سیدھا کیا تھا۔ آج فراغت اضافی سرکاری چھٹی کی وجہ سے نصیب ہوئی تھی۔

"کیا سڑی ہوئی غزلیں سنتی رہتی ہو تم بھی؟" اس بات پہ اس نے جہانگیر کو دیکھا اور دیکھتی رہی اور پھر اِک بے اختیاری طنزیہ مسکراہٹ اس نے لبوں پر نمودار ہوئی۔ "ہونہہ......" جیسے تاثرات ابھرے مگر اس نے کہا کچھ نہیں۔

"کچھ کام تھا؟" وہ یوں بولی جیسے اسے یوں جہانگیر کا مخل ہونا پسند نہیں آیا تھا۔

"نہیں کچھ خاص نہیں...... بور ہو رہا تھا تو سوچا تمہیں دیکھوں کیا کر رہی ہو؟" اس کی بات کے دوران وہ سر جھکائے کھڑی منڈیر کا کنارہ کھرچتی رہی۔ اتنا بھی احساس نہیں ہوا کہ جہانگیر بات ختم کر چکا ہے اور وہ بات ختم کر کے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد جب اسے غیر معمولی سا احساس ہوا تو اس کے ہاتھ کی حرکت یک دم رکی تھی۔ جہانگیر کچھ کہہ رہا تھا شاید اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ بس خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ خولہ کو سمجھ نہ آیا کہ اب کیا کہے...... اس نے بے ساختہ نظریں جھکائی تھیں۔

"تم بہت بدل گئی ہو خولہ......" بہت دیر بعد وہ بولا تھا۔

"اچھا تو......" عجب بگڑا سا انداز تھا۔

"خاموش...... مگر خوب صورت۔" اس کے انداز پر مسکراتے ہوئے وہ بولا تھا۔ خولہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے پر مجبور ہوئی تھی۔ وہاں نرمی تھی، حلاوت تھی، جذبات تھے، وہ چند لمحے اسی طرح اسے دیکھتی رہی اور پھر ایک تکلیف کی لہر نے اس کے کندھوں کو اچانک ہی جکڑ لیا تھا۔

اس نرمی...... اس حلاوت کو ختم ہوتے اک سیکنڈ بھی نہ لگتا اگر وہ آج جاب چھوڑ دیتی، اس کی مرضی کے خلاف اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا سوچ لیتی...... تو تب۔ تب بھی کیا یہ آنکھیں یوں ہی نرمی کا تاثر برساتی رہتیں۔ جواب بے حد واضح تھا...... اور اذیت یک دم ہی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

جہانگیر کچھ اور بھی کہہ رہا تھا اب...... لیکن ایک بار پھر سے وہ منڈیر کا کنارہ کھرچتی...... اور سماعتوں کو بہرہ پاتی تھی۔

☆☆☆

"آپ مزنہ کی بہن ہیں؟" وہ چائے کی پیالی میز پر رکھ رہی تھی، اس سوال پر چونکی اور سیدھا ہو کر حیرت سے اس نے سوال کرنے والی کو دیکھا۔

"جی...... مگر آپ......؟"

"میں اور مزنہ کلاس فیلو رہے ہیں، اس لیے آپ کو دیکھا تو ایک دم پہچان لیا۔" اس کی بات کو کاٹ کر اس لڑکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ وہ مزنہ کا پرپوزل دیکھنے آئے تھے اور وہ لڑکے کی چھوٹی بہن مہ جبیں تھی۔

"اچھا، اچھا......" خولہ نے خوش دلی سے کہا۔

"کالج میں تھیں آپ اس کے ساتھ......؟"

"جی...... اتنی دوستی تو نہیں تھی لیکن مزنہ اپنی آنکھوں کی وجہ سے پوری کلاس میں مشہور تھی۔" مہ جبیں اب کہہ رہی تھی اس کے یوں کہنے پر وہ ہنس دی تھی۔

"ہاں مزنہ کی آنکھیں بے حد خوب صورت ہیں۔" خولہ نے اعتراف کیا تھا۔

"اسی لیے تو میں نے آپ کو پہچانا......" اس کی بات پر خولہ نے ہلکا سا سر ہلا کر جواب دیا تھا۔

"میں بھائی کی تصویر لا کر دکھاتی ہوں آپ کو......" کچھ جوش سے کہہ کر وہ اٹھ کر چلی گئی تھی۔ وہ جس کا پرپوزل دیکھنے آئے تھے۔ وہ بذاتِ خود جرمنی میں سیٹل تھا، باقی سب تو اچھا ہی دکھ رہا تھا اب اگر وہ خود موجود ہوتا تو زیادہ اچھا رہتا۔ ابو کے چہرے سے بھی اسے یہی محسوس ہوا تھا کہ انہیں فیملی پسند آئی تھی۔ لیکن لڑکا...... خیر وہ مہ جبیں کی امی سے باتوں میں مشغول تھی کہ جبیں بھائی کی تصویر لے کر آگئی تھی۔ اس نے تصویر خولہ کی طرف بڑھائی تھی اور خولہ نے دل میں یہ دعا مانگتے ہوئے کہ "یا اللہ...... اب لڑکا بھی فیملی کی طرح اچھا ہی ہو۔" تصویر پکڑی تھی اور...... اور وہ بہت ہینڈسم نہ سہی تو نظر انداز کیے جانے والا بھی نہیں تھا۔

''ٹھیک تھا، عام مردوں جیسا.....'' خولہ نے اسے ناپسند نہیں کیا تھا۔ خود دیکھ کر اس نے تصویر ابو کی طرف بڑھادی تھی۔

''آپ چاہیں تو بھائی کی ID آپ کو دے دیتی ہوں، آپ اسکائپ پر بات بھی کر لیجیے گا اور دیکھ بھی لیجیے گا۔'' مہ جبیں نے کہا تھا۔

خولہ نے بے ساختہ ابو کو دیکھا انہوں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا تھا۔

''میرے خیال میں یہ ہی مناسب رہے گا۔ آپ مجھے ID دے دیں، ہم بات کر لیں گے۔'' خولہ کے کہنے پر مہ جبیں نے اسے ID لکھ کر دی تھی اور پھر..... پھر وہ بے حد اچھے اور خوشگوار موڈ کے ساتھ ان کے ڈرائنگ روم سے نکلے تھے۔ طمانیت کا احساس حاوی تھا کہ چلو شکر ہے کہیں تو کچھ بات بنتی نظر آئی۔ مہ جبیں اور اس کی امی انہیں دروازے تک چھوڑنے آئی تھیں اور جیسے ہی وہ دروازے سے نکل کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگے تو خولہ کی نظر یک دم سامنے موجود گھر کے گیٹ کی طرف پڑی تھی۔ وہاں ایک گاڑی آ کر رکی تھی اور کسی کو اتار کر زن سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اور جب گاڑی سے اترنے والے کا چہرہ واضح ہوا تو..... تو وہ مس مفتی تھیں۔

''اوئے.....'' وہ بے ساختہ حیران ہوئی۔ ''مس مفتی.....'' جتنی حیران وہ ہوئی تھی اتنا ہی بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ مس مفتی نے بھی اچنبھے سے مڑ کر دیکھا تھا۔

''مسز جہانگیر.....'' اور پھر انہوں نے زیرِ لب دُہرایا۔ خولہ مسکراتے ہوئے ان کی طرف بڑھی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا۔

''آپ یہاں رہتی ہیں؟'' ہاتھ ملانے کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

''میرا تو گھر ہے لیکن آپ یہاں کیا کر رہی ہیں مسز جہانگیر.....؟'' ان کے لہجے میں محسوس کی جانے والی خوشگواریت تھی۔

''میں.....'' وہ ذرا سی رکی اور پھر ان کو یہاں آنے کا مقصد بتانے لگی۔

''اوہ..... اچھا..... اب آئی ہیں تو چائے پیے بغیر تو میں جانے نہیں دوں گی۔'' مس مفتی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''ارے نہیں، نہیں..... مس مفتی میرے ساتھ میرے ابو بھی ہیں اور ہمیں واپس بھی جانا ہے تو.....''

''نہیں پھر کبھی نہیں بلکہ ابھی اور اسی وقت.....'' انہوں نے جیسے اس کی اگلی کہی جانے والی بات بوجھ کر جواب دیا تھا۔

''مس مفتی.....'' خولہ ذرا متامل تھی۔

وہ اسے یوں متامل دیکھ کر احمد صاحب کی طرف بڑھیں اور اگلے دو منٹ میں وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر گھر کے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ آج اچھا دن تھا زندگی کا شاید..... یا پھر خوشگوار دن..... وہ مہ جبیں کے گھر سے بھی بہت اچھے موڈ کے ساتھ نکلی تھی اور اب..... مس مفتی کے گھر..... وہ آدھا گھنٹا اس کے لیے بے حد خوشگوار رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مس مفتی اتنی ہنس مکھ ہوں گی۔ بے اختیار اس نے سوچا کہ آج صبح اس نے کس کا منہ دیکھ لیا تھا جو دن اتنا اچھا گزر رہا تھا۔

''اپنا ہی دیکھا ہوگا گر جہانگیر کا ہوتا تو دن ایسا تو ہرگز نہیں گزرتا.....'' اور خود کے سوال کا خود ہی جواب دیتے ہوئے وہ اِک بار پھر سے ہنس پڑی تھی۔

''میں بھی ناں.....'' سر جھٹک کر زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے اس نے کہا اور مس مفتی کی طرف متوجہ ہوئی تھی جو اسے کسی قسم کے رولز کی ترکیب بتا رہی تھیں۔

(جاری ہے)

''سونے کے زیور؟ بہت پسند ہیں مجھے..... کاش کوئی مجھے بھی.....''

''اس قدر کالی رنگت پر سونے کے پیلے چمکیلے زیور۔'' سانولی بولی ہی تھی کہ ..ی نے بات کاٹ لی۔ ''حد ہے..... مطلب شکل دیکھو اور شوق دیکھو۔'' گوری نے دل کی ساری بھڑاس ایک ہی بار میں نکال دی۔

''سانولی رنگت میں حو..کشش ہے ناں وہ تو گورے اور بھورے رنگ میں بھی نہیں۔ دیکھتی نہیں سیاہ بادل جب گھر کر آتے ہیں تو فضا کتنی مسحور ہو جاتی ہے اور جب یہ بادل برس جائیں تو ماحول تر و تازہ ہو جاتا ہے۔'' بھوری گو کہ رنگت میں گوری سے کم تھی مگر نقش اس کے بہت پُرکشش تھے۔ وہ سانولی سے بہت محبت کرتی تھی اس لیے اس کی حمایت میں فوراً بول اٹھی۔

''یہ ڈائجسٹوں کے فلسفہ جات مجھے نہ سناؤ۔ دیکھا ناں میری گوری رنگت کی وجہ سے ہی تو میری شادی بہرام جیسے وجیہہ شخص کے ساتھ ہو رہی ہے جو نہ صرف خوب صورت ہے بلکہ امیر بھی، اس بار تو مجھے عیدی کے طور پر سونے کے زیور بھیجے اور کپڑے ایک، ایک جوڑا دس پندرہ ہزار کا ہے۔ جوتے، چپل سب برانڈڈ ہیں۔ و.. ، سانولی خواب اپنی اوقات دیکھ کر دیکھنے چاہئیں۔''

سانولی دل برداشتہ ہو کر آنگن چھوڑ کر چھت پر چلی گئی۔ سیاہ آسمان پر جھل مل کرتے ہوئے تارے اسے ایسے لگتے جیسے اس آسمان کی رونق اور خوب صورتی ان تاروں سے ہے۔ انسان کی اچھائی اس کی سیرت کی خوبی اور خوب صورتی ہے۔

''لوگ آسمان کی سیاہی پر چمکتے تاروں کو کتنی چاہت سے دیکھتے ہیں تو پھر میری اچھائی، میری سانولی رنگت میں کیوں چھپ گئی ہے؟ کیوں لوگ مجھے میرے رنگ سے پہچانتے ہیں، مرے نام اور کردار سے نہیں۔'' دل بھر آیا تو

سلونی

فائزہ شیخ

URDU TUBE
Digitized by Google

آنسو بھی پلکوں کی نافرمانی کرتے اس کی سانولی مگر صحت مند جلد پر اپنا وجود مٹا گئے۔

چاندنی وہاں آ پہنچی تھی۔

"کیا ہوا سانولی؟" اس نے اسے روتا دیکھ کر اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

"رنگت کا رونا ہے چاندنی..... پہلے تو دنیا والے طنز کرتے تھے۔ اب اماں کو بھی مری رنگت کی وجہ سے میری شادی نہ ہونے اور رشتے نہ آنے کی فکر ہوگئی ہے آج تو سگی بہن نے بھی سنا دیا کہ اوقات سے بڑھ کر خواب نہیں دیکھو۔ میرے سانولے رنگ میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔ بھوری کا رشتہ بھی اچھے کھاتے پیتے خاندان میں ہوا ہے۔ اس کے لیے بھی ڈھیر جیدی آئی ہے۔ اور مجھے لوگ دیکھتے ہی مسترد کر دیتے ہیں کہ ہمیں رنگ گورا چاہیے۔"

وہ روئے جا رہی تھی چاندنی کے دودھیا ہاتھ میں اس کا سانولا ہاتھ مشرق و مغرب کی طرح لگ رہا تھا۔

"روؤ نہیں پیاری، ہیرا ہمیشہ کوئلے کی کان سے ہی نکلتا ہے اور ہیروں کی قدر تو جوہری ہی جان سکتا ہے۔ یہ زمانے والے رنگ، روپ اور پیسے کے پیچھے بھاگتے ہیں کہ انہیں چاند پر پڑے کالے دھبوں سے فرق نہیں پڑتا کیوں کہ چاند ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک دیتا ہے اور جو لوگ تمہارا رنگ دیکھ کر تمہیں مسترد کر دیتے ہیں، میں تو کہتی ہوں کہ اچھا ہی ہوتا ہے۔ جس انسان کے پاس کردار اور اخلاص کی اہمیت نہیں ان سے کیا رشتے بنانا۔" چاندنی کی باتوں سے سانولی کچھ متاثر ہوئی اور دونوں روشن چمکتے چاند کو دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

نام تو اس کا سلونی تھا مگر اس کی گہری رنگت کی وجہ سے سب اسے سانولی ہی کہتے تھے۔ آج سلونی بڑے فخر کے ساتھ اسٹیج پر کھڑی ایک ہاتھ میں ایوارڈ اور دوسرے ہاتھ میں مائک پکڑے آنسوؤں کو پلکوں پر ٹھہر جانے کا حکم سناتے ہوئے دل ہی دل میں ان تمام لوگوں کو یاد کر رہی تھی جو اسے ریجیکٹ کرتے رہے، جو اسے سانولی رنگت کا طعنہ دیتے رہے اگر وہ اس درد اور کرب کو محسوس نہ کرتی..... اگر اس درد کو دل میں نہ چھپایا ہوتا تو آج وہ اپنے جذبات، اپنے محسوسات، اپنی سوچ دنیا کے سامنے ظاہر نہ کر پاتی۔

لوگ بڑے اشتیاق سے اس کے خطاب کا انتظار کر رہے تھے۔

"شکریہ" آنسو زار و قطار بہنے لگے۔ اس کی سانولی رنگت اتنی سلونی تھی کہ میک اپ ایکسپرٹ کی مہارت نے اس کے نقش کو حسین کر دیا تھا۔ بھوری، گوری، چاندنی کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی سانولی ہے جو ہمیشہ احساسِ محرومی اور احساسِ کمتری کا شکار رہی وہ بھی اپنے ہی لوگوں کی بدولت۔

"میں نہیں جانتی کہ میں اس ایوارڈ کی مستحق ہوں یا نہیں۔ کیونکہ فیس آف دا ایئر کے لیے لوگوں کے ذہن میں انتہائی حسین و جمیل صورت ہوتی ہے..... گلابی ہونٹ، گہری سبز و سیاہ یا جھیل سی نیلی آنکھیں۔ سیاہ گھنے بادلوں سے بال یا پھر دودھیا کلائیاں..... سلونی سرور خان ان میں سے کسی ایک criteria پر بھی پوری نہیں اترتی۔"

وہ لمحہ بھر کو رکی۔ لوگ اسٹیج کے علاوہ ٹی وی اسکرین پر بھی اس ایوارڈ شو کو live دیکھ رہے تھے۔

"شکریہ ان لوگوں کا جو مجھے ریجیکٹ کرتے رہے، ان لوگوں کا جو مجھے یہ احساس دلاتے رہے کہ رنگ و روپ کی کمی کی وجہ سے میں زندگی میں کچھ بھی بیسٹ نہیں کر سکتی کچھ بن نہیں سکتی کچھ پا نہیں سکتی۔"

آنسو ہر حد پار کر کے بالآخر اس کے حسین و دلکش چہرے پر بہہ نکلے۔

"مگر پھر بھی شکریہ ان سب کا..... دیکھیں آج میں کس مقام پر کھڑی ہوں۔ یہ سب آپ ہی کی تنقید کی دین ہے۔" سلونی تمہاری شادی کسی امیر اور ہینڈسم لڑکے سے نہیں ہو سکتی کیونکہ تم کالی ہو۔" کالی..... جیسے کہ کالی ہونا کوئی گالی تھا اور پھر میں نے اپنی پہلی کہانی "کالی" کے عنوان پر لکھی جسے آپ سب نے بے حد پسند کیا۔ یہ کہانی اسی سلونی کی ہے..... ہاں میری جیسی ہر سلونی کی جسے دنیا تو دنیا گھر والے بھی طنز و طعن کرتے ہیں..... وہ دلبرداشتہ بھی ہوتی ہے، ٹوٹ بھی جاتی ہے اداس بھی ہوتی ہے مگر ہمیشہ کچھ دوست ہوتے ہیں جو میری زندگی میں بھی تھے اور میری جیسی ہر سلونی کی زندگی میں بھی ہوتے ہیں۔ چاندنی میری دوست اداس راتوں میں مرے ہاتھ کو تھامے، مجھے ہمت دینے والی..... بھوری، میری کزن تو ہے ہی میری دوست میری خیر خواہ بھی دھنک، اگر تم نہ ہوتی تو میں کبھی اپنے اندر چھپے رنگوں کو نہ پہچان پاتی کیونکہ دنیا نے تو مجھے کالے رنگ سے جانا تھا۔ میں کینوس پر کبھی رنگ نہ بکھیرتی، کبھی اپنے احساس اور جذبات کو مصوری میں نہ ڈھالتی۔ پیاری دوست "خیال" تمہاری محبت نہ ہوتی تو سلونی رونی رہتی بکھری رہتی۔ تمہارے خوب صورت خیالوں نے ہی تو سمیٹا مجھے۔ تم نے ہی تو مجھے آئینہ دکھایا، تم نے ہی تو

مجھے بتایا کہ میں سانولی ہوں مگر بدصورت نہیں ہوں..... اور تمہارے بعد یہ بات کتنے ہی لوگوں کو پتا چلی یہاں تک کہ "کالی" پر ایک ڈراما بنایا گیا اور جب لوگ مجھ سے اسکرپٹ لکھوانے آئے تو مجھے ہی اس ڈرامے کا مرکزی کردار ادا کرنے کی پیشکش ہوئی اور آج..... مرے ہاتھ میں یہ فیس آف دا ایئر ایوارڈ اس بات کا گواہ ہے کہ

رائگاں نہیں جاتی دل پہ جو گزرتی ہے
آدمی بکھرتا ہے شاعری نکھرتی ہے

آپ تمام احباب کا شکریہ..... اور ایک بات یاد رکھیں سلونی کی سیاہ رنگت میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ میں ان تمام لڑکیوں اور عورتوں سے صرف ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ اپنے آپ پر ہمیشہ اتنا اعتماد اور بھروسا رکھیں کہ رنگ و روپ آپ کی شخصیت، آپ کے کردار پر آپ کی کامیابی کی راہوں میں کبھی حائل نہ ہونے پائے۔ زمانے کو کبھی اتنی اجازت نہ دیں کہ آپ کے انتہائی قیمتی آنسو صرف اس لیے بہائیں کہ آپ کا رنگ سانولا ہے۔ جبکہ اس میں آپ کا کوئی عمل دخل نہیں، یہ تو خالقِ کائنات کی مصوری ہے کہ کہیں کہکشاں ہے تو کہیں اندھیرے۔ اپنی زندگی کے... مختارِ خود ہیں اپنے رنگ خود اپنے آپ پر سجائیں اور مخلوقِ خدا سے محبت کریں چاہے گورے ہوں یا کالے۔ کیونکہ انسان کی اصل پہچان اس کا کردار اور اخلاص ہے۔"

بہتے آنسوؤں مسکراتے لبوں اور بیش قیمت جذبات کی عکاسی کرتی اپنی ذرا سی تقریر میں اس نے بہت کچھ کہہ ڈالا تھا۔ گوری ٹیلی ویژن اسکرین کی دوسری طرف نادم اور شرمندہ سی آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کے شوہر نے پیچھے سے پکارا۔

"گوری، گوری یہ کیا تم ہر وقت ٹی وی کے سامنے بیٹھی رہتی ہو۔ شوہر گھر میں آ گیا ہے، پتا ہی نہیں بس اپنی....."

ابھی وہ بات پوری نہ کر پایا تھا کہ نظر سامنے اسکرین پر پڑی۔ سلونی ہاتھ میں ایوارڈ لیے اسٹیج کی سیڑھیاں اتر رہی تھی کیمرے اس کے آگے پیچھے گھوم رہے تھے۔ بار، بار اس کے چہرے کو فوکس کیا جا رہا تھا۔ اجمل صوفے پر ڈھے سا گیا۔

"اوہ واؤ..... میڈم سلونی فیس آف دی ایئر ہیں۔ دیکھو ذرا سانولی ہو کر بھی کیا قابلیت پائی۔ رائٹر، پینٹر اب ایکٹر بھی کمال کی نکلی اور تم نے بظاہر خوب صورت ہو کر بھی کیا پایا گوری؟" اس میں نے سوالیہ نظروں سے گوری کی طرف دیکھا جو اب نظر چرا کر کچن کی طرف جا رہی تھی جو اس کے بکھرے وجود کی طرح بکھرا ہوا تھا۔

☆☆☆

شادی کے بعد اجمل کا گوری کے سارے ناز اور نخرے اٹھانے کا سلسلہ کم ہوتے، ہوتے بالکل ختم ہو گیا۔ اجمل اپنی ماں سے بے حد پیار کرتا تھا جو اکثر بیمار رہتی تھی جبکہ گوری اپنے آپ کو ملکہ حسن سمجھتی تھی اس لیے وہ اپنی ساس کی خدمت کرنا اپنی توہین سمجھتی تھی اور اسی وجہ سے اجمل کے ساتھ کافی بار لڑائی ہوئی۔ کئی، کئی مرتبہ میکے روٹھ کر جا بیٹھی اور پھر اس شرط پر واپس آئی کہ الگ گھر میں رہے گی۔ اجمل نے اس کی یہ شرط تو نہ مان لی مگر اس کے دل میں گوری کی عزت کم ہو گئی۔

اجمل کو شادی کے کچھ ماہ بعد معلوم ہوا کہ گوری صرف میٹرک کر کے گھر بیٹھ گئی تھی، اسے کپڑوں، میک اپ اور جیولری کا شوق پڑھنے نہ دیتا۔ اجمل نے کافی بار کہا کہ آگے پڑھ لو مگر وہ یہی کہہ کر ٹال دیتی کہ مجھے پڑھ کر کون سا کاروبار کرنا ہے تم اتنا اچھا تو کماتے ہو۔ پھر یوں ہوا کہ اجمل کی ماں کا انتقال ہو گیا گوری رسمی طور پر شامل رہی۔ اب شادی کو چار سال ہو گئے تھے وہ اولاد سے محروم رہی۔ لوگ سو، سو سوال کرتے اور وہ جواب نہ دے پاتی۔ اس کا واحد مشغلہ ٹی وی دیکھنا تھا۔ صفائی کے لیے ماسی آ جاتی تو وہ مزید سست ہوتی گئی۔ اس کا وزن دواؤں کے اثر اور بے ہنگم کھانے کی وجہ سے بڑھنے لگا۔ وہ اپنے رنگ کے علاوہ اپنی تمام خوب صورتی کھو چکی تھی اور اجمل کو بھی۔ کیونکہ جس حسین صورت اور خوب صورت جسم پر اجمل کا دل آیا تھا وہ اب نہ رہا تھا۔ اجمل کو محسوس ہوتا تھا کہ گوری نے لالچ میں اس سے شادی کی۔ کبھی اس نے اجمل کے خاندان کو اہمیت نہ دی سوائے اپنی غرض کے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اجمل نے اولاد کی خاطر دوسری شادی کر لی اور اب چھ ماہ بعد اس کی بیوی حمل سے تھی۔ گوری کی خوب صورتی ماند پڑ چکی تھی۔ اب وہ محض اپنے میاں اور اس کی دوسری بیوی کی خادمہ تھی۔

"گوری..... گوری..... چائے بنا رہی ہو یا پائے؟"

اجمل کی دہاڑ پر وہ اپنے خیالات سے باہر آئی۔

وہ بے حد رو رہی تھی۔ سلونی سے اپنے کیے گئے برے رویے کی معافی مانگنا چاہتی تھی مگر وہ صرف سلونی کی مجرم نہ تھی۔ اپنے حسن کے آگے ہر ایک کو حقیر سمجھ کر اس نے اپنی شفیق ساس، اجمل اور اپنے خاندان تک کو کھو دیا تھا۔

اب سوائے پچھتاوے کے کیا باقی رہا تھا؟

Digitized by Google

مکمل ناول

سایہ اور ثمر

شبینہ گل

دوسرا اور آخری حصہ

یہ محض اتفاق ہی تھا کہ حدید ماں سے زیادہ قریب تھا اور منال باپ سے یا شاید قدرتی طور پر ایسا ہو کہ بیٹے، ماں کے نزدیک ہوتے ہیں اور بیٹی، باپ کے۔ گو کہ عارف احمد کی محبت اور رویہ دونوں سے یکساں تھا مگر پھر بھی حدید باپ کی نسبت ماں کے جذبات و احساسات کا زیادہ خیال کرتا جبکہ باپ کی طرف سے وہ قدرے بے پروا تھا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ خالدہ کا اپنا جھکاؤ بھی دیگر روایتی ماؤں کی طرح بیٹے کی طرف زیادہ تھا سو اسے بھی ماں کے آگے کوئی اور دکھائی نہ دیتا۔ اس کے برعکس منال بچپن ہی سے حساس تھی۔ وہ ماں اور باپ دونوں کا احساس کرتی، دونوں سے یکساں برتاؤ کرتی اور بھائی کا بھی پورا خیال رکھتی۔ شاید لڑکیوں کی فطرت میں مامتا بھری ہوتی ہے اسی لیے وہ ہر رشتے کے لیے بہت زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ منال کو ہمیشہ اس بات کا احساس رہتا کہ اس کے ابا ایک سرکاری محکمے میں اچھے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اپنی ایمان داری سے صرف جائز تنخواہ کماتے ہیں جو کہ بڑھتی ضروریات اور مہنگائی کے حساب سے قلیل لگنے لگی تھی۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتی کہ ابا سے فالتو تقاضے نہ کرے جبکہ حدید کو جس شے کی خواہش ہوتی وہ جھٹ سے اظہار کر دیتا، یہ سوچے بنا کہ ابا اسے پورا کیسے کریں گے۔ بعض اوقات وہ حدید کو احساس دلاتی تو وہ بخوشی اپنی خواہش سے دستبردار بھی ہو جاتا مگر اکثر و بیشتر اسے دھیان نہیں رہتا تھا۔

عارف احمد دوستوں کی محافل کے بہت شوقین تھے، شادی سے پہلے وہ ہر ہفتے دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کا وقت ضرور نکالتے، کبھی شمالی علاقہ جات کا رخ کرتے اور خوب موج مستی کرتے۔ شادی کے بعد اس معمول کو انہوں نے اپنی شریکِ حیات کے ساتھ بھی بانٹ لیا۔ ایک ہفتے وہ انہیں لے جاتے تو دوسرے ہفتے دوستوں کے ساتھ جاتے ہوئے انہیں میکے چھوڑ آتے کہ وہ تنہائی محسوس نہ کریں۔ انہیں اچھا پہننے، اچھا کھانے اور مہنگی خوشبویات استعمال کرنے کا جنون تھا۔ خالدہ کو بھی وہ ہمہ وقت بہترین پوشاک میں خوشبو سے لبریز دیکھنا پسند کرتے۔ پھر جب بچے بڑے ہونے لگے، اخراجات بڑھنے لگے تو انہوں نے اپنی بیرونی مصروفیات اور اخراجات کم کرنا شروع کر دیے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے انہوں نے اپنا شہروں، شہروں گھومنے کا شوق قربان کیا کیونکہ وہی شوق سب سے زیادہ پیسہ کھاتا۔ اس کے بعد ملبوسات اور خوشبویات کی قربانی کا وقت آیا۔ بچے بڑی جماعتوں میں پہنچے تو ہر موسم میں بس ایک بار کسی نہ کسی سیل سے کپڑے اور دیگر سامان خریدا جانے لگا۔

حدید نے پانچویں جماعت کے بورڈ کے امتحانات میں پہلی پوزیشن لی تو عارف احمد نے انعام کے طور پر اسے سائیکل دلائی۔ باقی سب نے بھی.. حتی المقدور قیمتی تحائف دیے کیونکہ ان کے پورے خاندان میں بورڈ میں پوزیشن کسی نے نہیں لی تھی گو کہ کبھی بچے لائق اور محنتی تھے اور اچھے گریڈ لیا کرتے تھے مگر پہلی پوزیشن کا اعزاز صرف حدید نے خاندان کو دیا جس کی بھرپور خوشی منانا تو لازم تھا۔ معروف اخبارات میں

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutube.com

Digitized by Google

اس کی تصویر کے ساتھ خبریں لگیں اور کئی اخباری نمائندے گھر پر انٹرویو کرنے بھی آئے۔ ایسے مواقع پر ہمیشہ یہی ہوتا کہ سب طالب علم کی ماں سے ہی سوالات کرتے اور بچے کی کامیابی کے حوالے سے بات چیت کرتے۔ عارف احمد سے اول تو کوئی سوال ہی نہ کرتا یا پھر سرسری سی بات کر کے توجہ خالدہ پر مرکوز کر دیتے۔ ہمارے معاشرے کا ذہن کچھ اس طرح بن چکا ہے کہ گھر اور بچوں پر محنت صرف ماں ہی کرتی ہے، باپ صرف پیسہ کمانے کی مشین ہوتا ہے جسے اکثر اوقات یہ تک نہیں پتا ہوتا کہ اس کے بچے کون، کون سی جماعتوں میں پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سب خالدہ ہی سے انٹرویو لیتے اور وہی سب جوابات دیتیں۔ سب جگہ وہ ایک محنتی ماں کا نمایاں مقام حاصل کر کے مشہور ہو گئیں۔ اسکول میں سب بچوں کی مائیں ان سے ایک ہی سوال کرتیں۔

"آپ نے یہ سب کیسے کیا، اپنے بچے پر اتنی محنت کیسے کی، آپ نے بچے کا کیا ٹائم ٹیبل بنا رکھا ہے، آپ کن ذرائع سے اپنے بچے کو تیاری کرواتی ہیں وغیرہ وغیرہ؟"

اور وہ منہ کھولے سب کو دیکھتیں پھر دھیمی آواز میں بس اتنا کہتیں۔

"اس میں میرا کوئی کمال نہیں، بچوں کو میرے شوہر خود پڑھاتے ہیں، وہی ان کا ٹائم ٹیبل سیٹ کرتے ہیں اور وہی ان پر محنت کرتے ہیں، میں تو بس ان کی خوراک پر توجہ دیتی ہوں۔"

"باپ تو بس ایک شیڈول بنا کر دے سکتا ہے یا ماہانہ اور سالانہ پروگریس پر نظر رکھ سکتا ہے، اصل کام تو ماں کا ہی ہوتا ہے، آپ بتانا نہ چاہیں تو وہ الگ بات ہے۔" مگر کوئی بھی ان کی بات پر یقین نہ کرتا۔ سب یہی کہتیں۔

اور خالدہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتیں۔ انہیں کسی کو قائل کرنا یا اپنا موقف سمجھانا نہیں آتا تھا اس لیے وہ خاموش ہی رہتیں۔ یوں سب کی نظر میں وہی ایک مثالی ماں کی صورت ابھریں۔ حدید اور منال کے اسکول سے تو انہیں بار ہا ٹیچنگ کی پیشکش بھی کی گئی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ ایک سادہ اور واجبی سی انٹر پاس عورت ہیں۔ وہ بھی اپنا بھرم توڑے بنا سلیقے سے یہ کہہ کر انکار کر دیتیں کہ نوکری کرنے سے ان کی توجہ گھر اور بچوں سے ہٹ جائے گی۔ اس بات کی بھی سب نے بے حد تعریف کی۔ وہ ہمیشہ سوچتیں کہ اللہ کو ان کی کوئی تو بات اتنی پسند آئی ہوگی جو انہیں اتنی محبت اور عزت سے نواز دیا کہ وہ سنبھال نہ پاتیں۔

☆☆☆

منال بھی بھائی کے نقش قدم پر چل رہی تھی اور اس کا ہر قدم بھائی کے قدم سے آگے ہی پڑتا۔ حدید کو اس کی کامیابیوں پر کبھی حسد محسوس نہیں ہوا۔ ان دونوں میں وہ روایتی جلن اور چڑ والا تعلق نہیں تھا جو اوپر تلے کے بہن بھائی میں ہوتا ہے۔ منال نے حدید سے زیادہ نمبر لے کر پانچویں کے بورڈ میں اس کا وہ ریکارڈ توڑ دیا جو تین سالوں میں کوئی بچہ نہیں توڑ سکا تھا۔ اخباری نمائندے اس کا انٹرویو لینے آئے تو اس نے بالکل مختلف بیان دیا۔

"میری تمام کامیابیوں میں سب سے بڑا ہاتھ میرے ابا کا ہے، وہ اپنی تمام مصروفیات کے باوجود ہم بہن بھائی کی پڑھائی پر بھرپور توجہ دیتے ہیں۔"

وہ اپنے ابا کو ان سے ملوانا چاہتی تھی، وہ چاہتی تھی کہ اس کی ماں کے ساتھ، ساتھ باپ کی بھی تصاویر اخبارات کی زینت بنیں، لوگ یہ جان لیں کہ ان کی کامیابیوں کے پیچھے ماں کا نہیں باپ کا ہاتھ ہے مگر۔

ایک بار پھر یہی ہوا کہ سب نے خالدہ پر توجہ دی انہی سے سوالات کیے۔ اس نے کئی بار ابا کو بات کرنے کے لیے اکسایا مگر وہ یہی بات کہہ کر اسے خاموش کرا دیتے کہ وہ آپ کی اماں سے بات کر رہے ہیں، بیچ میں بولنا یا ٹوکنا غیر اخلاقی حرکت ہے۔ اس روز پہلی بار منال نے اس کیچ پر سنجیدگی سے سوچا کہ ہمیشہ ایسے مواقع پر سب اماں کو کیوں اہمیت دینے لگتے ہیں۔ اس روز پہلی بار اس نے رات کو دیر تک جاگ کر عارف احمد کی

واپسی کا انتظار کیا اور جب وہ آئے تو ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"ارے میری بیٹی سوئی نہیں آج؟" انہوں نے پیار سے اسے اپنے پاس بٹھا کر پوچھا۔

"ابا، مجھے آپ سے ایک سوال کرنا ہے۔"

"کیسا سوال؟" انہوں نے جوتے اتارتے ہوئے غور سے بیٹی کو دیکھا۔

اسی وقت خالدہ نے آ کر انہیں سلام کیا اور کھانا لانے کا کہہ کر باورچی خانے کی طرف چل دیں تو وہ پھر سے منال کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اخبار والے آپ سے کیوں سوال نہیں کرتے، ہماری کامیابی میں آپ کا کردار جاننے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

اس نے ان کے جوتے اٹھا کر سامنے بنے ریک میں رکھتے ہوئے سوال کیا۔ وہ یک دم چونکے، دن والی بات اس نے اب تک ذہن پر سوار کر رکھی تھی، یہ اس کی حساسیت کی نشانی تھی۔ انہوں نے کندھے اچکائے اور آستین لپیٹنے لگے۔

"اس بارے میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں بیٹا، عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ بچوں کے والد ان کی کسی کامیابی میں حصے دار نہیں ہوتے اور انہوں نے کبھی ان کی کتابیں اٹھا کر دیکھی بھی نہیں ہوتیں۔ شاید اسی لیے وہ سمجھتے ہوں گے کہ مجھ سے سوال کر کے انہیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا اور میں بھی ہر بات سے لاعلمی کا اظہار کروں گا۔ پھر بھلا وہ مجھ پر اپنا وقت کیوں برباد کرتے۔ یہ اتنی بڑی بات نہیں، اتنا مت سوچیں اس پر۔"

منال نے سمجھداری سے سر ہلایا۔

"جی ابا آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، میری دوست ہے ناں ماہا، وہ کہتی ہے کہ میرے پاپا ہر سال رزلٹ والے دن مجھ سے پوچھتے ہیں کہ بیٹا اب آپ کون سی کلاس میں پروموٹ ہوئی ہیں۔ ابا انہیں اپنی بیٹی کی کلاس تک نہیں پتا۔" وہ حیرت سے بولی۔

صحن میں لگے بیسن پر منہ ہاتھ دھوتے ہوئے عارف احمد قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"تو دیکھیں ناں بیٹا پھر اخباری نمائندوں کا بھلا کیا قصور، ان کا واسطہ ایسے ہی لوگوں سے پڑتا ہوگا ہر جگہ۔"

"تو پھر تو آپ کو چاہیے تھا ناں کہ آپ اپنے بارے میں بات کرتے جب میں نے کہا کہ میری کامیابی میں سارا کردار میرے ابا کا ہے تب آپ کیوں نہیں بولے۔ انہیں پتا چلنا چاہیے ناں کہ سب کے ابا، ماہا کے پاپا جیسے نہیں ہوتے۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

"منال اب بس کرو سونے جاؤ، ابا کو تنگ مت کرو آرام سے کھانا کھانے دو، یہ عدالت صبح لگا لینا۔ بہت دیر ہو چکی ہے۔" خالدہ نے کھانے کی ٹرے لا کر ان کے سامنے رکھی تو منال کو ٹوکا۔

منال نے برا سا منہ بنا کر باپ کو دیکھا تو وہ بولے۔

"ارے کوئی بات نہیں خالدہ بیگم، اسے بیٹھا رہنے دیں۔ ہاں تو بھئی منال بی بی۔"

خالدہ بیگم دائیں بائیں سر ہلاتی واپس اندر چلی گئیں تو وہ منال سے بولے۔

"بھئی جب سب کے ابا ایسے ہیں، اور آپ اپنے ابا کی تعریفیں ساری دنیا کے سامنے لا کر رکھ دیں گی تو آپ کی سہیلیاں تو آپ سے جل جائیں گی اور ہو سکتا ہے ان کی بری نظر مجھے لگ جائے اور میں بھی ویسا ہی ابا بن جاؤں۔"

ان کی بات پر منال نے گھور کر انہیں دیکھا۔

"اللہ نہ کرے کہ میرے ابا ایسے ہو جائیں۔ ویسے یہ بات آپ نے ٹھیک کہی کہ میری سہیلیاں آپ کی وجہ سے مجھ سے جلنے لگ جائیں گی۔"

انہوں نے زور، زور سے سر ہلایا اور بولے۔

"بس تو پھر کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے منال کی کامیابی کا اصل راز۔"

انہوں نے ڈرامائی انداز میں کہا تو دونوں باپ بیٹی قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ باپ بیٹی کے پیار کو دیکھ کر آسمان پر چمکتا چاند کچھ اور چمکا، دور کہیں فرشتے اس مقدس رشتے کی محبت پر مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆

Digitized by Google

پالنا آپ کے لیے عذاب سے کم نہیں ہوگا اور بالفرض آپ اسے پالنے کا اچھا بندوبست کر بھی لیں تب بھی یہ بچہ زیادہ عرصہ جی نہیں پائے گا۔ ایسے میں اسے دنیا میں لانے کے لیے اتنی مشقت اٹھانا میرے نزدیک عبث ہی ہے۔"

خالدہ اس بات پر بری طرح پریشان ہوگئیں۔ ان کا رو، رو کر برا حال ہوگیا۔ ناہید آپا، فہمیدہ آپا، سمیرا بھابی، صفیہ بھابی سب دوڑی چلی آئیں۔ وہ سب اس بات پر متفق تھیں کہ خالدہ کو یہ بچہ ضائع کرا دینا چاہیے۔ اماں خاموش تھیں، انہیں سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا رائے دیں۔ خالدہ مسلسل اسی بات پر مصر تھیں کہ وہ یہ بچہ پیدا بھی کریں گی اور اسے پالیں گی بھی خود۔

"میرے بچے مجھ سے زیادہ تو آپ سب نے اور عارف صاحب نے پالے ہیں، اب یہ بچہ پوری ذمے داری کے ساتھ میں خود پالوں گی، یہ جیسا بھی ہے، میری اولاد ہے، عارف صاحب کی اولاد ہے، میں اسے قتل کرنے کا گناہ سر پر نہیں لے سکتی۔"

"سب اپنی، اپنی رائے دے رہے ہیں، کچھ آپ بھی تو کہیں، آپ کی اولاد ہے، آپ کیا سوچتے ہیں اس کے بارے میں، کیا ہمیں اس کا قتل جائز ہے عارف صاحب، کچھ تو بولیں۔" سب لوگ چلے گئے تو خالدہ نے شوہر سے پوچھا۔

عارف احمد کے چہرے پر گہری سنجیدگی کی چھاپ تھی۔ انہوں نے خالدہ کو کندھوں سے پکڑ کر آرام سے بستر پر بٹھایا اور بولے۔

"نہیں خالدہ، کسی صورت بھی اس بچے کا قتل جائز نہیں لیکن اگر آپ ایسا چاہتی ہیں تو میں آپ کا ساتھ دوں گا۔"

"میں اسے پالنا چاہتی ہوں، مجھے یہ ہر حالت، ہر بیماری میں قبول ہے۔"

"مجھے آپ کے اس فیصلے پر فخر ہے، میں اس صورت میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔"

وہ مسکرائے اور فیصلہ ہوگیا۔

وہ لمحہ شاید ان دونوں کی آزمائش کا ہی تھا۔ بچے کو اپنانے کا فیصلہ کر کے وہ دونوں اپنے رب کے آگے سرخرو ہوگئے، تبھی ایک دن اس رب نے ان دونوں کو کسی بھی مشکل سے بچانے کے لیے ان سے وہ بچہ خود ہی واپس لے لیا۔ ساتواں مہینہ چل رہا تھا جب ایک دن خالدہ کی طبیعت بگڑی، ایمرجنسی میں انہیں اسپتال لے جایا گیا جہاں انہوں نے مردہ بچے کو جنم دیا۔ وہ جسمانی لحاظ سے بھی معذور تھا اور بعد از پیدائش ذہنی اعتبار سے بھی کئی معذوریوں کے بارے میں ڈاکٹر انہیں پہلے ہی بتا چکی تھیں۔ خالدہ اس سانحے پر بہت روئیں مگر پھر عارف احمد کے ایک جملے نے انہیں سکون دے دیا۔ انہوں نے کہا۔

"آپ اپنے امتحان میں اللہ کے آگے سرخرو رہیں۔ وہی جانتا ہے کہ یہ بچہ دنیا میں آ کر ہمارے لیے کتنی مشکلات کا باعث بن سکتا تھا اور اللہ ہمیں ان مشکلات سے بچانا چاہتا تھا، اسی لیے اس نے اپنی چیز واپس لے لی اور دیکھیں کہ اس بچے کو واپس لے کر بھی اس نے ہماری آخرت کو سنوارنے کا ایک سبب بنا دیا۔ کتنا رحیم و کریم ہے میرا رب، اس کی مصلحتیں وہی جانے۔ اس کے جانے پر رونا بے معنی ہے، اس کا جانا بھی باعث رحمت ثابت ہوگا ہمارے لیے۔"

اور خالدہ بیگم کو صبر آ گیا۔ ایک بار پھر عارف احمد تن دہی سے ان کی تیمارداری اور دل جوئی میں جت گئے۔ منال ہمیشہ سوچتی کہ اس کے ابا میں نہ جانے کتنا حوصلہ ہے جو کبھی کم نہیں ہوتا۔ انہوں نے بیوی کی یہ خدمت گزاری ان کی ہر بیماری میں کی مگر منال وہ سب تو نہیں جانتی تھی، اپنے ہوش و حواس میں یہ پہلا موقع تھا جب اس نے باپ کو ماں کی ایسی خدمت کرتے دیکھا اور اس کے دل میں ان کا مقام بلند ہوتا چلا گیا۔ یہ بہت کڑا وقت تھا اور اس میں جس طرح انہوں نے خالدہ بیگم کا خیال رکھا، وہ خود کو زیر بار محسوس کرنے لگیں۔

ایک روز جب وہ معمول کے مطابق گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر پھلوں کی پلیٹ اٹھائے انہیں کھلانے کے لیے پاس آ کر بیٹھے تو خالدہ بیگم نے

احساسِ تشکر سے مغلوب ہو کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"بس کریں عارف صاحب میں بری طرح آپ کے خلوص کی مقروض ہو چکی ہوں، اتنی خدمت مت کریں، خدمت تو مجھے آپ کی کرنی چاہیے جبکہ آپ میری کرتے ہیں ہر وقت۔ ساری دنیا کی عورتیں بیماری میں بھی اپنا ہر کام خود کرتی ہیں اپنا گھر جیسے تیسے سنبھالتی ہیں، آپ نے تو مجھے ضرورت سے زیادہ ہی لاڈ پیار میں رکھا ہوا ہے۔ اب تو مجھے خود بھی شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ مت کیا کریں اتنا سب کچھ۔ اب میں بہتر ہوں، مجھے اٹھنے دیں کام کاج سنبھالنے دیں۔" عارف احمد نے خفگی بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا اور سیب کاٹتے ہوئے بولے۔

"یہ سب کر کے میں آپ پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔ آپ میری اولاد پیدا کرنے، میری نسل بڑھانے جیسا کٹھن کام کرتی ہیں، آپ کی صحت کا خیال رکھنا میرا فرض ہے کیونکہ آپ اپنی صحت کو میری ہی خاطر داؤ پر لگاتی ہیں۔ آج میں آپ کی صحت کا بھرپور خیال رکھوں گا تو ہی اپنی اولاد کو صحت مند ماں دے سکوں گا ناں۔ بیوقوف ہیں وہ لوگ جو کام کاج کی خاطر بیوی کو کولہو کا بیل بنا دیتے ہیں اور پھر وہ وقت سے پہلے بوڑھی، لاچار اور محتاج ہو کر اپنے ہی شوہر اور اولاد کے لیے ناکارہ ہو جاتی ہے۔ پھر بھی مرد اسے ہی قصوروار ٹھہرا کر یا تو دوسری شادی کر لیتا ہے یا پھر دوسری عورتوں کے چکر میں پڑ جاتا ہے کیونکہ اس کی بیوی ان سارے چکروں میں اپنی کشش کھو چکی ہوتی ہے۔ بھئی ساری زندگی گھر عورت نے ہی سنبھالنا ہوتا ہے ناں، ایسے میں پندرہ بیس دن اگر اسے بستر کا مکمل آرام اور بہترین خوراک دے دی جائے تو ان چند دنوں میں کوئی قیامت تو نہیں آ جائے گی۔ میں آپ کو اپنی اولاد کی خاطر صحت مند دیکھنا چاہتا ہوں، سمجھیں۔"

خالدہ بیگم مسکرا دیں۔

"آپ جیسی سوچ سب کی تو نہیں ہو سکتی ناں۔ منال بڑی ہو رہی ہے اور وہ آپ کا ہر انداز نوٹ کرتی ہے، لاشعوری طور پر اس کے ذہن میں ہم سفر کا یہی خاکہ پنپ رہا ہے اور اگر اسے آپ جیسا ہم سفر نہ ملا تو کیا ہوگا؟" وہ فکرمندی سے بولیں۔

عارف احمد نے کٹے ہوئے سیبوں کی پلیٹ ان کے آگے رکھی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

"کیوں نہیں ملے گا مجھ جیسا ہم سفر میری بیٹی کو؟ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اپنی بیوی کے لیے ویسے شوہر بنو جیسا شوہر تم اپنی بیٹی کے لیے چاہتے ہو۔ میرا تو اس بات پر ایمان ہے کہ اگر میں نے خود کو اللہ کی رضا کے لیے ایسا بنایا ہے اور اللہ اسے قبول کر لے گا تو میری بیٹی کو بھی مجھ سے اچھا ہی شریکِ سفر عطا کرے گا۔ آپ... بلاوجہ لایعنی سوچیں پال کر اپنے چہرے کی خوب صورتی کو گہنایا مت کریں۔"

انہوں نے اس انداز سے کہا کہ خالدہ بیگم ہنس پڑیں۔

کہتے ہیں کہ شادی کے بعد عورت کا چہرہ اور جسمانی حالت بتاتی ہے کہ اس کے شوہر نے اسے کس حال میں رکھا ہوا ہے۔ وہ عورتیں کبھی بوڑھی نہیں ہوتیں جن کے شوہر ان پر جان چھڑکتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی حال خالدہ بیگم کا بھی تھا۔ شادی سے قبل وہ مناسب صورت کی لڑکی تھیں جو پہن اوڑھ کر اچھی لگتی تھیں مگر شادی کے بعد عارف احمد کی توجہ اور محبت نے ان کے عام سے چہرے کو ایسا نکھارا کہ وہ خوب صورت ہوتی چلی گئیں۔ شادی کے چودہ برس بیت جانے کے بعد بھی وہ اس قدر خوب صورت اور کم عمر لگتی تھیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے اور ان کی قسمت پر رشک کرتے نہ تھکتے۔ لوگ ہمیشہ عورت کو الزام دیتے ہیں کہ وہ اپنا خیال نہیں رکھتی سر جھاڑ منہ پھاڑ پھرتی ہے۔ جس کا شوہر ہی اسے اہمیت نہ دیتا ہو تو وہ بھلا کس کے لیے سج سنورے۔ کہتے ہیں کہ عورت کو تم جیسا کہو گے وہ ویسی ہی بنتی چلی جائے گی، اسے بدصورت اور پھوہڑ کہو گے تو وہ وہی بنتی جائے گی اور اگر اسے خوب صورت اور سلیقہ مند کہو گے تو وہ خود بہ خود ویسی ہی بنتی چلی جائے گی۔ عورت موم کی ناک ہے، جہاں چاہیں موڑ دیں لیکن ہم اسے توڑ

Digitized by Google

دیتے ہیں، بدقسمتی سے یہ ہمارا معاشرتی رویّہ ہے۔

☆☆☆

آخری ایام میں عارف احمد کے اماں، ابا دونوں ہی جزوی طور پر محتاج ہوگئے تھے۔ ایسے میں اماں کو خالدہ دیکھتیں اور ابا کو عارف احمد...... جبکہ ان کے دفتری اوقات میں دونوں کو خالدہ خود سنبھالتیں۔ آصف، واصف بھائی اور ان کے بیٹے بھی باری، باری دیکھ بھال کے لیے آتے، جاتے رہتے تھے مگر مکمل ذمہ خالدہ ہی کا رہا اور انہوں نے اسے انتہائی خوش اسلوبی سے نبھایا۔ ایسے میں وہ اکثر سوچتیں کہ اللہ نے انہیں اپنے ساس سسر کی خدمت کے لیے چنا تھا، وہ معذور بچے کی دیکھ بھال میں لگ جاتیں تو انہیں کون دیکھتا۔ بے شک رب کے ہر کام میں مصلحت ہے۔ اسے قسمت کہیں یا ان کی آپس کی محبت کہ ابا کے انتقال کے بعد اماں پندرہ دن سے زیادہ نہ جی سکیں اور دونوں آگے پیچھے ہی دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کے انتقال پر خالدہ یوں ٹوٹ کر بکھریں گویا اپنے سگے ماں باپ فوت ہوئے ہوں۔ وہ ساس، سسر سے اسی درجے کی محبت کرنے لگی تھیں۔ نندیں روز آتیں اور خالدہ روز ان کے آگے یوں روتیں کہ انہیں اپنا غم ہلکا لگنے لگتا۔ وہ الٹا خالدہ کو تسلیاں دینے لگتیں، وہ رو رو کر بس یہی کہتیں۔

''اتنا دکھ تو مجھے اپنے سگے والدین کی وفات پر نہیں ہوا تھا، اپنے مردہ بچے کی پیدائش پر نہیں ہوا تھا جتنا ان کی وفات پر ہو رہا ہے۔ ایسے کہ مجھے جینا مشکل لگنے لگا ہے۔ اپنے سگے والدین اور اپنی سگی اولاد سے زیادہ قریب ترین اور خوب صورت ترین وقت میں نے اپنے ساس، سسر کے ساتھ گزارا۔ ان کے بغیر تو مجھ سے اس گھر میں رہا ہی نہیں جا رہا۔ ان کے جانے کے بعد تو میرے پاس کرنے کو کوئی کام ہی نہیں رہا۔ میں سارا، سارا دن ان کے پلنگ کی پائنتی پر بیٹھی ان کی صدا کے انتظار میں گزار دیتی ہوں کہ اب آواز آئے گی......

خالدہ پانی پلا دو، خالدہ کھانا کھلا دو، خالدہ ٹی وی لگا دو، خالدہ اخبار سنا دو، خالدہ چادر اوڑھا دو۔ میں بیٹھے، بیٹھے پورا دن گزار دیتی ہوں پر اس گھر کی خاموشی نہیں ٹوٹتی، ویرانی نہیں جاتی۔ میں کیا کروں؟ کیا کروں اب اس گھر میں۔'' وہ بولتی جاتیں اور روتی جاتیں۔ دنیا منہ میں انگلی دابے دیکھے جاتی، یہ کیسی بہو ہے۔

پھر وہ اس قدر مضمحل ہوگئیں کہ انہیں ڈپریشن کے دورے پڑنے لگے۔ عارف احمد نے ان کا نفسیاتی علاج شروع کروایا تو ان کی حالت میں بہتری آنے لگی مگر وہ چند ماہ ان کے لیے کٹھن ترین ثابت ہوئے۔ حدید پندرہ اور منال بارہ برس کی تھی، دونوں ہی عمر کے اس دور میں تھے جب بچہ جسمانی اور نفسیاتی تغیرات سے نبرد آزما ہوتا ہے اور ایسے میں بچوں کو ماں، باپ کی زیادہ توجہ اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عارف احمد کو ان باتوں کی بے حد فکر تھی اسی لیے انہوں نے دفتر سے پندرہ دن کی چھٹی لے کر خالدہ کے علاج پر خصوصی توجہ دی اور بچوں کے مسائل انہیں بتا کر انہیں مصروف کرنے کی اپنی سی کوشش بھی کرنے لگے۔ ان کی محنت رنگ لائی اور وہ نارمل ہونے لگیں۔ عرصے بعد کچھ جیب کھینچ کر اور کچھ قرضہ اٹھا کر انہوں نے سیر کا ارادہ بنایا اور خالدہ اور بچوں کو لے کر گلیات کی طرف روانہ ہوگئے۔

قدرت کے حسین نظارے ایسا ٹانک ہیں کہ انسان اپنے غم بھولنے لگتا ہے۔ خالدہ کی ذہنی حالت بھی بتدریج بہتر ہونے لگی اور پندرہ دن بعد جب عارف احمد دوبارہ دفتر جانے لگے تو ان کا ذہن کسی بھی قسم کی پریشانی سے آزاد تھا۔ خالدہ بیگم نے معمول کے مطابق ان کے ساتھ خوشگوار ماحول میں ناشتا کیا اور مسکرا کر انہیں اور بچوں کو رخصت کیا۔ وقت بڑا مرہم ہے، ان کے زخم بھی بھرنے لگے، حدید کے میٹرک بورڈ کے امتحانات شروع ہوئے تو وہ سب بھلا کر اس کی پڑھائی کا ساتھ مصروف ہوگئیں۔ عارف احمد اس کی سکون اور دھیان رکھتے اور خالدہ اس کے آرام، سے گزر خوراک کا۔ میٹرک کے امتحانات اچھے طریقے سے گزر گئے اور چند روز آرام کرنے کے بعد عارف احمد نے حدید کو کمپیوٹر کورس میں داخلہ دلوا دیا۔ وہ فارغ بیٹھنا

اور وقت ضائع کرنا نہ خود پسند کرتے تھے نہ بچوں کو ایسا کرنے دیتے تھے۔

محنت رنگ لائی اور حدید نے میٹرک میں بھی ریکارڈ توڑ نمبروں سے پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ان کے گھر نے نئے سرے سے خوشیوں کے رنگ دیکھے۔ وہ ماحول جو اماں ابا کے بعد بوجھل ہو چلا تھا وہ حدید کی کامیابی سے پھر سے کھل اٹھا۔ عارف احمد نے سب بہن بھائیوں کی دعوت کا اہتمام کیا اور سب اس کے لیے ڈھیروں تحائف لائے۔ تب اس نے عارف احمد سے ضد پکڑ لی کہ اسے ہر صورت موٹر سائیکل لینی ہے۔ پہلی مرتبہ اس کی کسی خواہش پر انہوں نے ٹھوس توجیہہ کے ساتھ انکار کر دیا۔

''دیکھیں بیٹا مجھے موٹر سائیکل دلانے پر کوئی اعتراض نہیں، اعتراض آپ کی عمر پر ہے، جب تک آپ اٹھارہ سال کے نہیں ہو جاتے اور آپ کا لائسنس نہیں بن جاتا تب تک میں موٹر سائیکل دلا کر دوسروں کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ آپ کسی اور چیز کی فرمائش کر سکتے ہیں، موٹر سائیکل آپ کو انٹر کے بعد دلا دوں گا یہ میرا وعدہ ہے۔''

حدید کا منہ بن گیا، اس نے عذر دینے شروع کر دیے۔

''ابا میرے سب دوستوں کے پاس پہلے سے موٹر سائیکل ہے ان کے ماں باپ کو تو کوئی اعتراض نہیں۔''

اس کے ادھورے شکوے میں ہزار سوالات پنہاں تھے۔ دوسرے والدین کی بے پروائی محتاط والدین کے لیے کتنی بڑی مصیبت بن جاتی ہے، کاش اس بات کا انہیں احساس ہو جائے جو اپنی جان چھڑانے کی غرض سے یا بے جا لاڈ پیار میں اپنی اولاد کے ساتھ، ساتھ دوسروں کی زندگیوں کو بھی مشکل میں ڈال دیتے ہیں۔

''سب کی اپنی، اپنی سوچ ہے بیٹا آپ جانتے ہیں میں اپنے اصولوں میں بہت سخت ہوں۔ آپ نے ریکارڈ کامیابی حاصل کی ہے آپ اس خواہش کے علاوہ کوئی اور چیز بتائیں میں بنا کسی اعتراض کے وہ چیز آپ کو دلا دوں گا۔''

تب بادلِ ناخواستہ حدید نے کمپیوٹر کی فرمائش کی جس پر وہ بلاتردد مان گئے۔

''ٹھیک ہے کمپیوٹر آگے جا کر آپ دونوں بہن بھائی کی ضرورت بھی بننے والا ہے، آپ کی پڑھائی میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ چند دن میں آپ کو بالکل نیا کمپیوٹر مل جائے گا۔'' انہوں نے یہ کہہ کر اسے گلے لگایا اور اس کا ماتھا چوما تو اس کے دل سے شکوہ دھل گیا۔ عارف احمد کو دل میں اتر جانے کا ہنر آتا تھا، وہ تو پھر ان کی اپنی اولاد تھا۔

ایک بار پھر وہی ہوا کہ اخبار والوں نے انٹرویو لیتے وقت عارف احمد کو نظر انداز کیا اور ایک بار پھر منال نے یہ بات بری طرح محسوس کی اور اس وقت اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ جب اس نے میٹرک میں حدید کا ریکارڈ توڑا اور ابا نے اس سے اس کی پسند کا انعام پوچھا تو اس کا جواب یکسر مختلف تھا۔ وہ اپنے باپ ہی کی طرح سب کا احساس کرنے والی بچی تھی تو پھر باپ کا احساس کیوں نہ کرتی۔

''جو میں مانگوں گی آپ دیں گے؟''

''بالکل میری جان، کیوں نہیں۔''

اس نے ایک لمحہ باپ کو گہری نظروں سے دیکھا پھر بولی۔

''تو ٹھیک ہے، میرا تحفہ یہ ہے کہ آپ مجھ سے وعدہ کریں اس بار اخباری نمائندوں کو پورا انٹرویو صرف آپ دیں گے۔''

وہ دنگ رہ گئے۔ اس کے دل میں یہ بات کتنے عرصے سے پل رہی تھی، اس بات پر خالدہ بیگم بھی چپ رہ گئیں۔

''ٹھیک ہے، پکا وعدہ'' کچھ سوچ کر وہ مسکرائے اور بولے ''اس بار میں خود انٹرویو دوں گا لیکن اگر انہوں نے مجھ سے سوال کرنا گوارا کیا تب۔ ویسے یہ کوئی انعام نہیں ہوا، آپ کوئی اور انعام بھی مانگیں۔''

وہ سرشاری ان سے لپٹ گئی۔

''ابا تحفہ پوچھ کر نہیں دیا جاتا، جو آپ اپنی مرضی

Digitized by Google

اور پسند سے دیں گے وہی مجھے قبول ہوگا۔ میری کوئی خاص خواہش نہیں۔"

عارف احمد محبت سے مسکرا دیے اور اس کا سر تھپتھپا کر بولے۔

"ہاں مگر اپنی اولاد کو تحفہ ان کی پسند اور مرضی سے ہی دیا جاتا ہے، اپنی پسند تو بتا دیں کہ مجھے کچھ آسانی ہو جائے۔ ایسے تو میری پریشانی بڑھ جائے گی کہ اپنی شہزادی کے لیے کیا تحفہ لوں اور آپ میری پریشانی میں اضافے کا باعث تو نہیں بننا چاہیں گی ناں۔"

اور بھلا منال ایسا کر سکتی تھی، سو جھٹ سے بول اٹھی۔

"ابا میرا دل کرتا ہے میری اپنی ذاتی لائبریری ہو، میں اپنے جیب خرچ سے کافی کتابیں لے چکی ہوں، آپ ایسا کریں میرے کمرے میں ایک پوری دیوار پر بک شیلف بنوا دیں تاکہ میری لائبریری کا آغاز ہو سکے اور ہاں، اس کا افتتاح بھی آپ ہی کریں گے۔"

وہ بھی قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

"دیکھا آپ نے خالدہ بیگم، میری لاڈو رانی نے کیسی پیاری فرمائش کی ہے، بالکل اپنے جیسی۔ بس تو پھر کل ہی آپ کی لائبریری کی تعمیر کا آغاز کرواتے ہیں۔"

خالدہ بیگم مسکرا کر دائیں بائیں سر ہلانے لگیں۔

"لاڈو رانی ہو یا لاڈلا راجا، آپ نے دونوں کو سر چڑھا رکھا ہے۔"

"ایسی بات کیوں کی آپ نے بھلا؟ کیا میرے لاڈ سے یہ لوگ بگڑ گئے ہیں؟" عارف احمد نے بھویں اچکا کر انہیں دیکھا۔

"ارے نہیں، اللہ نہ کرے ایسی تو کوئی بات نہیں۔" خالدہ بیگم گڑبڑا گئیں۔

وہ مسکرا کر پھر سے بیٹی کی طرف متوجہ ہوئے۔

"بس تو پھر۔ آپ ہمارے لاڈ کے بیچ میں نہ آیا کریں، جائیں منال بیٹی آپ جا کر اپنی دیوار کی پیمائش کر کے مجھے بتائیں تاکہ میں ترکھان کو بتا دوں۔"

منال خوشی، خوشی اٹھ کر اندر چلی گئی تو وہ بیوی کی طرف متوجہ ہوئے اور سنجیدگی سے بولے۔

"لاڈ تو بیگم صاحبہ ہم نے آپ کے بھی بہت اٹھائے اور بقول اماں مرحومہ کے، آپ کو سر چڑھا رکھا ہے، خود پر تو آپ کو کبھی اعتراض نہ ہوا۔ اب اولاد سے جلن کیوں۔"

خالدہ بیگم جھینپ گئیں۔

"حد کرتے ہیں آپ بھی، خدانخواستہ میں کیوں جلوں اپنی تابعدار اولاد سے، میں تو بس یہ کہنا چاہتی ہوں کہ خدا جانے آگے زندگی میں انہیں کتنی کٹھنائیاں جھیلنی پڑیں اور کیا خبر ان دونوں کے جیون ساتھی کس مزاج کے ہوں، ایسے میں پیار کے عادی ہمارے بچے مشکل میں پڑ جائیں گے، انہیں مشکلات کا عادی بھی بنائیں۔"

"ہم نے انہیں پیار، محبت سے ڈیل کر کے پیار، محبت ہی سکھایا ہے بیگم اور اسی محبت کو لے کر جب یہ دونوں عملی زندگی میں قدم رکھیں گے تو سب کو جیت لیں گے، انہیں نفرت اور منفی جذبات سے روشناس کروا کر کرنا ہی کیا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ "محبت فاتح عالم" سو انہیں محبت سے دنیا کو فتح کرنے دیں۔ جتنا مضبوط انہیں محبت بنا سکتی ہے اتنا نفرت نہیں بنا سکتی۔ آپ بس میری حکمتِ عملی پر بھروسا رکھیے۔"

شوہر کی اتنی مدلل بات پر خالدہ لاجواب ہو گئیں اور کیوں نہ ہوتیں، ان کی بات میں دم تھا۔ پھر وعدے کے مطابق عارف احمد اخباری نمائندوں کے سامنے منال اور خالدہ کے ساتھ بیٹھے مگر جب نمائندے نے ان سے سوال کیا کہ ان کا منال کی تعلیمی جدوجہد اور کامیابی میں کتنا ہاتھ ہے تو ان کے جواب کی متمنی منال ششدر رہ گئی۔ انہوں نے سارا کریڈٹ بیٹی کو دے دیا۔

"ہماری بیٹی ماشاء اللہ خود ہی اتنی قابل اور ذہین ہے کہ بچپن سے لے کر آج تک ہمیں اسے پڑھانے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسے کبھی کسی قسم کی رہنمائی کی ضرورت پڑی ہی نہیں۔ ابتدائی جماعتوں میں، میں نے ان کے ساتھ محنت کی لیکن اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں نے اپنے بچوں کا ایک ٹائم ٹیبل مقرر کر رکھا ہے جس پر یہ لوگ

خود پابندی سے عمل کرتے ہیں تبھی کامیاب رہتے ہیں۔"

سب طرف منال کے ابا کا چرچا ہو گیا تھا، ان کی محنت کا سہرا ان کے سر باندھ دیا گیا تھا، سب کچھ ویسا ہی ہوا تھا جیسا منال نے چاہا تھا لیکن وہ پھر بھی مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ اسے اب بھی لگ رہا تھا کہ انہوں نے اپنے بارے میں مکمل بات نہیں بتائی، وہ دانستہ خود کو منظرِ عام سے پیچھے رکھنا چاہتے تھے۔ ابا درحقیقت کیا تھے، وہ دنیا کو بتانا چاہتی تھی مگر ابا نے کسرِ نفسی سے کام لیا تھا۔ جیسا وہ اپنے باپ کے بارے میں سوچتی تھی ویسا کوئی اور تو نہیں سوچ سکتا تھا، اس کی کیفیات کو کوئی اس شدت سے نہیں سمجھ سکتا تھا جس شدت سے وہ سب اس کے دل میں موجزن تھا۔ اس نے تہیہ کیا کہ یہ کام اب وہ خود ہی کرے گی۔ اپنے ابا کی تمام تر محنتوں، مشقتوں اور خوبیوں کو دنیا کے سامنے لا کر انہیں بہترین انداز میں خراجِ تحسین پیش کرے گی کیونکہ اسے اپنے باپ سے عشق تھا، بے پناہ عشق۔

☆☆☆

اگلے چند دنوں میں منال کے کمرے کی ایک بڑی دیوار پر ایک بے حد خوب صورت بک شیلف بن گیا جس میں کئی سو کتابیں رکھنے کی گنجائش تھی۔ منال کے پاس بہ مشکل ساٹھ، ستر کتابیں تھیں جو اس نے کئی سال اپنا جیب خرچ بچا، بچا کر جمع کی تھیں۔ عارف احمد نے بک شیلف کے ساتھ، ساتھ اسے پچیس بہترین ادبی کتب کا تحفہ بھی دیا۔ پھر تو جیسے سب نے اس کی لائبریری کو مکمل کرنے کا تہیہ کر لیا۔ جو آتا منال کے لیے کتابیں لاتا، خاص طور پر اس کے تایا، تائی اور ان کے بچے تو ہر بار کوئی نہ کوئی کتاب ضرور لاتے۔ منال کی خوشی کا ٹھکانا نہ ہوتا اور اس کی لائبریری کو بھرتا دیکھ کر عارف احمد کو اپنا خون سیروں کے حساب سے بڑھتا ہوا محسوس ہوتا۔ یہی وہ دور تھا جب ان کتابوں کو پڑھتے، پڑھتے منال نے خود بھی لکھنا شروع کر دیا مگر اس بات سے منال کی گہری سہیلی فاریہ کے سوا کوئی بھی واقف نہ تھا۔

☆☆☆

عذرا آپی کے لیے

ہوا مسکرائی ہے
فضا گنگنائی ہے
عذرا رسول کے چمن میں آج
اک ننھی کلی مسکائی ہے
دیکھو زینب آئی ہے
خوش رہو بنتِ ذیشان
معراج رسول کا تم ہو نشان
پاکیزہ کے کنبے میں
خوشخبری یہ آئی ہے
دیکھو زینب آئی ہے
پیاری زینب جانِ جاں
ایک تمہارے آنے سے
دادا، دادی کے چہروں پر
کیسی رونق آئی ہے
دیکھو زینب آئی ہے
مما تمہاری ہیں شاداں
بابا بھی تو ہیں نازاں
عذرا آپی کے آنگن میں
بن کر رحمت آئی ہے
دیکھو زینب آئی ہے
دعا ہے میری اللہ سے
معراج رسول کو صحت دے
ان کو دادا کہنے کو
اک ننھی پری جو آئی ہے
دیکھو زینب آئی ہے
شمع تفسیر کا ہے یہ سماں
نزہت بھی تو ہیں فرحاں
پاکیزہ سنبھالنے کو
دادی کی ساتھی آئی ہے
دیکھو زینب آئی ہے

کاوش: شمع تفسیر، کراچی

Digitized by Google

حدید نے مکینیکل انجینئر بننے کے لیے سرکاری یونیورسٹی کے بجائے اس پرائیویٹ یونیورسٹی سے ڈگری لینے کی خواہش کا اظہار کیا جو پورے ملک کی مشہور ترین اور مہنگی ترین یونیورسٹی تھی۔ وہاں داخلہ لینا اگر حدید کا خواب تھا تو یونیورسٹی والے بھی اس جیسے غیر معمولی ذہانت رکھنے والے طالب علم کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ اس روز وہ رات کے کھانے کے برتن دھونے کے بعد باورچی خانہ صاف کر کے باہر نکلی تو اماں کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے ابا کو بولتے سنا۔

"میں سوچ رہا ہوں حدید کے داخلے کے لیے دفتر سے کچھ قرضہ لے لوں۔"

"کچھ قرضہ؟ لاکھوں روپے فیس ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کچھ قرضہ..... بجائے اولاد کو سمجھانے کے آپ خود کو قرض کے بوجھ تلے دبا رہے ہیں۔ اسے سمجھائیں کہ وہ اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے۔ مگر آپ، اس کی بیوقوفی میں اسی کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ہم نے اکیلے کو تو نہیں پڑھانا ناں، منال بھی ہے۔ سرکاری یونیورسٹی میں برائی کیا ہے آخر؟"

"دیکھیں خالدہ بیگم یہ نیا دور ہے، بچے کالج میں ہر طبقے کے طلبا کے ساتھ پڑھتے ہیں، اب کوئی عام سے نمبر لینے والا بچہ اس بہترین ادارے میں داخلہ لے اور حدید سرکاری یونیورسٹی چلا جائے تو وہ اس بات کو بہت محسوس کرے گا۔ سرکاری یونیورسٹی میں برائی کوئی نہیں ہے لیکن ہمارے معاشرے کا ذہن ہی کچھ ایسا بن گیا ہے کہ اس یونیورسٹی سے پڑھ کر نکلنے والوں کو اچھی بین الاقوامی کمپنیاں ہاتھوں ہاتھ لے لیتی ہیں، ہر جگہ انہی کا اسکوپ ہوتا ہے اور ایسے میں ہمارے سرکاری اداروں سے فارغ شدہ طلبا کوئی گھاس بھی نہیں ڈالتا۔ مستقبل کے حوالے سے سوچا جائے تو حدید کی خواہش بالکل بجا ہے۔ رہی بات منال کی تو وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہے اور بے شک اس کی پڑھائی بھی بہت مہنگی ہوگی مگر ڈاکٹری کے شعبے میں سرکاری اداروں سے ڈگری یافتہ ہونا زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ آگے اس کی اپنی قسمت۔ جب اس کا وقت آئے گا تب دیکھی جائے گی۔ اگر اس کی قسمت میں ڈاکٹر بننا لکھا ہوا تو اخراجات کا وسیلہ میرا رب خود بنا دے گا۔ یہ مسئلہ ہمارا نہیں۔ فی الحال میں حدید کی داخلہ فیس کے لیے دفتر سے قرضہ لے لیتا ہوں۔" عارف احمد پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھر کر بولے۔

"اور سیمسٹر کی فیسوں کا کیا ہوگا؟"

"اللہ وارث ہے۔"

"میں کچھ اپنا زیور بیچ دوں اگر۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ، ابھی میں زندہ ہوں، آپ نے سوچا بھی کیسے کہ میں آپ سے زیور لے کر اخراجات پورے کروں گا۔"

"ایک بات کہوں آپ سے اگر آپ برا نہ مانیں تو۔"

"ضرور....."

"یہ بچے جتنے آپ کے ہیں اتنے ہی میرے بھی ہیں۔ میں آپ کے نہیں اپنی اولاد کے اخراجات کے لیے مدد کرنے کا کہہ رہی ہوں۔ آپ مجھے پرایا کیوں کر رہے ہیں۔ ساری زندگی آپ نے بچوں کی ہر ذمے داری خود نبھائی، کیا یہ صرف آپ ہی کے بچے ہیں؟"

کمرے میں ایک لمحے کو مکمل خاموشی چھا گئی پھر عارف احمد بولے۔

"بخدا میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری محبت اور خلوص کو آپ اجنبیت سمجھیں گی۔ میں نے بچوں کا ہر ذمہ بچوں اور آپ کی محبت میں اٹھایا، میں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ بچے صرف میرے ہیں، اس لیے میں آپ کو ان کا کوئی کام نہ کرنے دوں۔ آپ اپنے دل سے یہ بات صاف کر دیں، مجھے بہت دکھ ہوا ہے کہ آپ میرے بارے میں ایسا سوچتی ہیں۔"

"مجھے بھی بہت دکھ ہوا ہے کہ آپ نے بچوں کے اخراجات کے معاملے میں میری مدد کو یوں رد کر دیا۔ میرا زیور سارا آپ ہی نے تو بنایا تھا اور اسے آپ ہی کی اولاد پر خرچ کرنے کی بات کی میں نے۔"

"بے شک وہ میرا مال تھا مگر وہ ملکیت اب آپ

کی ہے۔"

"میری ملکیت ہے ناں تو پھر میری مرضی میں جہاں چاہوں اسے خرچ کروں۔"

عارف احمد لاجواب ہو گئے۔

"میں اور آپ الگ نہیں، اسی طرح ہمارے مسائل بھی الگ نہیں۔ ہر چھ ماہ بعد ایک خطیر رقم سیمسٹر فیس کی مد میں ادا کرنا بالکل بھی ممکن نہیں۔ سمیرا اور صفیہ بھابی نے بھی اپنے زیور بیچ، بیچ کر بچوں کو پڑھایا ہے۔ اب چند سال میں وہ ان سے دُگنا کما کر لوٹا دیں گے۔ یہ زیور بھی تو اسی اولاد کا ہے ناں، ان کی شادیوں پر میں نے ان میں برابر تقسیم کر دینا تھا۔ تو تعلیم پر کیوں نہیں۔ شادی سے زیادہ اہم ان کی تعلیم ہے۔"

عارف احمد قائل ہو کر خاموش ہو گئے۔ منال بوجھل دل لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ماں باپ ان کی پڑھائیوں کے لیے کیا، کیا جتن کر رہے تھے، کیسے، کیسے پیٹ کاٹ کر پورا کر رہے تھے اور حدید کو احساس تک نہ تھا۔ اس نے سوچا وہ حدید سے بات کر کے اسے قائل کرنے کی کوشش کرے گی کہ وہ سرکاری یونیورسٹی میں داخلے پر آمادہ ہو جائے۔ اماں نے تو اسے سمجھانے کی اپنی سی کوشش کی تھی مگر ابا خاموش ہی رہے۔ اگلے روز منال نے حدید سے بات کی۔

"بھائی، کیا آپ کو اچھا لگے گا کہ اماں آپ کے داخلے اور پھر سیمسٹر کی فیسوں کے لیے ایک، ایک کر کے اپنا سارا زیور بیچ دیں۔ کیونکہ اس کے علاوہ تو اور کوئی ذریعہ نہیں ہے اماں ابا کے پاس۔ آپ سرکاری ادارے میں کیوں نہیں پڑھ لیتے۔"

حدید کچھ دیر سر جھکائے سوچتا رہا پھر ایک ٹھنڈی سانس خارج کر کے بولا۔

"دیکھو منال، تمہاری بات بالکل درست ہے، مجھے واقعی یہ سننا بھی اچھا نہیں لگا کہ اماں اپنا زیور بیچنے کا سوچ رہی ہیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ سرکاری تعلیمی اداروں کی بین الاقوامی کمپنیز کے سامنے اب کوئی اہمیت نہیں رہی اور ایسے اداروں سے فارغ التحصیل طلبا فارغ ہی رہ جاتے ہیں انہیں کہیں کوئی اچھی نوکری نہیں مل پاتی۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ میں اسکالرشپ حاصل کر سکوں۔ اس یونیورسٹی سے مجھے ایک چھوٹی سی اسکالرشپ تو فوری طور پر مل جائے گی جس سے میں اپنے روزمرہ کے اخراجات پورے کر سکوں گا، البتہ اگر پہلے سیمسٹر میں، میں نے غیر معمولی کارکردگی دکھا دی تو مجھے مکمل طور پر اسکالرشپ آفر ہو سکتی ہے۔ پھر اماں ابا پر ایک روپے کا بار بھی نہیں پڑے گا۔ میں بس وہی موقع حاصل کرنا چاہتا ہوں اور میرا پچھلا ریکارڈ یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ ان شاء اللہ میں آگے بھی کامیاب ہو جاؤں گا۔ تم بس دعا کرو کہ تمہارا بھائی جو سوچ رہا ہے وہ حاصل کر لے۔"

گو کہ حدید کی بات میں وزن تھا مگر ایک خلش منال کے دل میں پھر بھی تھی جس کا اظہار اس نے کر بھی دیا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی لیکن اگر آپ سرکاری یونیورسٹی میں داخلہ لیں تو آپ کو فوری طور پر ہائر ایجوکیشن کمیشن کی طرف سے اسکالرشپ مل سکتی ہے۔"

"منال تم سمجھ نہیں رہی ہو، انجینئرنگ فیلڈ میں جتنی آگے پرائیویٹ یونیورسٹیاں ہیں اتنی گورنمنٹ کی نہیں۔ تم فکر مت کرو، اماں کو اپنا سارا زیور نہیں بیچنا پڑے گا اور بالفرض ایسا ہوا بھی تو میں پارٹ ٹائم نوکری کر لوں گا اور ایک، ایک پائی لوٹا دوں گا، اماں کا احسان بھی بھولوں گا نہیں۔ میں وہ بیٹا نہیں جو ماں، باپ کے سارے اثاثے کھا کر سکون سے بیٹھ جائے۔ میں جانتا ہوں ہمارے اثاثوں پر تمہارا بھی برابر کا حق ہے اور میں کبھی تمہارا حق غصب نہیں کروں گا۔"

اس نے منال کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ تڑپ ہی گئی۔

"آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے کہ مجھے زیورات میں اپنے حصے کی فکر ہے بھائی۔ آپ کے اچھے مستقبل کے لیے میری ساری زندگی بھی قربان ہو جائے تو پروا نہیں۔ میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ اماں، ابا پر کوئی بوجھ نہ پڑے، نہ ابا کو دفتر سے قرضہ لینا پڑے نہ اماں کو زیور بیچنا پڑے، ہماری وجہ سے ان کی پیشانی پر کبھی بل تک نہ آئے۔"

Digitized by Google

"میں جانتا ہوں میری بہن بہت حساس ہے۔ تم فکر نہ کرو، میں بہت جلد کوئی نوکری کر کے ابا کے قرضے کی قسطیں ادا کر دوں گا۔ جس بات پر تم پریشان ہو رہی ہو، وہ سب میں بھی سوچتا ہوں اور میں نے اس کے لیے مکمل پلاننگ کر رکھی ہے۔" حدید محبت سے مسکرایا۔

اور پھر چند دن کی سوچ بچار کے بعد عارف احمد نے دفتر سے کچھ قرضہ اٹھایا اور حدید کا داخلہ کروا دیا۔ اسی لمحے منال نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے ڈاکٹر بننے کے شوق کو قربان کر کے سرکاری یونیورسٹی سے ایم اے کر لے گی تاکہ ابا کو کم سے کم اس کی طرف سے پریشان نہ ہونا پڑے۔ منال کو بعد میں پتا چلا کہ داخلے کی رقم کے ساتھ سمسٹر کی فیس اور سیکورٹی چارجز کے ساتھ، ساتھ کتابوں اور دیگر کئی ضروری اخراجات کے لیے مجموعی طور پر قرضے کی رقم ناکافی تھی اس لیے وہ کمی پوری کرنے کے لیے اماں کو اپنے زیورات میں سے ایک چھوٹا سیٹ بیچنا پڑا تھا۔ تب منال رہ نہ سکی اور ماں کے سامنے احتجاج کیا۔

"اماں آپ اپنا زیور کیوں بیچ رہی ہیں، کیا اس دن کے لیے آپ کے ابا نے یہ زیور آپ کو بنا کر دیا تھا؟"

خالدہ بیگم جو اس کی نئی سلی قمیصوں کے گلے اور دامن ترپائی کرنے بیٹھی ہوئی تھیں، سوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے ہنس پڑیں۔

"پہلی بات تو یہ کہ یہ زیور مجھے میرے نہیں بلکہ تمہارے ابا نے بنا کر دیا تھا۔ میرے ابا سے تو انہوں نے ایک تنکا تک نہیں لیا تھا۔ میں تو جن تین کپڑوں میں رخصت ہو کر اس گھر میں آئی تھی وہ بھی تمہارے ابا نے بھیجے تھے۔"

منال کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"کیا واقعی اماں؟ ایسا بھلا کب ہوتا ہے۔ مجھے ساری کہانی بتائیں، کیسے ہوئی تھی آپ اور ابا کی شادی؟ اور یہ جہیز نہ لینے کا خیال کس کا تھا؟ دادی نے کوئی اعتراض نہیں کیا؟ اتنا روشن خیال بھلا کون ہوتا ہے، کیسے ہوا تھا یہ سب؟"

"ارے سانس تو لے، لے لڑکی بتاتی ہوں۔"

وہ اس کے ایک ہی سانس میں سوالات کرنے پر ہنس پڑیں۔ منال ان کے قریب کھسک کر بیٹھ گئی تو پرانے وقت کو یاد کر کے ان کے چہرے پر ایک خوب صورت مسکان پھیل گئی جو اس بات کی شاہد تھی کہ ان کی یادیں کتنی سہانی تھیں۔ اس روز پہلی بار انہوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی اپنی بیٹی کو اپنی زندگی کے اس حسین ترین دور کی داستان سنائی جسے سن کر منال اپنے باپ کے عشق میں گوڈے گٹے ڈوب گئی۔ اولاد کی باپ سے محبت تو فطری بات ہے مگر باپ کی عظمت کی داستان سن کر منال تو یوں دنگ رہ گئی جیسے اماں اسے کسی شہزادے کی ماورائی داستان محبت سنا رہی ہوں۔ کتنی ہی دیر وہ اس داستان کے فسوں میں گم رہی پھر اچانک اسے یاد آیا کہ یہ کہانی شروع کس بات سے ہوئی تھی۔

"پر اماں..... پھر تو آپ کو یہ زیور بالکل نہیں بیچنا چاہیے، ابا نے اتنی چاہت سے آپ کے لیے بنوایا تھا۔ اسے تو سنبھال کر رکھتیں۔"

ترپائی مکمل ہو گئی تھی، انہوں نے دانتوں سے دھاگا کاٹا اور اسی خوب صورت مسکان کو چہرے پر سجائے بولیں۔

"تمہارے ابا اور میرے لیے تم دونوں اس زیور سے کہیں زیادہ قیمتی ہو، اس زیور سے زیادہ تم دونوں کی تعلیم کا زیور اہم ہے اور پھر زیور ہوتا کس لیے ہے بھلا؟ اسی طرح کسی آڑے وقت کے لیے ہی تو بنوایا جاتا ہے۔ آج یہ حدید کی تعلیم پر خرچ ہو گا تو وہ اس قابل ہو گا ناں کہ پیسہ کما کر ایسا زیور اپنی دلہن کے لیے بنوا سکے۔ وہ ہی کسی قابل نہ بن سکا تو یہ زیور میرے کس کام کا۔ اس کی پڑھائی اتنی مہنگی نہ ہوتی تو یہی زیور اس کی دلہن کے اور تمہارے کام آتا، دونوں صورتوں میں ہے تو یہ تم دونوں کا ہی۔ تو بس ایک حصہ تمہارے لیے رکھ کر حدید کا حصہ اس کی پڑھائی پر لگا رہے ہیں۔ جب نوکری کرنے لگے گا تو اپنی دلہن کے لیے زیور وہ خود بنا لے گا۔"

منال کو ان کی بات سے ہنوز اختلاف تھا مگر وہ خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

گھر والوں پر منال کے لکھنے لکھانے کا راز تب کھلا جب کالج میں تحریری مقابلہ ہوا اور سہیلی کے کہنے پر منال نے بھی ایک مختصر افسانہ لکھ کر جمع کروا دیا۔ نتیجہ آیا تو منال کی کہانی کو پہلا انعام ملا اور تقسیم انعامات کی تقریب میں کالج کی پرنسپل اور مقابلے کی منصفین پروفیسرز نے اس کے افسانے کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملا ڈالے۔ جب وہ انعامی کتب اور ازازی شیلڈ لیے گھر آئی تو خوشی سے عارف احمد اور خالدہ بیگم کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس کے بعد تو جیسے سلسلہ چل نکلا، منال کا قلم رکا نہ خیالات۔ عارف احمد نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور پھر اس کے لکھے افسانے، مضامین اور مقالے مختلف رسائل اور اخبارات کی زینت بننے لگے۔ اسے ادب سے لگاؤ تو تھا مگر باقاعدہ ایک لکھاری کی حیثیت سے اس شعبے میں قدم رکھنے کے بعد اس نے اسی شعبے کو مستقل طور پر اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ کم عمری سے اس نے ڈاکٹر بننے کا خواب دیکھا تھا مگر جب بھائی کے انجینئرنگ میں داخلہ لینے کی وجہ سے ابا پر بار پڑا تو منال نے اسی وقت سے اپنی خواہش کو دبا دیا تھا۔ پھر جب وہ باقاعدہ لکھاری بن گئی اور اس نے اس شعبے کے حوالے سے عزت اور شہرت کا مزہ چکھا تو فیصلہ بدلنا اور اس پر اماں ابا کو قائل کرنا مزید آسان ہو گیا اور اس نے پورے دل سے اردو ادب میں ایم اے کرنے کا فیصلہ کر کے اس خواہش کا اعلان بھی کر دیا۔ ابا کو دھچکا لگا، وہ اس کی کم عمری کی خواہش سے آگاہ تھے اور اس نئے فیصلے کے پس منظر کا بھی انہیں کچھ، کچھ اندازہ ہو رہا تھا مگر ان کے استفسار پر منال نے بے حد سلیقے سے ان کے خیال کو رد کر کے اپنا موقف بہت مضبوط لہجے کے ساتھ اس طرح سمجھایا کہ وہ مطمئن ہو گئے۔

"ابا میں ڈاکٹر ضرور بننا چاہتی تھی مگر جب سے لکھنا شروع کیا تب سے اردو ادب سے اس قدر لگاؤ پیدا ہو گیا کہ اب اس فیلڈ کو چھوڑنے کا سوچ کر بھی دل گھبراتا ہے۔ ڈاکٹری کی مشکل پڑھائی کے ساتھ میں یہ کام جاری نہیں رکھ سکوں گی اور اسے ترک کرنا بھی میرے لیے اب مشکل ہے۔ یہ شعبہ بھی اتنا ہی باعزت ہے جتنا مسیحائی کا شعبہ۔ میں طبی آلات کے بجائے قلم کی طاقت سے مسیحائی کا کام کروں گی اور یہ زیادہ مشکل کام ہے۔ آپ فکر نہ کریں میں نے یہ فیصلہ اپنے دل کی خوشی کو مدِنظر رکھتے ہوئے کیا ہے۔ ایک دن آئے گا جب آپ فخر سے میرا نام لے سکیں گے کہ مشہور قلم کار منال احمد میری بیٹی ہے۔"

اس نے اس انداز میں کہا کہ عارف احمد کھل کر ہنس دیے۔

"اور ہاں ابا، ایک بات اور..... یہ مت سمجھیے گا کہ آپ سستے میں چھوٹ گئے، اردو ادب میں ایم اے کے بعد میں انگریزی ادب میں بھی ایم اے کروں گی۔ اس کے بعد نفسیات میں اور پھر۔"

"ارے، ارے، ارے بس، بس بھئی کیا ساری زندگی پڑھتی ہی رہو گی کیا شادی نہیں کرو گی، اللہ معاف کرے عارف صاحب آپ تو اچھی شہ دیے جا رہے ہیں بیٹی کو۔"

ایسی بات کرنے والی بھلا خالدہ بیگم کے سوا کون ہو سکتی تھیں۔ منال ان کی بات پر منہ کے زاویے بگاڑتی کمرے سے نکل گئی اور عارف احمد بیوی کو گھورنے لگے تو وہ بھی گڑبڑا کر سامنے پھیلے دھلے کپڑے سمیٹنے لگیں۔

☆☆☆

منال کے کالج اور حدید کے یونیورسٹی جانے کے وقت سے ہی عارف احمد نے ایک جز وقتی نوکری شروع کر دی تھی لیکن جب منال بھی یونیورسٹی جانے لگی تو عارف احمد گویا مشین بن کر رہ گئے۔ علی الصباح جاگ کر انہوں نے شام کے اسکول میں پڑھنے والے بچوں کے لیے ٹیوشن سینٹر کا آغاز کر دیا، صبح چھ سے آٹھ بجے تک ٹیوشن پڑھانے کے بعد وہ ناشتا کر کے دفتر چلے جاتے۔

Digitized by Google

پانچ بجے دفتر سے آ کر معمول کے مطابق ایک گھنٹا منال بیوی، بچوں کو وقت دیتے اور پھر چائے پی کر چھ بجے شام کی نوکری پر چلے جاتے۔ دس بجے وہاں سے لوٹتے تو کھانا گھر والوں کے ساتھ کھاتے پورے دن کی روداد سنتے اور کچھ اپنی سناتے۔ منال ہمیشہ سوچتی۔

"ابا نہ جانے آرام کب کرتے ہیں۔"

حدید نے البتہ اس بارے میں نہ کبھی اپنی رائے کا اظہار کیا نہ کوئی سوال کیا۔ منال کو اپنے لکھنے کا اعزازیہ بھی ملنے لگا جو اس کے ذاتی اخراجات کے لیے کافی تھا لیکن پھر بھی باپ کا بوجھ بانٹنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کے طور پر اس نے ان کے ٹیوشن سینٹر کو باقاعدہ اکیڈمی میں تبدیل کرنے کی ٹھان لی۔ صبح اس کی کلاس دیر سے شروع ہوتی تھی اس لیے اس نے ابا کے ساتھ مل کر پڑھانے کی خواہش کا اظہار کیا جس کی انہوں نے شدید مخالفت کی۔

"منال کمانا میری ذمے داری ہے اور میں یہ ذمے داری آخری سانس تک نبھاؤں گا مگر تم لوگوں کی تعلیم کا حرج نہیں ہونے دوں گا۔"

منال خاموش نگاہوں سے چند لمحے انہیں دیکھتی رہی پھر آہستگی سے بولی۔

"ابا مجھے آپ سے ایک گلہ ہے۔"

ان کی بات کے جواب میں یہ شکوہ ان کے لیے کسی جھٹکے سے کم نہیں تھا کہ اتنی محنت کے بعد بھی ان کی اولاد کو ان سے کوئی شکایت ہو سکتی تھی۔

"کیسا گلہ؟" وہ بولے تو ایسے کہ ان کی آواز ایک سرگوشی کی طرح بمشکل حلق سے برآمد ہوئی۔

"آپ نے ہماری بہترین تربیت کی، ہمیں سب کچھ سکھایا، ہماری ہر خواہش پوری کی مگر۔" انہیں لگا ان کی سانس تنگی سے چل رہی ہے۔

"مگر۔"

"مگر آپ نے ہمیں اپنے جیسا بننا نہیں سکھایا۔"

سانس قدرے بحال ہوئی۔

"اپنے جیسا..... کیا مطلب؟"

"اپنے جیسا محنت کش، مضبوط اور سخت جان۔ زندگی کتنی بے رحم ہے ابا، یہ صرف آپ جانتے ہیں اور اس زندگی کی بے رحمی سے لڑنا آپ نے ہمیں نہیں سکھایا، آپ نے ہمیں صرف اس زندگی کا حسین چہرہ دکھایا اور کریہہ رخ ہمیشہ اپنی طرف موڑے رکھا۔ ہم نے بھی زندگی جینی ہے ابا! اسے اس کی تمام تر سختیوں اور بے رحمیوں کے ساتھ کیسے جیا جاتا ہے یہ آپ ہمیں بھی سکھائیں۔ یہ چیز ہماری تربیت کا لازمی حصہ ہونی چاہیے تھی۔"

ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ ان کی ننھی سی منال اتنی بڑی کب ہوئی انہیں پتا ہی نہ چلا، ان کی مشکلات کا احساس کب سے کرنے لگی انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔ ایسا احساس تو کبھی ان کی اپنی شریک حیات نے بھی نہ کیا تھا مگر اس کے لیے وہ خالدہ کو قصوروار نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے شریک حیات کو ہمیشہ دنیا کے سرد و گرم سے بچانے کے لیے اپنے پروں کے نیچے چھپائے رکھا تو بھلا وہ کیسے اس نہج پر سوچتیں۔ بیٹی کی حساس طبیعت نے ان کا دل جیت لیا۔ انہوں نے بے اختیار اسے گلے لگا کر ماتھا چوما اور جب بولے تو ان کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

"ہاں میں نے آپ کو زندگی کی بے رحمی اور معاشرے کا برا چہرہ کبھی نہیں دکھایا لیکن میں نے آپ دونوں کو بے لوث محبت کرنا سکھا دیا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز آپ لوگوں کے آگے بڑھتے رہنے کے لیے کافی ہے۔ آپ کو اجازت ہے آپ جو چاہیں کریں میری لاڈلی بیٹی۔ آپ میرا بازو بنیں گی تو مجھے خوشی ہوگی۔"

یوں اس نے اوپری منزل کے دو کمرے سامان سے خالی کروا کر فالتو سامان بکوایا اور باقی اسٹور میں سیٹ کر کے ان دو کمروں کو اکیڈمی کی شکل دے دی۔ ایک کمرے میں وہ پڑھاتی دوسرے میں ابا۔ شام کے اوقات میں ابا دوسری نوکری پر جاتے، اس نے شام کے دو گھنٹے کالج کی لڑکیوں کے لیے مختص کر دیے تو طالبات میں اضافہ ہونے لگا۔ عزیز و اقارب ہمیشہ ہی کہتے کہ خالدہ بیگم نے بچوں کی خوب تربیت کی ہے۔

چونکہ بچوں کے بڑے ہونے کے ساتھ، ساتھ تینوں بھائی باری، باری الگ ہوتے گئے تھے اس لیے سب لوگ عارف احمد کی ذمے دار طبیعت سے واقف ہونے کے باوجود اس بات سے انجان ہی رہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا سہرا عارف احمد کے سر جاتا ہے۔ چونکہ یہ ایک عمومی رویہ ہے کہ مرد اولاد کے اخراجات کے علاوہ ہر بات سے بری الذمہ اور بے خبر رہتے ہیں اور ہر گھر میں مائیں ہی بچوں کی تعلیم و تربیت کا مکمل بیڑا اٹھاتی ہیں اسی لیے خالدہ کی بات پر کوئی یقین ہی نہ کرتا اور سب یہی کہتے۔

"باپ جتنا بھی کر لے تربیت اس کے بس کا کام نہیں۔ یہ معرکہ ماں ہی سر کر سکتی ہے۔ عارف احمد نے بھی بچوں کی تربیت میں کردار ادا کیا ہوگا مگر اصل کام تو ماں ہی کرتی ہے، بھلا بتاؤ باپ سارا دن گھر پر ہوتا ہی کب ہے، سارا دن تو بچوں کو ماں ہی سنبھالتی ہے۔"

خالدہ مسکرا دیتیں مگر یہ نہ کہہ پاتیں کہ عارف احمد نے بچوں کی پرورش اور تربیت کے ابتدائی سال نوکری کے آٹھ گھنٹوں کے سوا تمام وقت گھر پر ہی گزارہ اور ان چند سالوں میں ہی بچوں کو ایسا بنا دیا کہ وہ ان کے لیے کبھی مسئلہ بنے ہی نہیں۔ انہوں نے ابتدائی عمر میں ہی بچوں کی کچھ ایسی تربیت کی کہ بعد میں وہ مصروف بھی ہوئے تو خالدہ بیگم پر کوئی بوجھ نہ پڑا، انہیں کبھی بچوں کو بٹھا کر کچھ سمجھانا نہیں پڑا۔ کچھ عارف احمد کا کمال اور باقی اللہ کا کرم کہ حدید اور منال دونوں ہی بے حد ذہین بچے تھے سو انہیں کوئی بھی بات سمجھانا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوتا تھا۔ جو بھی تھا، خالدہ بیگم کو اپنی محنت اور قربانیوں کی تعریف سننے کا مزہ خوب آتا۔ انہیں اچھا لگتا جب ہر سال بچوں کی غیر معمولی کامیابیوں پر ان کے اسکول کالج میں ایک ماں کی حیثیت سے انہیں بے تحاشا عزت دی جاتی، ان کی بچوں پر کی گئی محنت کو سراہا جاتا اور ہر جگہ ان کا سر فخر سے بلند ہوتا۔ کامیابی، شہرت اور تعریف کا نشہ ہوتا ہی ایسا ہے۔ بچوں کی غیر معمولی کامیابی پر ہر سال دونوں کے انٹرویو اخبارات میں شائع ہوتے اور ان کی ماں کو خراج تحسین پیش کرنے کے ساتھ، ساتھ ان کا بھی مختصر سا انٹرویو لیا جاتا۔ سب جگہ وہ ایک عظیم ماں کے طور پر جانی جاتیں جنہوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت دونوں پر جی جان سے محنت کی تھی۔ دونوں اپنے، اپنے تعلیمی اداروں میں اسٹار اسٹوڈنٹ کہلائے جاتے تھے۔

☆☆☆

حدید نے اپنا معیار برقرار رکھتے ہوئے یونیورسٹی کے پہلے سمسٹر میں بھی ریکارڈ نمبر حاصل کیے۔ حسب وعدہ ایک تقریب میں اسے اسکالرشپ سے نوازا گیا۔ اس تقریب تقسیم انعامات میں وہ سب گھر والے مدعو تھے۔ خالدہ بیگم کو اسٹیج پر بلا کر حدید کے برابر بٹھایا گیا اور ان سے خیالات کا اظہار بھی کروایا گیا، ان کے لیے مجمع نے تالیاں بھی بجائیں جبکہ ابا، منال کے ساتھ مہمانوں کے بیچ کرسی پر دیگر لوگوں کی طرح بیٹھے رہے۔ تب ایک بار پھر منال سے رہا نہیں گیا اور اس نے باپ سے سوال کر ڈالا۔

"ابا، ہمارے اہم مواقع پر آپ ہمیشہ پیچھے کیوں رہتے ہیں، اماں کے ساتھ آگے کیوں نہیں آتے؟ ہماری ترقی اور کامیابی میں سارا ہاتھ آپ کا ہے ابا...... اماں نے تو کبھی ہمیں کچھ نہیں پڑھایا نہ ہی وہ آپ جتنی قابل اور پڑھی لکھی ہیں۔ پھر یہ کارنامہ تو آپ کا ہوا ناں، اماں بھی کبھی آپ کو آگے نہیں کرتیں، ایسا کیوں ہے ابا؟ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ کیا آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ اپنے بچوں کی کامیابی کا کریڈٹ خود لیں کیونکہ اس کے اصل حقدار بھی آپ ہی ہیں۔"

"آپ کی اماں اور میں، الگ الگ ہیں کیا؟ اور آپ دونوں بچے ہم سے الگ ہیں کیا؟ ہم میں سے جو شخص بھی کوئی کامیابی حاصل کرتا ہے وہ سب کی کامیابی ہوتی ہے، میری یا تمہاری نہیں ہوتی۔ ہم چاروں ایک ہیں۔ جیسے آپ اور حدید کی تعریف ہم ماں باپ کو اپنی تعریف لگتی ہے، ٹھیک اسی طرح آپ کی اماں کی تعریف مجھے اپنی تعریف لگتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ

Digitized by Google

یہاں بھی تو اسٹیج پر آپ کی اماں کو ہی بلایا گیا ہے، مجھے بلایا جاتا تو میں جاتا ناں۔ اب خود سے بن بلائے اوپر جاتا اچھا لگتا کیا؟ بات کچھ آئی سمجھ میں یا نہیں؟" عارف احمد محبت سے مسکرا کر بولے۔

منال کے چہرے پر قائل نہ ہونے کے تاثرات خفگی کے تاثرات میں مدغم ہونے لگے۔ وہ نفی میں سر ہلا کر ضدی لہجے میں بولی۔

"مگر ہم پر کی گئی محنت تو ساری آپ کی ہے ناں۔ ٹھیک ہے اماں کی بھی برابر کی اہمیت ہے مگر جب انہیں پکارا جاتا ہے سراہا جاتا ہے تب آپ کو بھی ساتھ ہی پکارا اور سراہا جانا چاہیے۔ اگر ہم چاروں ایک ہیں تو ہمیں ہر کامیابی میں ایک ساتھ کھڑے نظر آنا چاہیے ناں، کوئی ایک آگے اور دوسرا پیچھے کیوں؟"

وہ پھر ہنس دیے۔

"ارے پگلی، یہ شکوہ تو تم جا کر اسٹیج سیکرٹری یا یونیورسٹی انتظامیہ سے کرو ناں، اس میں بھلا میرا یا خالدہ کا کیا قصور؟ ویسے بھی کیا حرج ہے، عورت تعریف کی زیادہ شوقین ہوتی ہے، مجھے نمایاں ہونے کی کوئی چاہ نہیں لیکن عورت میں نمایاں ہونے کی چاہ ہر چاہت پر حاوی ہوتی ہے۔ تمہاری اماں کو بھی اپنی تعریف و توصیف بہت بھاتی ہے، وہ مہینوں خوش رہتی ہیں اس ذرا سی تعریف پر اور اس خوشی کا پھل ہمیں ملتا ہے۔ تو بتاؤ سودا مہنگا تو نہیں ناں۔"

آخر میں شرارت سے بولتے ہوئے انہوں نے منال کے ہاتھ پر تالی ماری تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ تب عارف احمد کو لگا تھا کہ انہوں نے اسے بہلا لیا، بظاہر تھا بھی ایسا ہی، وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے اور معمول کے مطابق چہکنے لگی تھی مگر اندر، دل کے اندر دور بہت دور اس بات کی انی اب تک گڑی تھی۔ اپنے باپ کی خوبیوں کو دنیا کے سامنے لانا اب اس کا نصب العین بن گیا تھا۔ وہ دل سے چاہتی تھی کہ لوگ اس کے باپ کو جانیں اور سب باپ ایسے ہی بن جائیں جیسے عارف احمد تھے۔

☆☆☆

ایک روز حدید معمول کے مطابق شام کو اپنے دوستوں کی محفل میں جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب منال اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ بال سنوارتے حدید نے مسکرا کر آئینے میں اس کا عکس دیکھا اور مڑا۔

"منال تم...... خیریت تو ہے ناں؟ کیونکہ تم بنا خیریت کے میرے کمرے میں کم ہی آتی ہو۔"

وہ ہنس دی۔

"جی بھائی یہی سمجھیں کہ آج بھی خیریت نہیں ہے۔" وہ اتنا کہہ کر فرصت سے اس کے بستر پر بیٹھ گئی تو حدید کو احساس ہوا کہ بات کچھ خاص ہی ہے جو منال یوں وقت نکال کر خصوصی انداز سے اس کے پاس آئی۔

"یا اللہ خیر...... کہو کیا بات ہے؟"

چند لمحے وہ یونہی بستر کی چادر پر انگلی سے لکیریں بناتی رہی پھر پُرسوچ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

"بھائی، کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ابا دو، دو نوکریوں اور ٹیوشن کے بوجھ سے اب تھک رہے ہیں اور اب ہمیں ان کا بوجھ بانٹنا چاہیے؟ کیونکہ اب اس عمر میں جتنا انہیں آرام کی ضرورت ہے اتنا ہی وہ خود پر بوجھ بڑھائے جا رہے ہیں، صرف اس لیے کہ مہنگائی کے اس دور میں ان کی قلیل تنخواہ میں گزارہ مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ آپ نے کہا تھا آپ جلد پارٹ ٹائم جاب شروع کریں گے۔ کچھ سوچا آپ نے اس بارے میں؟"

حدید سوچ میں ڈوب گیا۔ دل ہی دل میں اسے شرمندگی کا بھی احساس ہوا کہ یہ بات اس نے کیوں نہیں سوچی جبکہ حالات و واقعات اس کے سامنے ہی تھے۔

"مجھے شرمندگی ہو رہی ہے منال، اصل میں مجھے باوجود کوشش کے ایسی کوئی جاب مل نہیں پائی جو میری پڑھائی کے اوقات کے ساتھ ایڈجسٹ ہو سکے۔ تم کتنی اچھی ہو سب کا احساس کرتی ہو۔ شاید میں اتنا اچھا بیٹا نہیں ہوں جتنی تم اچھی بیٹی ہونے کا ثبوت دیتی رہتی ہو۔ مگر یقین جانو میں ایسا جان بوجھ کر نہیں کرتا۔ مجھے ابا کا خیال ہے مگر شاید اتنا نہیں جتنا تمہیں ہے۔ تم بالکل

ٹھیک سوچ رہی ہو، میں تو بس یہی سوچتا رہا کہ میری پڑھائی کے اخراجات ان سے ہٹ گئے ہیں۔ اسکالرشپ سے میرا کام تو بن گیا ہے مگر باقی اخراجات تو اپنی جگہ پر ہیں، یہ میں نے نہیں سوچا اور پھر دفتر کا قرضہ بھی اب تک اترا نہیں۔ لیکن منال میں ان کی مدد کے لیے کیا کروں، تم ہی کوئی آئیڈیا دو۔"

منال مسکرادی۔ وہ جانتی تھی کہ حدید اس کی بات سمجھے گا کیونکہ وہ تھوڑا بے پروا ضرور تھا مگر بے حس ہرگز نہیں تھا۔

"میرے پاس آئیڈیا ہے تبھی تو آپ کے پاس آئی ہوں۔ بھائی آپ بھی ٹیوشن پڑھانا شروع کردیں۔ آپ کی ابھی اپنی پڑھائی چل رہی ہے مگر اپنے سے جونیئر سمسٹر کے طلبا کو تو آپ پڑھا ہی سکتے ہیں اور پری انجینئرنگ کے لڑکوں کو میتھس کی ٹیوشن بھی دے سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میتھس اور انجینئرنگ کے مضامین کی ٹیوشن اچھی خاصی مہنگی ہوتی ہے آپ چند گھنٹوں میں بھی اچھا خاصا کما سکتے ہیں۔ آپ کی مشکل پڑھائی کے ساتھ تو یہی ممکن ہے کہ آپ اکیڈمی کو وقت دیں، ویسے بھی ابا صبح کے اوقات میں پڑھاتے ہیں، شام کو ان کا کمرا خالی ہوتا ہے۔ آپ وہاں کلاس لے سکتے ہیں۔"

پھر دونوں نے مل کر ایک پوسٹر بنایا اور گھر کے باہر چسپاں کردیا۔ طلبا کی آمد کی رفتار سے انہیں لگا کہ بہت جلد انہیں یہ جگہ کم پڑ جائے گی۔ یوں حدید شام کے اوقات میں ابا والا کمرا سنبھالنے لگا اور کالج کے لڑکوں کی ٹیوشن کا بھی آغاز ہوگیا۔

☆☆☆

منال ایم اے اردو میں بھی اپنی ذہانت کے جھنڈے گاڑنے لگی۔ سرکاری یونیورسٹی کے اخراجات عملاً تو اتنے زیادہ نہیں ہوتے لیکن جو تھوڑے بہت خرچ ہوتے تھے وہ اپنی ٹیوشن کی کمائی اور اعزازیوں سے بخوبی چلا رہی تھی بلکہ خاطر خواہ بچت بھی کر لیتی تھی۔ پہلی بار جب عارف احمد نے اسے فیس کے پیسے دینے چاہے تو اس نے ان کی پیسوں والی ہتھیلی بند کر کے دبائی اور بولی۔

"آپ کی بیٹی کے پاس فیس کے پیسے ہیں ابا، میں کمائی اسی لیے کر رہی ہوں کہ اپنے اخراجات خود اٹھاؤں۔ آپ بے فکر ہو کر باقی اخراجات دیکھیں، آپ کی یہ بیٹی اب اپنے پیروں پر کھڑی ہو چکی ہے، اسے اپنا بوجھ خود اٹھانے کا سلیقہ سیکھنے دیں۔"

"یوں کہیں ناں کہ اب آپ کو ہماری ضرورت نہیں رہی، آپ خود مختار ہو گئی ہیں۔" عارف احمد اسے خفگی سے دیکھتے ہوئے بولے۔

منال کی آنکھیں حیرت اور دکھ سے پھیل گئیں۔

"ابا... ایسا سمجھتے ہیں آپ مجھے؟ ماں، باپ اپنی اولاد کا اے ٹی ایم کارڈ نہیں ہوتے کہ ہاتھ میں پیسہ آ جائے تو ان کی ضرورت ختم ہو جائے۔ ماں، باپ کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے ابا۔ ماں، باپ سایہ دار درخت ہوتے ہیں، جو پھل دینے کے قابل رہیں نہ رہیں، سایہ ہمیشہ دیتے رہتے ہیں اور ہر وقت پھل کی ضرورت ہوتی بھی نہیں، البتہ گھنا سایہ ہر وقت درکار ہوتا ہے۔"

"واہ، واہ...... ارے بھئی ہماری بیٹی ماشاء اللہ بڑی مشہور رائٹر ہے، اب تو اپنے الفاظ سے لاجواب کرے گی اپنے ماں باپ کو۔" عارف احمد کھل کر ہنسے تو وہ بھی مسکرادی۔

"یہ الفاظ سکھانے والے آپ ہی ہیں ابا، اللہ نہ کرے آپ کبھی میرے سامنے لاجواب ہوں، میں تو بس آپ کو قائل کرنا چاہتی ہوں اور وہ میں کر کے رہوں گی۔" وہ قطعیت سے بولی۔

"ہاہاہاہا، اسے کہتے ہیں الفاظ کا ہیر پھیر، لاجواب ہوں گا تو قائل ہوں گا ناں میری پیاری بیٹی اچھا چلیں، مان لیا، ہماری بیٹی اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی ہے، اب آپ اپنی فیس خود بھرا کریں گی تو ان پیسوں سے پھر میں ہر ماہ آپ کے لیے کچھ اچھی نایاب کتب خرید لیا کروں گا تاکہ آپ کی لائبریری میں اضافہ ہو۔"

منال ان کی اس بات پر خوشی سے اچھل ہی تو پڑی، البتہ خالدہ بیگم کے چہرے کے زاویے بگڑنے

Digitized by Google

لگے، وہ تنک کر بولیں۔

"حد کرتے ہیں آپ بھی، چلو ٹھیک ہے منال اپنا خرچ خود اٹھا رہی ہے اچھی بات ہے لیکن یہ جو پیسہ ہے اسے اس کے جہیز کے لیے بھی تو استعمال کیا جا سکتا ہے، اس بارے میں کچھ نہیں سوچا آپ نے، بیٹی جوان ہو گئی ہے، کل کلاں کو اسے بیاہنا ہے، سو انتظامات کرنے ہیں۔"

اس بات پر منال منہ بنا کر کمرے سے باہر نکل گئی جبکہ عارف احمد سنجیدہ صورت لیے بیوی کی طرف متوجہ ہوئے بولے۔

"مجھے اللہ پر توکل ہے کہ وہ میری بیٹی کو میرے جیسا ہم سفر عطا کرے گا جو اس سے جہیز کے نام پر ایک تنکا تک نہیں لے گا اور شان سے بیاہ کر لے جائے گا۔ اپنی شادی سے میں نے دور، دور تک کئی لوگوں میں مثال چھوڑی تھی، مجھے یقین ہے کہ کوئی تو میری پیروی کرتا مجھ سے آ ملے گا اور میری بیٹی کا رشتہ مانگے گا۔ اگر بھائی بہنوں نے ابا کے کہے کی لاج رکھی تو ہمیں فکر کی ضرورت ہی نہیں ہوگی، گھر کی گھر میں نمٹ جائے گی۔"

"اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟"

عورت تھیں ناں، خدشات سے پُر کیسے نہ ہوتیں۔

"میں یہ بات سوچتا ہی نہیں خالدہ بیگم، میں نے اللہ سے اپنی اولاد کے لیے ایسے ہی خاندان مانگے ہیں، وہ دے گا، میرا ایمان ہے۔" اتنا کہہ کر وہ اٹھ گئے۔ ہزار خدشات کے باوجود خالدہ بیگم کے چہرے پر پُرسکون مسکان پھیل گئی۔ اچھا ہم سفر بھی بڑی نعمت ہے۔

☆☆☆

یونیورسٹی کی سالانہ تقریب کے لیے اولاد کی تعلیم و تربیت میں ماں باپ کے کردار پر ڈراما تشکیل دینے کا منصوبہ منال کا تھا جس کی رائٹر اور ڈائریکٹر وہ خود تھی۔ ڈراما پوری یونیورسٹی میں بے حد مقبول ہوا اور اس پر منال کو اعزازی سند بھی ملی۔ انہی دنوں ملکی سطح پر ایک شارٹ فلم فیسٹول کا اعلان ہوا جو خاص طور پر طلبا و طالبات کے لیے منعقد کیا جا رہا تھا۔ منال کے پروفیسر نے اسے خیال دلایا کہ وہ اسی ڈرامے کے مرکزی آئیڈیا کو لے کر ایک شارٹ فلم تشکیل دے۔ منال کو ان کا آئیڈیا بہت پسند آیا اور یوں اس نے اس فلم پر کام شروع کر دیا۔ جو اس نے یونیورسٹی کی تقریب کے لیے لکھا تھا وہ اس کا ذاتی تجربہ اور سوچ تھی مگر فلم کے لیے اسے ایسے مزید کئی لوگوں کو تلاش کرنا تھا جو اس کے مرکزی خیال کو حقیقی تاثر دیں اور اسے محض ایک تخیل یا افسانوی مبالغہ گردان کر جھٹلایا نہ جا سکے۔ اس فلم کے لیے اسے بہت سا سرمایہ درکار تھا جس میں اس کی بچت کافی کام آئی اور کچھ ابا اور حدید نے اس کی مدد کی لیکن اس کی فلم کے مرکزی خیال سے سب لاعلم تھے۔ اس کام کے لیے دن رات اپنی نیند اور آرام تج کر جب اس نے جان توڑ محنت کی تب اسے صحیح معنوں میں ابا کے روز و شب کی مشقتوں کا ادراک ہوا۔ یہ فلم محض ایک مقابلے کی انٹری نہیں تھی، اس فلم سے اس کے جذبات جڑے تھے، وہ جذبات جن کا اظہار اس نے سب کے سامنے اسی فلم کے ذریعے کرنا تھا اور اس دن کا اسے شدت سے انتظار تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کوئی انعام جیت پائے گی یا نہیں لیکن اس کی ایک کلاس فیلو جس کے والد ایک ٹی وی چینل پر پروڈیوسر کی حیثیت سے کام کرتے تھے، اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس کی فلم انعام یافتہ نہ بھی ٹھہری تب بھی وہ اپنے والد سے کہہ کر اسے عوام کی نظروں تک پہنچانے کا کوئی نہ کوئی بندوبست ضرور کرے گی۔ دو ماہ کی ان تھک محنت کے بعد اس نے اپنی شارٹ فلم مقابلے کے لیے بھجوا دی جس کے نتائج کا اعلان ایک ماہ بعد متوقع تھا۔

☆☆☆

ہال میں رنگ و بو کا سیلاب برپا تھا۔ تقریب کا آغاز ہو چکا تھا، میڈیا کے تمام بڑے چینلز کے نمائندے کوریج کے لیے وہاں موجود تھے، کچھ ہی دیر میں شارٹ فلم کے نتائج کا اعلان ہو جانا تھا۔ تمام شرکا کی فلموں کی جھلکیاں اسکرین پر جھماکوں کی صورت چلائی جا رہی تھیں۔ سب کے دلوں کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں۔ مقابلے کے شرکا اور ان کے افرادِ خانہ کے لیے مخصوص

کرسیوں پر منال اپنے اماں اور ابا کے درمیان میں بیٹھی تھی۔ حدید بھی اماں کے برابر بیٹھا تھا اور تایا تائی اور پھپھو وغیرہ دوسرے حصے میں بیٹھے تھے۔ اسی وقت نتائج کا اعلان کرنے کے لیے میزبان نے مائیک تھاما تھا۔

"ساری دنیا میں ماں کی عظمت کے گُن گائے جاتے ہیں، ماں کی دعا اور ماں کے قدموں تلے جنت کی بات کی جاتی ہے، ہر بچہ ماں سے ہی زیادہ قربت رکھتا ہے، ماں بچوں کی تربیت کی تنہا ذمے دار کہلائی جاتی ہے، عظیم رہنما عظیم ماؤں کی گود سے نکلتے ہیں، ماں ہی اپنی اولاد کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیتی ہے ہر جگہ، ہر منظر نامے پر بس ماں حاوی رہتی ہے۔ ماں کی عظمت و اہمیت میں کوئی شک نہیں۔ لیکن اس سارے قصے میں باپ کہاں کھڑا ہے، دور بہت دور، ہر منظر کا پس منظر بنا، جس کا ان ساری کامیابیوں میں کہیں کوئی تذکرہ ہے نہ کردار۔ کیا باپ پیسہ کمانے کے سوا کچھ نہیں کرتا؟ کیا باپ صرف اولاد کا اے ٹی ایم کارڈ ہے؟ کیا باپ کا اولاد کی زندگی میں بس اتنا ہی کردار ہے کہ وہ انہیں پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے اور بس؟"

ہال میں مکمل خاموشی طاری تھی، سب لوگ جیسے ایک فسوں میں مقید، صرف میزبان کو سن رہے تھے جو انتہائی پراثر انداز میں بول رہی تھی۔ منال کے دل کی دھڑکن بری طرح بے ترتیب ہوئی۔ اس نے .... بے اختیار مٹھیاں بھینچ لیں اور کن اکھیوں سے ابا کو دیکھا، وہ بھی میزبان کو سن رہے تھے، اس نے بھی نظریں اسٹیج پر مرکوز کر دیں۔ میزبان کہہ رہی تھی۔

"بچہ اپنی کامیابی پر میڈل وصول کرتا ہے، اسے ماں کے نام کرتا ہے، باپ کہیں کسی کونے میں سر جھکائے کھڑا ہوتا ہے جس کا کسی کو خیال تک نہیں آتا۔ بیٹا پہلی تنخواہ وصول کرتا ہے تو ماں کے ہاتھ پر رکھتا ہے، باپ کے حوالے صرف ایک فخریہ مسکراہٹ۔ شادی کرتا ہے تو بیوی کو پہلا درس ماں کے احترام کا دیتا ہے اور بچوں کو ابتدا ہی سے ماں کی قربانیوں کی سناتا ہے۔ باپ کا تو نام تک کوئی نہیں لیتا۔ یہاں اس معاشرے میں جہاں عورت کو ہر بات پر مظلوم کہا جاتا ہے وہیں ایک ماں کی حیثیت سے اولاد کے ذریعے سب سے زیادہ عزت بھی یہی عورت حاصل کرتی ہے۔ ماں کی عظمت اپنی جگہ...... لیکن باپ کی اہمیت اور مقام پر کسی کو بات کرتے کم ہی سنا۔ ہمیشہ یہی سنا کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے، یہ کبھی نہیں سنا کہ باپ ناراض ہو تو بندہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پا سکتا۔ ہزاروں متنوع موضوعات پر بننے والی ایک سے ایک بہترین شارٹ فلمز ہمیں موصول ہوئیں مگر جسے پہلے انعام کا حقدار ٹھہرایا گیا وہ موضوع سب پر بازی لے گیا کیونکہ اس موضوع کو کبھی کسی نے اٹھایا ہی نہیں۔ یہ ون لائنر اسی فلم کا تھا۔"

ہال میں تالیاں گونج اٹھیں، میزبان ذرا کی ذرا رکی۔ عارف احمد کے چہرے پر ایک اداس مسکان اور آنکھوں میں نمی تھی۔ آخری جملوں پر منال کے دل کی دھڑکن بری طرح بے ترتیب ہوئی کیونکہ اپنی شارٹ فلم کا موضوع صرف وہی جانتی تھی، گھر میں اس نے کسی

نظم

میرے پیارو، میرے بچو
تمہیں جب میری یاد آئے، میری چاہت ستائے تو
ہاتھوں کو اٹھا لینا، ہونٹوں پر دعا رکھنا

میرے پیارو، میرے بچّوں
تمہیں جب میری یاد آئے، اور آنکھیں چھلک جائیں
خود کو تنہا نہ کر لینا، اک دوجے سے مل لینا

میرے بچّوں جگر گوشو
کبھی جب گھر میں آؤ تم، کہیں نہ مجھ کو پاؤ تم
جدائی درد بن جائے، درد حد سے گزر جائے
تو نانی سے لپٹ جانا، کسی خالہ کی بانہوں میں سمٹ جانا
انہی چہروں میں، میں ہوں گی
اسی خوشبو میں، میں ہوں گی

میرے پیارو، میرے بچّوں، میرے پیارو جگر گوشو

کاوش: ہما علی، اسلام آباد

Digitized by Google

سے بھی موضوع کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ تالیاں تمہیں تو میزبان مسکرائی اور بولی۔

"ہم انعامات کا اعلان کرنے کے ساتھ، ساتھ آپ کو فلم کی ویڈیو بھی دکھائیں گے۔ اس وقت ہم آپ کو پہلی انعام یافتہ شارٹ فلم دکھانے جارہے ہیں جس کا نام ہے "سایہ اور ثمر" جس کے خالق کا نام آپ کو بعد میں بتایا جائے گا..... دیکھیے۔"

منال کو لگا اس کی رگوں میں گردش کرتا خون یکلخت منجمد ہوگیا ہے۔ وہ ساکت سی بیٹھی سامنے دیکھ رہی تھی۔ ہال کی بتیاں مدھم ہوگئیں، اسکرین پر ایک شخص ایک چھوٹے سے بچے کو گود میں لیے نمودار ہوا۔ پھر اسے اس بچے کے ساتھ کھیلتا دکھایا گیا، اگلے منظر میں وہ اسے اسکول سے لاتا لے جاتا دکھائی دیا، دفتری اوقات میں بار، بار گھڑی دیکھتا اور پھر گھر واپسی پر بچے کو ہوم ورک کراتا دکھایا گیا۔ عارف احمد میکانکی انداز میں سیدھے ہو بیٹھے۔ منال نے دیکھا ان کی آنکھوں میں کوئی جذبہ تھا، کوئی خاص جذبہ جسے وہ کوئی نام نہیں دے پائی۔ یکا یک انہوں نے گردن موڑ کر منال کو دیکھا، وہ انہی کی طرف دیکھ رہی تھی، دونوں کی نظریں ملیں۔ ان کی نظروں میں سوال تھے اور منال کی نظروں میں بے پناہ عقیدت۔ وہ سمجھ گئے..... وہ سمجھ گئے کہ یہ فلم نہیں تھی، یہ تو اُن کی اپنی زندگی کی کہانی تھی، ان کی جدوجہد کی داستان تھی، جو اُن کی بیٹی کے قلم سے نکل کر اشکال میں ڈھلتی اسکرین پر چل رہی تھی۔ ایک فلم ان کی اپنی نظروں میں گھوم گئی۔ انہیں پتا ہی نہ چلا اس فرض کو نبھاتے کتنے ماہ و سال بیتے جسے منال قرض کی صورت دل میں جمع کرتی رہی اور وصولی کی رسید سامنے آگئی۔ ان کی بھری ہوئی آنکھیں بے اختیار چھلک پڑیں۔ اسکرین پر چلتے مناظر دھندلے پڑ گئے مگر انہیں یہ سب دیکھنے کی بھلا کیا ضرورت تھی، انہوں نے تو جیا تھا وہ ہر ایک پل، جو اب دنیا دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے بے اختیار ساتھ بیٹھی منال کا ہاتھ پکڑا اور اس پر ایک محبت بھرا بوسہ دیا۔ ان کے آنسو اس کی ہتھیلی کی پشت پر برسنے لگے۔ وہ دوسرے ہاتھ سے ان کے آنسو پونچھنے لگی۔ خالدہ بیگم اور حدید حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے، وہ نہیں جانتے تھے کہ ان دونوں میں سے کون اپنی محبتوں کا فرض نبھا رہا تھا اور کون اپنے ذمے کے قرض چکا رہا تھا۔

فلم ختم ہو چکی تھی، اسکرین تاریک ہوئی تو ہال کی بتیاں روشن ہوگئیں، منال اور عارف احمد چونکے، پورا ہال تالیوں کے شور سے گونج رہا تھا، لوگ بہ آواز بلند داد دے رہے تھے۔ کافی دیر تک تالیوں اور داد و تحسین کا شور نہ تھما تو میزبان کو ہاتھ کے اشارے سے درخواست کر کے سب کو خاموش کرانا پڑا۔

"اس شارٹ فلم کو ہمارے معزز ججز نے پہلے انعام کا حقدار ٹھہرایا ہے۔ اس کی خالق ہیں پنجاب یونیورسٹی کے اردو ڈپارٹمنٹ کی ہونہار طالبہ منال احمد۔ آپ سب کی پُرزور تالیوں میں ہم منال احمد کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دیتے ہیں۔"

منال لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ سرخ چہرہ لیے اٹھی اور عارف احمد کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے جیسے میکانکی انداز میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا اور وہ انہیں لیے اسٹیج کی طرف بڑھی۔ اس کا برسوں پرانا خواب پورا ہونے جارہا تھا۔ ہال ایک بار پھر زوردار تالیوں سے گونج رہا تھا۔ خالدہ بیگم، حدید اور گھر کے باقی افراد کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ عارف احمد، منال کے ساتھ جیسے گھسٹتے ہوئے جارہے تھے۔ اسٹیج پر پہنچ کر منال نے ان کا ہاتھ چھوڑا تو وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے اسٹیج کی دیوار سے جا لگے۔ منال انعام، میڈل اور داد وصول کر رہی تھی۔ ہال میں بے حد رونق تھی۔ ہر فرد کا چہرہ جگمگا رہا تھا، ہر طرف شور برپا تھا، سب کھلے پڑ رہے تھے۔ وہ بھی بہت خوش تھے، اتنے کہ انہیں خود بھی اپنی خوشی کا اندازہ نہیں تھا کیونکہ اس دن کا اپنی زندگی میں انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ منال فخر و انبساط سے لیریز چہرہ لیے جج اور دیگر اہم شخصیات کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ ان کی زندگی کی ایک

مسکان پر وہ ہزار جان سے قربان ہوتے تھے۔ اس کی کامیابی پر وہ خود کو ایک بلند مقام پر کھڑا محسوس کر رہے تھے۔ یکا یک ان کے دل میں پھیلی خوشی کی چادر پر افسردگی کی تہ چڑھنے لگی۔ وہ اس افسردگی کی وجہ جاننے سے قاصر تھے مگر اس کے زیر اثر وہ مضمحل سے ہو کر پیچھے ہٹنے لگے۔ پیچھے، ہٹتے، ہٹتے وہ بالکل دیوار سے جا لگے۔ ان کی طرف کسی کی نگاہ تھی نہ دھیان مگر یہ ان کا اپنا گمان تھا۔ وہ آنکھوں نے انہیں مسکراتے بھی دیکھا تھا اور پھر افسردہ ہو کر پیچھے ہٹتے بھی۔ وہ دو آنکھیں ملال سے بھر گئیں۔ بس یہی وہ لمحہ تھا جو اگر کھو جاتا تو اس کی زندگی کھو جاتی اور اسے یہ ہرگز گوارا نہ تھا کیونکہ اتنی ان تھک محنت اس نے اسی دن کے لیے تو کی تھی۔ ایک فیصلہ کر کے اس نے قدم آگے بڑھائے اور سب کی نظریں اس پر مرکوز ہوگئیں۔ اس نے باپ کا ہاتھ تھاما اور ڈائس کی طرف بڑھنے لگی کیونکہ اسے اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کے لیے پکارا جارہا تھا۔ مائیک کے آگے کھڑی ہو کر بھی اس نے باپ کا ہاتھ نہ چھوڑا۔

"ہال میں موجود تمام لوگوں کو منال احمد کی طرف سے السلام علیکم۔"

لوگوں نے زوردار آواز کے ساتھ اس کے سلام کا جواب دیا۔ وہ مسکرائی اور پھر بولی۔

"میری شارٹ فلم کے موضوع اور اس کی کامیابی کا سارا کریڈٹ میرے ابا کو جاتا ہے۔ میرے ابا، عارف احمد، میرا آئیڈیل، جن کی قربانیاں اور ان تھک محنتیں میں بچپن سے دیکھتی آرہی ہوں۔ ابا نے ہم پر کی گئی اپنی محنت کا کریڈٹ خود کبھی نہیں لیا مگر سچ تو یہ ہے کہ ان کی اسی عاجزی و انکساری نے مجھے اکسایا کہ میں اپنے ابا کے لیے کچھ ایسا کروں جو انہیں دنیا کے سامنے ایک مثال بنا کر پیش کرے۔ میرے ابا ایسے انسان ہیں کہ ان کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔ مجھے اس وقت بھی سمجھ نہیں آرہا کہ میں کن الفاظ میں ابا کا شکریہ ادا کروں۔ پہلا انعام لینے کے لیے جیوری کی میں بے حد شکر گزار ہوں لیکن آج جو میں اس مقام پر کھڑی ہوں اس کی وجہ صرف اور صرف میرے ابا ہیں۔ میں چاہوں گی کہ ابا یہاں اس ڈائس پر کھڑے ہو کر چند الفاظ آپ سب سے کہیں، آئیں ابا۔"

اس نے ڈائس سے ہٹ کر انہیں آگے کیا۔ عارف احمد کی اشکوں بھری آنکھیں چھلک پڑیں۔ انہوں نے آنسو صاف کیے اور مائیک تھاما۔

"میرے پاس اپنی بیٹی جیسے خوب صورت الفاظ و احساسات بالکل نہیں ہیں۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ منال، میری پیاری بیٹی، آپ میری جیت ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ ڈائس سے ہٹ گئے۔ ہال میں تالیوں کی گونج بہت دیر تک جاری رہی۔

☆☆☆

بزرگ راہی عدم سدھار چکے تھے، اولادیں اب بزرگ تھیں اور وہ جو کل بچے تھے، اب شادیوں کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ گھر کے سب سے بڑے بزرگ کی حیثیت سے شجاع حیدر اور سعید صالح نے سب بڑوں کے ساتھ مل کر بڑے ابا کی خواہش پوری کرتے ہوئے سب بچوں کے رشتے آپس میں طے کر دیے تاکہ لڑکوں کے والدین دلہنوں کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ یوں عارف احمد اور خالدہ کے حدید اور منال کا بھی رشتہ تایا اور پھوپی کے ہاں ہوگیا۔

☆☆☆

"کون کہتا ہے کہ اکیلا شخص کچھ نہیں کر سکتا۔ میں جانتی ہوں اکیلا شخص اگر باہمت اور مضبوط ہو تو وہ پوری دنیا بدل سکتا ہے۔ مگر دنیا بدلنے سے پہلے ضروری ہے کہ سب سے پہلے انسان خود کو اندر سے بدلے، وہ بدلے گا تو اس کا اپنا گھرانا بدلے گا، وہ اپنی سوچ کے مطابق اپنی اولاد کی پرورش کرے گا، اس کی نسل بدلے گی، اس کی دیکھا دیکھی اس کے باقی گھر والے بدلیں گے اور وہ آگے اپنے، اپنے گھرانوں کو بدلیں گے۔ ایک، ایک گھرانا ہوتے، ہوتے پورا خاندان بدلے گا، کئی خاندان ملیں گے اور مل کر معاشرہ بنائیں گے یوں

Digitized by Google

معاشرے سے ایک شہر وجود میں آئے گا، شہر سے ملک، ملک سے دوسرا ملک اور پھر کون جانے پوری دنیا۔ یہ ایک بہت بڑا خواب ہے جسے سننے والے دیوانے کا خواب کہتے ہیں لیکن دیوانگی کا رخ اگر مثبت سمت ہو تو انقلابی تبدیلیاں آتی ہیں۔ بالکل ویسی جیسی میرے ابا عارف احمد اپنے خاندان میں لے کر آئے۔ کیا، کیا نہ سنا انہوں نے اس سفر میں کیا، کیا نہ جھیلا۔ لیکن وہ ہارے نہ پیچھے ہٹے، نہ کسی کو مجبور کیا نہ اصرار، بس وہ چلتے رہے، لوگ ملتے رہے اور قافلہ بنتا رہا۔ آج وہ اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کا بویا بیج کئی تناور درختوں میں تبدیل ہو چکا ہے جو ایک دن باغ ضرور بنے گا۔ کہتے ہیں باپ شجرِ سایہ دار کے مانند ہوتا ہے، اولاد کو مرتے دم تک چھایا دیتا ہے، لیکن میرے ابا ثمر بار شجر تھے، جنہوں نے اپنی اولاد کے ساتھ، ساتھ پورے خاندان کو نہ صرف سایہ دیا بلکہ ثمر بھی دیا۔ کسی بھی درخت کے سائے تلے مسافر ستا کر خالی ہاتھ آگے چل دیتا ہے لیکن میرے ابا ایسا شجر تھے جو اپنی چھاؤں میں ستانے والے کو ثمر دے کر آگے بھیجتے تھے۔"

منال نے تحریر مکمل کر کے فائل بند کی اور قلم میز پر رکھ کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے دل میں اندر تک سکون سرایت کر گیا۔ اس نے انگلیوں پر حساب کبھی نہیں لگایا تھا مگر کئی برس بیت چکے تھے۔ وہ صفیہ تائی کی چھوٹی بہو اور شہود کی بیوی تھی مگر آج بھی اپنے باپ کی نسبت سے خود کو منال احمد لکھنے اور پکارے جانا پسند کرتی تھی۔ اب وہ ایک بہت بڑی رائٹر تھی، کئی کتابوں کی خالق..... مگر اس ایک کتاب کو لکھنا اس کا اولین خواب تھا۔ اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ اپنی کتابوں میں سے اس کی پسندیدہ ترین کتاب کون سی ہے تو وہ کہتی "سایہ اور ثمر" وہ ناول جو میں نے اب تک لکھا نہیں ہے مگر اسے لکھنا میرا خواب ہے اور اس کا موضوع میرا عشق۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ جب بھی لکھنے بیٹھتی، چند جملے لکھ کر اٹھ جاتی، اسے اپنے لفظ اتنے متاثر کن نہ لگتے جتنے وہ اس ناول میں شامل کرنا چاہتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ چند ماہ قبل عارف احمد کا انتقال ہو گیا۔ اس روز وہ ان کے پاس ہی تھی، ان کی طبیعت کچھ ناساز تھی وہ اس سے باتیں کرتے، کرتے سونے لیٹے تھے اور سوتے وقت جب انہوں نے کلمہ پڑھا تو منال خوف زدہ ہو گئی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائے اور اس سے اپنا سر اس کی گود میں رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے ان کا سر اپنی گود میں رکھا تو انہوں نے مسکرا کر آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر وہ انہیں دیکھتی رہی، اسے محسوس ہوا کہ وہ سو گئے ہیں۔ یکا یک ان کے وجود سے بے پناہ مسحور کن خوشبو پھوٹنے لگی۔ اسے عجیب سا احساس ہوا۔ خوشبو پورے کمرے میں پھیل گئی۔ اسی وقت خالدہ عشا پڑھ کر کمرے میں داخل ہوئیں تو چونک گئیں۔ انہیں کچھ عجیب سا غیر معمولی احساس ہوا تو وہ تیزی سے عارف احمد کے قریب آئیں اور ان کے سینے پر سر رکھ دیا پھر جب سر اٹھایا تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ انہوں نے منال کو بتایا کہ عارف احمد خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں۔ منال اس وقت تو صدمے سے بے ہوش ہو گئی مگر جب اسے ہوش آیا تو ایک عجب طرح کے سکون نے اس کے وجود کا احاطہ کر لیا۔ اس نے خاموش آنسو بہائے، سب کو سنبھالا، سارے مراحل طے کروائے اور اپنے ابا کو رخصت کروا دیا۔ لوگوں نے کہا کہ عارف احمد کی میت اس قدر..... بے وزن تھی کہ راستے میں لوگوں نے ایک بار چارپائی رکھ کر یقین دہانی کی کہ کہیں چارپائی خالی تو نہیں۔ لوگ ان کی مثالیں دے رہے تھے۔

ان کے جانے کے بعد منال کے اندر اچانک تحریک اٹھی اور وہ مسودہ نکال کر لکھنے بیٹھ گئی۔ بالآخر تین ماہ کی ان تھک محنت سے وہ ناول مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اگلی صبح اس نے یہ مسودہ پبلشر کو بھیجنا تھا اور ٹھیک دو ماہ بعد اس کتاب کی تقریبِ رونمائی ہونی تھی۔ آج اس کے قلم کا حق ادا ہو گیا تھا۔ ایک بیٹی کے باپ سے عشق کا حق ادا ہو گیا تھا۔

ختم شد

"عیرہ، شادی کی تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں؟" میری بیسٹ فرینڈ، سمیرا نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"سنو تم نے شادی کے بعد کی پلاننگ بھی کی ہے یا نہیں؟" سمیرا کی بات پر میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میری حیرت بھانپ کر وہ بے پروائی سے بولی۔

"یار..... میرا مطلب ہے شادی کے بعد بچوں کی لائن نہ لگا دینا بلکہ سال دو سال اپنی زندگی آزاد گزارنا، انجوائے کرنا..... بلاوجہ بچوں کی فوج ہوتی جائے اور بھی جانے وہ کیا، کیا کہتی رہی۔

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے بہ مشکل اپنا غصہ ضبط کیا، دل چاہ رہا تھا کہ گرامر کی موٹی سی کتاب جو اس وقت میرے ہاتھ میں تھی اٹھا کر اس کے سر پر دے ماروں۔

"میری بات سنو سمیرا ملک....." میں نے دانت پر دانت جماتے ہوئے کہا۔

"تم اپنے دماغ میں سے یہ خناس نکال دو تو بہتر ہے کیونکہ ایک ماہ بعد تم نے بھی ڈولی چڑھنا ہے۔ شادی کے بعد انسان کی زندگی بہت بدل جاتی ہے، خاص طور پر لڑکی کی۔ رہی بات اولاد کے لائن لگانے کی تو میں مانتی ہوں اس بات کا اختیار کسی حد تک ہمارے پاس ہے مگر بڑا خود مختار اوپر بیٹھا ہے۔ بچوں کی لائن لگے گی یا کس حساب کتاب سے بچے ہوں گے اس کا فیصلہ کرنے والے میں یا تم کون ہوتے ہیں لہٰذا ایسی باتیں کر کے اللہ کے غضب کو مت پکارو....." اسی اثنا میں باہر گیٹ کی گھنٹی بجی تو میں دروازہ کھولنے چلی گئی۔ دروازے پر سمیرا کا بھائی تھا جو اسے لینے آیا تھا۔ میں نے اسے آگر بتایا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور خدا حافظ کہہ کر اپنے بھائی کے ہمراہ چلی گئی۔

قصہ یوں تھا کہ ایک ہفتے بعد میری شادی تھی اور میں نے سمیرا کو جو میری پڑوسن اور دوست بھی تھی بلایا تھا

سب مایا ہے

تحسین گل

Digitized by Google

ڈیلی لاہور ٹائمز اور نئی امید رائٹرز فورم کے اشتراک سے ایک تقریب بسلسلۂ تقسیم انعامات وایوارڈز منعقد ہوئی جس کی صدارت معروف رائٹرز شاعرہ اور نامور وکیل سعدیہ ہما شیخ نے کی۔ مہمانان خصوصی میں فارق حارث العباسی، الیاس مجید شیخ و دیگر معززین شہر بھی موجود تھے۔

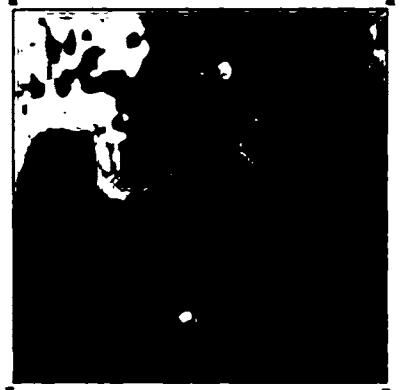

آئی سی سی پاکستان کی لیگل ایڈوائزر اور روزنامہ کشمیری ڈپٹی ایڈیٹر سعدیہ ہما شیخ ایڈووکیٹ ڈی ایس پی... غازی فاروق و حارث عسکری تجزیہ نگار سے ایوارڈ وصول کرتے ہوئے

تاکہ وہ میرا ہاتھ بٹا دے۔ ہاتھ تو اس نے بٹا دیا مگر میرے دل و دماغ میں انتشار پھیلا گئی۔ میں سر جھٹک کر بقیہ کاموں میں مصروف ہوگئی۔ گھر میں شادی کا خوشگوار ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ سمیرا ہر کام میں آگے، آگے تھی۔ کیونکہ میری بہنیں سب چھوٹی تھیں ایک آٹھویں میں تھی جبکہ دوسری پانچویں میں۔ بھائی ایک ہی تھا لہٰذا سمیرا نے دوستی کا حق ادا کردیا۔ شادی کی رسومات خیریت سے تمام ہوئیں میں بیاہ کر کراچی چلی گئی اور شادی کے ایک ہفتے بعد میں اور میرے میاں منان عمرہ پر چلے گئے۔ وہاں سے واپسی کے بعد ہم تقریباً ایک ماہ بعد گھر آئے کیونکہ دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ اسی اثنا میں سمیرا کی شادی ہوگئی۔ میں ملک میں نہ ہونے کی وجہ سے اس میں شرکت نہ کرسکی تھی۔

منان بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ اللہ نے جلد ہی میری گود بھر دی۔ شادی کے پہلے سال میرا بیٹا علی پیدا ہوا، چار برس کے بعد ابراہیم اور دو برس بعد فاطمہ..... زندگی خوشیوں سے معمور تھی۔ سمیرا سے میرا رابطہ قائم تھا۔ اس کے ہاں شادی کے کئی سال بعد اولاد ہوئی اور اب اس کے دو ہی بچے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی..... میری جب بھی فون پر اس سے بات ہوتی تو ایک ہی بات کہتی.....

''دیکھا اگادی ناں بچوں کی لائن، مجھے کہتی تھی کہ بچوں کی لائن نہ لگانا مجھے دیکھ شادی کے چار برس بعد اولاد ہوئی اور وہ بھی صرف دو..... حالانکہ میری ساس کو بڑا ارمان تھا کہ ان کے اکلوتے بچے کے ڈھیر سارے بچے ہوں مگر میں نے الطاف سے صاف، صاف کہہ دیا تھا کہ بس بچے دو ہی اچھے کم نہ زیادہ..... دیکھا دو ہیں اور دو ہی رہیں گے۔'' میں اس کی باتیں سن کر کبھی ہنس دیتی کبھی اسے ڈانٹ دیتی مگر وہ اپنے مؤقف پر قائم تھی۔

☆☆☆

دس برس گزر گئے، اسی اثنا میں سمیرا ملک سے باہر چلی گئی۔ اب میرا اس سے فون پر کبھی کبھار رابطہ ہوتا تھا۔ کبھی، کبھی میرے دل میں خیال آتا کہ شاید سمیرا ٹھیک ہی کہتی تھی، بچے دو ہی اچھے، اس مہنگائی کے زمانے میں اولاد کی پرورش، تعلیم، بڑے جان جوکھوں کا کام تھا۔ کبھی سوچتی کاش میں نے بھی سمیرا والی پالیسی اپنائی ہوتی تو زندگی زیادہ آرام سے کٹتی۔

''ایک دن صبح، صبح امی کا فون آیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد جو امی نے کہا تو میں سن کر سخت افسوس میں گھر گئی۔

''عبیرہ تمہاری دوست سمیرا کی بچی فوت ہوگئی۔''

''امی وہ کیسے.....؟ ابھی پرسوں ہی تو اس کا فون آیا تھا۔ سب خیریت تھی۔'' صدمے سے میری آواز ٹوٹ رہی تھی۔

''پتا نہیں بیٹا کیا ہوا۔'' امی افسردگی سے بولیں۔

''بچی نے اسکول میں کوئی الٹی سیدھی چیز کھالی تھی۔ اسے فوڈ پوائزن ہوگیا تھا اور منٹوں میں بچی چٹ پٹ ہوگئی۔'' میں نے امی سے تھوڑی بہت بات کر کے فون بند کیا۔ بڑی مشکلوں سے بستر پر بیٹھی۔ میری نظروں میں اس کی چھ سالہ بچی کی صورت گھوم رہی تھی۔ گڑیا سی بچی کیسے منوں مٹی تلے جا سوئی، آنسوؤں سے میری آنکھیں بھری جارہی تھیں۔ میں نے اسی وقت اٹھ کر سمیرا کو فون ملایا۔ اتفاق سے فون اسی نے اٹھایا۔ میری آواز سن کر وہ رونے لگی۔

''ہائے عبیرہ میری بچی چلی گئی۔ میری شہزادی چلی گئی۔ نہ جانے میرے گھر کو کس کی نظر لگ گئی۔ عبیرہ میں کتنی نادان تھی کہتی تھی کہ دیکھو میرے بچے دو ہیں اور دو ہی رہیں گے۔ یا اللہ مجھے معاف کردے۔ میرا غرور میری ضد مجھے لے ڈوبی، اللہ کو میری بات اتنی بری لگی اور اس نے مجھے کتنی سخت سزا دی۔ اب نہ جیتی ہوں نہ مرتی ہوں، عبیرہ تو ٹھیک ہی کہتی تھی اصل مالک و صاحب اختیار تو اوپر بیٹھا ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے اور میری نادانی کی سزا میرے دوسرے بچے کو نہ دے۔''

وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو رہی تھی۔ میں چُپ کی چُپ رہ گئی اسے کچھ بھی نہ کہہ سکی کہ ایسا مت سوچو۔ اس کی اتنی ہی زندگی تھی۔ بس مجھے اپنی شرمندگی یاد آرہی تھی جو سمیرا کی باتیں سن کر میں اپنے دل میں محسوس کرتی تھی۔

''یا اللہ مجھے معاف کردے۔ بے شک تو ہی سب سے بڑا ہے، ہم کتنے نادان لوگ ہیں، اپنے ہاتھوں سے اپنی جنت اجاڑ دیتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ نہ جانے کب ہمارے منہ سے نکلا کوئی لفظ اس کی پکڑ میں آجائے۔ یا اللہ مجھے معاف کردے۔ بے شک میں نادان تھی میرے خیالات کی سزا میرے بچوں کو نہ دینا، انہیں لمبی عمر عطا فرمانا، انہیں ہر پریشانی سے محفوظ رکھنا، میرے مولا، صاحب اختیار تو صرف تو ہی ہے کہ کس کے ہاں کتنے پھول کھلیں گے اور کتنے... مرجھا جائیں گے۔ تو ہی آگاہ ہے، میرے مالک مجھے معاف فرما۔'' میں اب پھوٹ، پھوٹ کر رو رہی تھی۔

شکست پا

زندگی کے نشیب و فراز میں انسان جانے کتنے محاذوں سے لڑتا ہے..... وہ بھی اپنوں کے درمیان منافقتوں اور مصلحتوں میں الجھا لڑتا رہا.....

آخری صفحات پر **اسما قادری** کے خیالات کی پرواز

ہنگامہ زن

ماضی کے پوشیدہ گوشوں..... اور بند دریچوں میں پنہاں راز و نیاز..... تاریخی صفحات پر **الیاس سیتاپوری** کے قلم سے

رنگ آسماں

زہریلے سانپوں اور گہری چالوں پر مشتمل خوفناک اور عبرت ناک واقعات کا سنگم..... **اے آر راجپوت** کے خیالات کی پرواز

وقت

خوشگوار مستقبل کی آس اور کربناک ماضی کی بھول بھلیوں میں گم شدہ لمحات کا احاطہ کرتے وقت کی مکاریاں۔ **حسام بٹ** کے قلم کا جادو

اس کے علاوہ تنویر ریاض، ڈاکٹر شیر شاہ سید، شاہ زین رضوان، اعتزاز سلیم وصلی، منظر امام اور آصفہ ضیا احمد کی خوبصورت کہانیاں

Digitized by Google

مکمل ناول

راکھ

سیما بنت عاصم

امی کی بات سن کر میرا منہ کا نوالہ منہ میں اور ہاتھ کا ہاتھ میں رہ گیا۔ کئی لمحے بیت گئے تو مجھے اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں امی.....؟"

"یہ کیا کہہ رہی ہوں جو تم سن رہی ہو..... وہ ارے وہی کہہ رہی ہوں ظفر کے ساتھ بھاگ گئی۔ تمہاری لاڈلی سہیلی گلابو اس ظفر کے ساتھ بھاگ گئی۔"

میری آنکھیں چوپٹ کھل گئیں۔ پل بھر کو قدموں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی..... ابھی کل ہی تو اجی دعوت نامے کے ہمراہ یہ پیغام دے کر گیا تھا کہ تاجو بھائی کہیں کہ جہیز اٹھوالیں اور آج جبکہ شادی میں صرف دو دن باقی تھے یہ خوشخبری سننے کو ملی..... جیسے میرا ہی کوئی دھڑکا مجھ پر تالیاں پیٹ، پیٹ کر ہنسنے لگا۔

"مم..... مگر آج تو مایوں تھا.....؟ یہ سب..... کب کیسے ہوا؟"

"اے بی بی.....! آج ہی تو بھانڈا پھوٹا کہ گلابو نے تو تیرہ تاریخ سے اس موالی کے ساتھ نکاح پڑھا رکھا

URDU TUBE
Digitized by Google

تھا..... پھر سب بہن، بھائیوں نے اسے بلا کے ان ہی دو کپڑوں میں اسے رخصت کر دیا بلکہ گھر تک چھوڑ کے آئے۔ ہے، ہے خانہ شادی، خانہ غم بن گیا..... دیکھ کے کلیجا منہ کو آتا تھا۔ اسی لیے تو دوڑی، دوڑی آئی کہ تم سج بن کے مایوں میں نہ جا پہنچو۔"

سچ تو تھا..... میں نے صبح سے کپڑے پریس کر رکھے تھے۔

"اب کاہے کی مایوں، اب تو پرسا دو پرسا..... اپنی آنکھوں سے دیکھ کے آئی ہوں..... گھر لگتا تھا جیسے ابھی، ابھی کوئی میت اٹھی ہو..... عزت کا جنازہ اٹھا سو اٹھا..... لاکھ دو لاکھ کا پھیر پڑا وہ الگ ہے بیچارہ اجی لاکھوں کے پیٹے میں آ گیا۔"

"اجی نے اگر میری کسی بات پر کان دھرے ہوتے، تو رونا کاہے کا تھا۔ مگر یہ سب..... اپنے ہاتھوں اپنے مقدر پر سیاہی پھیرنے والے لوگ ہیں۔" میں نے کہا۔

"سچ کہتی ہو، باپ مرا تو کڑیل مسٹنڈے تھے۔ مگر ساری زندگی ڈنڈے بجاتے گزری، اب دوسروں کی روٹیوں کے آسرے میں یا پھر در بدر مارے پھرتے ہیں۔ نشے بازی میں زندگی گزار دی..... آج برباد ہیں، ہال پر جھڑ گئے مگر نہ کسی نے روٹی دی نہ بیٹی، عمر گزر گئی۔ بیچاری میراں یہی دکھ لے کر مر گئی۔ بیچارے اجی اور وسیم چھوٹے ہی تو تھے۔ میراں نے انہیں اسکول سے اٹھا کے کام پر بٹھا دیا تھا۔ آج گھر گرہستی سنبھال رہے ہیں تو اپنے گنوں اور چار پیسے کی کمائی کی بدولت....."

"یہ تو میں بھی جانتی تھی گلابو کی شادی کا بھی سارا وزن اجی کے سر پر ہی تھا....."

"ہے، ہے..... کتنا نقصان ہوا بچے کا..... اپنی آنکھوں سے دیکھ کے آئی ہوں، شام میں مانجھے کے لیے پورے دس کلو چاول بھگو رکھے تھے۔ سارا محلہ تھو، تھو کر رہا ہے، برسوں کی بنی بنائی عزت پر پانی پھر گیا..... گلابو کے مرے ماں، باپ کی قبریں تک لرز اٹھی ہوں گی۔" امی کا تاسف ہی نہ مٹنے میں آتا تھا۔

میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اب کیسی روٹی اور کہاں کی بھوک، کیسے چاؤ سے قیمہ کریلے پکائے تھے، سب کچھ لپیٹ لپاٹ کر رکھ دیا اور سر تھام کے بیٹھ گئی، میرا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔ ظفر لٹو بدنام زمانہ آدمی تھا۔

"امی کہیں ایسا تو نہیں کہ بیچاری گلابو کے ساتھ وہ کوئی داؤ کھیل گیا ہو۔"

"اے جانے دو بی بی! گلابو اور لٹو کے چرچے بچے، بچے کی زبان پر تھے۔ سوراخ اپنی کشتی میں ہو تو طوفان سے کیا گلہ.....؟" امی کی بات راست تھی۔

"میں نے اپنے خدشات کے تحت دبے لفظوں میں اجی سے کہا تھا کہ معاملہ نازک ہے، محلہ پرے چپ چپاتے شادی بھگتا لے، بیچارے تاجو بھائی بیوی بھگتا چکے ہیں اور کون سا کچھ مانگ رہے ہیں مگر اجی نے کان نہ دھرے..... اڑ گیا کہ اس نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔"

"اے بی بی..... انہیں بھی کیا پڑی تھی پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی..... گلابو بھاگتی یا ساری زندگی بن بیاہی بیٹھی رہتی، تمہارا نام تو نہ بیچ میں آتا..... اب مل گیا سبق..... تمہیں تو ہمدردی، انسانیت دوستی کے سبق رٹے ہوئے تھے۔ اپاہج ہے، یتیم و یسیر ہے۔ دیکھ لیے اپاہج کے کرتوت....." سب کے منہ پر کالک پھیری سو پھیری۔ برسوں پرانی دوستی پر بھی تھوک دیا..... جو ٹانگوں سے پوری ہوتی تو جانے آسمان میں تھگلی ہی لگا کے آتی۔" امی شدید غم و غصے کا شکار تھیں مگر گلابو کے لیے ایسی باتوں پر میرا دل دکھ کر رہ گیا۔

"امی! آپ تو ایسا نہیں کہیں۔"

"میرے سامنے کے بچے ہیں سارے..... دیوار سے دیوار ملی ہے۔ مگر اب وہ وقت نہیں رہا جب میرا اور میراں کا دکھ سکھ سانجھا تھا۔ میراں غریب بھی مگر اپنی اولاد کو سمیٹ رکھا تھا۔ نہ میراں مرتی نہ یہ دانے بکھرتے....." وہ نرم پڑ گئیں۔

امی کا کہنا بجا تھا..... اماں میراں کے بعد اگر کبھی بھولے بھٹکے ہی پڑوس میں جھانکنا پڑ جاتا میں کبھی خوش ہو کے نہ لوٹی۔

امی اٹھ گئیں، میں لاکھ روکتی رہی۔

"تمہیں پتا ہے، چھوٹی دلہن کے یہی دن ہیں، بڑے کو سالانہ بونس ملا ہے اور اس کی بیوی بہانے کر کے میکے جا بیٹھی ہے سوچا ہوگا ساری رقم بالا ہی بالا ٹھکانے لگا دے تاکہ ماں، باپ کو بڑھا کے نہ دینے پڑ جائیں۔ میں ماں ہوں مجھے تو دیکھنا ہے ناں....."

میرا دل دکھ کر رہ گیا..... بڑھاپے میں اولاد کا دست نگر ہونا بھی کیا عذاب ہے۔ کیا وقت تھا جب راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ ابا میاں سرکاری ملازم تھے مگر اب صرف پنشن پر گزارہ تھا یا پھر مکان کا آدھا پورشن کرایے پر اٹھا رکھا تھا۔

"سچ پوچھو تو میرے بس کے نہیں ہیں یہ اسپتالوں کے چکر..... عائزہ (چھوٹی بہن) کو فون کیا تھا کہ کچھ دن آ کے رہ جائے مگر اس کے پاس تو میکے کے لیے وقت تھا نہ ہوگا۔"

میرا سر شرم سے جھک گیا..... میرا گھر چار محلے چھوڑ کے ہی تھا مگر میں بھی کئی، کئی دن میکے نہ جھانک پاتی تھی۔ سسرال بھر کی ذمے داریاں مجھے سر کھجانے تک کی فرصت نہ دیتیں۔ سسر عرصے سے بستر پر دراز تھے، ساس نفسیاتی مریضہ، ناپاکی کا وہم، انہیں چھو کر گزرتی ہوا بھی ناپاک محسوس ہوتی تھی۔ میرا سارا دن دھلائیوں، صفائیوں اور پکانے ریندھنے میں ہی گزرتا تھا۔ شادی کو آٹھ سال ہو چکے تھے اور میری گود سونی رکھنے میں شاید رب کی یہی مصلحت تھی کہ وہ مجھے اپنے کاموں کے لیے وقف رکھنا چاہتا ہے۔ امی چلی گئیں مگر میرا صدمہ کم نہ ہوتا تھا۔ ساری باتیں اِدھر اُدھر ہو گئیں، یاد رہا تو بس اتنا کہ میری ساری بھاگ دوڑ خاک میں مل گئی۔ میرا دل یقین کی ڈور تھام رہا تھا۔ گھوم پھر کر دھیان گلابو میں جا اٹکتا تھا۔

☆☆☆

میرے قدم بہ مشکل اماں میراں کے گھر تک اٹھ سکے تھے۔ صدر دروازہ تھا جس کے بعد سامنے ہی گلابو کا کمرا پڑتا تھا۔ میرے دل کو اک دھکا سا لگا۔ یہاں سے وہاں تک سناٹا تھا۔ امی کا فرمان بجا تھا، خانہ شادی، خانہ غم بن گیا تھا۔ شاید اسی لیے آج دروازہ کھلا تھا۔

آنے والے کو اپنی کھوپڑی کی سلامتی عزیز ہو تو اولاً نکڑ کے دربار میں حاضری لازمی تھی۔ جس کا کمرا سب سے آخر گھر کے صحن میں پڑتا تھا۔ یہ اور بات کہ پرلے درجے کی بخیل نگہت کے راج میں کسی کو دو گھونٹ پانی بھی مل جائے تو غنیمت..... وہ آئے گئے کو زیادہ منہ نہ لگاتی تھی۔ اکثر کو تو دروازے سے ہی چلتا کر دیتی..... ہال کمرا گھر کے وسط میں پڑتا تھا۔ آج سب وہیں جمع تھے، میں نے من بھر قدموں سے وہاں تک کا فاصلہ طے کیا تھا، منظر بہت سوگوار تھا۔ پرسا دینے والوں کا تانتا لگا تھا۔

"ارے تیرا ناس جائے، تو نے گھر کی عزت کے پرخچے اڑا دیے۔" یہ نگہت کی پکار تھی، ہال کمرے سے دو قدم پرے نگہت کی آواز میرے کانوں میں پڑی تھی۔ اور یہ تو کہنے والی بات ہی نہیں تھی کہ ذکر خیر گلابو ہی کا تھا..... میرا اگلا قدم ہال کمرے میں تھا اور ایک ہی نظر میں یہاں سے وہاں تک کا جائزہ لے لیا تھا۔ گھنے پن کی منہ بولتی مثال زمانے بھر کے ناکارہ دھکے چھوٹے بھیا، حسب عادت ایک کونے میں اکڑوں بیٹھے گم صم خلاؤں میں گھور رہے تھے۔ گھر کا ایک کونہ سدا ان کے دم سے آباد رہا..... سو آج بھی آباد تھا۔ ان کے سر سے چاہے ریل گاڑی گزر جائے وہ جوں کے توں بیٹھے نظر آتے۔

دوسرے گوشے میں بڑے بھیا، نشے میں دھت اوندھے پڑے تھے۔

ہال کمرے سے اس پار صحن میں فٹ بال کا ٹورنامنٹ چل رہا تھا۔ آپا منجھی کا اکلوتا سپوت اور یاسمین کی دو بیٹیاں۔

یاسمین کے پہلو سے لگا، گاؤ تکیے سے نیم دراز وسیم ایک کان سے ریڈیو لگائے بیٹھا تھا۔ وسیم، کم رو بلکہ سیاہ فام تھا۔ سارے چہرے پر آنکھیں ہی آنکھیں راج کرتی تھیں۔ میں اسے شروع ہی سے "جنتی" کہا کرتی تھی۔ گھر کے لیے وہ ہمیشہ پستا رہا۔ اس کے بائیں کان سے ہر وقت، ریڈیو لگا رہتا تھا۔ اس لیے اس کان کی سماعت گم ہو چکی تھی۔

یہ اور بات کہ "زن مریدی....." میں اجی سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ یاسمین جو چابی اسے بھر دیتی اسی پر پھدکتا پھرتا تھا۔

میں نے سامنے بیٹھی وسیم کی بیوی یاسمین کے پہلو میں جگہ تلاشی تھی۔

"آ گئیں.....؟" نگہت نے شکل دیکھتے ہی میری ٹانگ کھینچی تھی۔ طنز و ملامت بھرا لہجہ مجھے اس کی شکل دیکھتے ہی تاؤ چڑھتا تھا۔ عورت کی عورت..... اور اجی بیچارہ کل کا

Digitized by Google

بچہ...... کاٹھ کا الو تو کاہے کو اس جادوگرنی کے جال میں دھنستا؟ صورت نہ شکل...... موئی بارہ من کی دھوبن......

"دیکھ لیے اپنی لاڈلی کے کرتوت، بڑا دم بھرتی تھیں ناں، کیسی جان دیتی تھیں گلابو پر...... بہنا پا گانٹھ رکھا تھا، کیسے بڑھ چڑھ کر بیسویوں کام کروائے تھے۔ بھاگ دوڑ کر کے رشتہ طے کروایا تھا۔ سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیا...... اب لے کے بیٹھی رہو اپنی بارات...... گلابو نے چاند چڑھا بھی دیا۔ ہم تم بیٹھے ناچتے ہی رہ گئے۔" نکہت کی بات سے کس کافر کی مجال تھی کہ منہ پھیرتا۔

"ارے اس کے مزاج ہی کہاں ملتے تھے۔ کوئی رشتہ بھاتا ہی نہیں تھا، آسمان سے شہزادہ اترنے کا انتظار تھا۔" یاسمین طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کر فٹ سے بولی تھی۔

"اچھا!" میں دل ہی دل میں استہزائیہ ہنسی تھی "تو پھر لٹو جیسے دو کوڑی کے آدمی کے ساتھ نکل بھاگنے کی کیا تک بنتی تھی؟"

"ارے اگر یہی گل کھلانا تھا تو منہ سے پھوٹتی تو سہی...... زمانے بھر کی کالک اپنے منہ پر تھوپنے کی کیا پڑی تھی؟" آپا ننھی اپنا تازہ ترین غش پورا کر کے اٹھی تھیں۔

"ارے معلوم ہوتا کہ یہ گل کھلانے کے ارادے ہیں تو اس کی من مرضی ہی کر لیتے، یہ نوبت کاہے کو آتی؟ دو بول پڑھا کے عزت سے اسی کے ساتھ نہ چلتا کر دیتے، برسوں کی کمائی عزت کا جنازہ نکل گیا...... پرکھوں کی نیک نامی خاک میں مل گئی۔"

ہاہ...... عزت و نیک نامی......؟ میری جان کلس اٹھی...... نہ ہوا موقع نکہت کو لتاڑنے کا، ورنہ اتنا ضرور جتاتی کہ یہ عزت و نیک نامی اس وقت گھاس کھودنے گئی تھی۔ جب تم نے اجی پر ڈورے ڈال کر اسے پھنسایا تھا؟ تم پکی عمر کی عورت اور وہ بیچارہ ناتمک برابر چھوکرا، نکہت جتنی بھولی بن رہی تھی اتنی بھولی تھی نہیں۔

"عزت بچتی تو عزت سے اٹھ جاتی ناں...... مگر عزت تو جانے کب سے روندی جا رہی تھی۔ اے بی بی کیا، کیا بتائیں...... سارا محلہ دیکھتا تھا۔ رات گئے، اس کم بخت لٹو کی گاڑی گلی کے نکڑ پر آ کر رکتی تھی۔ یہ گلابو جھٹ اسے اندر گھسیڑ لیتی تھی۔"

ہال کمرے میں یہاں سے وہاں تک بھنبھناہٹ پھیلتی چلی گئی تھی۔ کئیوں نے توبہ تلہ شروع کر دی تھی۔ طنز ملامت، لعنت۔ پر مجھ سے بڑھ کر گلابو کو کون جانتا تھا۔ یہ سراسر بہتان تھا۔ وہ بہت شریف النفس، خدمت گزار صابر و شاکر لڑکی تھی...... کچے کردار کی رہی ہوتی تو کاہے کو ان ناگفتنیوں کی خدمت میں پستی......؟ اور اگر ایسا تھا بھی تو یہ بھری محفل میں کہنے والی بات نہیں تھی۔ مگر اصل مقصد بات کو خوب نمک مرچ لگا کر اچھالنا تھا۔

"اے بی بی! تم کیا جانو اس (فحش گالی) کے لچھن! ہم نے بھگتا ہے ہم سے بڑھ کر کون جانتا ہوگا۔" میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ میں کتنا یقین کر رہی تھی۔

"شاباش ہے آپ کی عقل کی خوبی پرواز کو......" میرا دل جل کر خاک ہوا۔ کہ آپ سب کچھ جانتے بوجھتے، دیکھتے اور سمجھتے بھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھی رہیں......؟"

"ارے میں تو جب ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ چوری چھپے کی ملاقاتیں کوئی نہ کوئی گل کھلا کے رہیں گی۔ جب لٹو گلی کے نکڑ پر آ کر گاڑی کے ہارن بجاتا تھا۔" وہ نکہت ہی کیا جو مات کھا جائے...... "اور یہ بے شرم سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسے گھسیڑ لیتی۔"

تو اب آنکھیں کیسے چوپٹ کھل گئیں اور اگر ایسا تھا بھی تو سارا گھر کیا بھنگ پیے پڑا ہوتا تھا؟

"ارے عزت کا جلوس تو اسی دن نکل گیا تھا۔ ہماری ہی عقل پتھر پڑے رہے۔ یاد نہیں...... تاجو (گلابو کا دولہا) کو جو کال آئی تھی...... اس میں کیا، کیا بے شرمی کی باتیں بتائی گئی تھیں کہ اٹھائی جائیں، نہ دھری جائیں، توبہ......! ایسی بے حیائی ہماری ناک کے نیچے چل رہی تھی۔ ایسی کھلی کھلی باتیں تو کوئی اندر کا آدمی ہی جان سکتا ہے ناں......" یہ صاف چشم پوشی تھی...... اپنا دامن بچا، دوسروں پر الزام کا ٹوکرا رکھنا...... ورنہ ایسا کہاں ہوتا ہے کہ ایک نام کا لر گھر کے آدمی سے بڑھ کر قابلِ بھروسا ٹھہرے۔

"اری سوچ میں انگلی نہ ڈال گزر گئی تو تیرا باپ مجھے گزار دے گا۔" میرے دل میں کسی یاد نے چٹکی لی۔ نہ ہوئیں اماں میراں اس وقت ورنہ گلابو جیسی اولاد پر کیچڑ اچھالنے والوں کے وہ لتے لیتیں کہ دنیا تماشا دیکھے......

انگلی نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔

"گلابو کے مرے ماں، باپ باپ کی قبریں لرز اٹھی ہوں گی۔"

"برا ہو اس زبان کا...... منہ پر آئی بات نہ رکتی۔ ایک نہ دو چار بچیاں ہیں میری۔ مانا کہ ہماری بچیاں گلی محلے میں بھی تک نہیں...... مگر یہ گلابو لفنگی تو گاڑی کے ایک ہارن پر لپک کر جاتی تھی جانے کب سے...... پینگیں بڑھا رکھی تھیں، بھائیوں کی عزت اچھالتے قدم بھی نہ لرزے؟"

بڑی آپا کی گل افشانی تھی۔ اور وہ آپا ننھی ہی کیا جو کسی کی تحریف کر جائیں...... گلابو کی خطا تو یوں بھی بڑی تھی۔ یوں بن رہی تھیں جیسے بھائیوں کی پہلے بڑی عزت تھی۔

"خدا کی مار پڑے گی بجے...... مرے ماں، باپ کی روحیں تڑپ رہی ہوں گی۔ ارے میری بات لکھ کر رکھ لو...... چار روز میں وہ کم بخت گلابو منہ کالا کر کے لوٹ نہ آئے تو میرا نام بدل دینا۔"

"ارے بی بی! اس کے چلتر تو شروع سے ایسے تھے، اس کو بیاہتا کون......" آپا بولیں۔ میرا دل جل اٹھا، لوگ کتنی جلدی بدل جاتے ہیں۔ یہ وہ آپا ننھی تھیں جن کی اولاد گلابو نے پال پوس کر جوان کی تھی۔ بڈحرامی ان پر ختم تھی۔ جہاں بیٹھ جاتیں، گھنٹوں نہ اٹھتیں، صبح دیکھو تو شام تک وہیں بیٹھی نظر آتیں، وہیں سے سارے احکامات جاری ہوتے رہتے، جیسے فقیر کو تکیے پر بٹھا دو تو وہ شام گئے ہی اٹھتا ہے۔

"ارے بنو...... سب مال سمیٹنے کے چلتر تھے، چپکے چپکے من پسند نکاح رچا کے سوچا ہوگا ابی سارا جمع جتھا لے کے لٹو کے ساتھ رخصت کر دے گا......" یہ نکہت کے شیطانی دماغ کی کارروائی تھی۔ جیسے میں جانتی ہی نہیں تھی۔ نکہت اپنا بخار کسی کو نہ دے نکلے، ٹکے پر جان دیتی...... نند کو بیاہنے کا جگر کہاں سے لاتی، نند بھی وہ جو کانٹے کی طرح آنکھ میں کھٹکتی تھی۔

"ہٹے، ہٹے...... اجی نے کمی کیا چھوڑی تھی بھری جوانی کو لات مار کر آنکھوں میں دھول جھونک...... کیسا داؤ کھیل گئی، ایک نہ دو، لاکھ کا نقصان ہے۔" نکہت کو سب سے بڑھ کر نقصان کا افسوس تھا۔

گلابو بیچاری کو روٹیوں تک کے لالے تھے اور یہ میں ہی جانتی تھی جہیز لاکھ کا تھا یا خاک کا...... تعریفی سند تو مل ہی جانی تھی۔ اور اپنی اہلیت اور گلابو کی خامیوں کو اچھالنے کے لیے ہی تو یہ ساری دھکم پیل چل رہی تھی۔

یہاں وہاں سے لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ دنیا کو ایسے معاملات میں چٹخارہ آتا ہے ہمدردی کی آڑ میں نمک پاشی......

"کوئی سنے گا تو کیا کہے گا؟ مایوں کی دلہن اپنے آشنا کے ساتھ فرار......" نکہت کا بس نہ چلتا تھا کہ اشتہار بنوا کر چلوا دے۔ مجھ سے بڑھ کر کون جانتا تھا کہ وہی چنگاریوں کو ہوا دینے والی تھی تا کہ جہیز کے نام پر خرچ ہونے والا مال بچے، جائداد کا ایک حصے دار کم ہوا اور وہ ساری بلا گلابو کے سر تھوپ کر مظلومیت کا ڈھکوسلا کیے بیٹھی آنسو بہاتی نظر آئے اور وہی ہو رہا تھا۔ شاید ایسے ہی وقتوں کے لیے کہا گیا ہے کہ بد اچھا بدنام برا...... ظفر لٹو سے گلابو کے تعلقات کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی مگر ان خبروں کو ہوا دینے میں گلابو کی دونوں بھاوجوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ کم تو آپا ننھی بھی نہیں تھیں، یہ تینوں خواتین گلابو کے نصیب کی دشمن تھیں اور اب خود کو بے قصور ثابت کرنے میں اپنا سارا زور لگا رکھا تھا۔

"اس ظفر لٹو کی ایسی کی تیسی......" ہال کمرے کے ایک گوشے سے ہانک اٹھی تھی۔ اگلے ہی پل نشے میں دھت بڑے بھیا لہراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میں لٹو کو مار، مار کر اس کا بھرکس نکال دوں گا، بیوہ کر دوں گا گلابو کو...... اس کی شادی، اسی تاریخ پر تاج الدین کے ساتھ ہی ہوگی۔"

مجھے ہنسی آگئی، اب چڑیاں کھیت چگ گئی تھیں۔ بڑے بھیا کو ہر معاملے میں بڑھکیں مارنے کی عادت تھی۔

ہال کمرے میں پھر بھنبھناہٹ ابھر کر پھیلی تھی۔ بھانت، بھانت کی بولیاں...... سب کی عقلیں گم تھیں کہ سب ہی گلابو کے کردار سے واقف تھے۔ اگر کچھ عرصہ لٹو کے ساتھ اس کی بھد نہ اڑتی تو صاف سیدھی سازش کہلائی جا سکتی تھی۔ نکہت بھابی و یاسمین بھابی کے کردار سے بھی دنیا واقف تھی۔ گلابو سے کسی کو یہ امید ہی نہیں تھی۔ دبی، دبی سرگوشیاں اٹھ رہی تھیں۔

Digitized by Google

ہیں مگر......! زخم بھر جائے مگر داغ تو رہ جاتا ہے۔ سے مرنے والوں پر بھی لوگ رو پیٹ کر صبر کر ہی لیتے

''گلابو......؟ نہیں! وہ تو ایسی لڑکی ہی نہیں تھی۔
ضرور کوئی......'' میری سوئی یہیں اٹکی ہوئی تھی۔
مگر اس کا کیا، کیا جائے کہ دنیا دوسروں کی آنکھوں سے دیکھتی اور اپنے کانوں سے سنتی ہے، کوئی انسان کتنا ہی صاف ستھرا ہو، لوگ اٹھتی انگلیوں کو گننے بیٹھ جاتے ہیں، معاملہ دوسرے کا ہو تو ہر خامی فوراً تسلیم کرلی جاتی ہے، انسان کہتا نہیں تو سوچتا تو ضرور ہے، جتنے منہ اتنی باتیں...... سب کی اپنی، اپنی بولیاں تھیں۔
''مایوں کی دلہن گھر سے بھاگ گئی، اب اس گھر کی بیٹیاں کون لے کر جائے گا......'' یہ آواز کمرے کے دوسرے گوشے سے اٹھی تھی، گویا مٹی کا مادھو بول اٹھا۔ خلا میں گھورتے، چھوٹے بھیا کی خاموشیاں طویل ہوتیں...... وہ کئی، کئی دن نہ بولتے، مانوں سالوں میں ایک بات کہتے مگر ایسی کہ یہاں سے وہاں تک آگ لگ جائے...... ان کے لب ہل کر پھر یوں ساکت ہوگئے تھے جیسے جنبش ہی نہیں کی ہو مگر ان کی بات میں اتنا وزن تھا کہ یہاں سے وہاں تک آگ لگ گئی۔ اِک چیخ ابھری تھی اور آپا ننھی ایک اور غش کھا کر لمبی پڑ گئیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو یہ صبح سے چوتھا غش تھا، اس لیے کہ نگہت نے اپنی اعلیٰ درجے کی کنجوسی دکھاتے ہوئے آپا ننھی کو بھی گھسیٹا تھا۔ اور دولھا کی شاپنگ ان کے سر تھوپ دی تھی۔ انہوں نے بیس ہزار کی رقم ٹھکانے لگائی تھی، اسی غم میں انہیں بار، بار غش آرہے تھے۔ کپڑے دولھا کے ناپ کے سل چکے تھے۔ اب ان کے لیے وہ چیتھڑے، ٹکڑے بیکار تھے۔
''گلابو! تیارا بیڑا غرق جائے، تو نے اس گھر کی عزت اچھال دی۔ اب کون ہماری لڑکیوں کو بیاہے گا۔''
یک دم میرا دل اس سارے منظر سے اچاٹ ہوگیا تھا اور وہاں روکنے والا تھا بھی کون...... لوٹتے سے میرے قدم من، من بھر کے ہو رہے تھے۔ بڑی غضب کی نقب لگی تھی۔ راتوں رات چور آنکھوں سے سرمہ چرا کر لے گیا...... میں جانتی تھی، کچھ عرصہ اس واردات کی دھول اڑے گی، یا اڑائی جائے گی...... لعنت ملامت، ہمدردی کی آڑ میں تاسف، بیلش گوئیاں پھر سب بھول بھال جائیں گے، کون کسی کے غم میں ہمیشہ روتا

دروازے پر میرا ٹکراؤ اجی سے ہوا تو وہ کاندھے پر چاول کی بوری لاد کے لوٹانے جا رہا تھا۔ میرے ساتھ لگ کر رو دیا تو مجھے تسلی دینی ہی تھی۔ ......صدر
''میں نے اسی دن کے لیے تمہیں سمجھایا تھا کہ ایسے مرحلے چپ چپاتے طے کیے جاتے ہیں، نہیں مانے ناں تم...... اب خوش ہو؟ برسوں کی عزت خاک میں مل گئی...... سب کیے کرائے پر پانی پھر گیا...... سب کچھ ملیا میٹ ہو کر رہ گیا۔''
''طوفانوں پر بند وہ باندھتے ہیں جو اُن سے ٹکرانے کی طاقت نہیں رکھتے...... مگر جب اپنا ہی سکہ کھوٹا ہو تو......'' اجی کے منہ میں بیوی کی زبان بول رہی تھی۔
یہ وہی بھائی تھا، جس نے کچھ دن پہلے چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کے مشورے پر کہا تھا کہ ''گلابو میری بہن نہیں، ماں ہے، سچ ہے بس ایک گام کی لغزش، ساری عمر کی نیک نامی پر پانی پھیر دیتی ہے، شاید اسی وقت کے لیے گلابو نے کہا تھا۔
''ہر بات کی تہ میں ایک بات ہوتی ہے اور وہی ساری بات ہوتی ہے۔'' اس ساری اٹھا پٹخ، چیخم پکار، اچھل کود کے عقب میں جو محرکات تھے ان کا سرا صرف ایک نکتے سے جا کر ملتا تھا۔ جو اس سارے فساد کی جڑ تھا اور اس ساری کی ساری مینا کاری کی جڑ بنیاد یہی نکتہ تھا۔ حالات کی ماری اپنوں کی ستائی لڑکیاں اگر چور دروازے کھول ڈالیں تو معتوب ہی نہیں مصلوب بھی ٹھہرتی ہیں۔
صد شکر کہ اماں میراں یہ دن دیکھنے کو زندہ نہ رہیں۔ ان کا کلیجا تو پہلے ہی چھلنی تھا۔
'' خواب اور خواہش میں اتنا فاصلہ کیوں ہوتا ہے۔'' ایک روز گلابو نے کہا تھا۔ اور میں نے جواب دیا تھا۔
''خواب اور خواہش تو اِک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں...... فاصلہ تو خواب و خواہش سے حقائق تک ہوتا ہے۔'' مگر کچھ خوابوں کی تعبیر اتنی بھیانک کیوں ہوتی ہے۔

☆☆☆

گلابو کی رخصتی بڑی ڈرامائی انداز میں انجام پائی

تھی۔ آپا ننھی اپنے حصے کے غش پورے کر چکیں تو فرمان جاری کیا۔
''ظفر لٹو کو بلا کے گلابو کو ان ہی دو کپڑوں میں اس کے ساتھ رخصت کردو......''
مشورہ بچت اور دامن بچانے کا تھا...... سو سب کا اتفاق ٹھہرا...... یہاں وہاں سب کے موبائلوں سے فون کھڑکایا گیا مگر لٹو کا نمبر بند...... شام چار بجے کہیں جا کے اس کا نمبر ملا...... اس دوران اجی کو سمجھا بجھا کے ٹھنڈا کیا گیا تھا اور اس یقین دہانی کے بعد کہ انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا وہ آنے پر آمادہ ہوئے تب تک خبر جنگل کی آگ کی طرح یہاں سے وہاں تک پھیل گئی تھی۔ لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔
بڑے مزے کا منظر تھا...... لٹو میاں چلتے تو ان کا پیٹ ان سے دو قدم آگے چلتا...... اب بھی اکڑتے چھاتی پھلائے داخل ہوئے تھے۔
''کیا صبح سے کالیس بار، مار کر جینا حرام کیا ہوا ہے؟'' اس کی آواز ڈول رہی تھی۔ ''ہاں ہم نے نکاح کیا ہے، کوئی گناہ تو نہیں کیا......'' اس نے نکاح نامہ سامنے لا دھرا تو اجی نے بے قابو ہو کر اس پر چڑھائی کی مگر وہ بھاگ نکلا۔ بہ مشکل اسے دبوچا گیا۔ کہیں لمبا بھاگ لیا تو گلابو کا ہاتھ کس کے ہاتھ میں دیں گے۔ وہ نہ اِدھر کی رہے گی نہ اُدھر کی...... اجی کو پکڑ دھکڑ کر قابو کیا گیا۔ مگر نہ، ذکر کرتے بھی ظفر لٹو کو دو چار لگیں پڑ ہی گئیں۔ گلابو نے بڑا اچھل کود مچائی تو آپا ننھی نے کس، کس کر دو چار جھانپڑ اس کی گدی پر جڑے۔
''خبردار...... میری بیوی کو کسی نے ہاتھ بھی لگایا تو...... اچھا نہ ہوگا......'' ظفر لٹو تن کر کھڑا ہوگیا۔ اجی پھر اس پر جھپٹ پڑا۔ نہ، نہ کرتے بھی اس کی چھوٹا بچاری...... اُدھر آپا ننھی نے رگڑا دیا۔
''کرے اپنے ہاتھوں اسے منزل تک پہنچا کے آئی تھی بد بخت ظفرو لڑکی ہے۔ نہ جانے یہ کم بخت اس بیچاری کو کہاں لے جا کر بٹھا دے......'' یہ کسی بھلی مانس کا مشورہ تھا جو گھٹ گھٹ سے نشانے پر بیٹھا...... تبھی دو چار لوگ آمادہ ہوئے کہ سنا تھا کہ لٹو کی جیب میں رکشے کا کرایہ تک نہیں تھا۔

پاکیزہ

زمانے بھر کا آوارہ، صورت نہ شکل...... ان جیسوں کو پوچھتا کون ہے، گلابو بھی غنیمت تھی۔ کون نہ جانتا تھا کہ وہ کیسا بدقماش آدمی ہے بالآخر لٹو کے گھر تک پہنچے تو اُدھر اِک نئی کہانی تھی گھنٹا بھر اس کی اماں نے رونے روئے۔
'' اس پر اللہ کی مار پڑے...... اس کا گزارہ تو بھتا خوری پر چلتا ہے۔ دن بھر نقلی پستول دکھا کر دنیا کو لوٹتا پھرتا ہے۔ اسے بیٹی دیتا کون؟ اس کے ساتھ گزارہ کرنے کو پتھر کا جگر چاہیے...... جانے کتنی لڑکیوں کی زندگیاں برباد کرچکا ہے۔ اے بی بی! ایسی بھی کیا تمہاری آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ انسان سوئی بھی لیتا ہے تو چھان پھٹک کرلیتا ہے۔'' اس کے کچے چھٹے کھلے تو وہ ماں کے منہ کو آنے لگا۔ مگر وہ بھی اسی کی ماں تھی، اتار کر جوتی اور کردی الٹی چڑھائی کہ ساری چوکڑی نکل گئی دم دبا کے بھاگتا نظر آیا۔
''اے بی بی! اچھی بھلی ہو، اِک ذرا ٹانگ میں نقص ہی تو ہے...... چورے چماروں کی بھی ہی شادیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ اب اگر اپنے ہاتھوں اپنے مقدر پھوڑ لیے ہیں تو اسے لے جاؤ، میں اسے عزت سے بیاہنے آجاؤں گی۔''
مگر اجی اب گلابو کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہ تھا۔
سنا تھا کہ لٹو کے گھر میں پانی پینے کا برتن تک کوئی ڈھنگ کا نہ تھا۔ گلابو چھکوں پھکوں رو رہی تھی مگر کسی نے نظر تک نہیں کی۔ از راہِ اتفاق گلی کے دو چار لوگوں کو اپنا نمبر بھی پکڑا آئے۔ گلابو کے ساتھ کچھ اونچ نیچ ہو جائے تو کم از کم اطلاع تو مل جائے۔

☆☆☆

''میرا گھر تو بسنے سے پہلے ہی اجڑ گیا......'' حسب توقع اگلے روز تاجو بھائی بھڑکتے چلے آئے۔ وہ سعد سے لپٹ کے آٹھ، آٹھ آنسو روئے۔ مجھے ایک دم سے ہنسی آئی۔ تاجو بھائی پر ڈبل لیبل لگ گیا تھا۔ ایک پانچ بچوں سمیت رفو چکر ہوگئی، دوسری مایوں والے دن نو دو گیارہ...... اب وہ کیا خاک کسی پر بھروسا کریں گے۔ سعد نے انہیں بھرپور تسلی سے نوازا تھا مگر وہاں تسلی کسے تھی۔ لنڈورا رہ جانے سے بڑھ کر پیسہ ڈوبنے کا غم کھائے جا رہا تھا۔
''میں تو بن موت مارا گیا بھابی......! ہزاروں کا نقصان ہوگیا۔'' وہ اب مجھ سے اپنا دکھڑا رونے آئے تھے۔

Digitized by Google

میرے دماغ کی چولیں جیسے ہل کر رہ گئی تھیں میرا ان پر بس نہ چلا تو اپنے میاں سعد کے کان اینٹھنے بیٹھ گئی۔

"یہ تاجو میاں آپ کو کہاں ٹکرا گئے تھے؟"

"مجھ سے کیا کہتی ہو، تمہیں ہی ولولہ اٹھا تھا۔ اب بھگتو۔"

"لو بھلا اب میرا قصور کہاں سے نکل آیا؟" میں کلس کر رہ گئی...... کوئی انسان آپ سے کتنا ہی قریب ہو مگر وہ آپ نہیں بن سکتا......

"مجھے کیا پتا تھا کہ گلابو کی اڑان اتنی اونچی ہے کہ اِک دن دنیا سو سو نام دھرے گی۔"

"دنیا تو تمہیں بھی نام دھرے گی۔ نہ تم ٹانگ اڑاتیں، نہ یہ نوبت آتی۔ تاجو بھائی کے لنڈورے اور گلابو کے بھاگنے پر تمہاری چندیا بجے گی وہ الگ...... بس اب سمجھو تمہاری خیر نہیں ہے۔" سعد باقاعدہ مجھے ڈرا رہے تھے۔

"جسے دیکھو، مجھی کو الزام دے رہا ہے۔" مجھے پتنگے لگ گئے۔

خدا گواہ تھا کہ میں نے رتی بھر ہیر پھیر سے کام نہ لیا تھا۔

"تم اپنی کھوپڑی کی خیر مناؤ...... ابھی تو تمہیں ہاتھ کے ہاتھ تاجو بھائی کا نکاح بھی پڑھوانا ہوگا۔"

"کمال کرتے ہیں آپ! میں نے کیا تاج الدین کی شادی کا ٹھیکا اٹھایا تھا۔ جو گلابو سے نہ ہوتی تو کسی اور سے کرانا میرا ہی فرض تھا۔"

"یار بندے کو امید ہو جاتی ہے، شادی کے حوالے سے خواب سجا لیتا ہے، مجھے کوئی شادی سے دو دن پہلے شادی ملتوی ہونے کی خبر دیتا تو میں تو پھندا لگا کے لٹک ہی جاتا......"

"اب میں کسی کے دل میں تو نہیں گھسی بیٹھی ناں...... نیکی جان کر ہی قدم اٹھایا تھا ناں......"

"ہاں...... مگر نیکی گلے پڑ گئی۔ ویسے گلابو نے اس مثال کو زندہ کر دیا کہ عشق میں لوگ تخت اور تاج کو ٹھکرا دیتے ہیں۔"

میں ان کے مطلب کو پا گئی تھی...... تاج سے مراد تھا۔ "تاج الدین......"

ہر کوئی یہی کہہ رہا تھا۔ کیا مٹی میں رُل کے نصیب پھوٹا ہے۔ تاج الدین اس ظفر لٹو سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔

"جناب من! پیار تو ایسا ہی ہوتا ہے...... اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

مگر میرا تاسف مٹائے نہ مٹتا تھا۔ میری نظروں میں رہ، رہ کر وہ وقت گھومتا جب امی نے صرف پندرہ دن بعد نکاح کی تاریخ پکڑائی تھی اور ان پندرہ دنوں میں جو نہ ہونا تھا، ہوا تھا۔ نکتے، شوشے، گل شگوفے، بم پٹاخے میری آنکھ جیسے کوئی خوشگوار خواب دیکھتے کھل گئی تھی۔

"جب کوئی بساط سے بڑھ کر اڑان بھر جائے تو مان لو کہ اس کی پشت پر کسی کا ہاتھ ہے۔" ان کی بات میں وزن تھا... میرے دل کو لگی، گلابو شادی کے لیے جی جان سے آمادہ تھی۔ لٹو کے کرتوتوں سے آگاہ بھی تھی۔ پھر اس کی یہ مجال......! یکایک بات گھوم کیسے گئی؟ میرا دل نہیں مانتا تھا۔

ہم راہ دیکھتے رہے...... وہ راستہ بدل گیا......؟

آفرین ہے بھئی......! میرا ذہن مسلسل اسی تانے بانے میں الجھا تھا۔ ذہن سے تیرہ تاریخ جیسے چپک کر رہ گئی تھی۔ اگر نکاح تیرہ تاریخ کو ہوا ہے تو یہ اس روز کی بات تھی جب تاجو بھائی کو فون پر دھمکیاں ملی تھیں، میں نے سیدھے سبھاؤ گلابو کو تاج الدین کے سامنے بٹھا دیا تھا اور گلابو نے کہا تھا۔

"شرافت اور نیک نامی انسان کی میراث ہوتی ہے۔"

مجھے اس سے امید بھی یہی تھی۔ [illegible] کیوں ہوا...... کس لیے ہوا...... یہ تو میں جانتی تھی مگر کب اور کیسے...... یہ نکتہ ہنوز سوالیہ نشان تھا۔

☆☆☆

اگلے دن گلابو کی دونوں بھاوجیں نکہت اور یاسمین آپس میں بھڑ گئیں۔ میں ابا میاں کی مزاج پرسی کو آئی تھی۔ سردیوں کی آمد، آمد تھی۔ چھوٹے کی بیوی سے سعد کے سوئیٹر کے لیے نئے ڈیزائن کے پھندے ڈلوانے تھے۔ امی کے صحن سے دیوار پرے کی تمام آوازیں بخوبی سنائی دیتی تھیں۔

"تو، تو چاہتی ہی نہیں تھی کہ گلابو کا گھر بسے...... تیری غلامی کون کرتا۔" یاسمین کم بولتی مگر جب بولتی کفن پھاڑ کے...... "تو نے ہی تو گلابو کو شہہ دی تھی کہ تاج الدین سے شادی سے انکار کر دے تاکہ وہ لٹو کے ساتھ منہ کالا کر جائے اور تیرا امال بچے......"

"اری چل، تو نے کیا کم زور لگایا تھا کہ تاجو سے

اس کی شادی نہ ہو، کوئی بھولا بھٹکا رشتہ آ جاتا تو ہزار کیڑے چننے والی بھی تو ہی تھی، لٹو کا رشتہ آیا تو انکوائری کا کیڑا بھی تیرے ہی دماغ میں کلبلایا تھا۔ خوب جانتی ہوں میں...... وسیم نے کوئی انکوائری نہیں کی تھی۔ جو تو نے اس کے کان بھرے، اس نے بک دیا...... لٹو سے بڑھیا بر گلابو کو نصیب بھی کہاں ہونا تھا......" نکہت بھی کم نہ تھی۔

"اری دنیا ٹھیک ہی تو کہتی ہے، چور آنکھوں سے سرمہ چرا کر لے گیا۔ ہونہہ......"

"چور کو گھر کا راستہ بھی اندر کا آدمی دکھاتا ہے، لٹو رات گئے باہر کا دروازہ کھول کے گلابو کے کمرے میں گھستا تھا تو تیرے کانوں میں کیا تیل پڑا ہوتا تھا۔"

میں نکہت کو خوب جانتی تھی، وہ چلتی ہوا پر عیب لگاتی تھی، یہ تو پھر بھی چاند چڑھ چکا تھا۔ میرا دل جل کر خاک ہو گیا۔ اگر ایسا تھا بھی تو بھلا کھلے بندوں کہنے والی بات تھی؟

"تیل تو تیرے کانوں میں پڑا ہوا تھا۔ تو، تو برابر کے کمرے میں سوتی تھی۔ سب سنتی سمجھتی تھی مگر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھی رہی... کیونکہ تو چاہتی ہی نہیں تھی کہ گلابو عزت سے بیاہی جائے، ایسا گل کھلے کہ سارا امال بچ جائے۔"

"اری تو، تو نے ایسا کون سا تیر مار لیا ہے۔ پانچ ہزار دے کے ہاتھ جھاڑ لیے۔ لاکھوں کا وزن... تو ہمارے سر تھا ناں۔"

"اور وہ جو پانچ چوڑے جہیز میں رکھوائے تھے چاندی کا جگر، جگر کرتا سیٹ بھول گئی؟"

"اری چل، میرا منہ نہ کھلوا، اپنے جہیز کے پرانے فیشن والے بساندھ مارے جوڑے، چاندی کا پالش چڑھا گلٹ کا سیٹ دکھا کے تو دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتی ہے۔ میری آنکھوں میں نہیں۔"

اور بھی جانے کیا، کیا الزام تراشیاں چل رہی تھیں۔ یہ سب معاملے کو ہوا دے کر پھیلانے کی کوششیں کرتی تھیں، ایک دوسرے پر الزام لگا کر دنیا پر اپنی اہلیت ثابت کرنا تھا۔ اگرچہ دونوں ہی اپنی، اپنی جگہ مجرم تھیں۔ میں اگر جا کر یہ بھی کہہ دیتی تو اِک نئی کہانی شروع ہو جاتی۔ اصل بات دب جاتی اور ملبہ مجھ پر آن گرتا...... اسی لیے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

☆☆☆

امی کا فرمان بجا تھا، نہ میراں مرتی نہ بیدانے بکھرتے۔

اماں میراں تنگدست تھیں مگر بڑی بھلی اولاد سمیٹ رکھی تھی۔ بیوہ ہوئیں تو ایک نہ دو، چار بیٹوں کی ماں تھیں، بڑے بھیا اور چھوٹے بھیا تو جوان ہی تھے مگر بالکل ناکارہ! اماں میراں نے ایک سخت اور کٹھن وقت جھیلا تو اپنی جوان اولاد کی نااہلی کے سبب...... شوہر کو اچانک دل کا دورہ پڑا تھا ان کی شہر کے وسط میں الیکٹرک کے سامان کی چلتی ہوئی دکان تھی، بس اس کا کرایہ آ جاتا تھا جو ڈوبتے کو تنکے کے مترادف تھا۔

بڑے بھیا، باپ کی زندگی میں ہی دنیا کے کان کترتے پھرتے تھے، کسی کو ٹھگ لیا، کسی کا کچھ اڑا لیا، کسی سے رقم اینٹھ لی۔ اچھے بھلے تھے، مگر کام کے نام سے گم صم ہو جاتے، گھر کے وسط میں ہال کمرے کا ایک گوشہ سدا ان کے دم سے آباد رہا۔ جہاں وہ اکثر گھٹنوں میں منہ دیے بیٹھے نظر آتے۔

اماں میراں کے گھر میں غربت مگر محبت و اپنائیت تھی۔ ان کے گھر سے ہمارے گھر کی دیوار ملی ہوئی تھی۔ پھر ایک وقت آیا کہ صحن کی درمیانی دیوار میں دروازہ کھلوا لیا گیا، یہ اس وقت کی بات تھی جب ابا میاں کو کسی دفتری کام سے شہر سے باہر جانا پڑا تھا۔ اماں میراں ہمارے ہی گھر سوتی تھیں، امی اکیلے میں ڈرتی تھیں۔ اماں میراں چھوٹے کو اپنے صحن میں لے جاتیں پھر امی اور چھوٹے کی مالش اور دیگر مدارات ایک ساتھ ہی ہوتیں۔ ہم چاروں بہن، بھائی اماں میراں کے ہاتھوں میں پلے بڑھے تھے۔ ہمارا سارا بچپن ان ہی کے آنگن میں کھیلتے گزرا۔ یہاں تک کہ امی اولاد کی طرف سے بے فکر رہتیں۔

وسیم میرے بڑے بھائی سے کچھ چھوٹا اور مجھ سے بڑا تھا۔ امی اور میرا چھوٹا بھائی زبیر ایک ہی پالنے میں جھولتے تھے۔ انیس، بیس کا فرق تھا اور سب سے چھوٹی بہن عائزہ کو تو پالا ہی آپا ننھی نے تھا۔ ان کے سارے لاڈ چاؤ وہی اٹھاتی تھیں۔ گلابو مجھ سے کافی بڑی تھی مگر میرا زیادہ تر وقت اسی کے ساتھ گزرتا تھا۔ بچپن میں پولیو کے اٹیک سے اس کی ایک ٹانگ متاثر ہوئی تھی۔ ذرا سا تیز زمین پر رکھتی تو سارا جسم جھٹکا کھاتا تھا۔ مگر رنگت گلابوں کو شرماتی تھی جبھی اس کا

URDU TUBE
Digitized by Google

نام گلابو پڑا۔ اماں میراں نے ہم چاروں بہن، بھائیوں اور اپنی اولاد میں کبھی فرق نہیں رکھا۔ کھانے کا وقت ہوتا، چٹنی بھی ہوتی تو سامنے رکھ دی جاتی۔ سوئے تو ساتھ ہی سلا لیا، ہم چاروں بہن، بھائی وہاں جا کر واپسی پر آمادہ نہیں ہوتے تھے، اپنے گھر کی اچھی بھلی چھوڑ کے وہاں کی چٹنی روٹی میں بھی خوش رہتے۔ رات زیادہ پڑتی تو ابا میاں ہمیں لینے پہنچتے، میں اماں میراں کی گود میں منہ چھپا لیتی۔ میں اور چھوٹا زبیر اکثر وہیں سو جاتے تھے تب بڑے یا چھوٹے بھیا ہمیں گود میں اٹھا کے گھر تک چھوڑنے آتے۔ اماں میراں کا زیادہ وقت ہمارے گھر گزرتا تھا۔ امی کو کہیں جانا ہوتا ہم اماں میراں کے پاس رہتے اور کبھی جو امی کے ساتھ وہ بھی جاتیں تو مانو ہم سب کی عید ہو جاتی۔ ہنڈ کلیا پکتی، بڑے سارے صحن میں کھیل کھیلے جاتے، آپا ننھی کے ہاتھ میں خوب ذائقہ تھا، وہ بچوں میں بچی بن جاتیں، اماں میراں، امی اور چھوٹے کو ساتھ لٹا کر کہانیاں سناتیں، ان کے ہاتھ کا ذائقہ بھلائے نہ بھولتا تھا۔ کیا بڑھیا بڑیاں توڑتی تھیں، کڑھی کوفتہ اور گجر بھتا اور ان کے ہاتھ کے تر تراتے پراٹھوں کا تو جواب ہی نہیں تھا۔ کیا وقت تھا کہ ہم سب اسکول یونیفارم میں قطار بنائے ان کے کچن میں بیٹھے ہوتے، امی زبیر، میں اور گلابو ساتھ بیٹھتے، آپا ننھی پرات میں پیڑے لگاتی جاتیں، اماں میراں توے سے کرارے پراٹھے اتارتی جاتیں، ہم کھاتے جاتے، اماں میراں ہی عید تہوار پر ہم سب کو حسب فرمائش مہندی لگاتیں میری اور عائزہ کی ننھی ہتھیلیوں پر مچھلی بنانے کے لیے مہندی کی پتی بنا کے چاند رات کو مٹھی میں دبا کر ہاتھوں پر پلاسٹک چڑھا تیں، رنگ تو خوب کھلا ہوا آتا۔ مگر ہاتھ بھیج جاتے، تب اماں میراں ہی چولھے پر ہمارے ہاتھوں کی سنکائی کرتیں، آج میرے، عائزہ اور گلابو کے بال جو گھٹنوں کو چھوتے تھے تو یہ اماں میراں کی محنت کا کمال تھا، وہی جمعرات کو تیل رگڑ، رگڑ کر اگلی صبح اسٹول پر بٹھا کر ہمارے سر دھلاتی تھیں۔

وسیم ان دنوں میٹرک کر رہا تھا، یہاں تک بھی رو پیٹ کر پہنچا تھا، اس سے کچھ اچھی امید تھی، وہ شروع ہی سے حساس و ذمے دار تھا، گھر کا خیال کرتا، محنت کش مگر تھوڑا کند ذہن تھا...... امی پڑھائی میں بہتر تھا مگر کبھی اس کے پاس جوتا نہ ہوتا کبھی فیس؛ وہ شرم سے منہ چھپا کر گھر میں پڑ جاتا۔

وسیم فیل ہوا تو اماں میراں نے اسے اسکول سے اٹھا کر سائیکل مرمت کی دکان پر بٹھا دیا۔ دن بھر وہ سائیکل مرمت کی دکان پر پنکچر لگاتا، ہوا بھرتا، شام میں سبزی والے کی دکان بند کرواتا، جس کے عوض اسے بیس روپے ملتے تھے۔ مانو اس وقت وسیم گھر کی گاڑی کھینچتا تھا۔

خود اماں میراں کو جو کام ہاتھ لگتا پکڑ لیتیں، لحاف میں ڈورے ڈالنا، چارپائیاں بنتا...... وہ اجرت پر کلابتو کی بیلوں پر ستارے ٹانکتیں اور اکثر اپنا سامان وہیں اٹھا لاتیں، امی کی وہ سنگی ساتھی بھی تھیں اور مشیر خاص بھی۔ گھریلو امور سے لے کر خاندانی معاملات تک...... وہ امی کی دست راست تھیں۔ ابا میاں سرکاری محکمے میں ملازم تھے، پیسے کی ریل پیل نہ سہی خوشحالی ضرور تھی۔

امی اس پورے گھرانے کا خاص خیال رکھتیں کہ دیوار سے دیوار ملی تھیں۔

مگر اماں میراں خوددار تھیں، امی نے ان کا بھرم کبھی نہ توڑا۔ ہمیشہ اچھی اور بہتر چیز سے نوازا۔ مگر بیوگی کے بعد اماں میراں مجبور ہو گئی تھیں۔ ایک بار امی نے سالانہ امتحان کے بعد بچوں کا پرانا سامان پھیری والے کو دیا تو انہوں نے دیکھ لیا۔

اماں میراں کا دکھ ان کے چہرے سے جھلکنے لگا۔

”ہمیں ہی دے دیتیں، جوتے کی وجہ سے امی دو دن سے اسکول نہیں جا رہا ہے۔“ امی نے امی کو نیا جوتا دلوا دیا مگر پھر استعمال شدہ چیزیں بھی انہیں دینے لگیں۔ کوئی بھی چیز پکاتیں، پڑوس میں ضرور بھیجتیں۔ اکثر تو اماں میراں ہمارے گھر ہی ہوتیں، امی برابر سے نوازتیں، وہ ہر چیز بیٹیوں کے لیے پلو سے باندھ لیتیں۔ کبھی، کبھی آنکھوں میں آنسو بھر لاتیں۔

”دو جوان کڑیل بیٹوں کی ماں ہوں، باپ کا سایہ سر پر نہیں رہا۔ اسی کی دکان چلا لیتے تو کاہے کو روٹیوں کے لالے پڑتے۔ مگر اپنی مستی میں مست ہیں، بڑا اوباش لڑکوں میں بیٹھنے لگا ہے۔ باپ کی زندگی میں ہی اس کے لچھن بگڑ گئے تھے اور چھوٹے کو تو جیسے دنیا سے سروکار ہی نہیں ہے، دو جوان بہنوں کا ساتھ ہے مگر آنکھیں بند کر رکھی ہیں، نہ جانے اس کا کیا بنے گا؟“ چھوٹے بھیا ایسے ہی تھے، نہ کسی کے اچھے میں نہ برے میں...... برسوں سے ایک ہی رخ پر بیٹھے، بیٹھے ان کی کمر دُہری ہو گئی تھی...... اماں میراں زیادہ بھاؤ کھاتیں تو ان کے آگے سے روٹی کھینچ لیتیں اور چھوٹے بھیا ٹھہرے سدا کے گھنے میسنے...... یونہی گم صم بیٹھے خلاؤں میں گھورتے رہتے، دو چار وقت گزرتے، ان کا منہ گھٹنوں تک لگ جاتا، اماں میراں کا دل پسیج جاتا، روٹی پھر ان کے آگے آ جاتی۔ لو جی چکی ہوئی پھر کام کو جاتی تھی ان کی جوتی، آپا ننھی نے بھلے وقتوں میں میٹرک کیا تھا مگر اماں میراں جوان لڑکی کو گھر سے نکالتے ڈرتی تھیں، مبادا بھٹک جائے، زمانہ خراب ہے، دنیا دوسرے کی مجبوریوں کو کیش کرنے کی تاک میں رہتی ہے بات تو سچ تھی، آپا ننھی گھر بیٹھے ہی اجرت پر کشیدہ کاری، سلائی کرتیں، گلابو گھر سنبھالتی۔

اماں میراں نے اس کی معذوری کے سبب چولھا چوکی اونچے تخت پر رکھا تھا تا کہ وہ کھڑی ہو کر آرام سے کام کر سکے۔ میں اس کے ساتھ، ساتھ لگی رہتی، کچن کے سارے کام میں نے گلابو سے ہی سیکھے...... وہ میری سلائی کی سنگی سہیلی تھی۔

شام گئے جب وسیم، سبزی کی دکان بند کروا کے لوٹتا تو اس کے پاس کچھ بچی کچھی سبزی وغیرہ اور بیس روپے ہوتے تھے، اماں میراں کا سارا گھرانا رات کے کھانے کے لیے وسیم کا منتظر رہتا تھا، بیس روپے ہاتھ کے خرچ ہو جاتے، بچی کچھی سبزی سے رات کے کھانے کا آسرا بنتا، امی کی تعلیم مہنگی پڑنے لگی تو اسے بھی اسکول سے اٹھا کر سنار کی دکان پر کام سیکھنے کو بٹھا دیا۔ اسے ہفتہ ملنے لگا تھا اماں میراں نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے کہ مکان کے دو پورشنز کر کے ایک حصہ کرایے پر اٹھا دیں تو کچھ آسرا بنے مگر اس کے لیے بھی تو رقم درکار تھی۔ دکان بیچنے پر وہ کبھی آمادہ نہیں ہوئیں، آپا ننھی کے لیے اماں میراں کی نظریں خاندان والوں کی طرف تھیں تو یہ ان کی خام خیالی تھی۔ رشتے دار ایسے ہوتے تو ر لا کا ہے کا تھا۔

جو خیر سے تعلیم یافتہ تھے تو اعلیٰ عہدوں پر جا بیٹھے، کھاتے پیتے گھرانوں کے تھے، پرواز بھی اونچی تھی، آپا ننھی کم تعلیم یافتہ، معقول صورت تھیں۔ پھر ان کے گھر سے کیا ملتا۔

اماں میراں کو اپنی ہر اولاد کی شادی کا چاؤ تھا، انہوں نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے، لاکھ سر پٹخا کہ کسی طرح بڑے چھوٹے ٹھکانے لگ جائیں ہر ماں کی طرح وہ سوچتیں کہ ممکن ہے شادی کر کے سدھر جائیں مگر یہاں تک کبھی نوبت ہی نہیں پہنچی، خاندان کی لڑکیاں تو رہیں ایک طرف، انہیں کبھی دوسرے نے بھی نہ سیٹھا۔

دونوں میں سے کسی کا بھی رشتہ لگتا، کوئی عقل کا اندھا اور گانٹھ کا پورا ان کو بیٹی دینے کے لیے آن ہی پھنستا تو معلومات کے مرحلے پر محلے والے بڑے بھیا اور چھوٹے بھیا کے وہ، وہ کچے چٹھے کھولتے اور کھل کر وہ اوصاف بیان کرتے کہ جو اُن میں تھے بھی نہیں...... ہر کوئی کانوں کو ہاتھ لگاتا، سو چھوٹے و بڑے بھیا کا گھر کبھی نہیں بس سکا...... سنا تھا کہ بڑے بھیا نے کسی دور افتادہ گاؤں میں سرسبز باغ دکھا کر شادی کر بھی لی تھی۔ گاؤں کے لوگوں کو تر نوالہ سمجھ کر نگلنے کی کوشش کی مگر وہ حلق میں اٹک گئے، بڑے بھیا کی اصلیت جلد ہی کھل کر سامنے آ گئی۔ سو وہ شادی زیادہ نہ چل سکی۔ اس کے بھائیوں نے گن پوائنٹ پر طلاق نامے پر دستخط کروائے تھے اور لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ آپا ننھی کی شادی کا بھی پروردگار نے خوب وسیلہ بنایا۔

ریٹائرمنٹ پر فنڈ و گریجویٹی کے حصول پر ابا میاں اچھا بھلا مکان ڈھا کر اسے جدید طرز پر تعمیر کرنے پر تل گئے۔ تو ہمیں کچھ عرصے کے لیے دوسرے علاقے میں مکان کرایے پر لینا پڑا۔ وہیں امی کی ملاقات شاہ جہاں سے ہوئی تھی جو اپنے بھائی کے لیے خوب صورت و معزز خاندان کی لڑکی کی تلاش میں تھیں، آپا ننھی خوش شکل، ہنر مند و سلیقہ شعار تھیں۔ صورت شکل لاکھوں میں ایک کہلائی جا سکتی تھی۔ اماں میراں کی آنکھیں رشتے داروں کے سوال کی راہ تکتے پتھرا گئی تھیں۔ ایک، ایک کر کے سب ٹھکانے لگ چکے تھے، جو بچ رہے، وہ آپا ننھی کے جوڑ کے نہ تھے، رشتہ معقول تھا، لڑکے کی اپنی ٹیلرنگ شاپ تھی، خود

ٹیلر ماسٹر تھا، اماں میراں کو بھلا اور کیا درکار تھا۔ سو قمر الدین کے رشتے کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اگرچہ غربت چٹ منگنی پٹ بیاہ کی اجازت نہ دیتی تھی۔ مگر اب تک کچھ نہ جڑ سکا تھا تو سال دو سال میں کیا جڑتا تھا۔ سو معاملہ آپا ننھی کے نصیب پر رکھ کر جھٹ بسم اللہ پڑھی اور واقعی خوب رہی۔

آپا ننھی نصیب کی دھنی بھی نکلیں، خیر سے بیاہ کر بھرے پرے سسرال میں گئی تھیں۔ خالص روایتی سسرال...... شروع کے دو چار سال تو ظاہر ہے گھٹ گھٹ کر گزارے مگر آپا ننھی بھی حرفوں کی بنی تھیں، بالآخر میاں کو مٹھی میں کرلیا۔ جوڑ توڑ کر کے چپ چپاتے سر چھپانے کا ٹھکانا بنالیا۔ اور سسرال کو خدا حافظ کہہ دیا۔

قسمت کی دھنی تھیں کہ اک کاٹھ کا الو میسر آ ہی گیا تھا۔ اب اپنا گھر تھا، اپنا راج...... رب نے انہیں لگاتار بیٹیوں سے نوازا تھا، تب کہیں جا کے لاکھ منتوں مرادوں کے بعد سپوت کی شکل دکھائی دی تھی۔

اماں میراں کی زندگی میں ہی الیکٹرک کے سامان کی دکان فروخت ہوگئی تھی، کچھ پیسہ لگا کر مکان کی حالت بہتر بنائی، کچھ پیسے سے امی و وسیم کو ان کے حسب پسند کام شروع کرادیے۔ خیر سے دونوں اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے۔

امی کا دل عائزہ پر تھا، وہ شروع سے ہی ایسی تھی۔ اندھیرے میں بٹھادو تو اجالا ہوجائے مگر وہاں دلی دور تھی۔ عائزہ کو سگے تایا نے مانگ لیا۔ وسیم، یاسمین کے گھر والوں کو بھا گیا۔ سو سیدھے سبھاؤ اسی پر جال ڈالا گیا تھا۔ وسیم کو پھر بھی اوقات سے بڑھ کر ملا تھا، یاسمین شکلاً اس سے بہتر بھی تھی...... سو اچھی بنی رہی تھی۔ امی پیروں پر کھڑا ہوا تو نکہت نے پھنسالیا جو اپنے نام کی ایک ہی تھی۔

اماں میراں مرتے دم تک ان بے جوڑ شادیوں کے غم میں کلستی رہیں، رو پیٹ کر گزری زندگی کو بری بھلی چھاؤں نصیب ہوئی تو پھل کھانے کو اماں میراں زندہ نہ رہیں، ان کے دل میں ہر اولاد کا دکھ پلتا تھا، اک روز سوئیں تو سوتی کی سوتی ہی رہ گئیں۔

آپا ننھی کی شادی کے بعد ان کی زندگی کا بڑا حصہ میکے میں گزرا تھا۔ ہل کر پانی نہ پیتیں، پاس پڑی تیلی بھی گلابو سے اٹھواتیں، یونہی تو نہیں آپا ننھی پر منوں کے حساب سے چربی چڑھ گئی تھی۔

مگر یہ تب کی بات تھی جب اماں میراں زندہ تھیں، اب میکے میں بھاوجوں کا راج تھا، آنے بہانے پڑ کر خدمتیں کروانے کے مزے ختم ہوگئے تھے، اب چولہا چوکی الگ تھا، آپا ننھی آتیں تو اپنا پکاتیں، اپنا کھاتیں اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سدا اپنے نصیبوں کو روتی لوٹی تھیں، ہر بار کوئی نہ کوئی شوشا چھوڑ کے جھڑپ لازمی تھی۔

امی کا فرمان بجا تھا، اماں میراں کی آنکھ بند ہوتے ہی سارے تانے بانے بکھر گئے تھے۔ بہت سی چیزیں بہت غیر محسوس انداز میں ہمارے آس پاس سانس لیتی ہیں، ہمارے اندر پلتی، پنپتی اور ہمارے ساتھ چلتی ہیں۔ میرا اور گلابو کا ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔ نادیدہ مگر دور، دور تک پھیلا ہوا۔ اس کی زندگی کھلی کتاب کی طرح مجھ پر عیاں تھی۔ وہ اپنا ہر دکھ سکھ مجھ سے کہتی، ابھی دن ہی کتنے گزرے تھے۔ جب اس نے ہمیشہ کی طرح میرے پاس آکر دکھڑا رو دیا تھا۔

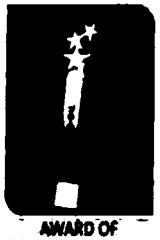

"آپا ننھی کی نظروں میں کوئی بڈھا کھوسٹ سا گیا ہے۔ پوتا، پوتی، نواسہ، نواسی والا مگر ہے مال دار...... وہ کہتی ہیں میں عیش کروں گی۔ اور ایسے رشتوں پر ناک بھوں چڑھاؤں تو سننے کو ملتا ہے کہ مجھے آسمان سے شہزادہ اترنے کا انتظار ہے۔ کچھ شرم کرلو، چالیس کی ہونے کو آگئی ہو، کون پوچھے گا جو دو چار سال اور گزر گئے تو......؟ عظیم عرف امی اور وسیم تم سے چھوٹے ہیں مگر گھر بار والے ہوکے بھی پرانے ہوچکے۔ شادی زندگی کی شرط تو نہیں، کچھ گزر گئی کچھ اور گزر جائے گی، آپا ننھی کا کہنا ہے، میری شادی کی عمر نکل چکی ہے، اب تو جو ملے غنیمت ہے۔"

"تمہاری شادی کی عمر نہیں، ان کا مطلب نکل چکا ہے، بچے پل پلا کر جوان ہوگئے۔ اب تمہارا مقدر پھوٹے یا کھلے...... انہیں کیا۔"

"سچ کہتی ہو، تبھی تو وہ آئے روز جوڑے چار جو ہاتھ لگے پکڑ لاتی ہیں تاکہ اونے پونے مجھے بھگتا کر جان چھڑائیں اور میں پھوٹی قسمت لے کر لوٹ آؤں تو الزام میری قسمت کے سر تھوپ کر سب اپنا الو سیدھا کرتے رہیں۔"

"کاش یہ عقل تمہیں پہلے آجاتی مگر تمہیں تو بچے، بچے کی خدمت گزاری کا شوق ہے ناں......"

Digitized by Google

"ارم......! میری ہڈیاں چٹخنے لگی ہیں، ان لوگوں نے یا تو میرا نصیب پھوڑ دینا ہے یا پھر آنے بہانے کر کے اچھے رشتوں کو ٹالتے رہنا ہے، بڑی تو چاہتی ہی نہیں کہ میری شادی ہو اور نکہت چاہتی ہے کہ رشتہ گھٹیا سے گھٹیا ہو تا کہ کم سے کم میں جان چھوٹے۔"

"شادی کے معاملے میں سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے، اس بات کو اچھی طرح جھاڑ جھنک کر اپنے دماغ کی کھونٹی پر ٹانگ لو۔"

"مجھے پتا ہے، آج کل اچھی بھلی لڑکیوں کے لیے رشتوں کا کال ہے۔ رشتہ آ جائے یہی غنیمت ہے، کتنی خوش نصیب ہو تم جو وقت پر بیاہی گئی ہو۔"

"ہاں...... مگر میں تمہاری طرح احمق نہیں ہوں۔"

"اور کیا...... تم نے چار حروف جو پڑھ رکھے ہیں۔"

"اچھا، یہ کہاں درج ہے کہ عقل صرف تعلیم والوں کی جاگیر ہے؟"

وہ لاجواب سی نظر آئی تو میں نے مزید کہا۔ "تمہیں ہزار بار سمجھایا ہے؟ یہ رشتے مصنوعی ہوتے ہیں، ان کو اپنانے میں ساری زندگی گزر جائے تب بھی کہیں نہ کہیں غیریت دکھا ہی جاتے ہیں۔"

"تو بہن کون سی سگی ہے، آپا ننھی کی اولاد پال کر جوان کر دی مگر چار روز رہنے چلی جاؤں تو اس کا میاں... نوالے گننے لگتا ہے، اور آپا ننھی سے تو اللہ ہی سمجھے، وہ تو چار دن رکھنے کی بھی روادار نہیں کہ جوان مرد کا ساتھ ہے، اس کی نیت بھی پھسل سکتی ہے۔"

میں پل بھر کو لاجواب ہو کر رہ گئی تھی۔

"ارے تو کسی حکیم نے نسخے میں لکھا ہے کہ ان کے آگے پیچھے پھرو، دفع کرو، منہ لگانا ہی چھوڑ دو، تمہیں کچھ مل جاتا ہے کیا؟"

"ارم......! میرا دل بچیوں میں پڑا رہتا ہے، اپنے ہاتھوں پال پوس کر جوان کیا ہے۔"

"بس یہیں تو انسان مات کھاتا ہے، محبت مار دیتی ہے۔"

خیر یہ تو میری آنکھوں دیکھی بات تھی، بچیوں کی کسی بھی ضرورت پر آپا ننھی سے پہلے گلابو دوڑتی تھی۔ آپا ننھی کی چاروں بیٹیاں گلابو کا دم بھرتی تھیں، گلابو نے سب کی عادتیں خراب کی تھیں۔ اور سب سے بڑی عروسہ کو تو پالا ہی گلابو نے تھا، نہ ہوتی گلابو تو کون ناشتے، کھانے باندھ کر اسکول، فیکٹری بھیجتا، آپا ننھی کی بدحرامی پر تو کوئی دو حرف پڑھنے یا چار پیسے کمانے سے رہا...... مگر جب پودا پھل دینے قابل ہو گیا تو آپا ننھی سوجوتے لگا، بغل میں داب چلتی بنیں...... چاروں بھانجیاں خالہ کے نام کی مالا جپتیں، عروسہ کسی کمپنی میں جاب کرتی تھی۔ گلابو کی حمایت پر آپا ننھی کو سو بار ڈانٹ دیتی، کبھی چپکے سے مٹھی گرم کر جاتی اور آپا ننھی کا میاں قمر و کلستا کہ گلابو نے اس کی بچیوں کو مٹھی میں کر رکھا ہے، اس نمک حرام کو کون شرم دلاتا کہ کسی کی اولاد پالنا آسان کام نہیں ہے، کوئی یونہی کسی کے گن نہیں گاتا، بیٹھے بٹھائے اپنا نہیں بن جاتا، بڑی جان مارنی پڑتی ہے تب کہیں جا کے درخت پھل دینے کے قابل بنتا ہے،

آپا ننھی کے یہی مزے تھے جو وہ بھاوجوں کے جوتے کھا کے بھی نہ ہلتی تھیں، میکے سے پل بھر کی نہ بنتی پھر بھی پڑاؤ میکے میں ہی رہتا، اگر سو سکھ تھے تو صرف بہن کے دم قدم سے...... بھاوجیں کہاں منہ لگاتی تھیں۔

"ہر بات کی تہ میں اک بات ہوتی ہے اور وہی ساری بات ہوتی ہے جب رشتے مفاد کی زبان بولنے لگتے ہیں تو انسان کی قدر و قیمت گر جاتی ہے۔"

"انسان کی قدر و قیمت اس کی وفا سے ہے، جو جتنا باوفا، اتنا ہی انمول ہے۔"

"خیر یہ تو نہ کہو، کتے کی اوقات دیکھی ہے ناں......"

"اے لڑکی......! زبان کو لگام دو، تم خود کو کتے سے ملاتی ہو، میں سمجھتی ہوں، تمہارا مقدر چھوڑنے میں جو غرض ہے اس کی انت میں لاکھوں کی مالیت کا مکان ہے۔ تبھی تو کہتی ہوں، اپنے لیے خود فیصلہ کرو، یوں دوسروں کے سہارے زندگی دشوار ہے۔" وہ جب بھی ملتی میں اس کی کھوٹی عقل میں یہی بات بٹھانے کی کوشش کرتی۔

"میں ہزار جگہ سمجھوتا کر جاؤں مگر قابلِ قبول تو ہو، اِک معمولی سے نقص کے سبب ایسا سستا سودا؟"

"ہاں، یہ تو خیر نا انصافی ہے، تم کسی پر بوجھ تو نہیں ہو۔" مگر اسے بوجھ ہی سمجھا جاتا تھا۔ کوئی بھولا بھٹکا مناسب رشتہ آ ہی جاتا تو ہزار مین میخ نکال کے رد کر دیا جاتا۔ ایک نہ دو، لاکھوں کا سودا تھا، اتنا کون لاتا پھر مفت

کی نوکرانی ہاتھوں سے نکل جاتی۔

آپا ننھی جو آئے روز آڑے ٹیڑھے رشتے پکڑ لاتیں تو محرک یہی تھا کہ گلابو کم سے کم میں بھگتائی جا سکے۔ بھاوجیں چاہتیں وہ بن بیاہی ہی رہ جائے تو اچھا ہے یا بیاہ کے نام پر بس دکھاوا ہو، اب انسان لاکھ سر پٹخ لے، کھینچ تان کے معاملات تو ایسے ہی ہوتے ہیں، جس میں نقصان سراسر گلابو کا تھا، جس سے ظاہر ہے کہ کسی کو غرض نہ تھی۔ سب اپنی، اپنی دنیا میں مست تھے۔

گلابو کی چھوٹی، چھوٹی ضرورتیں، دکھ بیماری، یہ وہ...... کپڑا، لتا تو کسی نہ کسی طرح سال میں ایک دو جوڑا بن ہی جاتا۔ میں جب بازار جاتی اس کے لیے کچھ نہ کچھ لے آتی۔

ایک روز میں نے اجی کو جا لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ سن کے اجی سے اس کی بیوی کا قبلہ درست کرواؤں گی۔ وہ میرا لحاظ کرتا تھا مگر گلابو کے نام پر بگڑ اٹھتا۔ اب بھی اس نے الٹی مجھ پر چڑھائی کر دی۔

"وہ مجھے بدنام کر کے ہمدردیاں سمیٹنے کو ایسی باتیں پھیلاتی ہے، ورنہ اسے کوئی کمی نہیں ہے۔"

میں اس سے کیسے کہتی، گلابو نے کبھی ایک لفظ نہیں کہا، میری بھی تو آنکھیں ہیں...... انسان کی ضروریات صرف دو روٹی ہی تو نہیں ہوتی مگر اجی بیوی کے کانوں سے سنتا اسی کی زبان بولتا تھا، بارہ من کی دھوبن نے اسے اپنی مٹھی میں لے رکھا تھا۔ میرے دل پر منوں بوجھ آ پڑا...... قدر ناشناسی بھی کیسا عذاب ہے، وہ ہیروں میں تولنے قابل تھی اور مٹی میں رُل رہی تھی اِک اندھیر مچی تھی۔ گلابو کے لیے میری دلگرفتگی سعد پر کھلی تو میں کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

"مشکلات و آلام ہمیشہ اچھے لوگوں کا نصیب کیوں ہوتے ہیں؟"

"بڑے لوگ ان کا بار اٹھانے کے اہل جو نہیں ہوتے۔"

"ہونا تو یہ چاہیے کہ آپا ننھی اسے سمیٹ لیں مگر آپا ننھی کی بھی جائداد کے بٹوارے پر دیدے گاڑے بیٹھی ہیں ابھی ایک نہ دو، چار بیٹیاں بھگتانی ہیں، جو خیر سے ساری کی ساری جوان ہیں۔"

"ہونا تو بہت کچھ چاہیے مگر سب کچھ حسبِ منشا کب ہوتا ہے؟" انہیں بھی افسوس تھا۔

"سب کے اپنے، اپنے مفاد ہیں، لاکھوں کی مالیت کا مکان ہے اسی پر سب نظریں جمائے بیٹھے ہیں، حصہ مل جائے تو دلدر دور ہوں، وارے کے نیارے ہو جائیں۔"

"ایسے ہی وقتوں میں تو کہا جاتا ہے کہ ہاتھیوں کی جنگ میں کھیت تباہ۔"

"سچ کہتے ہیں آپ...... وہاں سب ایک دوسرے کی جڑ کاٹتے پھرتے ہیں، گلابو تو پھر بھی خام پرزہ ہے۔ جسے ٹھکانے لگانے میں سو عذر مانع ہیں، اس کے سر پر ٹوپی رکھ دی جائے تو سارے گھر پر بھائیوں کا قبضہ رہ جائے گا۔ جائداد کا ایک حصے دار کم ہوگا۔ اور جہیز بھی بچ جائے گا۔ گلابو ٹھیک کہتی ہے، ہر بات کی تہ میں اِک بات ہوتی ہے اور وہی دراصل ساری بات ہوتی ہے۔"

"ہم...... ہم...... بیچاری...... بیشتر لڑکیاں والدین کے گزرنے کے بعد یونہی رُل جاتی ہیں، گلابو بھی ایسی ہی لڑکی ہے۔" میرے دل کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ دنیا میں کچھ خوش بخت ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی زندگی میں ان کا اپنا کچھ نہیں ہوتا، گلابو بھی ایسی ہی لڑکی تھی۔

☆☆☆

اگلی بار وہ میری مزاج پرسی کو آئی تھی۔ میں سعد کی فرمائش پر کچن میں کھڑی سوجی کا حلوا بھون رہی تھی۔

"اوہو، آج بڑے لوگ کہاں راستہ بھول پڑے؟"

"تم بیمار تھیں پھر کہاں ممکن تھا کہ میں رہ پاتی۔"

کسی کے پوچھ لینے سے کوئی کھڑا نہیں ہو جاتا۔ مگر وقت گزر جاتا ہے، بات رہ جاتی ہے۔

"تم نے اپنی جان کو کھٹ راگ بھی تو اتنے پال رکھے ہیں۔"

"اب تم جیسی لڑکی کو یہ بتانا پڑے گا کہ رب جن کو پسند فرماتا ہے، انہیں دوسروں کی حاجتیں پوری کرنے کے لیے چن لیتا ہے؟"

"ہم...... م...... سچ کہتی ہو، ویسے ہوا کیا تھا؟" اس نے تشویش سے پوچھا۔

"ٹانگ میں کھچاؤ سا ہو جاتا ہے اکثر سوچتی ہوں ابا میاں کے حکیم کو دکھا دوں۔"

''کہیں میاں کو دولتی تو نہیں جھاڑ دی تھی؟''
''میرے میاں تو بہت ہی شریف آدمی ہیں۔''
''شریف آدمی ہی تو بیوی سے ڈرتے ہیں۔''
''تم کچھ بھی کہو یہ سب محبت کا پھیلاؤ ہے۔''
''ہٹ ہا، کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں ناں وہ لوگ جنہیں کوئی چاہتا، سراہتا ہے، خیال رکھتا ہے۔ میں اگر خود سے اپنا دکھ کہوں تو اپنی ہی بازگشت خود سے ٹکرا کر لوٹ جاتی ہے۔''
''جبھی تو کہتی ہوں تم خود کے لیے خود ہی کوئی فیصلہ کرلو، یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر۔''
''تم نکہت کو جانتی ہوناں...... وہ یوں میری چوکسی کرتی ہے جیسے کسی کے ساتھ منہ کالا کر کے بھاگ جاؤں گی۔''
''اوہو...... یہ تو واقعی بڑی غلط بات ہے۔''
''غلط بات ہے؟ ارے ڈوب مرنے کا مقام ہے، وہ چلتی ہوا پر بھی عیب لگاتی ہے، بہانے ڈھونڈتی ہے، مجھ پر پھبتیاں اڑانے کے...... اور بڑی بھابی کے کان بھرتی ہے وہ الگ...... یوں دونوں کی پل بھر کو نہیں بنتی...... مگر معاملہ سسرالیوں کا ہو تو یوں ہم زبان رہتی ہیں کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔''
''دنیا کی آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی ہے، یاسمین اور نکہت کا کردار بھی دنیا پر عیاں ہے، خود اُن کی ہسٹری اگر کھنگالی جائے تو سارے بال سیاہ ہیں۔''
''ارم، اس گھر میں میرا دم گھٹنے لگا ہے، بہت محبوس فضا ہوگئی ہے۔''
''انسان کسی کی طرف ایک انگلی اٹھاتا ہے تو باقی کی چار انگلیاں خود اسی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔'' میں نے اپنے تئیں اسے تسلی دی تھی۔ مگر اس وقت بھول گئی کہ جب حبس و گھٹن بڑھ جائے، روزن بھی تبھی کھلتے ہیں۔
''سنتے ہیں کہ وقت جیسا بھی ہو بدلتا ضرور ہے مگر نہ بدلا تو میرا نصیب......''
''تمہاری جاسوسی پر کسی کو مامور کیا جائے تو پتا ہے کیا خبر لائے گا؟''
''یہی کہ اپنی زندگی میں، میں خود کہیں نہیں ہوں۔''
''یوں بچے، بچے کے آگے پیچھے پھر، پھر کے تم خود کو منوا بھی لو تو تمہیں کون سا تمغہ یا میڈل مل جائے گا۔''
میں غصے سے کہہ رہی تھی۔
''کوئی تمغہ یا میڈل مل بھی جائے تو کس کام کا...... میری زندگی کا تو ناس ہو جائے گا ناں......''
''ہو جائے گا کیا...... ہو رہا ہے، جنہوں نے اپنی ماں کو نہ سمجھا، تمہیں کیا خاک سمجھیں گے۔''
''ٹھیک کہا جب سر سے سائبان اٹھ جائے تو ایسے آزار خود بخود قسمت میں آن پڑتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ صرف ہم ہی بھگت رہے ہیں مگر ایسی کہانیاں ہر تیسرے گھر میں نظر آتی ہیں۔''
''تم کچھ بھی کہو مگر میں جانتی ہوں، دائرہ اس نکتے سے شروع ہو کر واپس اسی نکتے پر ختم ہوتا، اس سارے پھیلاؤ کا لب لباب بھی یہی ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ بس تم اپنی جگہ مضبوط اور پختہ رہو، اللہ کے ہاں ہر کام کا اِک وقت مقرر ہے۔''
''مگر کب...... ارم......؟''
''گلابو! وہ اپنے بندوں کی احتیاجات سے غافل نہیں ہے۔''
''سچ کہتی ہو مگر ایسا لگتا ہے کہ زندگی بس بیچ منجدھار ہی میں چکر پھیریاں کھاتی رہے گی۔ جیسے سب کے دلوں پر مہر لگ گئی ہے، برا وقت ٹھہر کیوں جاتا ہے؟ گزرتا ہی نہیں۔''
''یونہی تو نہیں کہا گیا کہ اندھیرے میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔''
''اچھا، حلوا کھاؤ گی تیار ہے۔''
''کھلانے والے پوچھتے نہیں، لا کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔'' بات ٹھیک تھی، میں نے ایسا ہی کیا۔
''یہ سب مصنوعی رشتوں کا عذاب ہے، انسان ان کو اپنانے میں زندگی رگڑ دیتا ہے، تب بھی یہ کہیں نہ کہیں غیریت دکھا ہی دیتے ہیں۔''
''اب اس سے بڑھ کر اور کیا عذاب ہوگا، آسمان اپنا ہے نہ قدموں تلے کی زمین...... پرائے تو خیر اپنے ہو ہی نہیں سکتے، اپنے بھی منہ پھیر کے چلتے ہیں، آپا ننھی کو اب اپنی بیٹیوں کی فکر پڑ گئی ہے، میں تو میں کام کے لیے نظر آتی ہوں، ہر وقت ادھار کھائے بیٹھی رہتی ہیں، جہاں میری شکل پر نظر پڑی اور ہاتھ کا کام چھوڑ دیا۔'' گلو، آ گئی

گلو، لے آٹا گوندھ کے روٹی پکا دے۔'' بیٹیوں کے لیے فیکٹری، اسکول اور کالج کے بہانے چلتے ہیں، دنیا کا کوئی کام لگتا ہے، ان کے لیے بنا ہی نہیں۔'' میں خوب جانتی تھی، وہ کتنے پانی میں ہیں، کبھی جو دو گھڑی کو بھی میکے آتیں، گلابو کے پاؤں میں چکر سے بندھ جاتے، کیا مجال جو گھڑی بھر کو ٹکوا لگنے دیں۔ گلابو کو گھر کے کاموں سے فرصت ملتی تو بچیوں میں گھری رہتی۔ آپا ننھی کی بچیاں وسیم اور یاسمین کی بچیاں، جو اس کی جان کھا کر رکھتیں۔ دیوار پار سے بھانت، بھانت کی بولیاں سنائی دیتیں، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سیکڑوں پھٹکاریں پڑتی تھیں، آپا ننھی، بیٹیوں کی مرداری پر انہیں کوستی، پیٹتی ہی سنائی پڑتیں۔
''کبھی سوچا ایسے کیسے گزرے گی؟''
''شاید یونہی کنواں کھود کے پانی پیتے، ارم خواب اور خواہش میں اتنا فاصلہ کیوں ہوتا ہے؟''
''تم پاگل ہو، خواب اور خواہش تو ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں، فاصلہ تو خوب و خواہش سے حقائق تک ہوتا ہے، انسان حقائق پر نظر رکھے تو خواب و خواہش کی پامالی سے شکستہ نہ ہو۔''
''ہم...... ویسے تم اس حلوے کو تھوڑا اور بھون لیتیں تو تمہارے کتنے پیسے خرچ ہوتے؟''
''مجھے پتا ہے، تم زیادہ افلاطون ہو، خاموشی سے کھالو۔'' میں اس کے مزاحیہ انداز پر مسکرائی تھی۔
''تمہارے ہاتھ میں ذائقہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔''
''وقت کے ساتھ انسان کا مزاج اور معیار بدلتا ہے، شادی سے پہلے سعد...... میٹھے کے نام سے کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے، اب فرمائش کر کر کے بنواتے ہیں۔''
''دیکھا، یہ ہوتا ہے کُک کا کمال......'' میں ہنس دی۔ ''لوگ کام کے نام سے سو بہانے کرتے ہیں، اتنی خدمت کسی اور کی کرلو تو کچھ پیسے ہی مل جائیں گے، غارت کرو، مٹی ڈالو ایسے نصیب پر، ہمارے گھر کا شیرازہ بکھر جانے دو۔''
''تا کہ صبح شام آپس میں جوتے چلیں؟''
''تو وہ تو اب بھی چلتے ہیں۔''
''ہم میں تو نہیں...... ہوناں......''
''گلابو اپنے لیے کچھ کرو......''
''اور اگر نہ کروں تو......''
''تو میری جوتی ہوگی اور تمہارا سر...... ٹھیک ہے؟''
میری بات شاید اس کی عقل میں سما گئی تھی جبھی کچھ دنوں بعد سننے میں آیا کہ گلابو نے علاقہ پرے کسی بنگلے میں کوئی کام پکڑ لیا ہے۔ میں نے سکھ کی سانس لی۔

☆☆☆

انہی دنوں لٹو سے گلابو کے تعلقات کی دھول اڑی۔ اولاً تو میں نے کان ہی نہیں دھرے۔ فلک پر تھوکنے والی بات تھی مگر دھول اڑتی رہی، اڑتی ہی رہی...... میں نے سوچا اسے بلا بھیجوں مگر وہ خود ہی چلی آئی۔
''مجھے پتا تھا کہ تم ضرور آؤ گی، خوشبو بتا رہی تھی کہ تم راستے میں ہو۔''
''جانے بھی دو یہ مکھن بازیاں......''
''اچھا، تو میری محبت تمہیں مکھن بازی نظر آتی ہے؟''
''تو اور کیا...... تمہیں تو کبھی نصیب نہیں ہوتا کہ میکے آؤ تو پڑوس میں بھی جھانکی مار لو......''
میں چپکی رہ گئی، اب اسے کیا جتاتی کہ پڑوس کے لیے قدم اٹھتے بھاری پڑ جاتے۔ نکہت کا منہ چڑھا رہتا وہ آئے گئے کو منہ لگانے کی قائل نہیں تھی، کبھی دو انگل کا سلام تک نہیں نصیب ہوتا، اگر جو کبھی بھولے بھٹکے جانا پڑ ہی جاتا، میں کبھی خوش ہو کے نہ لوٹی یہاں وہاں سے گلابو کی پکاریں پڑتی ہی رہتیں۔
اور یہ کل ہی کی بات تھی۔ میں ابا میاں سے ان کے دیرینہ حکیم جی کا پتا، ٹھکانا پوچھنے گئی تو لوٹتے سے بس اِک ذرا کی ذرا پڑوس کا دروازہ بھی بجا ڈالا...... گلابو کی بابت پوچھنا تھا، مانو توپوں کا منہ کھل گیا۔
''گلابو کا پتا، ٹھکانا ملتا ہی کہاں ہے، جب اور جہاں من میں سمائی نکل کھڑی ہوتی ہے، آج کل تو یوں بھی بڑے پر پرزے نکلے ہوئے ہیں۔ ہواؤں میں اڑ رہی ہے، بھائیوں کی عزت کی پروا ہے نہ مرے ماں، باپ کا کچھ خیال...... مجھ سے پوچھو، شادی کی آگ لگی پڑی ہے۔ بھائیوں کے ہاتھ پلے ہے ہی کیا...... جو وہ اسے بھگتائیں گے۔ خالی ہڈی کو کتا بھی نہ سونگھے۔'' اور وہ باتیں کہ اٹھائی جائیں نہ دھری جائیں۔ دروازہ کھولنے والی نکہت تھی۔ سسرالیوں کو بے عزت کرتے کے

Digitized by Google

دس گرجس کی جیب میں رہا کرتے تھے، رائی کا پربت بنانے میں جسے کمال حاصل تھا، ہر نئی تازہ رپورٹ مرچ مسالا لگا کر آتے جاتے کے آگے رکھی جاتی۔ وہ کیا جانے کہ اخلاق اور مروت ہیں کس چڑیا کے نام..... اتنی باتیں سن کر تو میں کیا ٹھہرتی سو چپ چاپ چلی آئی۔

''آج کل کہاں گم ہو؟ میں کل شام گئی تو.....''

''جانے بھی دو..... جس کا ٹاکرا نگہت سے ہوجائے، وہ میری سرگرمیوں سے بے خبر رہے، یہ کہاں ممکن ہے؟''

میں لاجواب ہوکر رہ گئی۔

''تمہیں پہلے کیا کم جھمیلے تھے، جو یہ نیا کھٹ راگ پال لیا ہے؟ صرف روٹیاں پکانے میں تمہیں کیا ملے گا؟''

''بس کچھ دنوں کی بات ہے، بنگلے کی مالکہ کسی حال سے ہے، کچن میں اس کا دم الٹتا ہے، شام میں تو میں فارغ ہی ہوتی ہوں، ہر کام پیسے کے لیے نہیں ہوتا، انسانیت بڑی چیز ہے۔''

''ہاں..... لیکن اگر وہ اپنی خوشی سے کچھ دے تو رکھ لینا، تم بھی کوئی حاتم طائی نہیں ہو۔''

''نہ، میری نیکی ضائع ہوجائے گی۔''

پھر میں اس سے پوچھ ہی بیٹھی کہ وہ آج کل ہے کن ہواؤں میں.....؟

''تم نے وہ شعر سنا ہے ناں۔

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے''

''جانے بھی دو، جیسے تمہیں پتا ہی نہیں، ورنہ میں نے تم سے بھی چھپایا ہے؟''

''ارے بھئی..... اتم بتاؤ گی تو پتا چلے گا ناں.....''

''سچ بتاؤں یا جھوٹ بولو.....؟'' وہ نظریں چرا گئی۔

''سچ ہی کہہ دو، جھوٹ تم کہاں سنبھال پاؤ گی؟''

''تو سمجھ لو کہ تم نے جو کچھ سنا ہے ٹھیک ہی ہے۔''

ظفر... لٹو کے لیے ہمارے کان کچھ اچھی باتیں نہیں سنتے تھے، وہ بدنام زمانہ اوباش آدمی تھا، یہ بتانے والی بات نہیں تھی۔ سوال یہ تھا کہ لٹو سے اس کا ٹاکرا کیسے ہوگیا، مجھے پتا تھا وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپائے گی، اب بھی بتانے لگی، لٹو اسی بنگلے کی گاڑی چلاتا تھا، جہاں گلابو روٹیاں پکانے جاتی تھی۔

''میں نے کہیں پڑھا تھا، اس خوشی سے دور رہو جو کل کو غم کی کائنات بن کر دکھ دے۔''

''چھوڑو یار..... محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔'' اس نے بات اڑانے کی کوشش کی مگر میں اٹک گئی۔

''سچ بتاؤ، یہ محبت ہے کہ دلاسا؟''

''جانے بھی دو، بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی۔'' میں ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی واقعی جب دیواریں بلند ہوں تو حبس اور گھٹن بڑھ جاتی ہے، انسان روزن تلاش کر ہی لیتا ہے، گلابو نے بھی چپکے سے ایک روزن کھول لیا تھا۔

خواہشات کی اسیر خوابوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکیوں کے آزار میں خوب جانتی تھی۔ کسی نے پسندیدگی کی سند بخشی، چند جھوٹے سچے آسرے پکڑا کر سنہرے خواب دکھائے نہیں کہ وہ زیر.....

وہ مضبوط مگر معصوم تھی، مجھے ڈر تھا کہیں لٹو اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھالے۔ اگلی بار میں نے پھر کریدا۔

''اچھا..... اسن وہ کیا کہتا ہے؟''

''یہی کہ اسے مجھ جیسی ہی کسی لڑکی کی تلاش تھی۔ میرے بنا وہ جی نہیں سکتا۔'' اس کی گلابوں جیسی رنگت گہری پڑ گئی۔

میں ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔ شاید یہیں آکے بنت حوا مات کھاتی ہے، کسی نے تعریف کے دو بول کہے نہیں، جھوٹی سچی محبت کا آسرا پکڑا یا نہیں اور ساری دنیا ایک طرف..... مگر گلابو مضبوط لڑکی تھی۔

''میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو بھیجے.....''

''اچھا..... ! ایسے لوگوں کا گھر بار ہوتا ہے کیا۔'' نہ، نہ کرتے بھی میرے منہ سے نکل گیا۔

''گھر والے اس کے ایسے نہیں ہیں، اس کے مخالف ہیں، سمجھو وہ اپنے ہر فیصلے میں آزاد ہے۔''

اب اگر میں اس سے کہتی کہ لٹو کے بارے میں ہمارے کان کچھ اچھی باتیں نہیں سنتے، اس کی شہرت داغ دار ہے، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ اس لیے مذاق میں اڑا دیا۔

''اسے لٹو اس لیے تو نہیں کہتے کہ ہر کسی پر لٹو ہو جاتا ہو؟''

وہ ہنس دی..... اس دن اس نے لٹو کی تصویر دکھائی تھی، اللہ معاف کرے ابکائی آتے، آتے رہ گئی، شکل

صورت تو خیر اللہ کی دین ہے، حلیہ بھی موالیوں جیسا تھا۔

''گلابو! یہ آدمی تمہارے قابل نہیں ہے۔'' میں کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہوتا ہے۔''

میں نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا تو وہاں شکستگی صاف رقم تھی۔

''مگر کبھی، کبھی اِک معمولی سا جز، کل پر حاوی ہو جاتا ہے۔'' وہ لاجواب ہوگئی۔

''کہیں تم یہ تو نہیں سوچتیں کہ اِک برتر آپشن ان کے سامنے رکھ دو تو وہ کسی معقول رشتے کے لیے آمادہ ہو جائیں؟'' میں نے ٹٹولا تھا۔

''مجھے ان سے کسی اچھے کی امید نہیں ہے۔''

''یہ خود پر ظلم کرنے کے برابر ہوگا۔''

''تو اب کون سا میں خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھول رہی ہوں؟''

سعد نے سنا تو بہت ہنسے..... ''شاید اسی لیے محبت کو اندھا کہا گیا ہے۔'' پھر چھیڑا۔ ''کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں ناں وہ لوگ جن سے کوئی پیار کرتا ہے، انہیں یاد کرتا ہے؟''

''اچھا، اب آپ کو بتانا پڑے گا کہ میں خود سے زیادہ آپ کو یاد رکھتی ہوں؟''

''بیوی تو دعا مانگنے کے لیے بھی یاد کر سکتی ہے، کوئی خوب صورت لڑکی اگر یاد کرے تو.....'' انہوں نے بھی ایک ہی کہی۔

''اچھا! تو کیا میں خوب صورت نہیں ہوں؟''

''تم تو گھر کی مرغی ہو ناں.....''

''ہاہ..... لوگوں کو پیسے دو، کچھ بھی بول ڈالتے ہیں۔'' میں نے دل بھر کے برا مانا وہ ہنس دیے؟ پھر گنگنائے۔

''کوئی میرے دل سے پوچھے۔''

''اچھا..... جناب، میں جیتی آپ ہارے۔'' وہ ہنس دیے۔

مگر میرا دل و دماغ گلابو میں اٹکا تھا، حالات کی چکی پھیریوں میں الجھی، اپنوں کی بے حسی کا شکار..... گلابو جیسی لڑکیاں، لٹو نے اسے جھوٹا، سچا آسرا پکڑا دیا تھا۔ وہی اس کے لیے غنیمت تھا۔

لٹو جیسے لوگ کیا خاک کسی سے محبت کریں گے، یونہی گلابو پر جال نہیں ڈالا ہوگا، ممکن ہے اس کے زیر نظر کوئی مفاد ہو، مجھے یہی کھٹکا تھا۔

☆☆☆

اور وہ جو کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے تو یہی گلابو کے معاملے میں ہوا۔ یاسمین و نگہت کی لن ترانیوں کے آگے اچھے اچھوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے پھر لٹو کیا بیچتا تھا۔

اجی نے سنا تو اسے گھر بٹھالیا..... اب روٹیاں پکانے کا کام خاک ہوا مگر مراسم بحال تھے۔ انہی دنوں سننے میں آیا کہ لٹو کی گاڑی رات گئے، گلی کے نکڑ پر آکر رکتی ہے، میں جانتی تھی۔ یہ اصل کو دس کر کے پھیلانے والی بات تھی، گلابو خوابوں کی اسیر سہی مگر عقل یا کردار کی اتنی کھوٹی نہ تھی۔

اور وہی ہوا، افسانہ بنا لیتے ہیں، لوگوں کی تو عادت ہے، سو خوب بھد اڑی مجھے پتا تھا، ان خبروں کو ہوا دینے میں اس کی دونوں بھاوجوں کا ہاتھ ہے، جنہیں مرچ مسالا لگا کر بات پھیلانے میں کمال حاصل تھا۔

لٹو نے رشتہ بھیجا اور رد ہوگیا۔ یہاں معقول و مناسب رشتوں پر ناک بھوں چڑھا دی جاتی، یہ تو پھر لٹو تھا۔

اجی نے مجھ سے کہا۔ میں گلابو کو سمجھاؤں، لٹو کی انکوائری میں گڑبڑ ہے، وہ میری بات مانتی تھی مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے، جب سعد نے مجھ سے تاج الدین کا ذکر کیا۔

''آدمی نیک، شریف مگر مجبور ہے، کوئی آگے نہ پیچھے، بیوی پانچ بچوں سمیت کسی آشنا کے ساتھ فرار ہوگئی۔ گھر کے معاملات سے پریشان ہے، کوئی مراجیتا ہو تو اس کا گھر بسے..... کوئی شرائط نہیں، لنگڑی، لولی بھی جڑ جائے تو غنیمت ہے۔''

''لنگڑی، لولی!'' میرے ذہن میں اِک خیال لہرایا۔

گلابو نامساعد حالات میں گھری تھی، کسی نے کچا پکا آسرا پکڑا دیا تھا۔ وہ رسی پر تکیہ کیے بیٹھی تھی۔ اِک بری راہ سے ہٹانے کے لیے لازم تھا کہ اسے ایک اچھا آپشن دیا جائے۔ میں نے اسی خیال کے تحت تاج الدین کو بلوا بھیجا۔

سعد نے بتایا تھا۔ آدمی نیک، شریف و معقول ہے۔ تاج الدین سچ مچ بھلے آدمی دکھائی پڑتے۔ پانچ

Digitized by Google

وقت ٹوپی لگا کر مسجد سدھارتے، کھنڈر بتاتا کہ عمارت شاندار تھی۔

''میرا وقت بہت اچھا تھا، مکان بنانے کے ٹھیکے لیتا تھا مگر بیوی ساتھ چھوڑ گئی۔ مکان بک گیا مگر مرا ہاتھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے، آج بھی گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے، بس گھر والی کی کمی ہے، اچھے وقتوں میں مالک مکان کو قرضہ دیا تھا، وہ کرایہ نہیں لیتا، جب گھر والی آئے گی، قرضہ واپس لے کر گھر بھی خرید لوں گا۔''

بات سچ تھی، گھر بنانا عورت کا کام ہوتا ہے۔ مرد کی کمائی ہونی چاہیے، ضامن سعد تھے اور بس، یہیں آکر ہر بات ختم ہو جاتی تھی۔ مجھے وہ کچھ بڑ بولا، ڈینگ باز سا لگا مگر غنیمت تھا کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہوتا ہے۔ عمر بھی مناسب تھی بلکہ سچ تو یہ تھا کہ جو بتائی اس سے کم ہی دکھتی تھی۔

میں نے گلابو کو بلا بھیجا، جس کے دماغ پر ہنوز لٹو سوار تھا۔

''تمہارے بھیجے میں اگر رتی بھر بھی عقل ہو تو زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو......''

''زبانِ خلق کسی کو بخشتی ہے کیا؟'' وہ فوراً بولی۔

''اس کی شہرت داغ دار ہے۔'' مجھے کہنا پڑا۔

''ہاں تو بنگلے کی مالک نے اسے چھٹی دے تو دی ہے۔''

''بھاڑ میں جائے بنگلے کا مالک، مجھے تمہاری فکر ہے۔''

''ہر کسی کو لٹو چرسی، موالی نظر آتا ہے، اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں، یہ خود کون سے دودھ کے دھلے ہیں۔''

میں چپ کی چپ رہ گئی۔ بات تو سچ تھی مگر......

''اجی کہتا ہے، وہ مجھے زندہ گاڑ دے گا مگر لٹو سے نہیں بیاہے گا، میں سب جانتی ہوں، یہ ساری آگ قمرو کی لگائی ہے، وہی اجی کے.... الٹے سیدھے کان بھرتا ہے۔''

''مگر رائی ہو تو پربت بنتا ہے ناں......'' میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ سانپ ابھی پٹاری میں تھا، گلابو پر اس کی اصلیت ابھی کھلی نہیں تھی۔

''نگہت کہتی ہے، مجھے ایسا بھی مل جائے تو غنیمت۔ جب سارے لوگ ایک ہی بات کہنے لگیں تو مان لینا چاہیے کہ وہ ٹھیک ہی ہے۔''

''اچھا، یہ کون کم بخت کہتا ہے؟''

نگہت کہتی ہے کسی کی پروا مت کرو، یاسمین کہتی ہے، نشے نے اس کے پھیپھڑے بیکار کر دیے ہیں اور نگہت کہہ رہی تھی کہ یاسمین نے انکوائری میں گڑبڑ کی ہے۔''

''یاسمین کہتی ہے، اجی کہتا ہے، قمرو کہتا ہے۔'' مجھے تو پتنگے لگ گئے۔ ''تم اپنی کہو گلابو تمہارا دل کیا کہتا ہے؟''

''جو سچ پوچھو تو لٹو کے بارے میں سن، سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔'' میں نے سکھ کی سانس لی۔

''تو لعنت بھیجو......چھوڑ دو اس خطرناک کھیل کو احمق! آدمی لڑکیوں کو پھنسانے کے لیے سبز باغ دکھاتے ہی ہیں اور یہ لٹو جیسے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں، بات الٹی پڑتی دیکھ کر اپنی راہ بدل لیتے ہیں، تم معصوم ہو یوں راہ چلتے دو ٹکے کے لوگوں پر رسک نہیں لیا جاتا۔''

''مگر لٹو نے تو رشتہ بھیج دیا ہے۔'' سادگی تو اس پر ختم تھی۔

''پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ، زندگی اتنی ارزاں نہیں ہوتی۔ کبھی، کبھی ہم اپنے ہاتھوں زندگی کو خود سے مایوس کرتے ہیں......اور بعض اوقات دنیا ہماری مجبوریوں کے سبب ہمیں کیش کر جاتی ہے۔''

''میں نے کہا تھا ناں...... مجھے کسی سے کوئی اچھی امید نہیں ہے۔''

''پاگل ہو تم......امید پر تو دنیا قائم ہے۔''

''ہاں......مگر یہ میری زندگی ہے اور اپنی زندگی کا فیصلہ بھی مجھے خود ہی کرنا ہے۔''

''یہ ہوئی ناں بات، کہنے اور کرنے میں فرق ہی کیا ہے، تم نے کہہ دیا، کر بھی ڈالو۔'' میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

''تم سچ کہتی ہو، کمپرومائز کے لیے بھی تو مقابل کا معقول ہونا لازمی ہے۔'' وہ ہاں اور نہ کے درمیان جھول رہی تھی، اب وقت آگیا تھا کہ اسے اِک بہتر آپشن دیا جائے سو میں نے تاج الدین کا پروپوزل اس کے سامنے رکھا۔

'' مجھے بس اس جہنم بھری زندگی سے نجات چاہیے، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔'' میں نے شکر کیا کہ معاملہ ابھی do or die تک نہیں پہنچا تھا۔

''جو چیز تم کو شک میں ڈال دے اس کو چھوڑ دو، آج کل یہی دور ہے تو، تو نہیں اور سہی......اور نہیں اور سہی......''

''سچ کہتی ہو......تم یا سعد میرا برا چاہیں گے کیا؟''

میرے سر سے جیسے کوئی بوجھ اترتا چلا گیا۔

آٹھ سال ہوئے تھے ہماری شادی کو......اور میں خوب جانتی تھی کہ زندگی کے لیے ایک اچھے جیون ساتھی کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔

''ویسے سچ، سچ بتاؤ......وہ رات میں دروازے تک آتا ہے؟''

''بس ایک دو بار......وہ گلی کے نکڑ پر گاڑی روک کر مس بیل دیتا ہے مگر میں نے کبھی دروازہ نہیں کھولا۔''

مجھے اس سے امید بھی یہی تھی۔ مگر کہانی کا اِک نیا باب کھل چکا تھا۔ گلابو کی جانب سے گرین سگنل ملتے ہی میں نے نکہت آپا نتھی کو کال ملائی، نیکی اور پوچھ، پوچھ، انہوں نے سارا معاملہ میرے ہاتھ میں دے کر سیاہ، سفید کا ٹوکرا میرے سر پر دیا تو میں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھے سبھاؤ گلابو کو تاجو بھائی کے سامنے لا بٹھایا۔ اور تاجو بھائی کی تو مانو لاٹری نکل آئی۔

لڑکی کسی کھوہ کی بھی ہو، محبت سے دامن بچانا مشکل ہے، کوئی اسے توجہ و اہمیت دے، لگاوٹ کی نظر سے نوازے، وہ پگھل جاتی ہے، گلابو بھی تو ایک لڑکی ہی تھی۔

''واہ، کیا کہنے بھئی کیا کہنے......کمال کر دیا۔ روزے، نماز کی پابند تو ہے ناں، میں برقع اڑھاؤں گا۔'' تاجو بھائی کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں، ان کی آنکھیں گلابو کے حسن سے خیرہ ہوئی جا رہی تھیں۔ میں جانتی تھی، گلابو دنیا کو جنت بنا دینے والی لڑکی تھی۔ اسی روز میں نے اجی کا گھیراؤ کیا۔ مگر بات اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ ہاہ......تجھ سے پہلے اس گلی میں تیرے افسانے گئے۔ میں نے آپا نتھی سے راز داری کی شرط رکھی تھی، جانے بیل منڈھے چڑھے نہ چڑھے۔ آپا نتھی نے ہی وسیم کو بلوایا اور ساری بات اس کے کانوں میں اتار دی۔

''ہاہ......اس نے اپنی بیوی کو بتایا ہوگا؟''

''جی ہاں......اور اس کی بیوی نے میری بیوی کو بتایا۔'' وہ ہنسا۔

''تو پھر......؟''

''پھر کیا......میری بیوی نے اٹھا لیا ڈنڈا......اور میں نے صاف سیدھا تمہارا نام اگل دیا۔''

''تو کیا میں نے کچھ غلط کیا؟''

''یہ میں نے کب کہا؟''

''تو پھر اعتراض کی کیا تک بنتی ہے؟''

''اعتراض ہے کس کم بخت کو......؟''

''اجی......میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گی۔''

''پہلے شادی تو ہو جانے دو۔'' وہ منہ پھاڑ کے ہنسا۔

اسی اتوار پر دکھوا تھا، ہمیں تاجو بھائی کو لے کر وہیں جانا تھا۔ اجی نے کہا وہ اسی دن نکاح کی تاریخ بھی پکڑا دے گا۔ میری خوشی دُگنی ہو گئی گویا سر سے منوں بوجھ سرکتا چلا گیا۔ امید تھی کہ آگے کی راہ سہل ہو گی۔ میں نے تاجو بھائی کو اچھی طرح سمجھایا تھا کہ بس خدا ترسی والی بات ہے، ایک تنکے کی بھی امید نہ رکھنا، میں نے انہیں خوب پکا کر لیا تھا۔

وہ بات، بات پر رو پڑتے، انہیں پرانی داستان دُہراتے رہنے کا خبط تھا۔ جب آتے گھنٹا بھر مغز چاٹ کر ہی ٹلتے......میرے پاس اتنی فرصتیں کہاں؟

بات پکی ہونے کی رسم پر گلابو کے لیے میں نے تاجو بھائی کی طرف سے خوب صورت کامدار جوڑا خریدا۔ ہار، پھول، گجرے، مٹھائی کا ٹوکرا، تاجو بھائی نک سک سے تیار ساتھ تھے۔ اجی کے سسرال والوں کو تو اللہ موقع دے، ٹوٹ پڑنے کا......پھر یاسمین کا میکا بھلا کیسے پیچھے رہتا......پھر یہاں وہاں سے بھانت، بھانت کے رشتے دار، سب ہی میں کھد بد مچی تھی، گلابو کے نصیب پھوٹے کہ کھلے......

اسی دن تاجو بھائی کا منہ میٹھا اور مٹھی گرم کی گئی۔ آپا نتھی کے میاں قمرو نے ان کا ناپ بھی لے لیا......گلابو پر ٹوٹ کر روپ آیا تھا، تاجو بھائی ایک نظر کے لیے پھڑک کر ہی رہ گئے، بڑا سارا کنبہ تھا، سارا گھر مہمانوں سے اٹا پڑتا تھا، جو دیکھتا، سراہتا اور گلابو کی قسمت پر اش، اش کرتا۔ کیا بڑھیا بر جڑا تھا، بھلا چنگا کھاتا کماتا......نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔

خیر تاجو بھائی شکل صورت اور قد کاٹھ کے بھی ایسے کھوٹے نہ تھے۔ دونوں بھاوجوں کا منہ چڑھا ہوا تھا، اجی نے تمام تفصیلات کے ساتھ سرخ کاغذ پر سنہری حرفوں میں نکاح کی تاریخ گوٹے کناری سے سجے پوش میں رکھ کر سعد کے ہاتھ میں تھمائی تھی۔ صرف پندرہ دن بعد......

''نکاح اسی جمعہ کو نہ پڑھا دیا جائے؟'' مجھے معاملے کی نزاکت کا احساس تھا تبھی دبے لفظوں میں کہنا چاہا۔

نگہت کو جیسے ہزار واٹ کرنٹ لگا تھا وہ بھڑک اٹھی۔

''ہے، ہے ارم! آہستہ بولو، دیواروں کے بھی کان

Digitized by Google

ہوتے ہیں۔" اس نے مجھے یوں دبکا دیا جیسے شیطان نمازی کو تھپکی دیتا ہے۔

"کیوں حرج بھی کیا ہے آخر.....؟"

"بیٹھے، بٹھائے دشمنی مول لینے والی بات ہے، ابھی تو تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔" یا تو اس نے صاف دامن بچایا تھا یا اب بھی امید تھی کہ گلابو، لٹو کی طرف نہ گھوم جائے۔

تف تھی ایسی بدگمانی پر.....تاجو بھائی پھولے نہیں سمارہے تھے مگر خرچے کی بات پر آنا کانی کرنے لگتے۔ چاہتے کہ کم سے کم میں معاملہ نمٹے..... بری کے لیے میں چار جوڑے ویسے میں زیادہ افراد نہ ہوں..... میں نے سیدھے سبھاؤ کہہ دیا کہ اپنی چادر کے مطابق پیر پھیلائیں، مانو ان کی دلی مراد بر آئی۔ اسی شام بری کی تیاری کے لیے بیس ہزار کی رقم میری ہتھیلی پر لا دھری۔

اسی رات نگہت کا لمبا سارا فون آ گیا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو گھنٹا بھر میرے کان کھائے اور مجھ سے بڑھ کر کون جانتا تھا کہ چٹکی لے کر بات اگلوانا نگہت کی فنکاری ہے۔

"دنیا اندھی نہیں ہے، سب جانتے ہیں کہ گلابو یتیم و یسیر معذور لڑکی ہے۔ یونہی کہیں جھونک ماری اور کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو دنیا کیا کیا نہ کہے گی، بھائیوں کو ہی سو، سو جوتے مارے گی کہ یتیم و یسیر لڑکی چھانا پھٹکا؟ نہیں آنکھیں بند کر کے بیاہ دی؟ اور یہ کہ اسے بیاہنا اِک اجی کے سر کا تو درد نہیں..... پہلے وہ کیا کم گھر بھر کو بھگتتا ہے، باقی سب وراثت کے لیے تو سینہ تان کے کھڑے ہو جائیں گے، گلابو صرف اجی ہی کی تو بہن نہیں ہے جو وہ اکیلا اسے بھگتتا پھرے۔"

اس نے راتوں رات تاج الدین کے رشتے میں سو کیڑے چن لیے تھے۔

"گلابو کے لیے رشتے بہتیرے مگر اس کے مزاج ہی کہاں ملتے ہیں اور اسے رشتوں کی ضرورت بھی کیا ہے، اپنی من مرضی پر چلتی ہے..... ایسے ویسوں کو تو گھاس بھی نہیں ڈالتی۔ اپنی اوقات نظر نہیں آتی، اب تاج الدین میں کون سے سُرخاب کے پر نظر آ گئے، بیوی چھوڑ کے بھاگ گئی تو کوئی وجہ ہی ہوگی ناں....." اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو بیسیوں من گھڑت فسانے لٹو اور گلابو کے حوالے سے وہ، وہ باتیں کہ زمین آسمان ایک ہو جائیں۔ میں اس کی سدا کی سنگی ساتھی نہ ہوتی تو اس کی شادی کروانے کے نام سے بھی کانوں کو ہاتھ لگاتی اور اگلا اسٹیشن پکڑتی..... مگر مجھے پتا تھا کہ میری چوں بھی پکڑی جائے گی۔ بات میں کلیاں پھندنے پرو کے حسبِ منشا رخ دینے میں کمال حاصل تھا اسے اور شاید مجھے فون کرنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ من میں تو بہت آئی کہ نگہت کو کھری، کھری سنا دوں..... مگر بات گھوم پھر کے وہیں آن رکتی کہ وقت پڑنے پر سوخن کے گھونٹ پیتی ہوں، ہاں کرتی رہی۔

مجھ سے بڑھ کر کون جانتا تھا کہ گلابو ایسی نہیں ہے وہ تو خود اپنے لیے سائبان کی تلاش میں ہے، ان سب کی نظروں میں کوئی سما تا نہیں تھا اس میں ان کی اپنی غرض تھی اور یہ کہ دنیا کب کسی کو بخشتی ہے۔

خوب سے خوب تر کے اس دور میں گلابو کو اعلیٰ بر کہاں سے جڑتا.....؟ گلابو کی شادی ہو رہی ہے، یہ لاکھ شکر کا مقام تھا..... آج کل اچھی بھلی لڑکیوں کے لیے رشتوں کا کال ہے، گلابو تو پھر بھی..... اب یہ لے دے بیکار تھی..... معاملہ تقریباً تیار تھا، بات ان کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔

رسم کے بعد اچانک میری مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ میرا ایک قدم بازار دوسرا گھر میں ہوتا..... اُدھر گلابو کی طرف سے پکار پڑتی۔ مجھے سسرال کے ہزار جھمیلے تھے پھر بھی دوڑ، دوڑ کے جاتی..... اِک موقع سے پڑتی پیسی بھی پھنسالی، ارادہ تھا کہ گلابو کو کانچ کا ڈنر سیٹ دوں گی، میری بری کا ایک اچھا سا جوڑا، گلابو نے سراہا تھا۔ شاکنگ پنک فیروزی پر خوب صورت آرکا گلا اور دوپٹے پر نازک آرکی بیل..... سوچا تھا دعوت کروں گی تو گلابو کو دوں گی۔

اس دن بھی میں گلابو کا ناپ لینے گئی تو اجی سے ٹکراؤ ہوا۔

اس نے ارادے لمبے باندھ رکھے تھے، فرنیچر کا آرڈر، ہال کی بکنگ، کیٹرنگ یہ، وہ اس نے اپنی کمپنی سے قرضہ پکڑا تھا۔ کچھ یہاں وہاں انکے نکلوائے، مل ملا کے ڈیڑھ دو لاکھ بنتا تھا۔

"ڈیڑھ دو لاکھ.....؟" پرلے درجے کی بخیل نگہت کا دم نکل ہی گیا۔ غالباً اب تک تمام معاملات بالا ہی بالا چل رہے تھے۔

"جب اُدھر سے کوئی مانگ تانگ ہی نہیں تو کاہے کو اتنا کھٹ راگ پالتے ہو۔ سیدھے سبھاؤ دو بول پڑھوا کر ہاتھ میں ہاتھ دے دو۔"

بات بچت پر آئی تو فوراً نگہت کی عقل میں سما گئی مگر اجی کہاں سنتا تھا، اس کے پاس سیکڑوں بہانے تھے اور ایک ہی رٹ.....

"نام کے سہی، گلابو چار بھائیوں کی بہن ہے، دنیا کیا تھوکے گی....."

سچ ہے، کبھی، کبھی دوسروں کے حصے کا بوجھ بھی خود ہی اٹھانا پڑتا ہے، اجی بھی ایسا ہی تھا۔ ہاں، اسی دن تو اس نے کہا تھا، گلابو میری بہن نہیں ماں ہے، اور نگہت مانو جلے پیر کی بلی بھی بن گئی تھی۔

میں نے گلابو کی جانب رخ کیا تو وہ موبائل پر لگی پڑی تھی، مجھ پر نظر پڑتے ہی کھٹ بند کر دیا۔

"کس سے بات چیت چل رہی تھی؟" میرا ماتھا ٹھنکا۔

"آپا نصی..... میرا مطلب ہے میرا فون تھا۔" اس نے نظریں چرا کر موبائل گریبان میں اڑس لیا۔

جب کسی بات پر دو بیان پڑ جائیں تو مان لینا چاہیے کہ کوئی گھپلا ہے۔ جیسے میں جانتی ہی نہیں تھی۔ آپا نصی بھلا کاہے کو اس کی ایسی فکر پالتیں کہ بیٹھے بٹھائے ڈیڑھ روپیا خرچ کر ڈالتیں۔ معاملہ اپنے مطلب کا ہو تو اور بات ہے۔ "پہلے لوگ جھوٹ بولتے تو مر جاتے تھے، اب تو بخار بھی نہیں چڑھتا۔"

"جب جانتی ہو تو پوچھتی کیوں ہو؟"

"اپنے موبائل کی سم بلاک کر دو۔"

"وہ دروازے تک آ جائے گا۔"

"اسی لیے تو کہتے ہیں کہ کسی کو اتنا سر ہی نہ چڑھاؤ کہ وہ رقص پر اتر آئے۔"

"میں تو کمبل کو چھوڑ دوں مگر کمبل....."

"ہاہ..... اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔"

میں سمجھ گئی گلابو پر دباؤ ہے، لٹو جیسے لوگوں سے یہی امید ہوتی ہے۔

ان ہی خدشات کے تحت سعد نے تاجو کو گلابو کا دامن بچاتے ہوئے گھنٹا بھر بیٹھ کر جچے تلے لفظوں میں سمجھایا۔ معاملہ تھوڑا نازک ہے، وہ ہوشیار رہیں، وہ بیچارہ پہلے ہی عورت کا ڈسا ہوا تھا، احسان مندی و انکساری اس کے لہجے و انداز سے چھلکی پڑتی۔ اب تک گلابو کے حالات سے کچھ نہ کچھ آشنا تو ہو ہی گیا تھا کہ معاملہ کھینچ تان کا ہے، سب ہی فرض کی ادائیگی سے بھاگ رہے ہیں بلکہ سچ تو یہ تھا کہ ذمے داری اٹھانے کے اہل ہی نہیں تھے، ورنہ رونا کاہے کا تھا۔ مگر یہ وہ معاملات تھے جن پر فاتحہ پڑھ کر صبر کیا جا چکا تھا۔

☆☆☆

کچھ دن گزرے، اِک نیا گل شگوفہ پھوٹا..... اس بار رسم کے سامان پر ناک بھوں چڑھائی گئی تھی۔ بری بڑھیا ہو، کہیں چار لوگوں میں ان کی ناک ہی نہ کٹ جائے، اجی بھی تو آخر بساط سے بڑھ کر، لے دے کے سہی..... بھی کچھ کر رہا ہے۔ مجھے پتا تھا کہ یہ سب روڑے اٹکانے والی باتیں تھیں۔

تاجو بھائی کی شکل پر پہلی بار تاسف دیکھنے میں آیا، شاید انیس بیس ہزار میں سے بھی کچھ واپسی کی امید تھی۔ اب یہ بات تو میرے ہی پیٹ میں تھی کہ میں نے خریداری میں معیار و درمیانہ رکھا۔ تب بھی کئی جگہ اپنی جمع جوڑ کو ہوا دکھانی پڑی تھی۔ میری اپنی اچھی بھلی رقم ٹھکانے لگ چکی تھی۔ مانو منہ سے نکلی بات گلے پڑ گئی تھی۔

"اس سے تو بہتر تھا کہ کوئی طلاق رانڈ، جڑ جاتی، اس کھٹ راگ میں تو جان نہ پھنستی۔"

میرے تلوؤں سے لگی سر پر بجھی..... صاف جھاڑ دیا کہ "اگر آپ کو کوئی پچھتاوا ہے تو وہ رہا دروازہ، چلتے پھرتے نظر آئیں، میں اسی تاریخ پر گلابو کا نکاح کہیں اور پڑھوا دوں گی۔" وہ سٹ پٹا گئے، میرے قدموں میں آن بیٹھے، دیر تک معافی تلافی کرتے رہے، تب کہیں جا کے میرا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

اس بار تو سعد بھی تاؤ کھا گئے، اسی وقت جا کے اجی و وسیم کے کان کھینچنے پر تیار ہو گئے، جنہوں نے بیویوں کو اتنی کھلی چھوٹ دے رکھی ہے کہ جو مرضی آئے کہتی، کرتی پھریں..... مگر میں جانتی تھی، وہ گئے تو کام بگاڑ کر ہی آئیں گے۔ سوجا کے اجی کو ہی آڑے ہاتھوں لیا۔

سیدھے سبھاؤ کہہ دیا کہ تاجو کی حیثیت کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے اور یہ کہ اجی جو کچھ بھی کر رہا ہے، اس کی اپنی مرضی ہے، تاجو بھائی کی طرف سے ایسا کوئی مطالبہ نہ

Digitized by Google

تھا، نہ ہے، شادی کی خریداری تاجو بھائی نے میرے سر پر لگا رکھی تھی، بری میں جوڑے کم مگر ڈھنگ کے ہوں گے، دنیا جو مرضی آئے کہے...... میں تاجو کی اوقات سے بڑھ کر اس پر دباؤ نہیں ڈال سکتی۔ امی سادہ دل بندہ تھا مگر بیوی کے خلاف اِک لفظ بھی سنتا تو ہتھے سے اکھڑ جاتا...... مگر آج اُف تک نہیں کی۔

میں نے اس کی رج کے کھنچائی کی کہ اپنے گھر کی عورتوں کو لگام دے۔ اور نگہت ایک چالاک، ڈھکوسلے باز...... اس کی خلاف مرضی اقدام کا نتیجہ تھا، رنگ میں بھنگ سو یہ بھی ہو کر رہا...... کچھ دن گزرے کہ اِک نئی ہلچل مچی، سننے میں آیا کہ نگہت اینٹھ کر میکے جا بیٹھی، گلابو صرف امی ہی کی تو بہن نہیں ہے، سب بہن بھائی مل کر اسے ٹھکانے لگائیں...... یہ صاف چشم پوشی بلکہ کنی کترانے والی بات تھی۔ بڑے ہوں یا چھوٹے بھیا...... گلابو تو دور کی بات...... اپنے پیٹ جوگے بھی ہوتے تو کاہے کو دنیا زمانے کے جوتے لاتیں کھاتے پھرتے۔ نگہت کے کلیجے پر ہاتھ پڑا تھا۔ وہ بلبلاتی پھر رہی تھی۔ امی نے تاریخ دے کر اس کی نفی کی تھی۔ وہ تبھی سے آگ لگانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ پرلے درجے کی بخیل نگہت اپنا بخار کسی کو نہ دے یہ تو پھر لاکھ دو لاکھ کا معاملہ تھا۔ بہ مشکل اسے سمجھایا بجھایا گیا۔ جو خرچ ہوگیا، اگلے ہاتھ سے واپس بھی تو آجائے گا۔ گلابو یتیم و یسیر لڑکی ہے، کون نہ سر پر ہاتھ دھرے گا۔ دنیا سے شرم و حیا ابھی اتنی نہیں مٹی ہے کہ لوگ کھائیں، موچھوں کو تاؤ دے کر نکل جائیں گے، نگہت ہڈی دے کر پکڑا لینے والی عورت تھی۔ نفع کی بات کھٹ اس کی عقل میں سما گئی۔ بڑے و چھوٹے بھیا تو خیر کسی گنتی میں نہ تھے، لے دے کر آپا منھی اور وسیم رہ جاتے تھے۔

"لاکھ دو لاکھ کا سودا ہے، مُردہ بھی کفن لے جاتا ہے۔" یہ آپا منھی کی منطق تھی۔ سوکھے ہاتھوں نگہت نے دولھا کی شاپنگ ان کے سر تھوپ دی تھی۔ وہ تلملا کر رہ گئیں۔

وسیم بیوی کے کانوں سے سنتا، اسی کی آنکھوں سے دیکھتا تھا، اپنی مجبوریوں کے رونے روئے، زیادہ تیر مارا تو پانچ ہزار دے کر ہاتھ جھاڑ لیے، لو جی ہوگئی شادی مانو زیادہ وزن امی کے کندھوں پر ہی تھا۔ تبھی نگہت نے شرط رکھی تھی کہ وہ جس کو چاہے گی، بلائے گی، جس کو چاہے گی نہیں، مطلب صاف تھا، یعنی جن سے اچھی امید ہوگی یا اس کا اپنا ہوگا، خیر یہ بھی غنیمت تھا، بھاگتے چور کی لنگوٹی سہی......

اس بات پر بھی بڑی لے دے چلی مگر پھر بات آئی گئی ہوگئی۔ مجھے فرصت ہی کہاں تھی کہ آئے دن اُدھر جھانکتی پھروں......

دن رات میرے بازار کے پھیرے لگ رہے تھے، درزیوں کے چکر...... یہ وہ، سیزن جا رہا تھا، بڑے بازار میں دکانوں کی چیزیں فٹ پاتھ پر نکل کر سیل پر آگئی تھیں۔ تب بھی دکان داروں کے مزاج کہاں ملتے ہیں، میں نے ہر چیز معیاری رکھی تھی۔ اک پڑوسن خاتون میری مشیر و معاون تھیں۔ کبھی، کبھی مجھے واقعی خاصی تاخیر ہوجاتی...... تب سعد طنز کا ڈھیلا مارتے۔

"آگئیں آپ...... ایسی بھی کیا جلدی تھی؟" یا کہتے...... "وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت......"

اس میں کچھ شک نہیں تھا کہ گھر متاثر ہو رہا تھا، آفرین تھی سعد پر کہ کبھی اُف نہ کرتے کہ سو کام میری جان کو پڑے روتے رہ جاتے تھے۔ اس دن بھی میں نے کہا۔

"ہماری ذرا سی بھاگ دوڑ سے کسی کا بھلا ہوجائے تو ہمارا کیا جاتا ہے؟"

"یار......! اس گلابو رانی کے چکر میں لگتا ہے میری بیوی کہیں کھو گئی ہے۔"

"چلیں پھر سمجھ لیں کہ اس نیکی میں آپ بھی شامل ہوگئے ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے... تو پھر آپ کی طرف سے مجھے گلابو کی شادی مبارک ہو۔"

اکثر شام میں تاجو بھائی چلے آتے، ان کا قصہ زلیخا ہی نہ ختم ہونے میں آتا۔ پرانی داستان سو بار رگڑ کے بھی نہ تھکتے۔ سعد اپنی شیخ چلی کی اولاد کہتے تھے۔ بڑ بولے، ڈینگ باز، میں نے سعد کو کہہ رکھا تھا کہ انہیں بالا ہی بالا بھگتایا کریں، معاملہ شادی سے متعلق کسی امر کا ہو تو اور بات ہے۔

اس دن بھی میں امی کی طرف جانے کی تیاری میں تھی۔ میرے ہاتھ سے اچار خراب ہوجاتا تھا، میں نے امی سے ڈلوایا تھا، مرتبان تبھی امی کے صحن میں ہی رکھا تھا۔ اس کی مزاج پرسی لازمی تھی۔

"کیوں جی، کہاں کے ارادے ہیں؟" انہوں

نے تاڑ لیا۔

"جیسے آپ تو جانتے ہی نہیں...... ملا کی دوڑ مسجد......"

"واپسی کب ہوگی؟"

"جب آپ لے آئیں گے۔"

"ہائیں......! یعنی مجھے بھی جانا ہے۔"

"تو میں بیوقوف ہوں جو آپ کے ہوتے اکیلی دھکے کھاتی پھروں گی۔"

"یوں تو نہ کہو...... وہ تو رہا چار قدم پر تمہارا میکا......"

"تب بھی میں ایسے جاتی ہوں جیسے سات سمندر پار ہو۔"

"چلیے، آپ کے صدقے کچھ ہماری بھی آؤ بھگت ہوجائے گی۔"

"ہاں، ہاں، ویسے تو وہ آپ کو پتھر مارتے ہیں؟"

"جانے بھی دو، خوب سمجھتا ہوں میں...... یہ پھیرا بھی یقیناً گلابو رانی کے صدقے ہی ہوگا۔"

"اوہو...... بلاوجہ آپ نے بیچاری گلابو سے بیر باندھ لیا ہے۔"

"اجی جناب جیسے آپ خوش ویسے ہم خوش......"

"اچھا، یاد دلاؤں کہ کتنی بار نعرۂ احتجاج بلند کیا تھا؟"

"تو تم کون سا باز آگئیں......؟"

میں نے منہ چڑا کر انہیں انگوٹھا دکھا دیا۔

مگر مجھے گلابو کے پاس جاتے جاتے شام ہوگئی۔ امی میری اور عائزہ کی شاپنگ دکھانے بیٹھ گئیں...... وہ ہم دونوں کے لیے ہمیشہ یکساں چیزیں خریدتیں۔ عائزہ کی خریداری زیادہ ہوتی، دو بچوں کے سبب...... چھوٹی بھاوج کی بس صبح شام کی خبر تھی...... سعد، ابا میاں کے ساتھ شطرنج کی بساط بچھا کر بیٹھ گئے۔

سچ تو یہ تھا کہ مجھے لٹو والے معاملے کی کھد بدھ تھی اور وہاں وہی رفتار بے ڈھنگی......

میں نے اپنا سر پیٹ ڈالا۔

"اسی لیے تو کہتے ہیں کہ کسی کو اتنا سر ہی نہیں... چڑھاؤ کہ وہ رقص پر اتر آئے۔"

"ارم! مجھے ٹھوکر سے ڈر لگتا ہے۔"

"اندھیرے میں راستہ تلاش کرو گی تو ٹھوکر تو لگے گی ناں......"

"نگہت کہتی ہے اگر میں تاج الدین کے لیے انکار کردوں تو وہ چپ چپاتے لٹو سے میرا نکاح کروا دے گی۔"

"اور تم کرلو گی؟" میں نے ٹٹولا۔

"نہ بابا نہ......" وہ دہل اٹھی۔ "ساری زندگی کی نیک نامی و شرافت مٹی میں مل جائے گی۔"

"نگہت ایسا اس لیے کہتی ہے کہ ساری بلا تمہارے سر تھوپ کر دو کپڑوں میں سیدھے سبھاؤ رخصت کردے۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری، اپنا اچھا برا تم خود بھگتو...... وہ حرے سے ہاتھ جھاڑ کر کنارے ہوجائے کہ یہ سب کیا دھرا تمہارا اپنا ہے۔"

میں نے اس کی کھچائی کی کہ اس سلسلے کی روک تھام کرے، تاجو پہلے ہی عورت کا ڈسا ہوا ہے، اب اسے یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ تاجو کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی تو اچھا نہ ہوگا۔

"وہ کوئی راہ چلتا فقیر ہے کہ دے دلا کے چلتا کروں؟"

"تو پھر سر کا تاج بنالو......" میری جان کلس اٹھی۔

"تم سمجھتی نہیں ہو، وہ میری جان کو آجائے گا۔"

"تو کب تک پردہ ڈال کے رکھو گی؟ ایسی باتیں ڈھکی تھوڑی رہتی ہیں۔"

"ڈھکی چھپی رہ بھی کیسے سکتی ہیں۔ سارے محلے میں مٹھائی بٹ چکی ہے۔ شادی کی تیاری چل رہی ہے۔"

"تبھی تو کہتی ہوں...... احتیاط کرو، وہ پہلے ہی عورت کے ہاتھوں چوٹ کھا چکا ہے، کبھی، کبھی چھوٹی، چھوٹی باتیں بھی کسی بڑے نقصان کا سبب بن جاتی ہیں، بس تم مضبوط رہو۔" میں اسے سمجھا رہی تھی۔

"تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟"

"اس کی چندیا پر ایک بال نہ چھوڑتی۔"

"اس کی چندیا تو پہلے ہی صاف ہے۔"

"تو پھر سو جوتے لگا کر آگے کا راستہ دکھاتی کہ چلتا پھرتا نظر آئے۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے۔"

مجھے بخوبی ادراک تھا تبھی میدان صاف پا کر امی کو جا لیا۔

وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر پیر پسارے میچ کی جھلکیوں میں گم تھا۔ مجھے دیکھ کر سیدھا ہو بیٹھا۔

"وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت......"

Digitized by Google

"دنیا میں اگر خوش فہمی نہ ہوتی تو بیوقوف کیسے زندہ رہتے؟"
"جیسے تم زندہ ہو، ہا، ہا، ہا......"
میں نگہت کا خیال کر کے طرح دے گئی، جو میری بُو پاتے ہی کچن سے لنگور کی طرح چھلانگ لگا کر اگلی ہی جمپ میں کمرے میں تھی۔ میں نے لٹو والے معاملے کی طرف توجہ دلائی تو اس نے کان سے مکھی اڑا دی۔
"جب سب جانتے ہو تو موبائل اپنے قبضے میں لو، لٹو کی کال یا وہ خود آئے تو کہہ دو، گلابو چار بھائیوں کی بہن ہے، اس کی طرف ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھا یا اس محلے میں نظر آیا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ گلابو کے کمرے کا دروازہ صدر دروازے سے لگا ہے، تم نائٹ ڈیوٹی پر ہوتے ہو، نگہت سے کہو، گلابو کے ساتھ سو جایا کرے یا پھر اسے اپنے کمرے میں سلائے۔"
"اوہو......ارم تم بہت ڈرپوک ہو۔"
"ڈرپوک نہیں محتاط......" میرے اندر دھکڑ پکڑ سی مچی تھی۔ میں نے امی سے لاکھ سر پھوڑ کے دیکھ لیا، گلابو کو کچھ دن کے لیے کہیں اور چھوڑ دے۔ نکاح بھی کہیں اور ہی رکھ لے، میں اپنے گھر رکھ لوں تو تاجو سو کاموں سے وہاں آتا ہے، اِک نیا فسانہ پھوٹ جائے گا۔ مگر نہ...... امی کی نہ ہاں میں نہ بدل سکی۔
لوٹتے سے یاسمین میرے سر ہو گئی، ابھی شادی میں گنتی کے دن پڑے تھے کہ شوشا چھوڑا گیا......تاج الدین کی انکوائری......
میرے دل کو دھکا سا لگا، میری اور سعد کی شمولیت و ضمانت کے باوجود انکوائری۔ اب جبکہ ہنڈیا پکنے کو تیار تھی تو تاجو کی جڑ بنیاد کھودنے کا خیال آیا؟
یہ کیڑا یاسمین کے دماغ میں کلبلایا تھا۔ اور دوسروں کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانا تو کوئی یاسمین سے سیکھے۔
سعد نے کہا بھی کہ یہ ان کا حق بنتا ہے۔ مگر یہ میں ہی جانتی تھی۔ یہ سارے الجھاؤ، اَلکاؤ ڈالنے کے لیے تھے۔ انکوائری کی آڑ میں کیڑے چنے جائیں گے تاکہ ہمیشہ کی طرح مین میخ نکال کر رد کر دیا جائے۔
"تاج الدین میں آخر خوبی ہی کیا ہے، صورت نہ شکل، گھر نہ در، دو ٹکے کی حیثیت جانے کیا بھا گیا ہے، نہ کوئی آگے نہ پیچھے، ایسے لوگوں کا کیا بھروسا، بیوی چھوڑ گئی تو کوئی وجہ ہی ہوگی ناں......" یاسمین اپنی ساری بپتا بتا کر آخر میں یہ بھی کہہ گئی۔
جوابِ جاہلاں باشد خموشی، میں لہو کے گھونٹ پیتی ہوں ہاں کرتی رہی۔
اس بار سعد خود ساتھ گئے، کارخانے سے گلی محلے تک......صد شکر کے پروردگار نے ہماری عزت رکھ لی۔
میں نے سکھ کی سانس لی اور ابھی یہ سانس درمیان میں تھی کہ اِک اور پٹاخا چھوٹا......اک شام عروسہ آپا نھنی کی بیٹی کا فون آیا۔ وہ تاجو کا نمبر مانگ رہی تھی۔
"کیوں بھئی، تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی؟" میں کھٹک گئی۔
"بھئی ہمارے ہونے والے خالو ہیں، گپ شپ لگائیں گے، امی نے ان سے جوتے کا نمبر لینے کو کہا ہے۔" وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔
میں سمجھ گئی اس کی پشت پر گلابو کا ہاتھ ہے، بھانجیوں سے اس کی گٹھ جوڑ چلتی تھی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ بھلا مجھ سے پردے داری کی کیا تُک بنتی تھی۔ مگر خیر، یہ اچھا ہی تھا، ربط بڑھے تو اچھا ہے، اِک نئے سفر کا راستہ سہل ہوگا، اتنا آسان بھی نہیں ہوتا، دل کو اِک راہ سے ہٹا کر اگلے رستے لگانا، مجھے اندازہ تھا سو عروسہ کو نمبر سینڈ کر دیا۔
مجھے کیا پتا تھا کہ یہ اقدام اِک نئے فساد کی جڑ، بنیاد بن جائے گا۔
اگلے ہی روز تاجو بھائی پھڑکتے چلے آئے۔ انہیں موبائل پر دھمکیاں دی گئی تھیں۔ گلابو اور لٹو کے تعلقات پر وہ، وہ باتیں کہ زمین آسمان ایک ہو جائیں، ضرور یہ آگ کسی دشمن نے لگائی ہوگی۔ یہ کام کسی گھٹیا انسان کا ہی ہو سکتا ہے، جو لٹو کے سوا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر اس تک تاجو کا نمبر کیسے پہنچا......؟ گلابو تو یہ حماقت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ میرے ذہن پر بار، بار عروسہ کا نام دستک دے رہا تھا۔
میں اگلی جست میں آپا نھنی کے سر پر جا سوار ہوئی۔
آپا نھنی کی کھوپڑی گھوم گئی، ان کا مال خرچ ہو رہا تھا۔ بیس ہزار کی بیسی تھی۔ شادی کی تیاری چل رہی تھی۔ تاجو کے کپڑے لتے، جوتے کے ڈبوں تک کو لڑکیوں نے

ربن سے سجایا تھا۔ آپا نھنی نے کس، کس کر دو چار دو ہتھڑ عروسہ کو جمائے تو اس نے جھٹ اگل دیا کہ تاجو بھائی کا نمبر ظفر لٹو کو اسی نے دیا تھا۔ اس دن فیکٹری سے لوٹتے ہوئے لٹو نے اس کی راہ روکی تھی اور گن پوائنٹ پر اس سے فون کروا کر تاجو کا نمبر نکلوایا تھا۔ آپا نھنی نے اپنا آپ پیٹ لیا، بکھرے، تکڑے دھموکے اور جمائے مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔
"اُف میرے خدا......" میں نے سر تھام لیا، پیروں تلے سے زمین سرکتی چلی گئی۔ مانو سارے دھڑکے زندہ سلامت ہو کر سامنے آن کھڑے ہوئے، چاروں طرف خطرے کی گھنٹیاں ہی گھنٹیاں بجتی سنائی دینے لگیں۔ پہلی بار لگا کہ گلابو کسی خطرناک جال میں پھنس گئی۔ میں نے گلابو کا گھیراؤ کیا اور وہ لتے لیے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔
"میں نے کہا تھا ناں وہ جان کو آ جائے گا۔" اسے اور کچھ نہ سوجھا تو ٹسوے بہانے بیٹھ گئی۔
"اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟" میرا دل پسیج گیا۔
"تم جو کہو، جو چاہو، میں تاجو کے پیر پکڑ کر اسے اپنی سچائی کا یقین دلانے کو تیار ہوں۔" وہ چھکوں پھکوں رو رہی تھی۔
مجھے ایک بار پھر گلابو کو تاجو بھائی کے سامنے بٹھانا پڑ گیا تھا اور اسی دن گلابو نے کہا تھا۔ "شرافت و نیک نامی انسان کی میراث ہوتی ہے، میں اسے رسک پر نہیں رکھ سکتی۔"
مجھے اس سے امید بھی یہی تھی، تاجو بھائی شانت ہو کر لوٹے تھے، اس وقت میرے فرشتوں کو بھی کیا خبر تھی کہ یہ گلابو سے میری آخری ملاقات ہے، میں ایک، ایک دن گن گن کر گزار رہی تھی کہ شادی سے صرف دو دن پہلے یہ خوشخبری سننے کو ملی۔ مانو اب تک دنیا میری نظروں کے سامنے گول، گول گھوم رہی تھی، یہ کیوں ہوا...... کیونکر ہوا......؟ الٹی گنتی چل رہی تھی......اور میں جیسے اب تک کا شمار ہی بھول گئی تھی۔
پلک جھپکتے میں جیسے سب کیے کرائے پر پانی پھر گیا تھا، مجھے رہ رہ کر تاؤ چڑھتا تھا، بس گھڑی بھر کی غفلت کا پھیر پڑ گیا۔ سچ مچ اپنی بھاگ دوڑ خاک ہونے کا افسوس تھا۔ اک حج کا ثواب......اور سعد کہتے کہ نیت کی راستی پر ہی اجر و ثواب ہے میں نے اسی راستی کو بنیاد بنا کر سارے کڑے مرحلے طے کیے تھے اور اب جبکہ آنکھوں کی سوئیاں نکلنی باقی رہ گئی تھیں۔
تیرہ تاریخ جیسے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی۔ مجھے یاد ہے یہی وہ دن تھا جب میں نے گلابو کو تاجو بھائی کے سامنے بٹھایا تھا۔ وہ شانت ہو کر لوٹے اور میں نے اسے وکٹری دکھائی۔
"ہنسی تو پھنسی......" میں نے کافی عرصے بعد گلابو کو ہنستے دیکھا تھا، جانے وہ دن نکاح سے پہلے کا تھا یا بعد کا......گلابو اپنی جگہ پختہ تھی۔ پھر آناً فاناً لٹو کا داؤ کیسے چل گیا؟ مجھے گلابو کی فکر کھائے جاتی تھی، سارے دھڑکے اندیشے مجھے ستاتے، وہ سب کے لیے مر گئی تھی۔ پھر بھی جانے کیوں دل کو اِک یقین سا تھا کہ وقت کبھی نہ کبھی اسے میرے سامنے ضرور لا کھڑا کرے گا......لٹو جیسے لوگ یونہی کسی پر جال نہیں ڈالتے، یقیناً لٹو کے زیرِ نظر کوئی مفاد ضرور ہوگا ورنہ گلابو میں ایسے کون سے لعل جڑے تھے۔ جانے کیسے، یہی اندیشہ امی کے سامنے زبان پر آ گیا۔
"ارے یہی مفاد ہوگا کہ محتاج ہے، بیساکھی تھما کر در، در کی بھیک منگوائے گا یا فقیروں سے دام کھرے کرے گا۔ محتاجوں کی بڑی مانگ ہے، لوگ ہاتھ پیر تڑوا کر بھیک منگواتے ہیں۔ چاندی ہو جائے گی چاندی۔"
امی کی بات سولہ آنے درست تھی۔ میرے دل کو لگی مگر اب چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں۔ آپا نھنی کو اپنے چالیس ہزار کا غم کھائے جاتا تھا۔ جو کپڑے لتے تاج الدین کے ناپ سے سل گئے تھے وہ اب کسی اور کے لیے بیکار تھے، وہ اس شام تاج الدین کا ناپ لوٹانے آئیں تو دبے لفظوں میں اپنا نقصان گنوانے لگیں، ان کے ناقص بھیجے میں یہ بات جانے کہاں سے آسائی تھی کہ میں اب تاج الدین کو کہیں اور کھپاؤں گی جیسے میرے پاس دنیا زمانے کے ناٹھے نکوڑے رشتوں کا درخت ہی تو لگا ہو۔
آپا نھنی سودے بازی کی ماہر تھیں، وہ دام کھرے کر کے اپنی شاپنگ کھپانا چاہتی تھیں۔ یہ اسی صورت ممکن تھا، جب تاج الدین کا سلسلہ کہیں اور بنتا اور ایسے آثار و ارادے دور، دور تک نہ تھے۔

Digitized by Google

آپا ننھی کے میاں قمردے سعد نے رسمی سا افسوس کیا تو بولا۔
”اجی صاحب! اِک آفت مچا رکھی ہے، گلابو نے نکاح ہی کیا ہے ناں......! کوئی جرم یا گناہ تو نہیں کیا...... بھئی یہاں نہیں کیا، وہاں کرلیا، بات تو ایک ہی ہے۔“
میرے دل پر منوں بوجھ آپڑا، کوئی سالوں ساتھ رہ کے اپنا نہیں بن جاتا، وہ داماد تھا۔ اس کا بھلا گیا ہی کیا تھا جو وہ غم مناتا۔ آپا ننھی نے بتایا، اب مکان بیچنے کا نکتہ زیرِ غور ہے، عزت کا جنازہ تو نکل ہی چکا ہے، اب ٹھکانا بدلنا ہی بہتر ہے۔ شاید سب کو اسی وقت کا انتظار تھا، خود آپا ننھی کو یکے بعد دیگرے چار بیٹیاں بھگتانی تھیں، سب کے اپنے، اپنے مفاد تھے۔ رہی گلابو تو اس کا انجام حسبِ مرضی رہا تھا، لاکھ روپے کی بات تھی اور دو ٹکوں میں ہوگئی... مگر اس سے اہم اور غور طلب نکتہ اِک اور تھا...... مجھے کیا، کسی کو بھی یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہ آتی تھی۔ امی نے سختی سے میرے کان اینٹھے تھے کہ اب تک جو کیا سو کیا، اگر کسی برے وقت میں گلابو اپنے نصیبوں کو روتی پیٹتی تمہاری دہلیز تک آن پہنچے تو انہی قدموں اسے واپس لوٹا دینا۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا...... اور یہیں آکر میرا دل کچا پکا پڑ جاتا تھا۔

☆☆☆

یہ انہی دنوں کی بات ہے، ابھی اس واقعے کی دھول اڑ ہی رہی تھی۔ اللہ نے چھوٹے کو چاند سے بیٹے سے نوازا، گلابو کے ناپ کا سامان ابھی تک میرے پاس پڑا تھا، میں نے میکے کو پر تولے، تو چلتے سے گلابو کی چیزیں بھی بغل میں دبالیں کہ کھڑے، کھڑے نگہت کو تھما آؤں گی، میراں اماں کا گھر لگتا تھا کہ ویران قبرستان، گلابو کے کمرے پر من بھر کا تالا دیکھ کر میرا کلیجا منہ کو آنے لگا، میرے لیے وہ گھر اب پرایا ہوچکا تھا، مانو میرا ایک میکا ختم ہوگیا، اب وہاں غیروں کا راج تھا، ورنہ ایسا کہاں ممکن ہے کہ اِک عمر ساتھ جڑے رہنے کے بعد اتنا کچھ یک دم آپ کے اندر سے نکل جائے...... لوٹتے سے یونہی ذرا کی ذرا میری نظر اوپر اٹھی تھی، بڑے بھیا چھت کی منڈیر پر بیٹھے نیچے جھانک رہے تھے، میں اس رخ پر تھی کہ ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ بڑے بھیا کے ہاتھ میں نوٹوں کی گڈی تھی، انہوں نے محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا پھر احتیاط سے وہ گڈی نیچے پھینک دی۔ تیزی سے چھت کو جاتی سیڑھی سے نیچے اترے اور کھٹ سے گڈی اپنے کرتے کی جیب میں ڈال لی، مقام تو ہنسنے کا تھا مگر مجھے رونا آنے لگ، بچوں کے ... نقلی نوٹوں کی گڈی تھی یک دم ان کی نظر مجھ پر پڑی تو ڈر گئے، دیوار کی اوٹ میں چھپ گئے، کچھ دیر گزری پھر چپکے سے سر نکال کے جھانکا، میں ہنوز ساکت تھی۔
”کام ہوگیا۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کے یوں لہرایا جیسے کسی معالے سے خلاصی پائی ہو، اشارہ گلابو کے اقدام کی جانب تھا جیسے یہی ان کی منشا رہی ہو۔
میں سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔
بالا آخر کفر ٹوٹا خدا، خدا کر کے......
سننے میں آیا کہ گلابو نے یہاں وہاں فون کھڑکائے کہ میری بس ایک بات سن لو...... مگر کوئی آمادہ ہی نہیں تھا۔ ایک ہی جواب، ہماری طرف سے مرگئی پھر کھٹ سے فون بند...... تب اس کا روتا دھوتا فون میرے پاس آیا۔
”میرا یقین کرو، آدھی رات کو لٹو نے مجھے بہانے سے باہر بلایا تھا۔ اور گاڑی میں بٹھا کر گن پوائنٹ پر نکاح پڑھوایا، اسے میری شادی کی بھنک پڑ گئی تھی، میرا یقین کرو ارم......“ گلابو کا یہ بیان گویا تابوت میں آخری کیل!
اگر ایسا تھا تو اس نکاح کو چیلنج کیا جاسکتا تھا مگر اتنا جگر کون لاتا۔
لٹو نے بہت جلد اپنی اصلیت پر آکر گلابو کی زندگی جہنم بنادی تھی۔ مانو سب کی امیدیں پوری کردی تھیں اور جو جہنم ہی بھگتنا ٹھہرا تو اپنا جہنم کیوں نہیں......؟ یہ گلابو کا فیصلہ تھا۔
میں نے کہیں پڑھا تھا جہاں محبت نہ ہو، وہاں اندھیرا ہوتا ہے اور اندھیرے میں انسان بھٹک تو ہو جاتا ہے، مصنوعی رشتے تو کیا خاک اپنے بنیں گے، اپنوں کو بھی غیر بنادیتے ہیں، گلابو کو بھی اپنوں کی ..... بے حسی لے ڈوبی تھی۔ مگر گلابو کا فیصلہ درست تھا کہ غلط...... اس کا فیصلہ وقت کرے گا...... یا دنیا......؟ یہ کون جانتا ہے۔

بدگمانی...... ممانعت الٰہی

تمام تر حمد و ثنا اللہ تعالیٰ کے لیے ہے کیونکہ اللہ ہی معبودِ برحق ہے، اس کی ذات میں بے شمار صفات ہیں۔ اس ذات جیسا کوئی اور نہیں...... کیونکہ وہ واحد ہے۔ اللہ تعالیٰ قادر ہے ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے وہ جو چاہے کرے اور جیسا چاہے ویسا ہی کرے، کوئی اسے روکنے والا نہیں...... اللہ رزاق ہے، چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی مخلوق کو رزق دیتا ہے، وہی ہر چیز کا خالق ہے۔
اور اسی کی تخلیق کردہ یہ دنیا بہت پُرفریب ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے زندگی گزارنے کے تمام تر لوازمات حضرت انسان کے لیے رکھے ہیں اور یہ سب اتنا دلکش ہے کہ انسان اس دنیا میں کھو جاتا ہے دل لگا بیٹھتا ہے۔ اور یہی دل لگی اس کے لیے نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔ کیونکہ اس کی کثرت غفلت پیدا کرتی ہے اور اپنے رب کی یاد میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔
تو اپنے رب سے اپنے خالق سے اپنے مالک سے پہچان کے لیے دلوں کا تزکیہ کرنا ضروری ہے کیونکہ دل کی پاکیزگی کے بغیر اللہ کی معرفت حاصل نہیں ہوسکتی۔ کچھ ایسے گناہ ہیں جو دل کو سیاہ کردیتے ہیں اور ان کی موجودگی میں دل یادِ الٰہی کی طرف راغب نہیں ہوتا۔ جب تک دل سے پورے طور پر یہ گناہ ختم نہ ہوں گے تو دل میں اللہ کی نورانی تجلیات کو جذب کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ ایسے میں ہمیں اپنے دل کا پاکیزہ کرنا مصفا کرنا ضروری ہے۔
وہ گناہ جو بظاہر عیاں بھی ہیں وہی ہیں جو ہلاکت میں ڈالتے ہیں جیسے حسد، ظلم، بخل، غصہ، بغض، ریاکاری، تکبر، غفلت، طمع و لالچ، جھوٹ، غیبت اور بدگمانی۔
آج ہمارا موضوع بدگمانی ہے۔ بدگمانی کے لغوی معنی بے جا شبہ، بدظنی، خیال فاسد ہے۔
ظن کا مطلب سوچ یا دماغی خیال ہے، سوچ اچھی بھی ہوتی ہے اور بری بھی...... مگر جب ہم کسی کے بارے میں اپنے دل میں برا ظن خود بخود پیدا کر لیتے ہیں تو اسے بدظنی کہا جاتا ہے اور یہ ایک طرح سے ذہنی وہم ہوتا ہے جو اچھے گمان کا پیش خیمہ نہیں ہوتا کسی چیز یا شخص کے بارے میں اچھا گمان نہ رکھنا ہی بدگمانی ہے...... بغیر کسی تحقیق کے طرح، طرح کے خیالات پیدا کرتے رہنا کوئی اچھی عادت نہیں جہاں کہیں دو افراد کو دیکھا کہ وہ آپس میں کوئی بات کر رہے ہیں تو اپنے دل میں یہ سوچ پیدا کرلینا کہ وہ میرے خلاف ہی کچھ کہہ رہے ہوں گے' یہ بدگمانی کے زمرے میں شمار ہوگا۔ اور یہ عادت بہت بری ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے گناہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا جب تک واضح دلیل سے کسی بات کا یقین نہ ہوجائے ہرگز، ہرگز بے بنیاد گمان سے کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔
”ظن“ یعنی گمان کا انسانی اعمال سے گہرا تعلق ہے، حسن ظن انسان کو اچھائیوں کی طرف مائل کرتا ہے جبکہ بدظنی یعنی بدگمانی انسان کو برائیوں میں ملوث کرتی ہے۔ اس لیے اچھا انسان وہی ہے جو اس برائی کو اپنی سوچ میں شامل نہ ہونے دے۔ بدگمانی آپس میں بغض و کینہ و نفرت اور دشمنی پیدا کرتی ہے کیونکہ انسان کسی سے اس وقت بدگمان ہوتا ہے جب وہ یہ سنتا ہے کہ فلاں

Digitized by Google

تمہارے بارے میں اس طرح کے برے خیالات رکھتا ہے یا ان کہی باتیں اس کی طرف منسوب کردیتا ہے۔ تو دونوں بلاوجہ ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ اس لیے اسلام میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ بدگمانی پیدا نہ ہونے دو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

"اے ایمان والو! بہت بدگمانیوں سے بچو یقین مانو کہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں۔" (سورۂ حجرات)

تو بدگمانی حرام ہے، یہ جائز نہیں کہ تمہارے دل میں کسی کے متعلق غلط خیال آئے یا تم اس کی طرف سے بدگمان ہو۔ یعنی کسی شخص کو قصداً برا نہیں سمجھنا چاہیے۔ دلوں کے اسرار سے (علام الغیوب) اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی واقف نہیں.....) اس لیے کسی بندے کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی شخص کے متعلق اپنے دل میں غلط خیال جمائے، ہاں اگر برائی اس طرح ظاہر ہوجائے کہ انکار کی گنجائش باقی رہے اور نہ تاویل و توجیہہ کی۔ برائی کے وسوسے ڈالنا شیطان کا کام ہے۔ اس کی تکذیب کرنی چاہیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ.....

"اللہ تعالیٰ نے مسلمان کا خون اور مال حرام کیا ہے اور یہ بھی حرام کیا ہے کہ اس کے متعلق برا گمان رکھا جائے۔"

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی امت کے دین کی حفاظت اور آخرت کی بہتری کا کس قدر خیال تھا۔ نیز امت پر کس قدر شفقت فرمائی۔ اور انہیں اس طرح سے بچنے کا طریقہ بتایا اور یہ بھی بتلایا کہ اس عالم دین کو بھی اپنے احوال پر شامل نہ کرنا چاہیے جو تقویٰ اور اتباعِ شریعت میں مصروف ہو اسے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ لوگ مجھ سے بدگمانی نہیں کریں گے بلکہ اچھا ہی گمان رکھیں گے۔ آدمی کتنا ہی صاحب علم اور صاحب تقویٰ کیوں نہ ہو.....لوگ اسے ایک نظر سے نہیں دیکھتے کچھ لوگ اسے اچھا سمجھتے ہیں اور کچھ برا جانتے ہیں بلکہ برا سمجھنے والوں کی تعداد اچھا سمجھنے والوں سے زیادہ ہوتی ہے۔

بدگمانی اور بروں کی تہمت سے بچنا ضروری ہے۔ برے لوگوں سے بدگمانی ہی کی توقع رکھنی چاہیے۔ جب آپ کسی شخص کو لوگوں سے بدگمانی اور ان کی عیب جوئی میں مصروف دیکھیں تو سمجھ لیں کہ وہ باطن کے خبث (پلیدی، گندگی، بدباطنی) میں مبتلا ہے۔ بدگمانی اس کی خباثت کا عکس ہے۔ وہ ہر شخص کو اپنی ذات کے آئینے میں دیکھنا چاہتا ہے، مومن اپنے بھائی کے فعل کے لیے اعذار تلاش کرلیتا ہے۔ منافق کو عیب جوئی کے علاوہ کسی چیز کی توفیق نہیں ہوتی، مومن کا دل ہر شخص کی طرف سے صاف رہتا ہے۔

بدگمانی شیطانی حملوں کا دروازہ کھولتی ہے اور طرح، طرح کے ہتھکنڈوں کے ذریعے شیطان انسان کو گمراہی میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اس لیے درحقیقت بدگمانی سے بچنا شیطان سے بچنا ہے۔ کیونکہ شیطان کا اصل مقصد انسان کو کسی نہ کسی بہانے سے اللہ کی عبادت اور یاد سے غافل کرنا ہے چونکہ بدظنی، غفلت پیدا کرتی ہے اس لیے بدگمانی والا شخص ہمیشہ یادِ الٰہی سے غافل رہتا ہے۔

صوفیاء کا طریق حسن ظن ہے کیونکہ اللہ کے بندے اللہ سے محبت رکھتے ہیں جس بنا پر وہ اللہ کی بنائی ہوئی ہر چیز کے بارے میں حسن ظن رکھتے ہیں کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ مخلوقِ خدا پر حسن ظن رکھنا درحقیقت اللہ تعالیٰ پر ہی حسن ظن رکھنا ہے۔

☆☆☆

غزوۂ مریسیع کے معرکے میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ واپس آنے لگے تو ایک منزل پر رات میں پڑاؤ کیا۔ حضرت بی بی عائشہؓ ایک بند ہودج میں سوار ہو کر سفر کرتی تھیں۔ اور چند مخصوص آدمی اس ہودج کو اونٹ پر لادنے اور اتارنے کے لیے مقرر تھے۔ حضرت بی بی عائشہؓ لشکر کی روانگی سے کچھ پہلے لشکر سے باہر حوائج ضروریہ کے لیے تشریف لے گئیں جب واپس ہوئیں تو دیکھا کہ ان کے گلے کا ہار کہیں ٹوٹ کر گر پڑا ہے۔ وہ دوبارہ اس ہار کی تلاش میں اپنے لشکر سے باہر چلی گئیں۔ اس مرتبہ واپسی میں کچھ دیر لگ گئی اور لشکر روانہ ہوگیا۔ آپ کے ہودج لانے والوں نے یہ خیال کیا کہ...

ام المومنین ہودج کے اندر تشریف فرما ہیں ہودج کو اونٹ پر لاد دیا.....اور پورا قافلہ منزل سے روانہ ہوگیا۔ جب حضرت بی بی عائشہؓ منزل پر واپس آئیں تو یہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا، تنہائی سے سخت گھبرا گئیں۔ اندھیری رات میں اکیلے چلنا بھی خطرناک تھا اس لیے وہ یہ سوچ کر وہیں لیٹ گئیں کہ جب اگلی منزل پر لوگ مجھے نہ پائیں گے تو ضرور ہی میری تلاش میں یہاں آئیں گے۔ وہ لیٹی، لیٹی سو گئیں۔ ایک صحابی حضرت صفوان بن معطلؓ وہ ہمیشہ لشکر کے پیچھے، پیچھے اس خیال سے چلا کرتے تھے تاکہ لشکر کا گرا پڑا سامان اٹھاتے چلیں..... جب وہ اس منزل پر پہنچے تو انہوں نے حضرت بی بی عائشہؓ کو دیکھا.....انہوں نے آپ کو شکل کھڑی کے دیکھا تو آپؓ نے حرکت کی اور کہا کہ مجھے کھڑی سمجھ کر ہاتھ نہ لگانا میں عائشہؓ ہوں.....اور لشکر سے پیچھے رہ گئی ہوں۔ ان کے منہ سے نکلا انا للہ وانا الیہ راجعون اور اونٹ لا کر آپ کے پاس بٹھا دیا۔ آپؓ چادر میں لپٹی ہوئی اونٹ پر سوار ہوگئیں۔ اور وہ خود اونٹ کی مہار تھام کر پیدل چلتے ہوئے اگلی منزل پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچ گئے۔

منافقوں کے سردار عبد اللہ بن ابی نے اس واقعے کو حضرت بی بی عائشہؓ پر تہمت لگانے کا ذریعہ بنالیا اور خوب اس تہمت کا چرچا کیا اس منافق نے اس تہمت کو مدینہ میں اس قدر اچھالا کہ ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس شرانگیز تہمت سے سخت رنج وصدمہ پہنچا چند مسلمان بھی بدگمانی کا شکار ہوئے مگر مخلص مسلمانوں کو بھی انتہائی رنج و غم ہوا.....حضرت بی بی عائشہؓ چونکہ مدینے پہنچتے ہی سخت بیمار ہوگئیں پردہ نشین تو تھیں صاحبِ فراش ہوگئیں اور انہیں اس تہمت کی بالکل خبر ہی نہیں ہوئی جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت بی بی عائشہؓ کی پاک دامنی کا پورا، پورا علم و یقین تھا۔ مگر چونکہ اپنی بیوی کا معاملہ تھا اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بیوی کی برات اور پاکدامنی کا اعلان کرنا مناسب نہیں سمجھا اور وحی الٰہی کا انتظار فرمانے لگے۔ اس درمیان میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مخلص اصحاب سے اس معاملے میں مشورہ فرماتے رہے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے اس تہمت کے بارے میں گفتگو فرمائی تو انہوں نے عرض کیا....."یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ منافق یقیناً جھوٹے ہیں اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ کو یہ گوارا نہیں ہے کہ آپ کے جسم اطہر پر ایک مکھی بھی بیٹھ جائے چونکہ مکھی نجاستوں پر بیٹھتی ہے تو بھلا جو عورت ایسی برائی کی مرتکب ہو اللہ قدوس کب؟ اور کیسے برداشت فرمائے گا کہ وہ آپ کی زوجیت میں رہ سکے۔"

حضرت عثمانؓ نے کہا۔"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے سائے کو زمین پر نہیں پڑنے دیا تاکہ اس پر کسی کا پاؤں نہ پڑ سکے تو بھلا اس معبودِ برحق کی غیرت کب یہ گوارا کرے گی کہ کوئی انسان آپ کی زوجہ محترمہ مطہرہ کے ساتھ ایسی قباحت کا مرتکب ہوسکے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا....."یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ایک مرتبہ آپ کی نعلین اقدس میں نجاست لگ گئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیلؑ کو بھیج کر آپ کو خبر دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی نعلین اقدس کو اتار دیں۔ اس لیے حضرت بی بی عائشہؓ معاذ اللہ اگر ایسی ہوتیں تو ضرور اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل فرما دیتا۔" جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت بی بی عائشہؓ اور حضرت صفوان بن معطلؓ دونوں کی برات وطہارت اور عفت و پاک دامنی کا پورا علم اور یقین تھا اور یقینی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم تھا کہ منافق تو ہیں ہی جھوٹے۔

حضرت بی بی عائشہؓ چونکہ مدینے سے واپسی پر بہت بیمار ہوگئی تھیں اس لیے وہ اس خبر سے واقف نہ ہوسکیں۔ اور جب انہیں صحت حاصل ہوئی تو ایک رات ایک صحابیہ حضرت ام مسطح سے یہ دلخراش اور روح فرسا خبر سنی اور انہیں سخت دھچکا لگا اور شدتِ رنج و غم سے وہ نڈھال ہوگئیں۔ چنانچہ ان کی بیماری میں اور اضافہ ہوگیا۔ وہ دن رات بلک، بلک کر روتی رہیں اور بالآخر وہ اپنی والدہ کے

Digitized by Google

گھر چلی گئیں اور وہاں بھی لگاتار روتی رہیں..... اس دوران نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا! تمہارے بارے میں ایسی خبر اڑائی گئی ہے اگر تم پاک دامن ہو اور یہ خبر جھوٹی ہے تو عنقریب اللہ تعالیٰ تمہاری برات کا بذریعۂ وحی اعلان فرما دے گا..... ورنہ تم توبہ و استغفار کرلو کیونکہ جب کوئی بندہ اپنے اللہ سے توبہ استغفار کرتا ہے اور بخشش مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف فرمادیتا ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ گفتگو سن کر حضرت بی بی عائشہؓ کے آنسو تھم گئے۔ تب ہی بی بی عائشہؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ جواب دیا کہ لوگوں نے جو یہ ایک بے بنیاد بات اڑائی ہے اور یہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھ چکی ہے اور کچھ لوگ اس کو سچ سمجھ چکے ہیں۔ اس صورت میں، میں یہ کہوں کہ میں پاک دامن ہوں تو لوگ اس کی تصدیق نہیں کریں گے اور اگر میں اس برائی کا اقرار کرلوں تو سب مان لیں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں اس الزام سے بری اور پاک دامن ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ضرور میری برات کو ظاہر فرمادے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت بی بی عائشہؓ کا جواب سن کر ابھی اٹھے بھی نہ تھے کہ ناگہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل ہونے لگی اور شدید سردی کے باوجود پسینے کے قطرات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدن مبارک سے ٹپکنے لگے۔ جب وحی ختم ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

''اے عائشہ.....! تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کی حمد کرو کہ اس نے تمہاری برات اور پاک دامنی کا اعلان کردیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۂ نور کی دس آیتوں کی تلاوت فرمائی..... ان آیات کے نازل ہوجانے کے بعد منافقوں کا منہ کالا ہوگیا اور حضرت بی بی عائشہؓ کی پاک دامنی کا آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ اس طرح چمک اٹھا کہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے دلوں کی دنیا میں نورِ ایمان سے اجالا ہوگیا۔

☆☆☆

حضرت بشر حافیؒ بعد نماز جمعہ کچھ طعام مول لے کر محتاجوں اور گوشہ نشینوں کو کھلایا کرتے تھے۔ ایک روز حسبِ معمول جمعہ کی نماز پڑھ کر بازار میں گئے وہاں سے گوشت، روٹی اور حلوا خرید رہے تھے کہ ایک بدگمان و منافق معتقد نے آپؒ کو جب یہ چیزیں خریدتے دیکھا تو اپنے دل میں کہا کہ دیکھو یہ کیسا مردِ کامل و باخدا ولی بنے ہوتے ہیں؟ اور دنیا کی لذتوں میں کس قدر مائل ہیں دوسرے لوگوں کو تو یہ لذتِ دنیا سے نفرت دلاتے ہیں اور خود اپنے نفس کو اس کا ذائقہ چکھاتے ہیں۔ آج تو انہیں دیکھنا چاہیے کہ یہ نعمتیں کہاں لے جاتے ہیں؟ اور کہاں بیٹھ کر کھاتے ہیں؟

حضرت بشر حافیؒ نے کھانے اپنی پوستین میں رکھے اور ایک طرف کی راہ لی۔ جن کے پیچھے، پیچھے یہ بدگمان عقیدت مند بھی لگا ہوا چلا جارہا تھا۔ اور یہ سوچ رہا تھا کہ جس جگہ پر یہ حضرت بشر حافیؒ بیٹھ کر مرغن غذا کھائیں گے وہاں انہیں خوب نصیحت کروں گا اور ان کی اس مکاری کا پردہ فاش کروں گا۔

شہر دمشق کے دروازے سے باہر نکل کر تھوڑی دور چل کر دیکھا کہ ایک مسجد ہے جس میں حضرت بشر حافیؒ داخل ہوئے پیچھے، پیچھے وہ بدظن شخص بھی داخل ہوا تب اس نے دیکھا کہ ایک نورانی چہرے والے نحیف سے مرد وہاں بیٹھے ہوئے ہیں جو کئی روز کے بھوکے معلوم ہورہے تھے۔ حضرت شیخ بشر حافیؒ نے ان کے قریب پہنچ کر انہیں سلام کیا اور کھانا پوستین سے نکال کر ان بزرگ کے آگے رکھا۔ ان بزرگ نے وہ کھانا شکم سیر ہوکر کھایا۔

بدظن عقیدت مند یہ حال دیکھ کر سخت نادم اور شرمندہ ہوا اور اپنے دل میں کہا کہ افسوس میں نے ایسے ولیِ باخدا کی نسبت بدگمانی کی اور مفت میں گناہ گار ہوا..... خیر اب یہ جب مسجد سے باہر نکلیں گے تو ان سے اس بدگمانی کی معافی مانگ لوں گا..... اُدھر حضرت بشر حافیؒ اس بزرگ کے ساتھ ذکر مولا میں مصروف ہوئے..... ادھر وہ شخص آپ کے انتظار میں سوگیا۔

جب وہ ذکرِ الٰہی سے فارغ ہوئے تو سیدھے مسجد سے چلے گئے۔ جب اس دوران اس شخص کی آنکھ کھلی تو اس نے حضرت بشر حافیؒ کو مسجد میں نہ پایا چاروں طرف اس نے پریشانی سے دیکھا کیونکہ وہ جہاں کا وہ باشندہ تھا

یعنی دمشق شہر کا تو وہ جنگل ہے اور نہ وہ بیابان بلکہ محض ایک نیا جنگل ہے ہر طرف بشر حافیؒ کو تلاش کرتا ہے اور شہر دمشق کا راستہ تلاش کرتا ہے لیکن اسے نہ راستہ ملتا ہے اور نہ بشر حافیؒ۔ آخر کار اسی مسجد میں داخل ہوکر وہ ان صالح بزرگ کے پاس پہنچا..... اور ان سے پوچھا کہ حضرت میں کہاں ہوں؟ اور حضرت بشر حافیؒ کہاں ہیں؟ اور شہر دمشق کا راستہ کدھر ہے؟ تب ان صالح بزرگ نے فرمایا..... یہ بغداد کا صحرا ہے اور تمہارا گھر یہاں سے بہت زیادہ دور ہے تم نے بدگمانی کر کے اپنی عزت گنوائی۔ اور اب دیکھا تم نے بدگمانی کر کے کیا صلہ ملا؟ تم اپنے گھر اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک وہ کامل بشر یہاں آئے۔

یہ جان کر اس شخص کے ہوش اڑ گئے بہت رویا دھویا بڑا واویلا مچایا۔ تب ان بزرگ نے کہا۔ اچھا اب ٹھہرو..... آٹھ روز تک یہیں پر انتظار کرو جب جمعہ کا دن ہوگا تو اسی طرح بعد نماز جمعہ میرے دوست بشر حافیؒ میرے لیے کھانا لے کر آئیں گے تو میں ان سے تمہاری سفارش کروں گا کہ وہ تمہارا قصور معاف کردیں اور پھر تم کو تمہارے گھر پہنچا دیں۔ اس بدگمانی کرنے والے شخص نے آٹھ روز تک وہیں قیام کیا..... جب جمعہ کا دن آیا تو حضرت بشر حافیؒ اسی طرح کھانا لیے تشریف لائے..... اور پھر بعد کھانا اور ذکر الٰہی کے ان بزرگ نے اس بدگمان شخص کو آپؒ کے سامنے پیش کیا اور کہا آپؒ اسے معاف کردیں اور اسے شہر دمشق پہنچا دیں۔

حضرت بشر حافیؒ نے خاموشی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور مسجد سے باہر لے کر نکلے اور فرمایا میرے پیچھے قدم بہ قدم چلو..... یہ حضرات چند قدم ہی چلے تھے کہ شہر دمشق کی فصیل نظر آنے لگی..... اس شخص نے آپ کے ہاتھ پر نفاق و بدظنی سے توبہ کی اور اپنے گھر کو روانہ ہوا۔

☆☆☆

حضرت ابوالفضل جوہری مصریؒ کی ایک شخص نے بہت تعریف سنی تو ان کی زیارت کی خواہش لے کر وہ مصر پہنچا جب آپ کی مجلس میں پہنچا تو حضرت کو بہت شاندار لباس پہنے دیکھا، دیکھنے میں وہ بہت امیر نظر آرہے تھے۔ اس کے دل میں فوراً یہ خیال آیا کہ اس قدر دنیاوی شان و شوکت رکھنے والے خدا کے بندے نہیں ہوسکتے۔ یہ سوچ کر وہ واپس چل دیا۔ واپسی میں ایک گلی سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ ایک عورت پریشان حال کھڑی رو رہی ہے..... اس نے رونے کی وجہ پوچھی تو عورت نے کہا کہ میری ایک ہی بیٹی ہے اور اس کی شادی کا دن قریب ہے اور آج اچانک اس پر کسی جن کا سایہ ہوگیا ہے۔ اور وہ سخت بیمار ہے میں غریب عورت ہوں، پریشان ہوں کہ اس جن کے قبضے سے میری بیٹی کیسے نکلے؟ اس نے کہا آپ گھبرائیں نہیں مجھے اپنی لڑکی کے پاس لے چلیں اس کا علاج میں کروں گا..... چنانچہ اس کے گھر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ وہ لڑکی عجیب و غریب حرکات کررہی ہے اس نے قرآن کی آیات پڑھ کر اس پر دم کرنا شروع کیا..... تو اس پر حاوی جن نے بڑی فصیح زبان میں کہا۔ ''سن لو میں ان سات جنوں میں سے ہوں جو حضرت علیؓ کے دستِ حق پرست پر ایمان لائے تھے۔ ہم ساتوں آج حضرت ابوالفضلؒ کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے آئے تھے وہی حضرت ابوالفضلؒ جن کے متعلق تم اپنے دل میں بدگمانی پیدا کر کے لوٹے ہو..... بدنصیب ہو تم جو لوٹ آئے..... ہم ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے حاضر ہوئے تھے..... اس لڑکی نے ہم پر نجاست پھینکی میرے ساتھی بچ گئے مگر وہ نجاست مجھ پر پڑی اور میں نماز سے رہ گیا اسی غصے میں نے اسے پکڑ لیا..... اور تم نے جو حضرت کے لیے بدگمانی کی ہے، اس کا بھی مجھے رنج ہے تم توبہ کرو اور حضرت کی بارگاہ میں حاضری دو.....'' اس شخص نے کہا..... ''میں سچے دل سے اس بدگمانی پر اللہ سے توبہ کرتا ہوں اور ابھی پھر واپس جاتا ہوں مگر تم بھی اس لڑکی کو معاف کردو.....'' ان کے کہنے پر وہ جن چلا گیا اور وہ لڑکی ٹھیک ہوگئی۔

پھر یہ شخص واپس حضرت ابوالفضلؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے اسے آتے دیکھا تو مسکرائے اور فرمایا..... ''جب تک جن نے نہیں کہا تم نے ہماری بزرگی تسلیم نہیں کی۔''

تو اللہ والوں سے کبھی بدگمان نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے دلوں میں اللہ کی یاد ہوتی ہے اور دنیا سے ان کا تعلق محض ظاہری اور کئی حکمتوں کی بنا پر ہوتا ہے۔ حدیث

Digitized by Google

مبارکہ میں بدگمانی کا کیا خوب علاج بیان فرمایا گیا ہے۔
”تین باتیں مومن میں ہوتی ہیں اور اس کے لیے ان میں سے نکلنے کی صورت بھی ہے۔ چنانچہ سوءِ ظن سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ اسے دل میں راسخ نہ ہونے دیا جائے۔“ مطلب یہ کہ اگر کبھی کوئی غلط گمان دل میں آ بھی جائے تو نہ اسے ٹھہرنے اور نہ جمنے کا موقع دے۔ اور نہ اعضا کے ذریعے اس کا اظہار کرے..... قلب میں جمنے کی صورت تو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے کراہیت یا نفرت کرنے لگے۔ بہر حال شیطان معمولی سی بات کو بہانہ بنا کر دل میں لوگوں کی طرف سے برائی ڈالتا ہے۔ اور دل میں یہ بھی خیال کراتا ہے کہ ہم کس قدر دانا اور عاقل ہیں کہ برائی کا کتنی جلدی ادراک کر لیا..... جبکہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے اور بدگمانی رکھنے والا شخص شیطان کے فریب کی تاریکی میں دیکھتا ہے۔

اگر آپ کسی سے بدظن ہو جائیں تو اس کی زیادہ خاطر داری کریں، زیادہ تعظیم کریں..... اس کے حق میں دعائے خیر کریں اس طرح شیطان آپ سے مایوس ہو جائے گا..... کیونکہ اچھا گمان کرنا ایمان والوں کی علامت ہے اور بدگمانی ایمان والوں کو زیب نہیں دیتی۔

اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ بدگمانی کی سخت وعید ہے کیونکہ یہ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ معاشرے میں جتنی بھی برائیاں ہیں تجسس، غیبت، حسد، بغض، کینہ، جلن، عداوت یہ تمام برائیاں آپس میں جڑی ہوئی ہیں، اور یہ بدگمانی ہے۔ صرف ایک برا گمان کرنا اور پھر اس پر جمنا معاشرے میں اتنی ڈھیروں برائیوں کو جنم دیتا ہے۔

ہر رشتے میں ہر ایک کے لیے اچھا گمان رکھیں سامنے والوں کے مثبت رویے یاد رکھیں۔ تو کبھی آپ کسی سے بھی بدگمان نہیں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سوءِ ظن یعنی بدگمانی سے محفوظ رکھے..... الٰہی آمین۔

☆☆☆

حرفِ آخر

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انتہائی نادم دل کے ساتھ دعا گو ہوں کہ اس مضمون میں کہیں کوئی غلطی، کوئی کمی، کوئی کوتاہی ہو گئی ہو..... تو اے میرے پیارے رب تو جو غفور الرحیم ہے مجھے معاف فرما دے..... ریاکاری سے بچاتے ہوئے اس کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما لے..... آمین۔ ان تمام معتبر ہستیوں کی شکر گزار ہوں جن کے کتب سے یہ مضامین منتخب کیے اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

☆☆☆

آخر میں سب سے پہلے عذرا جی! آپ کی باجی جان کا پیغام جو میرے لیے تھا پڑھا بے حد خوشی ہوئی اور ان کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے اور اتنی محبت سے میرے مضامین پڑھنے کے لیے ان کا بے حد شکریہ..... بس ان جیسے محبت کرنے والوں کی قدر دانی ہے..... جزاک اللہ.....

یہ سب اس عظیم رب کا کرم ہے اور دوسرے میرے پڑھنے والوں کی محبتیں..... خولہ سعید جاوید، ارے آپ اتنے عرصے سے کہاں چھپی ہوئی تھیں؟ ڈیئر آپ کے تبصرے نے تو میری روح تک کو سرشار کر دیا۔ کیا یاد دلا دیا آپ کی اتنی محبت، اتنا خلوص بخدا میری تو آنکھیں نم کر گیا..... خوب صورتی کی بات کر کے شرمندہ کر دیا..... یہ آپ کا حسنِ ظن ہے بس اتنے محبت بھرے تبصرے کے لیے دعا ہی دعا ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے، آمین۔ تسنیم ماپارا جی.....! آپ کی دعائیں اور محبتیں سچ جانیے مجھے ایک نئی انرجی بخشتی ہیں خوش رہیے۔ آسیہ عامر، ارے آپ کو معتبر کر دیا نہیں بلکہ آپ میرے لیے پہلے ہی سے بہت معتبر ہیں۔ کیونکہ مجھے اپنی ہر ریڈر بہن بہت پیاری اور عزیز ہے، مجھے اپنے تمام ریڈرز ناموں کے ساتھ یاد رہتے ہیں۔ ثمینہ کوکب، بہت شکریہ جزاک اللہ..... اسما شاہد، حوصلہ افزائی پر شکریہ..... سلمیٰ غزل، سچ آپ تو یقیناً میرا وزن بہت بڑھا دیا۔ آپ کے تبصرے میرا دل و دماغ سب خوش کر دیتے ہیں، خوش رہیے اور دعاؤں میں یاد رکھیے۔

باقی وہ تمام بہنیں جو بیمار ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے اور دنیا و آخرت کی تمام تر بھلائیاں عطا فرمائے۔ (آمین) آپ کی اختر شجاعت۔

وہ آئے بزم میں

ہما بیگ

منفرد لب و لہجے کی مالک
بین الاقوامی شہرت یافتہ
ادیبہ و شاعرہ
فاطمہ حسن
سے دلکش گفتگو

ادب کو زندگی کا آئینہ کہا جاتا ہے۔ جس میں ہم اپنے رہن سہن، بول چال، رویوں، طور طریقوں، رسوم و روایات، تہذیب و تمدن، اخلاق و کردار اور فکر و نظر کا عکس دیکھنے اور حتی الامکان اسے اس طرح دکھانے کی کوشش کرتے ہیں جس طرح وہ ہمارے تجربے میں آتے ہیں۔ زبان، ادب کی روح ہے۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے ایک دل کی بات دوسرے دل میں جا اترتی ہے۔ یہ باہمی رابطے کا موثر ذریعہ ہے اور اسی ذریعے

سے فکر و خیال اِک فرد سے دوسرے فرد تک پہنچتے ہیں اور یہی ذریعہ ایک مربوط معاشرے کی تشکیل نو کا سبب بنتا ہے۔ زبان ہمارے فکر و خیال کو الفاظ کا روپ دیتی ہے لفظ جتنے آسان ہوں گے زبان اتنی ہی عام فہم، شیریں، بلیغ اور موثر ہوگی۔ ادب کی خواہ کوئی بھی شکل ہو، شاعری ہو یا نثر۔ جب تک آسان فہم زبان نہ ہو۔ اسے پزیرائی نہیں مل سکتی۔ خاص طور پر آج کے تیز رفتار دور میں۔

فاطمہ حسن ان چند لکھنے والوں میں سے ہیں۔ جن کی تحریر اُن کی شخصیت کی صحیح معنوں میں آئینہ دار ہے۔ آسان فہم زبان اور دلکش اندازِ تحریر کی بنا پر وہ دنیائے ادب میں بہت منفرد مقام رکھتی ہیں۔ آپ کی شاعری میں دردمندی، شدتِ احساس، سچائی اور سچ کا کھرا پن پورے ذوق جمال کے ساتھ کارفرما ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اچھا انسان اور اچھا شاعر ایک ہی شخصیت میں یکجا ہوتے ہیں۔ تبھی زیست کے صحرا میں شجرِ سایہ دار کی صورت نمودار ہوتے ہیں۔

فاطمہ حسن نے پابند اور آزاد دونوں طرح کی نظمیں لکھیں۔ نثری نظمیں، گیت اور ہائیکو بھی۔ ان کے کلام میں ایک نوجوان کی سی محبت کا درد بھی موجود ہے۔ ایک میچور، ذمے دار خاتون کا عہد بھی اور ایک ماں والی پرورش و تمناؤں کا اظہار بھی۔ فاطمہ حسن نے عورتوں کے مسائل کو شروع سے اپنے قلم کا میدان بنایا ہوا ہے۔ اسے وہ فیمنزم، نسائیت کا نام دیتی ہیں۔ ان کے افسانوں کا بنیادی وصف بھی فیمنزم ہے۔ شاعری ہو یا نثر ان کی تحریر خواتین کے مسائل کے ہی گرد گھومتی ہے۔

اُن کی کہانیاں مختصر ہوتی ہیں..... یہ افسانے سماجی موضوعات پر ہیں۔ آپ محتاط گو انسان ہیں۔ اُنہیں اپنی نوکِ قلم اور نوکِ زبان دونوں پر کنٹرول ہے۔ فاطمہ حسن کی کہانیوں میں کہیں، کہیں سرکشی کا تو رنگ ہے، بغاوت کا نہیں۔ خود اعتمادی ہے، احساسِ برتری نہیں۔ ان کی ابتدائی کہانیوں میں دھیمی، دھیمی رومانیت ہے تو بعد کی کہانیوں میں حکایتی رنگ اور کہیں خواب کا سا بیان۔ شاعری فاطمہ حسن کی داخلی شخصیت کے رنگ و آہنگ کے ساتھ اظہار کی راہ اختیار کرتی ہے جبکہ افسانے ان کی خارجی زندگی کے تجربات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔

فاطمہ حسن کی نظموں میں نسائی رنگ نہ صرف عورت کی سوچ و فکر اور معاشرے میں اس کے مقام کو واضح کرتا ہے بلکہ یہ رنگ عورت کی محبت و نفرت اور اس کے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم اور اس کے ظلم کے خلاف اور اپنے حقوق کے لیے آواز اُٹھانے کے پہلو کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ ان نظموں میں ایک خاص قسم کی خود اعتمادی اور فخر و غرور کے اس پہلو کی بھی جھلک نظر آتی ہے جو اس معاشرے میں عورت کو اپنا الگ مقام اور پہچان بنانے میں کام آتی ہے۔ یوں تو صفحات کے صفحات بھر جائیں ان کے تعارف میں مگر آج ہم فاطمہ حسن سے بہت ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو بھی کریں گے۔ تو آیئے

سوالات کا آغاز کرتے ہیں

☆.....☆.....☆

پاکیزہ ❖.....ادبی دنیا میں قدم رکھنے کے بنیادی محرکات کیا تھے؟

ڈاکٹر فاطمہ حسن ❖.....یوں تو لکھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ جب لکھنا نہیں آتا تھا تو تصویریں بناتی تھی پھر آہستہ، آہستہ پڑھنے کی طرف مائل ہوگئی اور مطالعہ میری عادت بنتا گیا۔ اسکول کے زمانے ہی سے شاعری میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ انہی دنوں دیوان غالب ڈائری پر نقل کیا۔ ادب سے دلچسپی کی بنا پر میں نے اردو ادب میں آنرز کرنے کے لیے ڈھاکا یونیورسٹی میں ایڈمشن لیا جہاں ایک مضمون فارسی بھی تھا۔ پھر سقوطِ ڈھاکا کا سانحہ پیش آیا۔ اور اس صدمے کو کم کرنے کے لیے میں نے کتابوں میں پناہ لی۔ وہ ایک برس میں نے ڈھاکا میں گزارہ۔ اور اسی دوران ساری دُنیا کے ادب کے مطالعے کے ساتھ، ساتھ زندگی کی بہت سی تلخ حقیقتوں کا بھی تجربہ حاصل کیا۔ 1973ء میں جب کراچی آئی تو سنجیدگی سے لکھنا شروع کیا..... شعر بھی اور کہانیاں بھی۔ تخلیقی صلاحیت اللہ کی دین ہے شاعری قطعاً شعوری طور پر نہیں ہوسکتی۔ آپ شعوری طور پر اس صلاحیت کی جلا تو کرسکتے ہیں مگر اس سے تخلیقی فن پارے کی توقع عبث ہے۔

پاکیزہ ❖.....غزل آپ کے مزاج سے زیادہ قریب ہے یا نظم؟

ڈاکٹر فاطمہ حسن ❖.....غزل ہم سب کے مزاج سے قریب تر ہے، اُردو شاعری کا بڑا اثاثہ غزل پر مشتمل ہے۔ اس صنف کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا مثنوی سے ہوئی۔ مگر اس پر بھی غزل حاوی ہوتی گئی۔ شاید ہی کوئی شاعر ہو جو غزل کی مشق سے نکل سکا ہو۔ نظم کی اپنی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے موجودہ دور میں اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ نظم کا کینوس وسیع ہوتا ہے۔ یہ کسی بھی موضوع اور کیفیت کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ آزاد نظم، نثری نظم نے وسعتِ بیان کی شکایت کو کسی حد تک دور کیا ہے۔ جہاں تک میرے مزاج کا تعلق ہے مجھے غزل اور نظم دونوں اصناف پسند ہیں۔ شاعری اپنے اظہار کی صورت خود منتخب کرتی ہے۔ شعر کہنے سے پہلے تو یہ فیصلہ نہیں کیا جاتا کہ اس بحر میں اتنے اشعار ان معنی اور مضامین کے ساتھ کہے جائیں گے۔

یہ تو ایک غیر شعوری عمل ہے، تخلیق اپنا پیرایہ اظہار خود منتخب کرتی ہے، شعر کی تخلیق اختیاری نہیں ہوتی۔ یہ سرزد ہوجاتی ہے۔ اس صورتِ حال میں یہ فیصلہ کرنا کہ کیا مزاج سے قریب ہے، مشکل ہے۔ جس قسم کے حالات اور موڈ سے انسان اس وقت دوچار ہوتا ہے وہی شاعری پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر رومینٹک اظہار کے لیے غزل اور تلخ حقائق کے اظہار کے لیے نظم زیادہ موزوں ہے۔ کبھی، کبھی اس کے برعکس بھی ہوجاتا ہے مگر یہ ضرور کہوں گی کہ آج کے دور میں نظم ہمارے مزاج میں زیادہ داخل ہوگئی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ آج کے پیچیدہ مسائل اور تجربے اظہار کے لیے بڑا کینوس چاہتے ہیں۔

پاکیزہ ❖.....آپ کی نظموں میں اختصار بہت زیادہ ہے۔ یہ مزاج کا حصہ ہے یا آپ نظموں میں اس کو بہتر سمجھتی ہیں؟

ڈاکٹر فاطمہ حسن ❖.....میں اسے بہتر سمجھتی ہوں اسی لیے یہ میرے مزاج کا حصہ ہے۔ میرے خیال میں غیر ضروری تفصیلات اور الفاظ کی بھیڑ بھاڑ خیال کی گہرائی اور احساس کی شدت کو متاثر کرتی ہے۔ اکثر اوقات میں نظمیں لکھ کر فاضل سطریں کاٹ دیتی ہوں۔ بس وہی سطریں رکھتی ہوں جس کے ذریعے بات قاری تک بھی پہنچے اور نظم کا دائرہ بھی مکمل ہوجائے۔

پاکیزہ ❖.....آپ نے نثری نظمیں بھی کہیں، کیسا تجربہ رہا؟ آپ کے نزدیک نظم کی موجودہ دور میں کیوں ضرورت ہے؟

ڈاکٹر فاطمہ حسن ❖.....بہت اچھا۔ نثری نظم شدتِ جذبات کے لیے موزوں ہے۔ اس کا روھم دراصل جذبے

Digitized by Google

اور کیفیت کا ردھم ہے۔

اگر نظم میں شدت ہے تو وہ قاری تک منتقل ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ تلخ و پیچیدہ حقائق کا اظہار نثری نظموں میں بھرپور طریقے سے ہوتا ہے۔ یہ صنف آج کے عہد کے بہت سے پیچیدہ مسائل اور تجربوں کو بیان کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہے۔ میں نے بیشتر نظمیں شدت کی کیفیت میں لکھی ہیں۔ اس میں کوئی کیفیت ایسی ہوتی ہے جو عام حالت میں مختلف ہوتی ہے جو غزل اور پابند نظم میں نہیں لکھی جاسکتی۔

پاکیزہ ❖.....آپ کی غزل میں نسوانیت کے ساتھ، ساتھ انفرادی طریقے سے جرأت اور بے باکی بھی نظر آتی ہے اس کی وجہ؟

ڈاکٹر فاطمہ حسن ❖.....جدیدیت اور نسائی ادب کی طرف میرا رجحان ابتدا سے رہا ہے۔ میرا پہلا مجموعہ کلام بہتے ہوئے پھول میں زیادہ تر نثری نظمیں ہیں۔ اور ان میں کئی نظموں کو نسائی تنقید کے حوالے سے دیکھا گیا ہے۔ سچا اظہار ہمیشہ انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔ میرے تجربات صرف میرے ہیں۔ انہیں لکھتے ہوئے جو پیراڈکشن میں نے استعمال کیا ہے۔ اس میں یہ خیال رکھا ہے کہ کسی اور کا عکس اس پر نہ پڑے۔ جو علامتیں، استعارے کسی کردار کی پہچان ہوں ان سے اجتناب کیا ہے۔ اسی طرح اضافتوں اور تراکیب کا وہ استعمال جو اب ہماری زندگی سے خارج ہے۔ اس کا میں نے اپنی تحریروں میں کبھی استعمال نہیں کیا۔ میری سچائی ہی میری انفرادیت ہے اور میری جرأت بھی۔

پاکیزہ ❖.....آپ کی شاعری میں نسائی شعور کی کوئی خاص وجہ؟

ڈاکٹر فاطمہ حسن ❖..... میں جو صحیح سمجھتی ہوں، وہی لکھتی ہوں، لوگوں نے اسے بعد میں فیمنزم کا نام دیا۔ میں نے جب 1975ء میں یہ نظم لکھی تو صرف معاشرتی ناانصافی میرے شعور میں تھی۔

میں ماں سے یہ کہتی ہوں
یہ پیڑ جو میں نے لگائے ہیں
وہ آسیب بن کر میرے بچپن کا ڈر بن جاتے ہیں
تو وہ ہنستی ہے اور کہتی ہے
میری گود تمہارے لیے بہت چھوٹی ہے
پھر میں آنکھوں کا ہر اس چھپانے کے لیے
اخبار سامنے کر لیتی ہوں
اور اس کی آنکھیں ویتنام کی تصویر میں الجھ جاتی ہیں
وہ دھیرے سے کہتی ہے
جنگ سے اغوا تک کی خبروں میں
تم نے امن کا اشتہار کہیں دیکھا ہے؟
میں تمہیں تمہارے باپ کے خلاف بولتے دیکھ کر
بہت خوش ہوتی ہوں
کہ اب تمہاری پناہ میں آنا چاہتی ہوں

تو 1975ء میں یہ کہنا کہ ماں، بیٹی کی پناہ میں آنا چاہتی ہے اور باپ کے خلاف بولتے دیکھ کر خوش ہوتی ہے تو اس نظم کو لکھتے وقت مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ یہ میں فیمنزم لکھ رہی ہوں۔ یہ میرا سچا اظہار تھا، نہ تو مجھے میرے باپ سے کبھی کوئی تکلیف پہنچی، نہ ہی

اپنے شوہر سے، میں نے معاشرے میں جو دیکھا، جو محسوس کیا، وہی لکھا کس، کس طرح عورتوں کو ہدف بنایا گیا۔ جاہل، بیوقوف، کمزور اور بزدل کہا گیا۔ اور اپنی مردانگی کے نام پر جو، جو ظلم کیے، اپنی کم بصیرتی کی وجہ سے عورت کو اس کا جائز مقام نہیں دیا گیا۔ مرد صرف اپنے ذاتی مفاد کو دیکھ رہا ہوتا ہے، یہ نہیں سوچتا کہ اس ایک عورت سے اپنی آنے والی نسل، ملک و قوم پر کیا اثرات پڑ رہے ہیں، یہ سب دیکھ کر مجھے تو لگتا ہے عورتیں زیادہ دانش اور برداشت کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ بہت سی قربانیاں وہ صرف اس لیے دیتی ہیں کہ نہیں گھر برباد نہ ہو جائے۔ خاندان نہ بکھر جائے، قوم برباد نہ ہو جائے۔

پاکیزہ ❖.....اچھا اب ذرا بات آج کے معاشرتی رویوں پر ہو جائے کہ..... پہلے کی نسبت اب طلاق کی شرح بہت بڑھ گئی ہے اس کی وجہ جدید فلمیں، انٹرنیٹ، فیس بک تو نہیں ہیں؟

ڈاکٹر فاطمہ حسن ❖..... ہر چیز کے منفی پہلو بھی ہوتے ہیں اور مثبت پہلو بھی۔ ہر دور میں جو ترقیاں ہوئی ہیں اور انسان نے جو ایجادات کی ہیں ان میں اس کے اپنی تباہی کے بھی پہلو ہیں، پہلے جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس دور کے حساب سے تھا۔ آج جو ہو رہا ہے وہ آج کی ضروریات کے تحت ہے، وقت کے پہیے کو الٹا تو نہیں چلایا جاسکتا، ہاں ان ایجادات کو مثبت انداز میں اپنے استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ جیسے ٹیلی ویژن، موبائل انہوں نے اگرچہ مطالعے کو ختم کر دیا ہے لیکن جب میں بیرون ملک جاتی ہوں تو وہاں لوگ چاہے بس میں سفر کر رہے ہوں حتیٰ کہ سوئمنگ پول پر بھی ہوں کتاب ان کے زیر مطالعہ ہوگی۔

ہمیں اپنے بچوں میں مطالعے کا شوق، رجحان پیدا کرنا ہوگا اور یہ کام صرف والدین ہی کر سکتے ہیں اگر آپ نے اپنے بچوں کے ہاتھ میں کتاب پکڑائی تو وہ کبھی نہیں چھوٹے گی، مطالعہ اس کی فطرت کا حصہ بن جائے گا۔ دوسری بات پہلے ذرا ہم خود کو دیکھیں کہ ہم خود کیا کر رہے ہیں، والدین مکاری کریں، جھوٹ بولیں، رشوت لیں، ہر وقت موبائل اور غیر ضروری مصروفیات میں پڑ کر بچوں کو اگنور کریں اور پھر امید لگائیں کہ بچے ایک اچھے شہری، اچھے انسان بنیں، تو یہ ناممکنات میں سے ہے۔

پاکیزہ ❖.....موجودہ دور میں تنقید نگاری میں کافی کمی آگئی ہے اس کی وجہ؟

ڈاکٹر فاطمہ حسن ❖..... تنقید کے لیے جس مطالعے کی ضرورت ہے اس کی موجودہ دور میں کمی ہے، تنقید کرنے والا اگر منطقی انداز میں دلائل کے ساتھ تنقید کر رہا ہے تو اسے سب برداشت بھی کریں گے اور ان کی تحریر پر مثبت اثرات بھی مرتب ہوں گے، مطالعے کی کمی کی وجہ سے کوئی کیسے معتبر ہو سکتا ہے۔ تنقید وہ کرے جسے مکمل اسلوبیات کا پتا ہو، تحریکوں کا پتا ہو پھر تو وہ تنقید کر سکتا ہے۔ تنقید نگار کو با مطالعہ ہونا ضروری ہے۔ پھر تو لوگ اس کی تنقید پر اس کے احسان مند ہوں گے اور اگر تنقید کے بجائے تضحیک اور تنقیص مقصد ہو تو اسے کوئی برداشت نہیں کرے گا۔

پاکیزہ ❖.....آپ کا تعلق ایک نامور تحریک ایک کارآمد ادارے سے ہے..... یہ بتائیں کہ انجمنِ ترقی اردو کے اہم مقاصد کیا ہیں؟

ڈاکٹر فاطمہ حسن ❖.....انجمنِ ترقی اردو کا کتب خانہ اور دفتر اس وقت گلشن اقبال کراچی میں ایک ہزار گز کی عمارت میں واقع ہے جو رہائش کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔ اس کی اوپر کی منزل بطور لائبریری استعمال ہو رہی ہے جبکہ نیچے کی منزل میں انتظامی دفاتر ہیں اور ماہانہ مجلہ قومی زبان تحقیقی و تنقیدی کتب کی اشاعت و فروخت کی انجام دہی کی جاتی ہے۔ اس مختصر سی جگہ میں متبادل انتظام کر کے باقاعدگی سے علمی اور ادبی تقریبات بھی منعقد ہوتی ہیں۔

اس انجمن کے قیام کا مقصد اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے پاکستان میں عملی طور پر نافذ کرانا ہے اور زبان و ادب کی ترقی و اشاعت ہے ساتھ، ساتھ

Digitized by Google

شاخیں قائم کرنا.....اردو اور پاکستان کی علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لانا ہے۔

پاکیزہ ❖.....ایک بے حد خوب صورت کارہائے نمایاں یعنی اردو باغ.....اردو باغ کی تعمیر کی کیا وجوہات ہیں؟

ڈاکٹر فاطمہ حسن ❖..... موجودہ عمارت میں نہ تو ساٹھ ہزار کتابوں اور رسائل کی گنجائش ہے۔ اسی وجہ سے نئی کتابیں اور متعدد خیر خواہوں کی جانب سے دی جانے والی تاریخی کتابیں لائبریری کی کتب میں شامل نہیں کی جارہی ہیں، حتیٰ کے انجمن کے نادر مخطوطے امانتاً نیشنل میوزم میں رکھے گئے ہیں جن کو لائبریری میں ہونا چاہیے تھا۔

ان حقائق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جون 1987ء میں اس وقت کے صدر انجمن جناب نور الحسن جعفری نے کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی سے ایک ایمنٹی پلاٹ اسکیم 32 گلستان جوہر کراچی میں لائبریری کے لیے حاصل کیا۔ اس پلاٹ پر وسائل نہ ہونے کی وجہ سے تقریباً دو دہائی تک تعمیر نہیں ہوسکی۔ سابق صدرِ پاکستان جناب ممنون حسین کی اردو سے محبت اور وسعت نظری تھی کہ انہوں نے اس جانب نگاہ کی۔ اردو باغ کی تعمیر کو مکمل سرپرستی، براہ راست نگرانی اور بروقت عمل کے ذریعے نہ صرف ممکن بنایا بلکہ اس کی تعمیر کے پہلے مرحلے کے لیے وسائل بھی مہیا کیے۔ جو بلاشبہ قابلِ تحسین ہے۔

پاکیزہ ❖.....ماہنامہ پاکیزہ کے حوالے سے آپ کیا کہنا چاہیں گی؟

ڈاکٹر فاطمہ حسن ❖.....گزشتہ چالیس دہائیوں سے زائد پر محیط یہ پاپولر ادب کا ماہنامہ پاکیزہ میرے بھی زیرِ مطالعہ رہا اور اس کے پڑھنے اور لکھنے والوں سے بھی رابطہ رہا.....یہ بھی اردو زبان و ادب کی خدمت میں پیش، پیش ہے۔ اللہ معراج رسول صاحب کو صحت و زندگی دے کہ ان کا ادارہ اردو زبان و بیان کی آبیاری اور خدمت میں مسلسل سرگرم عمل ہے۔ (الحمدللہ)

ہاں میں پاکیزہ قلم کاروں سے اپنی بہنوں سے یہ ضرور کہنا چاہوں گی کہ کوئی بھی تحریر لکھتے وقت اپنی صنف کے وقار اور مان کو پیشِ نظر رکھیں اپنی ہی صنف کو نفسیاتی طور پر کم تر اور مضحکہ خیز یا انتہائی مظلوم یا ظالم بنا کر پیش مت کریں جس سے بحیثیت انسان اس صنف کے مقام و مرتبے کو ٹھیس پہنچے۔

ویسے میں پاکیزہ پڑھتی رہی ہوں اور شاعری بھی چھپتی رہی ہے اس کے علاوہ اور کیا کہوں بس مصنفات اور اردو شعراء ادب کی ترویج اشاعت اور تعمیری امور میں اپنا حصہ ڈالتی رہیں۔

ہوا چلے گی تو خوشبو میری بھی پھیلے گی
میں درختوں پہ چھوڑ آئی ہوں اپنے ہاتھ کے رنگ

☆☆☆

ایک دلکش شام نیلوفر عباسی کے نام

آسیہ عامر

عزیز قارئین! یہ احوال ہے اس پارٹی کا جس میں رنگ و خوشبو باتیں کرتے ہیں دلکش آنچل لہراتے ہیں اور دل نشیں ہستیوں سے خوب صورت گفتگو ہوتی ہے۔

جی ہاں آپ نے صحیح پہچانا۔ یہ پاکیزہ کی روحِ رواں ہماری بہت ملنسار، خوش اخلاق اور دوستوں کی دوست و بے حد قدر دان محترمہ عذرا رسول کے زیرِ اہتمام ایک خوشگوار نشست کا احوال ہے۔

آپی عذرا رسول کی طرف سے دی گئی پارٹی کا تو سنتے ہی ایسا لگتا ہے کہ سردی کے موسم میں بھی ہوا بہار کی تعریف میں گنگنا رہی ہے تا حدِ نگاہ حسین نظاروں کا ایک دلفریب منظر اپنی دل کشی دکھا رہا ہے۔ گلاب مسکرا رہے ہیں، کلیاں چٹک رہی ہیں، ہر طرف شوخ نظارے منتظر ہیں۔ ایسے میں چار بجے شام تک کا انتظار.....اور پھر وہاں کے سحر کن ماحول کا تصور..... فضا میں تو کیا ہمارے من میں بھی بہار کا سماں ہے۔ بہر حال ہم بھی اس بہار کو انجوائے کرنے پوری تیاری کے ساتھ پارٹی میں پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی ہمیں نزہت اصغر اور عذرا رسول صاحبہ نے پاکیزہ کی عاشق کا خطاب دے ڈالا جو ہم نے دل و جان سے قبول کیا ہے۔ وہ بہت بہت پیار اور خلوص سے ملیں۔

نزہت اصغر کا مجھے بانہیں پھیلا کر گلے ملنے کا انداز بڑا بے ساختہ تھا۔ چند خواتین اور آ گئی تھیں تو عذرا صاحبہ نے کہا کچھ تصویریں بنوا لیتے ہیں اور سب کے کیمرے آن ہو گئے۔ تصویریں لیتے، لیتے دیگر مہمان بھی آ گئے۔ عذرا رسول ہلکے پیلے اور فیروزی کمبی نیشن

URDU TUBE
www.urdutube.com
Digitized by Google

کے خوب صورت لباس میں ہمیشہ کی طرح بہار کا تازہ کھلا گلاب لگ رہی تھیں۔ (ماشاء اللہ) ہاتھوں میں فیروزہ انگوٹھی اور فیروزی گولڈ کی چوڑیوں کا سیٹ ایسے لگ رہا تھا جیسے انہی کے لیے بنا ہے۔ ہلکے پھلکے میک اپ میں بہت پُرکشش لگ رہی تھیں اور سادگی میں بھی تیرا حسن لاجواب ہے۔''

نزہت اصغر سی گرین سوٹ میں پہلے سے زیادہ ینگ لگیں۔ ایک بات نوٹ کررہی ہوں نزہت اصغر کو جب بھی دیکھتی ہوں خدا جھوٹ نہ بلوائے پہلے سے زیادہ اسمارٹ لگتی ہیں، ماشاء اللہ! آمنہ حماد، یمنیٰ احمد، لبنیٰ خیال سب بہت پیاری اور اپنی، اپنی لگیں۔ لبنیٰ خیال کا نام بڑا شاعرانہ سا ہے۔ شاعرانہ سے اپنی شاعرہ شگفتہ شفیق یاد آئیں۔ جو مسکراتے چہرے کے ساتھ ہاتھوں میں خوب صورت بکے لے کر آئیں تو پورا ماحول گل و گلزار ہوگیا۔ بلیو ایمبر ایڈری کرتا اور شانگ پنک اور بلیو لہریوں والا چوڑی دار پاجامہ پہنے بہت پیاری اور زندہ دل لگیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی زندہ دلی ہمیشہ سلامت رکھے، آمین۔

رضوانہ پرنس آف وائٹ سوٹ میں گولڈن بالوں میں مسکراتی ہوئی اچھی لگیں۔ ہما بیگ کے تو جی کیا کہنے راڈ سیٹنگ میں پہلے سے بالکل چینج لگیں۔ اسی دوران چیف ایڈیٹر دوشیزہ منزہ سہام مرزا آئیں۔ ایسے آئیں کہ بس چھا گئیں۔ منزہ کی آنکھیں جگنوؤں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ اسکن اور فیروزی کمبی نیشن کے کپڑوں میں کندھوں پر پشمینہ کی نفیس شال اوڑھے بہت اسمارٹ لگ رہی تھیں۔ مجھے ملتے ہی انہوں نے مجھ سے میری بیٹی عائشہ کا پوچھا۔ ''بیٹی کو ساتھ نہیں لائی ہو؟'' اور پھر میرے اکلوتے جھمکے پر نظر پڑتے ہی کہنے لگیں۔ میں بھی ایک کا فیشن آگیا ہے۔ نزہت اصغر کو بھی بہت پسند آئے تو میں نے ساری رام لیلا سنادی کہ چلتے ہوئے گھر میں ایک ٹوٹ کر گر گیا تو میں ایک ہی پہن کر آگئی کہ کہیں پارٹی ہی نہ ختم ہوجائے۔ عقیلہ حق سے میری پہلی ملاقات میں ہی ایسا لگا جیسے کوئی اپنا بچھڑا

عذرا رسول، نیلوفر عباسی کو پھول اور تحائف دے رہی ہیں جبکہ نیلو صاحبہ نے بھی تحائف دیے

ہوا ملتا ہے۔ ناہید فاطمہ حسنین نے بالوں کو اسٹریٹ کیا ہوا تھا، وہ سیدھی لال قلعہ سے آئی تھیں جہاں ان کی فیملی پارٹی تھی، بہت غضب ڈھا رہی تھیں۔ قوس قزح لگ رہی تھیں۔ سرسبز نیلے پیلے، لال گلابی کا سنی دوپٹوں والیوں کے ساتھ بہت پیاری، پیاری تصویریں .... بنوائیں۔ سیما مناف، حمیرا طارق میرا فیورٹ کلر پہنے ہوئے اور زہرہ جنید، روبینہ رشید، یاسمین رشید سب بہت اچھے لگ رہے تھے۔ یہ احوال ہے اس پارٹی کا جس میں پیار بھری خوشیوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جس میں بار بار ڈوب کر ابھرنے کو دل چاہتا ہے۔

تو بہنو! اب انتظار ختم ہوا۔ تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آگیا۔ جی ہاں مہمانِ خصوصی ''عید کا چاند'' ماضی کی نامور اداکارہ، صدا کارہ، ملٹی ٹیلنٹڈ شخصیت نیلوفر عباسی جن کا ڈراما شہزوری سپر ڈوپر ہٹ ہوا تھا اور آج تک سب اس کے گرویدہ ہیں۔ جس کے متعلق نامور اداکارہ شبنم نے کہا تھا۔ ''جو کردار نیلوفر عباسی نے کردیا ہے وہ میں بھی نہیں کرسکتی۔''

یہ پارٹی خاص اس دوستی کے نام تھی جو عذرا رسول اور نیلوفر عباسی کی بیس سال سے زائد عرصے سے رواں دواں ہے۔ کسی سیانے نے کیا خوب کہا ہے۔ ''ان لوگوں کو کھونے سے ڈرو جن کے نزدیک دوستی کے رشتے خون کے رشتوں سے زیادہ عزیز ہوں۔'' ایک دفعہ پھر نیلوفر عباسی کے ساتھ سب نے تصاویر لیں۔ اسی دوران سیما رضا روا بھی آگئیں۔ اب سب اپنی، اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے۔ عذرا رسول ہر گیدرنگ میں کوئی نہ کوئی خوب صورت بات یا پیغام ضرور دیتی ہیں بلکہ رائٹرز کو بھی اظہارِ خیال کا پورا موقع فراہم کرتی ہیں۔ انہوں نے نیلوفر عباسی کو مخاطب کرکے کہا۔ ''نیلو آپ اتنے عرصے سے ملک سے باہر ہیں مگر جب بھی آتی ہیں تو آپ کے دوست احباب اور مداح اسی طرح آپ کو عزت دیتے ہیں۔ مختلف تقریبات منعقد کرتے اور بے انتہا خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ آپ ماشاء اللہ آج بھی لوگوں میں اتنی مقبول ہیں۔ اتنا عرصہ گزر گیا لیکن آج بھی آپ آتی ہیں تو ایک بھی لمحہ خالی نہیں جاتا بلکہ مجھے بھی اتنے انویٹیشن دیتی ہیں جن سے میں فائدہ نہیں اٹھا پاتی ایک آدھ ہی میں پہنچ پاتی ہوں۔ نیلو آپ سے میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں تھوڑا سا کچھ بتائیں کہ کس طرح زندگی گزارنی چاہیے اور کیا اصول ہونے چاہئیں کہ سب سے تعلقات اچھے رہیں۔ درگزر کرنے کا معاملہ کتنا ہو اور کتنا وسیع دل ہونا چاہیے کہ چھوٹی سی چھوٹی بات اور بڑی سے بڑی بات کو بھی نگیٹو نہ لیں۔'' عذرا صاحبہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا کہ ''نیلو کے جواب دینے سے پہلے ایک بات میں ضرور

دائیں سے عقیلہ حق، نیلوفر عباسی، منزہ سہام، عذرا رسول، ہما بیگ، سیما مناف، یاسمین رشید و سیما رضا

URDU TUBE
Digitized by Google

بتاؤں گی جو کہ مجھے لازمی بتانا بھی چاہیے کہ یہاں تک جو نیلوفر کے ساتھ تعلقات پہنچے ہیں تو وہ زیادہ تر نیلوفر کی وجہ سے ہی ہیں۔ ان کی وضع داری، ان کا خلوص۔ کبھی انہوں نے یہ نہیں کہا کہ زیادہ تر میں ہی فون کرتی ہوں۔ عذرا آپ نہیں کرتیں کیونکہ یہ جانتی ہیں کہ میں کس طرح مصروف رہتی ہوں۔ یہ محسوس کرتی ہیں کہ میرے شوہر کتنے شدید بیمار ہیں، ان کے ساتھ میری مصروفیت اور ذہنی تکان کس حد تک ہے۔ نیلو کی یہ بڑائی ہے کہ کبھی شکایت نہیں کرتیں اگر فون اٹینڈ نہیں بھی کیا اور میں نے... کئی دن بعد دیکھا تو افسوس ہوا کہ نیلوفر کا فون آیا تھا مگر انہوں نے کبھی شکایت نہیں کی کہ میرا فون اٹینڈ نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ آج یہ میرے ساتھ یہاں بیٹھی ہیں۔ اتنے سالوں میں ایک بار بھی شکوہ کرتیں، بدگمانی پالتیں اور دور ہو جاتیں اور میں اسے نہیں پکڑ پاتی کیونکہ میرے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوتا لیکن بیچاری فون کر کے چھوڑ دیتی ہیں اور میرے دل میں اتنی بڑی جگہ بنا دیتی ہیں کہ کیا بتاؤں میری سالگرہ ہو تو ان کا میسج بھی آئے گا اور فون بھی۔ یقیناً یہ ان کا پیار ہے، خلوص ہے جس سے ہم بندھے ہوئے ہیں۔"

نیلوفر عباسی، عذرا رسول اور رضوانہ پرنس بے حد خوشگوار تاثرات کے ساتھ

عذرا آپی کی سچی اور خلوص بھری باتوں کے بعد اپنے خوب صورت نرم و ملائم لہجے میں کہ جس سے اخلاص کی شیرینی ٹپکتی ہے۔ وہ لہجہ جو دھنک گیت بن کر سماعتوں کو خوشگوار احساس دے، ایسا لگے کہ کوئی الہڑ دوشیزہ شفق نرم کومل سروں میں کوئی پیار کی بات کہنے چلی ہو۔ ایسے جیسے ریشم کے جھولے پر کوئی مدھر گیت ہلکورے لینے لگا ہو کیا دل گداز و مسحور کن انداز۔

جیسی نیلوفر عباسی کی شخصیت ہے ویسا ہی دھیما لہجہ نرم و ملائم بہت پیاری شخصیت کی مالک..... عذرا صاحبہ کے سوال کے جواب میں انہوں نے کچھ یوں کہا۔

"عذرا نے جو کچھ کہا میں بالکل اسے قبول کرتی ہوں (خوب صورت مدھر قہقہہ) دوسری سب سے بڑی بات یہ کہ وہ جگہ بہت اچھی ہوتی ہے، وہ وقت بہت اچھا ہوتا ہے جہاں آپ اپنے چاہنے والوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے یہاں جتنے بھی لوگ آئے ہیں وہ سب مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ یہ ملاپ بلاغرض ہے کیونکہ یہاں جتنی اس وقت پیاری، پیاری رائٹرز، ریڈرز، شاعرات موجود ہیں انہیں مجھ سے کوئی غرض نہیں، عذرا سے بھی کوئی غرض نہیں کیونکہ عذرا اگر ان کی تحریریں چھاپتی ہیں تو ان کے ٹیلنٹ کی بنا پر، کوئی ذاتی تعلقات پر نہیں تو یہ میرے لیے بہت ہی خوشی کی بات ہے۔ میں جب سے آئی ہوں اتنی ٹینشن کہہ لیں یا مصروفیت کہہ لیں کہ بس اِدھر دوڑ اُدھر دوڑ لیکن میں آج شام کے لیے بہت ایکسائٹڈ تھی کہ میں یہاں جاؤں گی تو فریش ہو جاؤں گی اور میں بہت خوش بھی ہوں گی اس لیے کہ مجھے بہت پیارے بہت خوب صورت چہرے پُرخلوص جذبات و احساسات لیے نظر آئیں گے وہ جو ہمیشہ میرے ساتھ رہے ہیں۔

شگفتہ شفیق شاعرانہ لب و لہجے کے ساتھ عذرا رسول کو خوب صورت پھول دیتے ہوئے

ہیں مگر پھر بھی ہمیشہ موقع فراہم کرتی ہیں جہاں تک عذرا نے یہ سوال کیا کہ کس طرح میں بہت سارے لوگوں سے تعلقات جو کہ مختلف فیلڈ کے ہیں نبھاتی ہوں تو میں خود ہمیشہ ایک سی رہی۔ میں بلاغرض، بے لوث ملتی ہوں بلکہ ان لوگوں سے خود ہی دور ہو جاتی ہوں کہ جن سے کام پڑ سکتا ہے کہ کہیں کچھ کہہ نہ دوں۔ میں حیران ہوتی تھی (یہ بات اپنے منہ سے کہنا اچھا نہیں لگتا) کہ جب میرے کیریئر کا عروج تھا، پی ٹی وی پر شہزوری چلا اس وقت میں یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ تھی وہاں لڑکیاں اور لڑکے بھی ساتھ ہی تھے، وہ کہتے تھے ارے آپ تو ویسی ہی ہیں، میں کہتی کیا مطلب.....؟ مطلب آپ میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی، آپ اسی طرح سے بات کرتی ہیں اسی طرح سے behave کرتی ہیں۔ یونی کے پوائنٹ میں ہی چڑھتی ہیں۔ میں نے کہا تو اور کیا میں جہاز میں چڑھوں گی، پوائنٹ کی بس میں ہی جاؤں گی ناں۔ ظاہری بات ہے اور جو یونیورسٹی کا ماحول ہے وہی کپڑے پہنوں گی، وہی گاؤن پہنوں گی مجھ میں کوئی سرخاب کے پر تو نہیں لگ گئے ہیں۔ شہرت نے یا مداحوں کی پسندیدگی نے میرا دماغ نہیں خراب کیا، عذرا کا یہ خلوص ہے کہ وہ مجھے کبھی بلانا نہیں بھولتیں حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ بہت مصروف رہتی

دائیں سے ہنستی مسکراتی ناہید فاطمہ حسنین، یمنیٰ احمد، آمنہ حماد، آسیہ عامر، عذرا رسول و نزہت اصغر

Digitized by Google

دائیں سے لینی خیال، روبینہ رشید، عذرا رسول، سیما مناف، حمیرا طارق اور زہرہ جنید

میں اللہ کا بہت شکر ادا کرتی ہوں اور میں انہی لوگوں سے ملنا پسند کرتی ہوں جن میں تصنع نہ ہو اور اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس وقت بھی میرے اردگرد جو لوگ ہیں۔ وہ بہت پیار کرنے والے اور سچے کھرے لوگ ہیں ماشاء اللہ۔ اس دوران عذرا آنٹی ویٹرز کو ہدایات دیے جارہی تھیں۔ نیلوفر عباسی کی خوب صورت باتوں کے بعد پُرلطف ہائی ٹی کا آغاز ہوا کہ جس میں بہت گرما گرم مزیدار حلیم، کرسپی فش اینڈ چپس، الفریڈو پاستا، چکن سینڈوچز، خستہ گرما گرم سموسے اور جناب میٹھے میں گاجر کا حلوا تھا جسے سب نے ہی مزے لے، لے کر کھایا۔ پاکیزہ کی تقریبات میں ہمیشہ بہت اچھا مینو ہوتا ہے اور بے انتہا مزیدار اور معیاری کہ جس سے سبھی لطف اندوز ہوتے ہیں الحمدللہ۔ آخر میں گاجر کا حلوا کھاتے ہوئے بڑے کمفٹس ہوئے۔ عذرا آنٹی نے کہا آج کل میٹھا کم ہی کھانا چاہیے لیکن میٹھا، میٹھا بولنا ضرور چاہیے۔ عقیلہ حق نے کہا میٹھا کیسے بولا جاتا ہے؟ یعنی کہ اخلاق! کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ کہا لب لباب یہ ہے کہ.....

''خوش اخلاقی ایک جادو ہے جو ننانوے فیصد لوگوں پر اثر انداز ہوتا ہے، خوش اخلاقی کی زبان نہیں ہوتی لیکن وہ اپنی اس بے زبانی کے باوجود جنگلی سے جنگلی اور وحشی سے وحشی انسان کو بھی رام کرلیتی ہے اور کوئی قیمت بھی نہیں لگتی اور نفع بہت زیادہ۔'' (کیوں بہنو! ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟) اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کے دلوں میں پیار محبت ہمیشہ قائم رکھے، الٰہی آمین۔ سب رائٹرز اور ریڈرز عذرا آنٹی سے اس طرح فرمائش کرتی ہیں جیسے اپنی امیوں سے کرتی ہوں گی کہ اگلے مہینے پھر پارٹی رکھیں؟ تو وہ بھی اسی شان سے کہتی ہیں ہاں تو مل جل کر decide کرلو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عذرا رسول کو بہت بڑا دل دیا ہے۔ سادگی، اپنائیت، پیار، معصومیت، سمجھداری، زمانہ سازی، شہرت کیا کچھ نہیں دیا۔ اللہ ان کا دامن خوشیوں سے بھرا رکھے اور سرمعراج کو تندرستی دے (آمین)۔ ہم سب کی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ ہاں آخر میں گرم گرم چائے اور کافی کا بہت مزہ آیا۔

تو بہنو! یوں ایک بہت پُروقار اور پُرخلوص دوستوں کی محفل برخاست ہوئی، جہاں سے میں تو بہت خوشگوار یادیں اور باتیں لے کر گھر کو روانہ ہوئی، اب آپ بتائیے گا کہ آپ کو اس تقریب میں کتنا مزہ آیا۔

☆☆☆

کتاب دوستی کا رجحان

شائستہ زریں

معزز قارئین! السلام علیکم

فروری کا مہینہ آمدِ بہار کی نوید دیتا ہے۔ اِدھر چند برسوں سے عالمی سطح پر فروری کا ایک دن محبت سے منسوب کیا جاتا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ دیوانے تو دیوانے بعض فرزانے بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ اور جب بات محبت کی چل نکلی ہے تو کیوں نہ کتابوں سے دوستی اور محبت کرنے والوں کی بات کی جائے تو جو کتابوں سے وفا نباہنے کے لیے سالانہ یوم کا انتظار نہیں کرتے۔ جب جی چاہتا ہے سفرِ عشق پر نکل پڑتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اس المیے کا شکار ہیں کہ کتاب کلچر بے اعتنائی کا شکار ہو کر رفتہ رفتہ ہمارے درمیان سے اٹھتا جارہا ہے۔ اس کی جگہ اب سوشل میڈیا نے لے لی ہے۔ ہاتھ میں لے کر کتاب پڑھنا اب وقت کا زیاں سمجھا جاتا ہے۔ اس کا ایک جواز یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ کتابوں میں خیالی باتیں ہوتی ہیں ہم حقیقت پسند ہیں۔ کتابیں تخیل کا شاہکار ہوں یا حقیقی زندگی کی نقیب اگر دلچسپ اسلوب کی حامل اور بامقصد ہوں تو پڑھ کر نہ صرف لطف آتا ہے بلکہ ان میں درج کوئی فقرہ شعر یا قول صرف قلب و ذہن پر مثبت اثرات ہی مرتب نہیں کرتا بلکہ پڑھنے والوں کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

ان ہی عوامل کے پیش نظر ہم نے ایک سروے رپورٹ تیار کی اور شرکاء سے معلوم کیا کہ

سوال نمبر 1: آپ کے خیال میں کتاب دوستی کا رجحان پہلے کی بہ نسبت گھٹا ہے یا بڑھا ہے؟ کیوں؟ خود آپ کی کتاب سے کتنی اچھی دوستی ہے؟

سوال نمبر 2: آپ کے خیال میں کتابوں میں درج باتیں محض خیالی ہوتی ہیں یا حقیقی زندگی کی نقیب؟

سوال نمبر 3: وہ ایک کتاب جسے پڑھ کر آپ کو بہت لطف آیا اس میں درج کوئی فقرہ یا شعر جو آپ کی زندگی پر اثر انداز ہوا؟ کیسے؟

پھول کھلنے کی اس رت میں ادارہ پاکیزہ کی جانب سے کتاب سے محبت اور دوستی کی مہک کی ایک سوغات۔

تاجدار عادل

(شاعر، ٹی وی پروڈیوسر)

1: ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ہی ہمارے معاشرے میں کتاب دوستی دوسری سماجی اقدار کی طرح آہستہ آہستہ بدلتی جارہی ہے اور آج تو اپنی کمترین سطح پر نظر آتی ہے۔۔ ہمارے ساجیات کے ماہرین کو اس طرف توجہ دینی چاہیے تھی لیکن بدقسمتی سے انہیں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اپنے نوکری کے گریڈز کی جدوجہد سے فرصت ہی نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اب دیر ہوگئی ہے۔ اب اگر وہ کوئی حل بتانا بھی چاہیں گے تو کوئی نہیں سنے گا۔ اس لیے کہ معاشرے کی وہ روایتی تقریبات (جیسے ادبی محافل مشاعرے وغیرہ) ان میں بھی ان معاملات کو بیان کیا جائے تو کوئی نہیں سنتا، حاصل کلام یہ ہے کہ 22 کروڑ کی آبادی میں اگر سال کی 22 لاکھ کتابیں بھی خریدی اور پڑھی جارہی ہیں تو خود ہی اندازہ کر

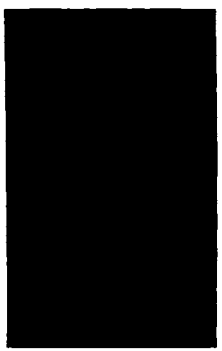

Digitized by Google

لیں کہ کیا تناسب بنتا ہے۔ میری کتاب سے بہت اچھی دوستی ہے اور اب بھی میں ہر روز ایک دو گھنٹے لازمی طور پر کتاب کے ساتھ گزارتا ہوں۔ وجہ یہ ہی ہے کہ بقول جناب صبا اکبر آبادی

یہ احترام روایت تو کم نہیں ہوگا
ہمارے خون میں شامل ہے کیا کیا جائے

2: کتابوں میں درج باتیں خیالی ہی ہوتی ہیں (سوائے سائنس اور تحقیقی کتابوں کے) لیکن یہ خیالات بھی حقیقت کے اظہار سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔

3: خطوط غالب، کلام غالب، یوسفی صاحب کی کتابیں، شاعری۔ ہر ایک میں بہت لطف انگیز خیالات ہوتے ہیں لیکن ایک شعر کسی شخص کو بہت زیادہ متاثر کرتا ہے اور وہی شعر کسی دوسرے کے ساتھ اتنا محبت بھرا برتاؤ نہیں کرتا۔ وجہ یہ ہے کہ خیال آپ کے ذہن کا مہمان ہوتا ہے تو جیسا سلوک آپ مہمان کے ساتھ کریں گے وہی خوشی آپ کو حاصل ہوگی۔

محبوب سرور

(پروگرام منیجر، سابق مدیر ماہنامہ آہنگ، رائٹر پروگرام سیکشن ہیڈ کراچی)

1: جی ہاں کتاب پسند لوگ ہمیشہ مخصوص رہے

ہیں۔ اس دور میں بھی کتاب پڑھنے والے اور کتاب دوست موجود ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں سوشل میڈیا کے بے دریغ استعمال کی وجہ سے کتاب بینی کا رجحان کم ہوا ہے، لیکن ہماری کتاب سے دوستی روز اول کی طرح قائم ودائم ہے۔

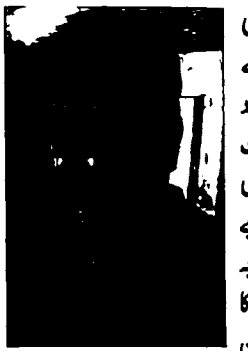

2: بعض کتابوں میں خیالی باتیں ہوتی ہیں، بعض میں حقیقی بھی لیکن اچھی کتاب وہی ہے جس کا مقصد زندگی کی حقیقت سے قریب ہو۔

3: ابھی جو آخری کتاب (جو تیسری بار) پڑھی ہے۔ وہ ہاشم ندیم صاحب کا ناول عبداللہ ہے۔ اس کا ہر فقرہ دل کو چھو لینے والا ہے۔

"مجھے اپنی ہار سے زیادہ اس لڑکی کی جیت پر خوشی ہے۔ چلو کوئی تو ہے اس دنیا میں ایسا جو پہلی ہی نظر میں تمہارے دل میں اترنے کا ہنر جانتا ہے۔ میری مانو تو اب دیر نہ کرنا۔ کبھی، کبھی محبت میں ذرا سی دیر بھی صدیوں کی مسافت بڑھانے کا سبب بن جاتی ہے۔"

لبنیٰ غزل

(قلمکار۔ لائبریرین)

1: میں سمجھتی ہوں کہ کتاب دوستی کا رجحان کم نہیں ہو سکتا۔ بے شک اب ای کتاب کا زمانہ ہے مگر کتاب اور صفحات اور ان میں لکھے لفظوں کا لمس اور خوشبو الیکٹرانک میڈیا نہیں دے سکتا۔ جو خوشی قاری کو کتاب تھام کر ہوتی ہے وہ ای کتاب سے نہیں مل سکتی۔ کتاب کے لکھے نقش

مدتوں ذہن پر نقش رہتے ہیں جبکہ ای کتاب صرف آپ کی نظروں سے گزر کر بعد میں اوجھل۔ ای کتاب پڑھتے، پڑھتے بجلی اچانک چلی گئی تو سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے جبکہ کتاب آپ کے سامنے مجسم موجود ہے اور بجلی کی ترسیل کے بغیر آپ کے ذہن کو توانائی پہنچا رہی ہے۔ اس لیے میرے خیال میں کتاب پڑھنے کا رجحان زیادہ ہے۔ میں ایک لائبریری سے وابستہ ہوں۔ جہاں بچوں میں کتابیں پڑھنے کا جنون ہے اور اپنی کلاس کی باری آنے کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں اور انہیں کتاب ایشو کرتے وقت ان کو قابو کرنا مشکل ہو جاتا ہے ایک دن بعد ہی کتاب پڑھ کر واپس لے آتے ہیں اور روزانہ نئی کتاب پڑھنا چاہتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میری کتاب سے

دوستی بہت اچھی ہے۔ کتاب ہی میری بہترین دوست ہے اور میرا شوق ہی کتاب پڑھنا ہے۔

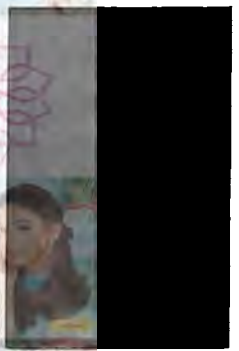

2: کتاب لکھنے والا اس دنیا سے ہی تعلق رکھتا ہے اور وہی لکھتا ہے جو وہ معاشرے میں دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے اور سچ لکھ کر سب کو محسوس کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور وہی سچا مصنف ہے۔ معاشرے کی دکھتی رگ پر اپنے قلم کا نشتر چلاتا ہے۔ اس لیے میرے خیال میں کتابوں میں لکھی باتیں حقیقی معاشرتی مسئلے بھی ہوتے ہیں۔ جنہیں خوب صورت لفظوں میں ڈھال کر پیش کرنا ایک مصنف کا کام ہے۔

3: ایک نہیں کئی کتابیں ہیں جنہیں پڑھ کر ذہنی آسودگی اور روحانی اطمینان محسوس ہوا اور دل و ذہن پر نقش قائم رہے۔ بشریٰ رحمن کی کتابیں لگن اور خوب صورت نئی نسل کی لڑکیوں کے لیے بہت مثبت پیغام ہے۔ لگن میں ایک بے پروا لڑکی کو گھر بنانے کا بہت اچھا درس دیا۔ ہر دلعزیز مصنفہ عمیرہ احمد کی ہر تحریر سبق آموز ہے خاص طور پر پیر کامل ﷺ۔

منزہ ارشاد

(معلمہ۔ صدا کارہ)

URDU TUBE

1: کتاب سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ گھر میں بیس افراد تھے اور سب کے سب کتابوں کے دیوانے۔ زیادہ تر یہی سمجھا جاتا ہے کہ لوگوں نے کتابیں پڑھنا چھوڑ دی ہیں لیکن میرا مشاہدہ ہے کہ ایسا نہیں ہے کتابیں پڑھنے والوں کی تعداد میں کمی تو ہوئی ہے مگر ایک بہت بڑا طبقہ آج بھی کتب پڑھنے کا شوق رکھتا ہے۔ عالمی پیمانے پر بیسٹ سیلرز اس کا ثبوت ہیں۔ اچھی کتابوں کے تراجم آج بھی کیے جا رہے ہیں۔ پاکستان میں اساتذہ اور والدین کو بچوں میں مطالعے کی عادت پیدا کرنے کے لیے مزید سنجیدگی سے کوشش کرنا ہوگی۔ رجحان میں جو کمی نظر آ رہی ہے وہ اسمارٹ فون کے۔۔۔ بے فیض استعمال کی وجہ سے ہے۔

2: پریم چند نے جب ادب برائے زندگی کی تحریک شروع کی تب سے اب تک ادب نے انسان کے سماجی،

معاشی، نفسیاتی مسائل اور دیگر پہلوؤں کا بخوبی احاطہ کیا ہے اور معاشرے کی اصلاح کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کتابوں کے آئینے میں ہم اپنا چہرہ دیکھ کر اپنے کردار کی نوک پلک سنوار سکتے ہیں۔

3: شاعری زیادہ متاثر کرتی ہے غالب کے اشعار رہنما ہیں۔ اور کلام میر بھی

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا
(غالب)

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
(میر)

یہ اشعار زندگی کی جنگ کو مسلسل لڑتے رہنے پر اکساتے ہیں۔

اطہر رضا اجنبی

(صدا کار، پروگرام ہیڈ ایف ایم 107 کراچی)

1: کتاب دوستی کا رجحان پہلے کی بہ نسبت گھٹا ہے مگر کتاب دوستی کی اہمیت بہت بڑھ ہے۔ دنیا جتنی بھی ترقی کرلے کتاب تھام کر ورق پلٹنا، کاغذ کی خوشبو، پڑھتے پڑھتے سو جانا۔ یہ کیفیات اور لطف بھی کمپیوٹرائزڈ کتابیں پڑھنے میں نہیں آ سکتا۔ اچھی کتاب انسان کی سچی دوست ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں کتابیں پڑھنے کے رجحان کو اسکولوں کی سطح سے پروان چڑھانا پڑے گا۔ ساتھ ہی والدین کی ذمے داری بنتی ہے کہ وہ جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو کتاب دوست بھی بنائیں۔ میری کتاب سے دوستی بہت گہری ہے اور اس میں بہت بڑا کردار میری والدہ ماجدہ عشرت سلطانہ کا

Digitized by Google

ہے۔ جنہوں نے ہم سب بہن بھائیوں میں بچپن سے ہی اچھی معلوماتی، تفریحی اور سبق آموز کتابیں پڑھنے کی عادت کو فطرت بنایا۔ آج بھی میرے گھر میں میری بیٹیوں کے سامان میں سب سے زیادہ کتابیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کچھ کتابیں قیمت کے معمولی فرق سے نہیں خریدیں مگر بعد میں بہت پچھتاوا ہوا۔ اسی لیے اب اصول بنا لیا ہے کہ دلچسپی کی جو کتاب جس

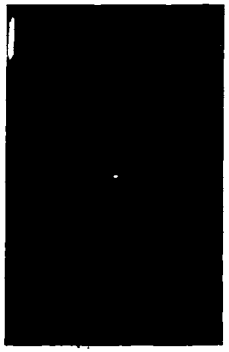

وقت نظر آجائے اسے خرید لینا چاہیے۔ بچوں، جوانوں، بڑوں سب کو لائبریریز جانے کے لیے وقت نکالنا چاہیے۔ شہر کی لائبریریز کی حالت اگرچہ دگرگوں ہے۔ متعلقہ اداروں کو اس جانب توجہ دینی چاہیے۔ آج کل کسی بھی لائبریری جا کر ایسا لگتا ہے شیلف میں کتابیں گھٹی، گھٹی سانسیں لے رہی ہیں۔ ان کی سسکیاں اور خاموش چیخیں سننے کی ضرورت ہے۔ یادر کھیے کتابوں کا ہم پر حق ہے۔ اور وہ حق یہ ہے کہ انہیں پڑھا جائے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ادوار میں ان کو لاگو کیا جائے۔

2: اس بات کا انحصار اس بات پر ہے کہ کتاب کس نوعیت کی ہے۔ اگر کوئی خودنوشت ہے تو اس میں درج باتیں اور واقعات حقیقی زندگی کی نقیب ہوتی ہیں۔ کتاب اگر شاعری کی تو ہے وہ تخلیق کا شاہکار ہے۔ اگر افسانہ ہے تو خیال بھی ہو سکتا ہے۔ سفرناموں میں مجھے لگتا ہے کہ کئی بار تحریر کے رنگ کھلانے کے لیے باتوں اور واقعات کو دلچسپی کا لبادہ پہنا دیا جاتا ہے اور سچی بات ہے کہ کئی بار ایسی تحریریں تصنع کا بہترین نمونہ بن جاتی ہیں۔ اور سفرنامے کی اصل روح فنا ہو چکی ہوتی ہے۔

3: اشفاق احمد کی زاویہ بھی پسندیدہ کتابوں میں سے ایک ہے۔ یوں تو اشفاق صاحب نے ہر جملے میں روح کو جھنجوڑ دیا ہے مگر جو بات ایمان کو تازہ رکھتی ہے، دل پر لگتی ہے وہ دھوکے کے حوالے سے ہے۔ ”کسی کو دھوکا دینا اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ دھوکے میں بڑی جان ہوتی ہے وہ مرتا نہیں ہے، گھوم پھر کر ایک روز واپس آپ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ کینہ، اس کو اپنے ٹھکانے سے بڑی محبت ہے اور وہ اپنی جائے پیدائش کو چھوڑ کر اور کہیں نہیں رہ سکتا۔“

آصف الیاس
(فلمکار، وائس اوور آرٹسٹ)

1: میرے نزدیک کتاب دوستی کا رجحان پہلے کی نسبت بڑھا ہے۔ ہم ٹیکنالوجی سے بوکھلاہٹ اور میڈیا سے اکتاہٹ کا شکار ہو رہے ہیں لہٰذا عذاب کے بعد اب ہم کتاب کی جانب بڑھ رہے ہیں اور اس کا ثبوت حالیہ اردو کانفرنس، کتب میلے، مشاعرے اور کتابوں کی بڑھتی ہوئی اشاعت ہے۔ کتاب سے زیادہ میری دوستی کتابی لوگوں اور اہل قلم افراد

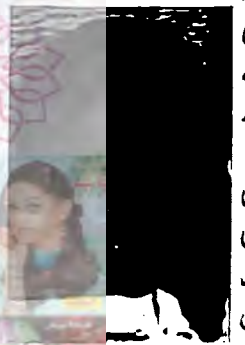

سے ہے، کیونکہ یہی احباب کتاب سے میری دوستی کو مضبوط رکھتے ہیں۔

2: افسانوں میں گھڑی کتاب بھی کہیں نہ کہیں حقیقت بیان کرتی ہے۔ درسی کتب اور خاص کر مذہبی کتب کو ہم محض خیال نہیں کہہ سکتے، کتاب شعور کی علمبردار ہے۔ اس لیے حقیقی زندگی کی نقیب ہے۔

3: میں نے لائبریری سائنس کا طالب علم ہوتے ہوئے بھی بہت کم کتابیں پڑھی ہیں (اب شاید مجھے تحفے میں کتب نہ ملیں) لیکن پی ٹی وی ڈراما ”پاکستان کا مطلب کیا“ لکھنے کے لیے ”علی پور کا ایلی“ تھیٹر ”غالباً آپ غالب“ لکھنے کے لیے ”دیوان غالب“ اور ہاشم ندیم کی بچپن کا دسمبر (شاگرد کی جانب سے تحفہ اور بہن کے

اصرار کی وجہ سے پڑھی) لیکن قرآن پاک (جس کا میں جمعہ، جمعہ قاری ہوں) اس کی اس آیت کریمہ نے میری زندگی بدل دی کہ ”تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ عطا کروں گا“ بے روزگاری اور بیکاری کے دنوں میں تلاوت کلام پاک میرے لیے سرمایہ اور مذکورہ آیت میرے لیے رہنما تھی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قاری قرآن پاک اور اپنا شکر گزار بنائے۔ آمین

عفان وحید
(ٹی وی آرٹسٹ)

1: میرے خیال میں کتاب دوستی کا رجحان بہت کم ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ انٹرنیٹ ہے، سوشل میڈیا ہے۔ ان چیزوں نے ہم کو اتنا جکڑ کے رکھا ہوا ہے کہ کتاب پڑھنے کا وقت ہی نہیں رہا۔ حالانکہ میرا بیس سے انتیس سال کی عمر کا عرصہ کتابوں اور مطالعے سے بھرپور تھا۔ میں نے بہت کتابیں پڑھیں۔ اداکاری کے میدان میں آنے کے بعد بھی کافی عرصے تک پڑھتا رہا۔ اب رجحان تھوڑا کم ہو گیا پھر بھی ایک کتاب میرے پاس ہر وقت، ہر حال میں رہتی ہے۔

2: کتابیں زندگی کو عمدگی سے گزارنے اور اچھا انسان

بنانے میں بہت معاون ہوتی ہیں۔ یہ میرا مشاہدہ بھی ہے اور تجربہ بھی۔ انسان کتابوں سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ میں ذاتی طور پر محسوس کرتا ہوں کہ کتاب پڑھنے سے پہلے انسان جو ہوتا ہے کتاب پڑھنے کے بعد وہ نہیں رہتا۔ اس کی زندگی میں کوئی نہ کوئی مؤثر تبدیلی ضرور آجاتی ہے۔

3: بہت کتابیں پڑھی ہیں۔ ہر کتاب میں سے بہت سی چیزیں یاد کر لیتا تھا سو کوئی ایک انتخاب یا اقتباس تو نہیں بتا سکتا۔ ہاں

THE FORTY RULES OF LOVE

جس میں رومی اور شمس تبریز کے 40 اصولوں نے مجھے بہت متاثر کیا وہ سب کے سب ہی بہت اچھے ہیں اب ان میں سے کوئی ایک کیا بتاؤں!

ام البنین
(میڈیکل طالبہ)

1: جہاں تک کتاب دوستی کے رجحان کی بات ہے تو یہ پہلے کی بہ نسبت گھٹا ہے۔ کیونکہ آج کل جتنا زمانہ ترقی کر رہا ہے تو اس لحاظ سے ٹیکنالوجی نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ موبائل دوستی اور ای بک وغیرہ نے کتاب کی جگہ لے لی ہے۔ میری کتاب سے واقفیت ہے، ناولز پڑھنا زیادہ پسند ہے۔ افسانے اور منی ناولز بہت دلچسپ لگتے ہیں۔ اور یہ سب کتاب ہاتھ میں لے کر ہی پڑھنے میں مزہ آتا ہے۔

2: میرے خیال میں کتابوں میں جو لکھا ہوتا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی کی زندگی میں ایسا واقعہ ضرور ہوا ہوتا ہے جو کسی کہانی یا ناول میں درج ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے کہانیاں لکھی بھی جاتی ہیں کہ کچھ سبق حاصل کر کے پڑھنے والے جہاں ضرورت سمجھیں اپنی اصلاح بھی کر لیں۔

3: مجھے نمرہ احمد کا مصحف پڑھ کر بہت مزہ آیا تھا وہ جذبات ناقابل بیان ہیں۔ اس میں ایسے رونگٹے کھڑے کرنے والی باتیں تھیں جو واقعی میں سچی اور دل کو چھونے والی تھیں۔

”صفا و مروہ دراصل ایک عورت کے صبر کی نشانی ہیں، جب آپ کو بے قصور تپتے صحرا میں چھوڑ دیا جائے اور آپ اس توکل پر کہ اللہ ہمیں کبھی ضائع نہیں کرے گا صبر کریں تو پھر زمزم کے میٹھے چشمے پھوٹتے ہیں۔“ یہ سطریں پڑھ کر مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ صبر اور یقین

Digitized by Google

کے ساتھ ہر مشکل آسان ہوسکتی ہے اور بالکل اللہ پر توکل ہر پریشانی سے نجات کا باعث ہے۔

ردا عبدالغفار

(مصورہ، شاعرہ)

1: کتاب دوستی کا رجحان پہلے سے کم ہوگیا ہے۔ اب اس کی وجہ آپ انٹرنیٹ پر موجود ای کتب بھی کہہ سکتی ہیں اور سوشل میڈیا بھی لیکن کتابوں کے دلدادہ اب بھی کتابیں بیگ میں رکھ کر سفر کرتے ہیں جس طرح میں۔

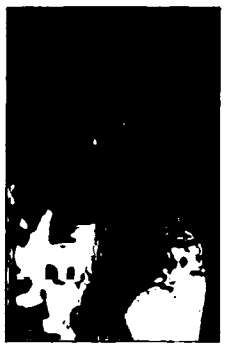

2 : کتابیں ہمیشہ سے انسان کی بہترین رفیق رہی ہیں اوران میں موجود باتیں زندگی کا خلاصہ اب پڑھنے والے پر منحصر ہے کہ اس پر یہ باتیں کس طرح اثرانداز ہوتی ہیں۔

3: یہ ایک انتہائی پیچیدہ سوال ہے لیکن چلیں چونکہ اس کتاب کا میری لکھت پڑھت پر بھی کافی اثر رہا ہے۔ یہ شعر جون ایلیا کے مجموعے گمان سے ہے۔

کہیں معلوم کیا سازش ہے دل کی
کہ خود ہی مات کھائی جا رہی ہے

فضہ اطہر

(طالبہ)

1: کتاب سے لوگوں کی دوستی ختم نہیں ہوئی ہے۔ غیر ضروری مصروفیات کی وجہ سے ہم نے اپنے اس بہترین دوست کو وقت دینا کم کردیا ہے ہم یقینی طور پر یہاں اس کتاب کی بات کررہے ہیں جو کاغذ پر چھاپی جاتی ہے، جو شیلف کی زینت بنتی ہے اور جو بغیر بولے سب کہہ جاتی ہے۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میرے والدین نے مجھے بچپن سے ہی کتاب پڑھنے کا عادی بنادیا یوں سمجھ لیجیے کتاب میری گھٹی میں شامل ہے۔

2: جتنا میرا مطالعہ ہے مجھے لگتا ہے کہ کتابوں میں لکھا حقیقت اور تصور کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ یہی خوبی قاری کی ذہنی بالیدگی کا باعث بنتی ہے۔

3 : مجھے وہ کتابیں پسند ہیں جو کامیاب زندگی گزارنے کے حوالے سے لوگوں کے حقیقی تجربات پر مبنی ہوں۔ ویسے ڈراؤنے موضوعات پر لکھے ناول بھی پسند ہیں۔

☆☆☆

قارئین کرام!

کارلائل نے کہا تھا کہ ''دنیا پر صرف کتابیں ہی حکمرانی کررہی ہیں'' اور میں سمجھتی ہوں کہ دنیا پر ہی نہیں دلوں پر بھی کتابیں حکمرانی کررہی ہیں لیکن افسوس صد افسوس اب قارئین کتب کی تعداد میں تکلیف دہ حد تک کمی ہوگئی۔ سروے کے شرکاء نے بھی کتب بینی کی شرح میں اضافے کے لیے چند قابل عمل تجاویز پیش کی ہیں کیا ہی اچھا ہو اگر متعلقہ افراد ادارے اور ارباب اختیار انہیں قابل توجہ جانتے ہوئے ایسے عملی اقدامات کریں کہ ہمارے نوجوان اور طالب علم ایک مرتبہ پھر کتاب کی جانب لوٹ آئیں اور سوشل میڈیا پر کتابی چہرے پڑھ کر اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے کتاب کا چہرہ دیکھ لیں کہ اچھی کتاب کا مطالعہ چہرہ ہی نہیں انسان کی شخصیت بھی نکھار دیتا ہے۔ سچی بات ہے کتاب دوستی ہی نے آج ہمیں اس قابل بنایا ہے کہ ایک اہم سماجی، علمی اور ادبی مسئلے کے حل کے لیے اپنے قلم سے جہاد کرنے کی موہوم سی کاوش کی ہے بقول شاعر

ہم نے لکھنا کتاب سے سیکھا
اس کی توقیر ہم سے پوچھے کوئی

کتاب سے دوستی کرلیجیے کل یہ افتخار اور اعزاز آپ کے حصے میں بھی آجائے گا۔

☆☆☆

گوشۂ ظرافت

ادارہ

مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں..... مگر ایسی نشتر زنی بخاطرِ اصلاح کا فن بھی کسی، کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔

اپنے باذوق قارئین کے لیے چوہدری سردارمحمد خان عزیز کی منفرد کتاب دعوتِ لطائف سے چند اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں جو یقیناً آپ کو پسند آئیں گے۔

عرض مصنف

پرانا مقولہ ہے کہ اگر ہنسیں تو ساری دنیا آپ کی ہنسی میں شریک ہوگی اور اگر رونے کا پروگرام بنائیں گے تو اس وقت یقیناً آپ کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کرے گا اور بلاشبہ آپ کو رونے کے فرائض تنہا خود ہی ادا کرنا پڑیں گے۔ یہ امر کم از کم ایک حقیقت کی اچھی خاصی وضاحت کرتا ہے کہ مہذب دنیا میں انسانی تعلقات کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے حسِ ظرافت نہایت ضروری شے ہے۔ اس رنج و محن کی زندگی میں اگر ہم میں ہنسنے ہنسانے کی لیاقت نہ ہو تو زندگی، زندگی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ زندگی محض سانس لینے کا نام نہیں بلکہ اپنی تمام تر قوتوں کو کام میں لاتے ہوئے اکتساب مسرت کرنے کا نام ہے۔ شاید زندگی میں بہت کم ایسی چیزیں ہوں گی جو ایک شگفتہ اور بے تکلف قہقہے سے زیادہ حسین ہوں گی۔ یوں سمجھیں کہ قہقہہ ایک حسین و جمیل جوئے رواں ہے جو اپنے حیات بخش نغمات کو ساتھ لیے ہنستی گاتی پوری خود اعتمادی کے ساتھ زندگی کا سفر طے کررہی ہے۔ ایک بے ضرر اور پاکیزہ قہقہہ جملہ روحانی عوارض کے لیے اکسیر ہے اور دل کی تمام بیماریوں اور ناپسندیدہ خیالات سے نجات دیتا ہے۔

معلومات عامہ

اسکول بورڈ کے چند ممبران آج سالانہ معائنہ کررہے تھے۔ مختلف کلاسوں میں گھوم کر طالب علموں کے تعلیمی اور علمی معیار کا اندازہ لگانا ان کا مقصد تھا۔ جس ماسٹر صاحب کی کلاس میں وہ سب سے پہلے داخل ہوئے۔ وہ دراصل درسی کتابوں کے مقابلے میں معلوماتِ عامہ کے زیادہ قائل تھے۔ چنانچہ بورڈ کے اراکین کے سامنے طلبا کی عام واقفیت کا نمونہ پیش کرنے کی غرض سے انہوں نے اپنی کلاس کو مخاطب کر کے سب سے پہلا سوال یہ پوچھا کہ ''میگنا کارٹا پر دستخط کس نے کیے تھے؟'' سوال سن کر ساری کلاس پر خاموشی طاری ہوگئی اور کسی لڑکے نے جواب کے لیے ہاتھ نہ اٹھایا۔ ماسٹر صاحب بھی ایک آدھ منٹ تک جواب کے انتظار میں خاموش کھڑے رہے۔ یکا یک بورڈ کے ایک ممبر نے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا اور پھر ماسٹر صاحب کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ''مجھے اس لڑکے کی آنکھوں میں شرارت نظر آتی ہے۔ ہو نہ ہو یہ کام اسی لڑکے کا ہے، مجھے اس پر مکمل شبہ ہے۔''

Digitized by Google

ماسٹر صاحب نے اس طالب علم کو کھڑے ہونے کا حکم دیا اور پھر پوچھا کہ بتاؤ۔ ''میکنا کارٹا پر کس نے دستخط کیے تھے؟''

طالب علم نے کہا۔ ''جناب میکنا کارٹا پر میں نے دستخط نہیں کیے۔'' یہ سن کر ماسٹر صاحب کو بہت غصہ آیا اور لڑکے کو کان سے پکڑ کر ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس لے گئے اور سارا قصہ کہہ سنایا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے لڑکے کو مار پیٹ کی دھمکی دی اور تھوڑی سی گوشمالی بھی کی۔ لیکن طالب علم اپنے بیان سے منحرف نہ ہوا۔ بالآخر ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا کہ ''میری مار پیٹ سے سب ڈرتے ہیں۔ مجھے یہ لڑکا بے گناہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس نے میکنا کارٹا پر دستخط کیے ہوتے تو ضرور بتا دیتا آپ اور کسی سے پوچھ دیکھیے.....''

ماسٹر صاحب کلاس میں تشریف لے آئے اور دوسرا سوال یہ پوچھا۔ ''پاجامہ واحد ہے یا جمع؟''

''جناب پاجامہ واحد بھی ہے اور جمع بھی۔ اوپر سے واحد شروع ہوتا ہے اور نیچے آکر جمع بن جاتا ہے۔'' ایک طالب علم نے جواب دیا۔

''زیکوسلوکیا کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟''

''جناب اس کے ہجے بہت مشکل ہیں۔''

''اچھا اب یہ بتاؤ کہ مغلوں کے عہد میں سب سے زیادہ شکستیں کس بادشاہ کو ہوئی تھیں؟'' ماسٹر صاحب نے تاریخ کا دوسرا سوال پوچھا۔

''جناب شطرنج کے بادشاہ کو۔''

''قرضِ حسنہ کیا ہوتا ہے؟''

ایک طالب علم نے ہاتھ اوپر اٹھایا اور جواب دیا۔ ''جناب قرض حسنہ یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی قرض خواہ رقم کا مطالبہ کرتا ہے، قرضدار آہستہ، آہستہ سے ہنس دیتا ہے اور رقم ادا نہیں کرتا۔ دراصل اس قرضے کو قرض ہنسنا کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔''

''مادری زبان کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ اسے مادری زبان کیوں کہتے ہیں؟''

''جناب جہاں تک زبان کے استعمال کا تعلق ہے۔ باپ کے مقابلے میں عموماً ماں زبان کو زیادہ استعمال کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص اپنی زبان کو مادری زبان کہنے پر مجبور ہے۔ باپ کا اس میں بہت کم دخل ہوتا ہے۔''

اس کے بعد ماسٹر صاحب نے اردو کی کتاب اٹھائی اور یہ شعر پڑھا۔

''دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کر''

پھر پوچھا یہ شعر کس کا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے؟

ایک طالب علم۔ ''جناب یہ شعر جمالیات کے کسی انسپکٹر نے لکھا ہے اور اس کا مطلب صاف ظاہر ہے۔''

اتنے میں تفریح کی گھنٹی ہوگئی۔ بورڈ کے ممبران رخصت ہوگئے۔ لیکن ماسٹر صاحب نے سزا کے طور پر کلاس کو چھٹی نہ دی اور حکم دیا کہ فٹ بال میچ پر جوابِ مضمون لکھو۔ ساری کلاس جواب مضمون لکھنے میں مصروف ہوگئی۔ سامنے ایک ڈیسک پر ایک مسکین صورت طالب علم منہ میں قلم دبائے آرام سے بیٹھا تھا۔ ایک منٹ بعد ماسٹر صاحب کی نظر جو اس پر پڑی تو پوچھا کہ تم کیوں نہیں لکھتے؟ لڑکے نے جواب دیا جناب میں نے تو لکھ کر مکمل بھی کرلیا۔ ماسٹر صاحب نے کاپی اٹھا کر دیکھی تو اس میں لکھا تھا۔

''بارش ہوتی رہی اور میچ نہ ہوسکا۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟ تمہیں تو مضمون نویسی میں انعام ملنا چاہیے۔'' ماسٹر صاحب سچ مچ ناراض ہوگئے۔

''جناب میرا نام خلیل خاں ہے لیکن خدا کے لیے آپ مجھے ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس نہ لے جائیں۔ آپ میرے محلے والوں سے دریافت فرما سکتے ہیں میں نے آج تک فاختہ نہیں اڑائی۔

☆☆☆

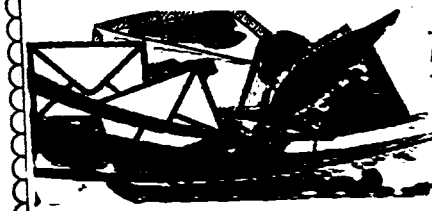

بہنوں کی محفل

مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

03316266612,021.35386783.021.35802552.Ext:122.107

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ وبرکاتہ!

تمام حمد وستائش اس ذات والا صفات کو زیبا جو کل کائنات کا خلق کرنے والا ہے۔ یکتا و وحدہ لاشریک ہے اور کروڑوں درود و سلام حبیب خدا رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر جو وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ پروردگار عالم کے حضور دست بستہ دعا گو ہیں کہ اپنے خزانہ غیب سے وہ سب کچھ عطا کرے جو ہمارے حق میں بہترین ہو۔ ہمارے وطن پاکستان میں امن وسکون کی فضا اور خوش حالی رہے اور تمام اہلِ وطن اس کی ترقی وتنک نامی کے لیے کوشاں رہیں۔ (الٰہی آمین)

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

پیاری بہنو! سلام اور پُرخلوص دعاؤں کے ساتھ آپ کی محفل میں حاضر ہوں۔ پچھلے دنوں ہمارے ملک کی لیجنڈ فنکارہ اور پاکیزہ کی پُرخلوص دیرینہ ساتھی نیلوفر عباسی حسبِ معمول ماہ دسمبر میں اپنی ادبی اور نجی مصروفیات کے سلسلے میں امریکا سے کراچی آئیں..... مجھ سے ملنے تو وہ خیر ضرور آتی ہیں۔ اس مرتبہ بھی جب اپنی مصروفیات کے دوران انہوں نے مجھ سے ملنے کے لیے وقت مانگا تو میں نے فوری یہ فیصلہ کیا کہ کیوں نہ اس بھرپور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک چھوٹی سی گیدرنگ رکھ لی جائے تاکہ چند رائٹرز اور ریڈرز بھی نیلوفر کی خوب صورت کمپنی سے محظوظ ہوسکیں۔ میں نے فوری نزہت اصغر کو ہدایت کی کہ جو، جو رائٹرز بہ آسانی آسکیں انہیں انوائٹ کرلو تو یوں کوئی پندرہ سولہ رائٹرز اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر آپائیں۔ اور یہ امر میرے لیے نہایت مسرت کا باعث ہوتا ہے کہ جب پاکیزہ کی پرستار خواتین اپنی پُررونق آمد سے میری کسی بھی تقریب کو گل وگلزار بنا دیتی ہیں۔ اور اس دفعہ تو جانِ محفل نیلوفر عباسی تھیں تو کیوں نہ شوق سے آتیں..... بہرحال 2 جنوری کو ڈی ایچ اے سن سیٹ کلب میں پیاری نیلوفر کی سحر انگیز شخصیت کی کشش ان سب کو کھینچ لائی، اس موقع پر نیلوفر سے بہت پُرلطف اور مسحور کن گفتگو ہوئی۔ بہنو! اس خوب صورت محفل کا احوال مع تصاویر آپ اسی شمارے میں دیکھیں گی۔

کچھ دن پہلے میری ڈریس ڈیزائنر مسرت بشریٰ سے فون پر بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ میری دو خالائیں لاہور سے چند دن کے لیے آئی ہوئی ہیں ان میں سے ایک کافی عرصے پہلے پاکیزہ میں افسانے لکھتی رہی ہیں وہ اکثر آپ کے ذکر پر ملنے کی بات کرتی ہیں تو اگر وقت ہو تو آجائیں، میں نے اگلے دن کا پروگرام بنالیا اور ڈیفنس فیز II میں واقع ان کے گھر شام کو پہنچ گئی۔ وہاں جا کر ایک بہت ہی خوب صورت نفیس اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون سے تعارف ہوا کہ یہ خالدہ نسیم صاحبہ ہیں، میں تو حیرت اور خوشی سے اچھل پڑی ان کا ذکر تو اکثر پاکیزہ میں ہوتا تھا اور وہ 1975ء سے اکثر پاکیزہ میں چھپتی رہتی ہیں۔ خالدہ نسیم صاحبہ کی شخصیت میں جو سحر ہے وہ بیان نہیں کرسکتی، میں آدھے گھنٹے کا سوچ کر گئی تھی اور دو گھنٹے کے بعد تک اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا بہت خوب صورت اور دلچسپ باتیں ہوئیں اتنے میں مسرت کی امی بھی جو بالکل برابر میں رہتی ہیں وہ بھی آگئیں سب سے مل کر بہت خوشی ہوئی ان کا تو پورا خاندان ہی بہت پڑھا لکھا، باذوق اور ادب دوست ہے۔ دورانِ گفتگو میں نے خالدہ صاحبہ سے پوچھا کہ اب آپ کیوں نہیں لکھ رہیں تو انہوں نے بتایا کچھ تحریریں بھیجنے کے لیے نظرِ ثانی کی منتظر ہیں اور نیا اس لیے نہیں لکھ پا رہی ہیں کہ بچوں کے بیرونِ ملک سیٹل ہونے کی وجہ سے وہ اکثر سفر میں رہتی ہیں۔ اب بھی بڑی بہن کی مزاج پرسی

Digitized by Google

کرنے ہم دونوں بہنیں لاہور سے چلی آئیں۔ یہاں مسرت (میری بھانجی) سے پاکیزہ اور آپ کا ذکر چھڑا اور دیکھیے ملاقات بھی ہو گئی۔ میرے لیے تو بہنو یہ لمحات واقعی قیمتی تھے کہ پاکیزہ کے اتنے پُرخلوص مداحوں سے ملاقات جو ہو گئی۔ مسرت کی امی جو سب سے بڑی بہن ہیں ان سے بھی اچھی بات چیت رہی۔ باقاعدگی سے پاکیزہ پڑھنے کی بدولت وہ آپ سب بہنوں اور پاکیزہ سرگرمیوں سے بخوبی واقف رہتی ہیں۔ ان شاء اللہ ہم خالدہ نسیم کا انٹرویو بھی جلد سے جلد کرنے کی کوشش کریں گے۔ میں اپنی پیاری دوست اور ماہر ڈریس ڈیزائنر مسرت کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ اتنی پیاری، پیاری خالاؤں اور والدہ صاحبہ سے بھی ملاقات کروائی جس سے میں بہت لطف اندوز ہوئی۔ اور بہنو! چلتے ہوئے خالدہ نسیم نے مجھے ترکی کی بہترین انجیروں کا تحفہ بھی دیا۔ سلامت رہیں۔ میری پُرخلوص دعائیں آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔

بہنو! اس دفعہ گفتگو تھوڑی طویل ہو گئی اس لیے مصنفات کی تحریروں پر اگلے ماہ بات کریں گے۔ ہاں جاتے، جاتے ان تمام قاری بہنوں بے حد شکریہ جو مجھے دادی بننے کی مبارک بادیں بھیج رہی ہیں اور دعاؤں میں یاد رکھے ہوئے ہیں۔ نگہت سیما آپ کا شکریہ کہ اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر خط بھی بھیجا اور تحریر بھی۔ اللہ آپ لوگوں کو صحت وسلامتی سے رکھے اور آپ اسی طرح پاکیزہ کی رونقیں بڑھاتی رہیں۔ الٰہی آمین آئندہ ملاقات ہو گی ان شاء اللہ

اللہ نگہبان......دعا گو عذرا رسول......!

☆☆☆

پیاری پاکیزہ بہنو... !عذرا آپا کی اتنی خوب صورت اور دلچسپ باتوں کے بعد گنجائش نہیں رہتی کہ مزید کچھ کہا جائے اور آپ سب کی سرگرمیاں اور خطوط بھی منتظر ہیں اور میری بھی کوشش ہوتی ہے کہ اپنی پیاری پیاری پاکیزہ بہنوں کی باتوں کو زیادہ سے زیادہ جگہ مل سکے بس ابھی اتنا ضرور عرض کروں گی کہ نئی لکھنے والی بہنیں تحریر بھیج کر کم از کم دو ماہ ضرور انتظار کیا کریں تاکہ اچھی طرح پڑھ کر اس کی اشاعت یا نا اشاعت کا فیصلہ کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ اپنی رائے، تبصرے، تجویز، تنقید اور مشوروں سے بھی آگاہ کریں۔

اور حسبِ روایت نت نئی خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوصِ دل سے درود ابراہیمی اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہلِ وطن کو بھی یاد رکھیں۔ اللہ رب العزت عالم اسلام کی تمام پریشانیوں کو رفع کرے اور تمام مسلمانانِ عالم کو کامیابی نصیب ہو۔ (الٰہی آمین)

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری سعدیہ کاظمی کے نند کے بیٹے کی شادی گزشتہ دنوں بخیر و خوبی انجام پائی۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار پروین افضل شاہین، بہاول نگر کی بھتیجی شمع رخ کی شادی خانہ آبادی بخیر و خوبی انجام پائی۔ بارات چشتیاں سے بہاول نگر آئی تھی۔ (مبارکاں)

☆ مصنفہ شیریں حیدر نے گزشتہ مہینے عمرے کی سعادت حاصل کی۔ (بے حد مبارک ہو)

☆ مستقل قاری طاہرہ، خوشاب کے ہاں اللہ کی رحمت تیسری بیٹی کی صورت اتری ہے (بے حد مبارک باد)

☆ مصنفہ رفعت سراج کی پیاری بیٹی دریہ منیر اس ماہ بابل کا انگنا چھوڑ کر پیا دیس سدھار رہی ہیں۔ ہماری پیاری رفعت آج کل اسی سلسلے میں شدید مصروف ہیں۔ (بے حد مبارک ہو رفعت جی اللہ آپ کے تمام کاموں کو آسان بنائے اور دریہ سمیت تمام بچیوں کے نصیب روشن کرے الٰہی آمین۔)

☆ ہماری پیاری بے حد خوش مزاج ٹیلنٹڈ رائٹر رضوانہ پرنس کا لکھا سوپ سیریل لوگ کیا کہیں گے ہم ٹی وی سے آن ائر جا رہا ہے۔ (بے حد مبارک ہو)

☆ وادی کاغان کی ملکہ اور ہماری پیاری تبصرہ نگار شگفتہ حیا ترمذی، وادی میں شدید سردی کے باعث مانسہرہ شفٹ ہو گئی ہیں۔ شگفتہ حیا کوہستان کے اخبارات میں باقاعدگی سے کالم نویسی کرتی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ رائٹر اور مستقل تبصرہ نگار سلمٰی غزل کی بیٹی داماد نے مع بچوں کے عمرے کی سعادت حاصل کی۔ (بے حد مبارک ہو) سلمٰی غزل کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ ان کا چھوٹا بیٹا اور بہو، پوتے سمیت امریکا واپس سدھارے۔ آج کل سلمٰی بچوں کے جانے سے کافی اداس ہیں۔ (ارے اللہ خیر رکھے پھر سے آجائیں گے یا آپ ملنے چلی جایئے گا)

☆ رائٹر رفاقت جاوید کے سب سے چھوٹے بیٹا بہو آج کل آسٹریلیا سے آئے ہوئے اس لیے ان کے گھر میں کافی رونق ہے۔ (ماشاء اللہ)

☆ رائٹر ثمر کاظمی، ڈی آئی خان جن کی اس ماہ سالگرہ بھی ہوتی ہے کی شادی خانہ آبادی پچھلے دنوں بخیر و خوبی انجام پائی۔ (مبارک باد)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ مستقل قاری اور مراسلہ نگار فرخندہ جعفری، گجرات کی مکمل صحت کے لیے خصوصی دعا کی درخواست......

☆ پاکیزہ کی دیرینہ رائٹر زاہدہ پروین، میر پور خاص کی بیٹی کائنات عبدالحلیم اور زاہدہ پروین کے شوہر صاحب کے لیے بھی دعائے صحت کی گزارش۔

☆ نئی ابھرتی ہوئی رائٹر اور شاعرہ ہما علی، اسلام آباد کے پتے کا کامیاب آپریشن ہو گیا ہے۔ اب وہ روبصحت ہیں۔ (شکر الحمدللہ)

☆ ہماری رائٹر شائستہ زریں کی آنکھ کا موتیے کا کامیاب آپریشن ہوا ہے اللہ تعالیٰ ان کو روبصحت عطا فرمائے اور ان کی آنکھوں کی بینائی کو سدا قائم رکھے، آمین۔

☆ مستقل پاکیزہ قاری طاہرہ، خوشاب کی والدہ محترمہ کے لیے دعائے صحت کی استدعا ہے

☆ پاکیزہ کی دیرینہ پرستار شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار فریدہ جاوید فری، لاہور کے چھوٹے بھائی عبدالمنان خان کینسر کے عارضے میں مبتلا ہیں ان کے لیے دعائے صحت کی خصوصی درخواست ہے۔ (بھائی کی بیماری میں فریدہ اپنی بیماری بھول گئیں اللہ انہیں بھی صحت سے رکھے)

☆ مستقل پاکیزہ قاری اور شاعرہ فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی کی طبیعت اللہ کے فضل و کرم سے اب بہتر ہے۔

☆ پاکیزہ کی سینئر تبصرہ نگار ڈاکٹر ممتاز ضیا، کراچی کی مکمل صحت وسلامتی کے لیے خصوصی دعا۔

☆ عذرا رسول صاحبہ کی بچپن کی دوست اور پاکیزہ کی پرستار یاسمین رشید اچانک دل کے عارضے میں مبتلا ہو گئیں اور ایمرجنسی میں ہی انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی ہوئی۔ الحمدللہ اب وہ روبہ صحت ہیں۔ (یاسمین باجی اللہ آپ کو صحت سے رکھے۔ ابھی مجھے آپ سے کپڑے بھی ڈیزائن کروانے ہیں)

☆ رائٹر اور مستقل پاکیزہ قاری ثمر کاظمی کی والدہ کی طبیعت ان دنوں ناساز ہے۔

☆ رائٹر افشاں آفریدی کے ماموں جان ان دنوں کافی علیل ہیں۔

انتقالِ پُرملال

☆ پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی مصنفہ عالیہ بخاری کے شوہر طویل علالت کے بعد اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ادارہ عالیہ بخاری اور ان کے خانوادے کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری، رائٹر اور شاعرہ فصیحہ آصف خان، ملتان کے جواں سال بہنوئی دل کے دورے کے باعث انتقال کر گئے۔ تمام مرحومین کے درجات کی بلندی کے لیے دعائے مغفرت کی استدعا ہے۔

☆☆☆

☆ اب آتے ہیں آپ بہنوں کے کھٹے میٹھے خطوط کی جانب......

✍ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ "نئے سال کا پہلا شمارہ ایشا خان کے خوب صورت سرورق سے سجا میرے ہاتھوں میں ہے۔ ماڈل دانتوں کی نمائش ایسے کر رہی تھی جیسے کسی ٹوتھ پیسٹ کے لیے شوٹ کرا رہی ہو۔ (شاید ایسا ہی ہو) ویسے ایک بات ہے ماڈل ہے بہت خوب صورت......آپی! آپ کا اداریہ وطن کی محبت سے بھرپور ہوتا ہے (جی ہر محبِ وطن کے دل کی آواز ہے) دین کی باتیں اور شمع ہدایت پڑھ کر ایمان کو تازہ کرتی ہوں، آپی عذرا! آپ کی باتیں ہمیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ ہماری بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری نند فریدہ جاوید فری، معراج بھیا کو، امینہ عندلیب کو، ہما علی، فریدہ ہاشمی، عصمت کے بیٹے مسعود کو مکمل صحت دے، آمین۔ ہر ماہ آپی سعدیہ ہما شیخ ایڈووکیٹ اپنے بارے میں کوئی نہ کوئی خوشی کی خبر لاتی ہیں۔ نجی چینل جوائن کرنے پر دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ پاکیزہ کے مہمان میں وہاج علی اور ان کی من موہنی اہلیہ ثنا فاروق سے بات چیت پسند آئی۔ شاہینہ مسعود اور ثمینہ کوکب کو بہترین سوالات پر انعامات جیتنے پر دلی مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ نیا سال شروع ہو چکا ہے اب تو آپ

URDU TUBE ENTERTAINMENT www.urdutubes.com
Digitized by Google

اکثر گنگناتی ہوں، پاکیزہ ڈائری میں بھی انعامات کا سلسلہ شروع فرمادیں۔" (ضرور غور کریں گے)

✉ نگہت سیما، چکوال سے۔ "محترمہ عذرا رسول السلام علیکم بہت دنوں سے آپ کو خط لکھنا چاہ رہی تھی۔ کہانی کی پسندیدگی کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا لیکن وہ کیا کہ ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں...... دراصل جاب کی مصروفیت، عمر کے ساتھ اب تھکن ہو جاتی ہے۔ یوں بھی پڑھانا ایک تھکا دینے والا کام ہے۔ بس اب چند ماہ بعد جاب سے فارغ ہو کر باقاعدگی سے پاکیزہ میں شرکت کروں گی۔ (جی ہاں ضرور ان شاء اللہ) آمنہ سے وعدہ کیا تھا سالگرہ نمبر کے لیے تو لکھ ہی نہیں پا رہی...... امرت، پہلی قسط سے ہی اس کہانی نے گرفت میں لیے رکھا...... اور آخر تک تجسس برقرار رہا۔ محبت لفظ ہے لیکن بھی متاثر کر رہی ہے اچھی ہے۔ سب تو ترتیب سے پڑھ نہیں پاتی جو ہاتھ میں آ جائے۔ آپ کو اپنی پوتی زینب کی مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کو صحت و زندگی عطا کرے اور اس کا نصیب اچھا ہو، آمین۔ نئے سال کی آمد مبارک ہو۔ اللہ کرے یہ سال ہم سب اہلِ وطن کے لیے اور ہمارے ملک کے لیے مبارک ثابت ہو، آمین۔ نزہت، آمنہ اور دوسرے تمام اراکین ادارہ کے لیے بھی دعائیں اور سلام محترم معراج رسول کی زندگی کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جلد مکمل صحت عطا کرے، آمین۔" (تبصرے کا شکریہ اور دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)

✉ اسما شاہد، لاہور سے۔ "جب بھی کوئی سانحہ یا المیہ جنم لیتا ہے تو اس کے پیچھے کئی human errors کارفرما ہوتے ہیں جو حالات کو پوائنٹ آف نوریٹرن تک لے جاتے ہیں۔ نیلوفر خان، بہارہ کھو نے طیبہ عنصر مغل کی کہانی کاجل کوٹھڑی کے ضمن میں جو نکات اٹھائے ان کے پیچھے یہی عوامل کارفرما تھے۔ (بالکل درست کہا آخر دنیا میں حادثات بھی تو ہوتے ہی ہیں) جنوری کا شمارہ اپنے جوبن پر نظر آیا۔ من میرا ہلکا پھلکا انداز لیے بہترین کہانی تھی، ہم جو نظر آتے ہیں اصل میں وہ ہوتے نہیں، انعم بخیل کی...... سوچ ایک بہترین سوچ لیے ہوئے تھی۔ ہم عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ پانچ، دس بچانے پر فخر اور پانچ، دس ہزار کا سوٹ لینے پر بے انتہا خوش...... شمیم فضل خالق کی کہانی بھی تاثر چھوڑنے میں کامیاب رہی۔ سالِ نو پر اپنے آپ کو آمادہ کیا کہ سلسلے وار ناول ضرور پڑھنے ہیں کہ یہ کام مجھے بہت مشکل لگتا ہے۔ سحر ساجد کی نار اور افشاں آفریدی کی کہانی شروع کی بہت interesting لگیں۔ (جی ضرور پڑھیے گا آغاز ہی متاثر کن ہے) ریگ زار میں اگر ایک گھر کا شیرازہ بکھرتا دیکھا تو یہ رشتے دل کے رشتے ہیں میں گھر کیسے بنتے اور پھلتے پھولتے ہیں کا مشاہدہ کیا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بدکلامی اور بدزبانی، لڑائی جھگڑے کی اولین وجہ ہے جبکہ زندگی کی اونچ نیچ بیان کرتی نزہت جبیں کی کہانی ایمان، امید، یقین اور عمل پیہم کی عملی تفسیر لگی پر کہانی کے title پر تلک لگی لڑکی کا sketch کہانی کے حساب سے misfit لگا۔ (آئندہ مزید خیال رکھیں گے) عقیلہ حق کی حاصل لا حاصل story of the month ٹھہری...... بہت خوب عقیلہ جی superb اگر رضائے الٰہی سمجھ کر چیزوں کو قبول کرنے کی عادت ڈال لی جائے تو ہمارے لیے زندگی بہت آسان ہو جائے (جی بالکل) اختر شجاعت کے مضمون کے تو کیا کہنے بہت اچھی طرح حرف، حرف سمجھاتی ہیں۔ وہاج علی سے ملاقات اچھی رہی اور گوشۂ ظرافت میں اشکوں کی حقیقت، حقیقتاً مزہ دے گئی۔" (بہت پیارے دقیق تبصرے کا شکریہ)

✉ ثریا فرخ، کراچی سے۔ "سب سے پہلے تو محترمہ عذرا رسول کو ان کی پوتی زینب کی بہت، بہت مبارک باد...... یہ بڑے نصیب کی بات ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے بچوں کے بچے دیکھنا نصیب فرماتا ہے۔ (جی بے شک یہ ہمارے رب کا بہت کرم ہے) دسمبر کے شمارے میں اپنا افسانہ دیکھ کر دل خوش ہوا۔ میری خوش نصیبی کہ اس ہر دل عزیز رسالے میں جگہ پائی۔ امرت میرے پسندیدہ ناولوں میں سے ہے۔ محترمہ شیریں حیدر نے اتنے سارے کرداروں کے ساتھ انصاف کیا وہ قابلِ تعریف ہے۔ (جی بالکل) محترمہ اسما قادری کا افسانہ بھی بہت پسند آیا۔ اصل میں کسی قصور کے پیچھے جو محرکات ہوتے ہیں ان پر لوگوں کی نظر جاتی ہی نہیں...... کسی مجرم کو اس کے جرم کی سزا تو مل جاتی ہے مگر اس کا کیا، کیا جائے جو اسے اس جرم پر اکساتا ہے (یہ تو ہے) شمع ہدایت بھی میرے پسندیدہ سلسلوں میں سے ہے۔ اللہ اختر شجاعت کو خوش رکھے اور ان کا زورِ قلم اور زیادہ ہو۔ بہت محنت اور تحقیق سے لکھے گئے اس سلسلے کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔" (دعاؤں کے لیے جزاک اللہ اور مختصر تبصرے کا شکریہ)

✉ سعدیہ کاظمی، کراچی سے۔ "پاکیزہ ہاتھ میں اٹھاتے ہی سب سے پہلے دین کی باتیں پڑھیں پھر ہمیشہ کی طرح مجھے کچھ کہنا ہے، ماہ ربیع الاول کی رحمتوں اور برکتوں کے حوالے سے لکھا گیا مضمون دل کو چھوتا چلا گیا۔ صفہ کے بارے میں، میں کیا لکھوں جب، جب اس تحریر کو پڑھتی ہوں یہ موتیوں کی طرح میرے دل کے اندھیرے کو روشن کرتی چلی جاتی ہے دل پر اس کا لکھا لفظ، لفظ موم بن کر گرتا ہے اور دل پگھل کر آنسوؤں کی صورت آنکھوں سے رواں رہتا ہے۔ لگتا ہے زندگی یکسر بدل گئی ہو۔ میں دردانہ نوشین سے ایک بار

ملنا چاہتی ہوں (جی اب وہ کراچی آئیں تو یہ موقع مل جائے گا) اور اگر وہ بہتر سمجھیں تو میں اپنا موبائل نمبر دے رہی ہوں وہ جب کہیں گی میں خود انہیں کال کروں گی شاید ان سے بات کر کے میرے بے چین دل کو کچھ سکون نصیب ہو جائے۔ وہ آئے بزم میں، غزالہ فرخ سے ملاقات کا احوال پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ یہ کہاں بچیں کہ دل ہے...... رفعت آپا پلیز سفینہ کو پرنس سے دور مت ہونے دیجیے گا۔ (آپ کی خواہش پوری ہوئی) بڑی جاندار تحریر ہے آپا کی۔ میں تو ہمیشہ یہی دعا کرتی ہوں کہ اللہ پاک عذرا رسول اور معراج رسول کے اس خوب صورت گلشن کو ہمیشہ آباد رکھے، آمین۔" (بہت شکریہ پیارے سے خط کا آپ کا پیغام دُردانہ صاحبہ کو دے دیا گیا ہے)

✉ فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ "پاکیزہ اس مرتبہ جلدی مل گیا ٹائٹل اچھا لگا۔ عذرا جی کو پوتی کی بہت، بہت مبارک، پروین بھابی آپ کی دعاؤں کا بے حد شکریہ...... مجھے کچھ کہنا ہے نزہت جی نے بہت اچھا لکھا۔ دین کی باتیں پڑھ کر دلی سکون ملتا ہے۔ اوہ مائی فیورٹ رائٹر کا ناولٹ یعنی شمیم فضل خالق کی تحریر پڑھ کر تو مزہ آ جاتا ہے گلو کی چنداواہ کیا ناولٹ ہے مکمل ناول سایا اور ثمر، شبینہ گل جی بہترین لگا۔ حاصل لاحاصل تو کمال کی تحریر، عقیلہ حق جی مبارک ہو۔ منی ناول نے تو کمال کر دیا۔ صفہ دردانہ نوشین کمال کی تحریر ہے۔ افسانے سب کے سب بہترین لگے۔ ایک سے بڑھ کر ایک خوش ذائقہ میں فرائی مچھلی کھا کر مزہ آ گیا۔ معراج بھائی کو اللہ تعالیٰ صحت دے، آمین۔ طیبہ عنصر کو بیٹی کی شادی کی بے حد مبارک باد قبول ہو۔ نیا سال مبارک ہو۔" (آپ کو بھی نیا سال مبارک ہو، اللہ پاک آپ کو صحت و سلامتی عطا کرے، آمین)

✉ وردہ ایوب، ملتان سے۔ "اس بار میں تھوڑا مختصر تبصرہ کروں گی کیونکہ ٹائم کی کمی کی وجہ سے میں رسالے کا مطالعہ بھی کم کرتی ہوں اور اب تو موسم ہی ایسا ہے کہ دن چھوٹے ہو گئے ہیں، میرا آدھے سے زیادہ دن پڑھائی میں گزر جاتا ہے مگر اپنی خواہش کو مدِنظر رکھتے ہوئے مطالعہ کر لیتی ہوں (ہاں بالکل پہلے پڑھائی پھر رسالہ) پچھلے ماہ کا پاکیزہ بہت اچھا تھا ساری کہانیاں بہت زبردست تھیں۔ لیکن جب اس ماہ کا پاکیزہ صبح کے وقت آیا تو میں نے نماز پڑھ کر جلدی سے پاکیزہ میں بہنوں کی محفل میں اپنا نام تلاش کیا، کیونکہ میں نے جلد بازی سے سارے صفحوں پر ایک نظر ڈالی اس لیے مجھے اپنا نام نہ ملا۔ پھر مایوس ہو کر میں سورتیں وغیرہ پڑھ کر فارغ ہوئی تو میں نے آرام سے بیٹھ کر ایک، ایک نام چیک کیا جب میں نے اپنا نام پڑھا تو مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کے بعد آپ کا شکریہ کہ آپ میرا خط شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ (ہم تو ہر قاری کو جگہ دینے کی کوشش کرتے ہیں) میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو مزید ترقی عطا فرمائے۔" (دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)

✉ شمع تفسیر، کراچی سے۔ "گزشتہ چند مہینوں میں مصروفیت بہت زیادہ رہی۔ سوا دو مہینے تو خاص الخاص مہمانوں کے ساتھ ہی گزر گئے۔ تاہم پاکیزہ کا مطالعہ اسی طرح جاری رہا جیسے صبح دوپہر اور رات کا کھانا۔ آپ نے میرے والد کے لیے دعائے مغفرت کروائی بے حد احسان مند ہوں بہت شکر گزار ہوں۔ (ارے شکریے کی کیا بات ہے پاکیزہ آپ کے غم و خوشی میں شریک رہتا ہے) عذرا آپی کو پوتی کی آمد کی بہت، بہت مبارک باد...... طیبہ عنصر بیٹی کی شادی کی مبارک باد قبول کریں، پروردگار اسے سدا خوش اور آباد رکھے...... الٰہی آمین۔ اب آتی ہوں اس کہانی کی طرف جس نے دل باغ، باغ کر دیا۔ نومبر کے شمارے میں عقیلہ حق کی تحریر عام سے خاص تک بہت زبردست تھی۔ عام طور پر منفی کردار کو بھی کہانی کے آخر میں کچھ رعایت دے دی جاتی ہے مگر عقیلہ حق صاحبہ نے رضا کے جس طرح بخیے ادھیڑے...... گویا حق ادا کر دیا۔ خصوصاً لفظ "مسٹر معمولی" تو بے حد مزہ دے گیا۔ بہت خوب عقیلہ حق، اسی طرح دسمبر کے پاکیزہ میں محترمہ ریحانہ آفتاب کی تحریر رجوع لاجواب رہی، بہترین موضوع بہترین آغاز بہترین انجام...... دردانہ نوشین خان کی صفہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد تحریر ہے...... پڑھ کر سکون محسوس ہوتا ہے مگر صفہ کا اکیلا پن اداس بھی کر دیتا ہے۔ رفعت سراج تو یہ کہاں بچیں کہ دل ہے میں ایسی بلندی پر نظر آ رہی ہیں کہ جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ زارا کو گھر بدر کر دینا تاجور کی بڑی بھاری غلطی ثابت ہوگی۔ بظاہر تو یہی لگتا ہے۔ (اب تو معلوم ہو گیا ہوگا کیوں ایسا ہوا تھا) طیبہ عنصر مغل کی کاجل کوٹھڑی اداس کر گئی...... پُراثر تحریر تھی۔ اسما قادری کی بلا عنوان دل دکھی کر دینے والی مگر حقائق پر مبنی تحریر تھی واقعی حقوقِ نسواں کے علمبردار تو بہت نظر آتے ہیں مگر بسا اوقات مظلوم مرد بھی ہوتا ہے...... ایسے واقعات وقتاً فوقتاً رونما ہوتے رہتے ہیں کہ دلہن اگلے دن گھر واپس آئی تو دوبارہ لوٹ کر سسرال گئی ہی نہیں وجہ عام طور پر وہی بیان کی جاتی ہے جو اس کہانی میں بدر حسن کی دلہن نے اپنی جان چھڑانے کے لیے بیان کی...... حقیقت میں بھی ایسا ہوتا ہے مگر ہمیشہ ایسا ہو یہ ضروری نہیں...... اور پھر تیزاب پھینکنے کے واقعات بلاشبہ یہ ایک وحشیانہ اور قبیح فعل ہے مگر اس کے پس پردہ حقائق کو بھی پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ (جی یہی بات تو رائٹر نے اجاگر کی ہے) عورت کو محتاط طور طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ ہر چند کہ اس طرح کے نوے فی صد کیسز میں میری نظر میں عورت ہی مظلوم ہوتی ہے تاہم اس کہانی

Digitized by Google

میں بلاشبہ بدر حسن مظلوم نظر آئے اور میرے ذہن میں بے ساختہ اس بلا عنوان کہانی کا عنوان یہی آیا کہ "مجرم تو ہوں مگر مظلوم ہوں میں۔" نزہت جی، غزالہ فرخ سے ملاقات بہت اچھی رہی۔" (عنوان تو اچھا سوچا دیگر تبصرے کا شکریہ)

✍ نازنین آفریدی، پشاور سے۔ "جنوری کا پاکیزہ میرے ہاتھ میں ہے، ہمیشہ کی طرح بہنوں کی محفل سے شروعات کی۔ شمع ہدایت کا موضوع بہترین تھا۔ وہاج علی سے ملاقات معذرت کے ساتھ کچھ خاص نہ لگی۔ کہانیوں کی طرف آئی تو یہ دیکھ کر ایک جان لیوا جھٹکا لگا کہ رفعت سراج کے ناول کی آخری قسط ہے اس بار...... کیوں؟ آخر کیوں......؟ اتنا اچانک ختم کر دیا اتنا بہترین، اتنا زبردست تو چل رہا تھا۔ یہ کہاں بچیں کہ دل ہے، محبت لفظ ہے لیکن بھی ختم کر دیا۔ مجھے اینڈ کچھ پسند نہیں آیا لیکن چلیں ٹھیک ہے۔ (ڈیئر سلسلے وار کا کبھی نہ کبھی اینڈ تو ہوتا ہے اور یہی تشنگی تو مزہ دیتی ہے) جیسے حیا بہن کی مرضی امید ہے محفل میں پشتو بولنا منع نہیں ہوگا۔ (ہرگز نہیں) میرا اسارا زنگ اتار دو، افشاں آفریدی میری قبیلہ دار اگر یہ لفظ صحیح ہے تو ان کا پہلا طویل ناول ہوگا جو میں پڑھوں گی۔ ابھی تو یہ پہلی قسط تھی ناول سمجھنے کے لیے تھوڑا وقت درکار ہوگا۔ البتہ درمکنون کے ساتھ ہمدردیاں ابھی سے ہیں۔ صفہ بہت متاثر کن ہے۔ سحر ساجد کا من جان بازم مجھے یاد ہے اور اب نار کی بھی پہلی قسط بہت اچھی لگی۔ حاصل لا حاصل بس ٹھیک تھی۔ گلو کی چندا اور یہ رشتے دل کے رشتے ہیں۔ اس ماہ کی بہترین تحریریں لگیں مجھے...... من میرا مناسب تھی۔ ہاں اسما طاہر کی ریگ زار کی تعریف نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی۔ یہ حقیقت ہے اولاد کی تربیت اور کردار سازی میں والدین کا بہت عمل دخل ہوتا ہے (والدین ہی کا تو عمل دخل ہے) روحانی مشورے، گوشۂ ظرافت، بزم پاکیزہ، اور حسن نکھاریے بہت پسند آئے۔ آخر میں آنٹی عذرا رسول کو ان کی پوتی کی بہت مبارک ہو۔ (جی ان کی طرف سے بہت شکریہ) آنٹی میرا خیال ہے اتنا تبصرہ کافی ہوگا، آپ کی معروفیات کا بھی خیال ہے مجھے، معروفیات میری بھی ہیں مگر کوشش ہوگی اگر آپ جگہ دیں تو میں ہر ماہ تبصرہ بھیج سکوں، اللہ آپ کو خوش و آباد رکھے۔ اپنا خیال رکھیے گا۔" (جگہ تو اپنے تمام قارئین کو دینے کی کوشش کرتے ہیں بس صفحات کی کمی کبھی آڑے آجاتی ہے، رسالہ دیر سے پہنچنے کی آپ کی شکایت جلد رفع کی جائے گی)

✍ فرخندہ جعفری، گجرات سے۔ "ماشاء اللہ پاکیزہ کی صحت اب بہت اچھی ہوگئی ہے۔ تمام سلسلے بہت عمدہ اور کہانیاں حقیقت کو چھو رہی ہیں۔ میں بہت سخت بیمار ہوگئی تھی۔ اس لیے نومبر میں تبصرہ نہ بھیج سکی۔ اس ماہ دونوں شماروں پر تبصرہ بھیج رہی ہوں۔ افشین نعیم نے بالکل سچ لکھا ہے، آج کل کچھ ماڈرن مائیں اپنی بچیوں کو نہ کام کرنے دیتی ہیں نہ کچھ سکھاتی ہیں۔ کام کرے گی تو ہاتھ خراب ہو جائیں گے، ناخن ٹوٹ جائیں گے، اتنے لاڈ کرتی ہیں کہ بیٹی نکمی ہو کر رہ جاتی ہے تعلیم اپنی جگہ مگر کام کا ہنر اپنی جگہ تعلیم تو محنت کرنا سکھاتی ہے۔ نہ کہ نکما پن اس طرح کے کئی کردار اردگرد بکھرے پڑے ہیں۔ فصل، صبیحہ شاہ یہ حقیقت ہے کہ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ انسان کو پتا بھی نہیں چلتا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ایسے، ایسے عبرت ناک واقعے دیکھے ہیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہماری رائٹرز جو کچھ لکھ رہی ہیں یہ کہانیاں نہیں ہیں حقیقت ہے۔ اسی لیے پاکیزہ رسالہ اچھا لگتا ہے۔ ال، غزالہ رشید نے اچھا پیغام دیا ہے۔ آج کل کی نوجوان لڑکیوں کے لیے۔ یہ زندگی کے راستے، ام ایمان قاضی نے زندگی کے راستے اس طرح سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ پڑھ کر دل کھول کر داد دینے کو چاہتا ہے۔ اچھی کہانیاں دماغ کی تاریں ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ صفہ، دردانہ نوشین خان بہت لاجواب، اتنی عمدہ تحریر جسے پڑھ کر بہت مشکل الفاظ اور اسلامی طور طریقے بھی سمجھ میں آرہے ہیں۔ رائٹر اس کہانی پر بہت محنت کر رہی ہیں اللہ تعالیٰ ان کے زورِ قلم میں مزید اضافہ کرے۔ شمع ہدایت، وصف الٰہی، ایفائے عہد...... اختر شجاعت صاحبہ نے بہت محنت سے اس موضوع کو اجاگر کیا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو کہ ہر ماں کے اندر ہونا چاہیے۔ نزہت اصغر صاحبہ نے رائٹر سکینہ فرخ کا انٹرویو بہت اچھے انداز میں کیا ہے۔ بہت اچھی، اچھی باتیں پڑھنے کو ملی ہیں۔ واقعی یہ تعریف ان کے شوہر کی بنتی ہے۔ انہوں نے شادی کے بعد لکھنا شروع کیا۔ مگر ہمارا تو یہ حال ہے کہ شادی سے پہلے جو لکھتے تھے وہ بھی بھول گیا۔ عذرا رسول صاحبہ کی باغبانی کے نام، ویسے تو عذرا صاحبہ کو پوتی کی مبارک باد، اللہ تعالیٰ اسے زندگی والی اور نیک بنائے۔ تمام رائٹرز بہت ہی پیاری لگ رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو صحت و تندرستی سے رکھے۔ وہ اسی طرح اچھی تحریریں پاکیزہ میں دیں۔ پاکیزہ ڈائری، عظمیٰ آفاق کی ڈائری ہمیشہ کی طرح ماہ نومبر اور ماہ دسمبر میں بھی نور کے موتیوں سے بھری ہوئی تھی۔ میری تحریر تقاضائے وفا، پاکیزہ ڈائری میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ باقی تمام تحریریں اچھی تھیں سب پر تبصرہ کرنا مشکل ہے۔ آپ سب کو میری طرف سے نیا سال مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ سال ہم سب کے لیے خوشیوں کا پیغام لائے۔ تمام بیماروں کو شفا دے، آمین۔ امرت، شیریں حیدر کی گرفت کہانی پر بہت مضبوط ہے، کہانی کے کردار اپنا سفر نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں، رشتے ناتے کس طرح انسان نبھانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے مگر یہ رشتے اتنا دکھ دیتے ہیں کہ انسان بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اچھا پیغام دے رہی ہیں۔ یہ کہاں بچیں کہ دل ہے، رفعت سراج، آخر زارا کا بھید کھل ہی گیا اس کی اپنی

غلطیوں سے...... اپنا خون اپنا ہی ہوتا ہے، تا جور کب تک برداشت کرتی اپنی بیٹی کے بارے میں سن کر زارا کو گھر سے نکال دیا۔ بہت سبق آموز کہانی ہے۔ گواہ رہنا، نفیسہ سعید، سچی حقیقت...... یہ نہ تو کہانی ہے اور نہ ہی ناولٹ...... یہ سانحہ تو جب بھی یاد آتا ہے خون کے آنسو رلاتا ہے، کتنی ماؤں کے پھول مرجھا گئے تھے۔ کہانی انعام یافتہ ہے۔ بلا عنوان، اسما قادری...... جیسی کرنی ویسی بھرنی...... ہمیشہ کمال کی کہانی پاکیزہ میں دیتی ہیں۔ اتنے نیک اور محنتی بیٹے کی شادی ماں نے بڑی جلد بازی میں کر دی۔ انہیں لڑکی کے رشتے داروں سے چھان بین کرنی چاہیے تھی۔ دشت میں آب، فرح بھٹو...... کہانی بہت اچھی ہے، اپنے جگر کا ٹکڑا بہن کو دے کر اسے مایوسی کی دنیا سے نکال لائی۔ یہ قربانی ہر کوئی نہیں دے سکتا۔ سودا، سکینہ فرخ، رح عورت د، دیر...... رحوع، اپنا دامن اپنی آگ۔ بہن کا سہاگ بچانے کے لیے اتنی قربانی دینے اور بھائی ساری عمر اس آگ میں جلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ خوش قسمت کون...... حمادیہ احمد، ہر عورت کو دوسری عورت پر رشک آتا ہے مگر کوئی بھی اس دنیا میں خوش نہیں۔ سب کو کچھ نہ کچھ دکھ ہوتا ہے۔ ٹوٹی صراحی، ایمل رضا کہانی بہت ہی سبق آموز ہے۔ خوش فہمی میں رہ کر اور دوسروں کے فریب میں آ کر اپنا دل ہار دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ مرد تو ہمیشہ صنف نازک کو سبز باغ ہی دکھاتا ہے۔" (تفصیلی تبصرے کا شکریہ)

✍ تسنیم کوثر، کراچی سے۔ "اس دفعہ تو تقریباً تمام ناولز اور افسانے بے حد اچھے رہے ڈھونڈنے پر بھی کوئی خرابی یا نقص نظر نہیں آیا۔ محبت لفظ ہے لیکن اتنا خوب صورت ناول اتنی خوب صورتی سے مکمل کیا جس کا جواب نہیں...... حیا بخاری کو بہت، بہت مبارک باد۔ (خوش ہو جاؤ حیا) اور گلو کی چندا اللہ، اللہ کتنا مکمل معصوم اور پیارا سا بلکہ حسین تر ناولٹ کا تو جواب ہی نہیں۔ شمیم فضل خالق خوش رہیے، آپ نے ہمیں خوش کر دیا۔ اسی طرح نزہت جبیں ضیا کا ناولٹ یہ رشتے دل کے رشتے ہیں بھی خوب رہا۔ اس نے بھی پسندیدگی کی سند حاصل کی ہے اور خاص کر عقیلہ حق تو چھا گئیں ان کے ناولٹ حاصل لا حاصل کو نمبر ون کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اور سایہ اور شمر، شبینہ گل کا ناول بھی لائق تعریف ہے اس میں اتنے سلیقے اور تمیز سے اچھی باتوں اور نصیحتوں کو اجاگر کیا گیا ہے کہ ہر بات دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ (واقعی شبینہ نے بہت محنت سے لکھا) شمع ہدایت میں پردہ پوشی پر مضمون بہت اچھا لگا۔ اختر شجاعت صاحبہ نہایت دل جمعی سے لکھتی ہیں، ان کا انداز دل کو چھوتا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک ہدایت عطا فرمائے۔ اختر شجاعت صاحبہ کو دلی دعائیں اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ...... (الٰہی آمین) اور ہاں جو نئے ناولز شروع ہوئے ہیں ان کے بارے میں ان شاء اللہ دو اقساط کے بعد عرض کریں گے (جی ضرور) البتہ بزم پاکیزہ میں بہت مزہ آتا ہے۔ اور ہاں بھئی یہ کہاں بچیں کہ دل ہے کا اینڈ تشنہ اور ادھورا، ادھورا سا لگا کم از کم سفینہ اور پرنس کی شادی تو خوب صورتی اور شاندار طریقے سے ہونا چاہیے تھی۔ فوراً ہی جھٹ پٹ اختتام کیا ہے خیر یہ تو رائٹر کی مرضی ہے لیکن پھر بھی رفعت سراج صاحبہ کو ہماری طرف سے بہت، بہت مبارک باد...... (شادی کی تفصیل سے آپ کہیں گھبرا نہ جاتیں تسنیم) اور سب سے اچھی، بہنوں کی محفل تو پاکیزہ کی شان ہے۔ خاص طور پر عذرا رسول صاحبہ بہنوں سے جس خلوص اور محبت سے مخاطب ہوتی ہیں بہت اچھا لگتا ہے۔ پیاری بہن عذرا رسول ہمیشہ خوش رہیے اور پیاری نزہت آپ کو بھی میری طرف سے ڈھیروں دعائیں باقی تمام پاکیزہ کے سلسلے ہمیشہ کی طرح بہترین رہے۔" (بہت شکریہ پیارے سے تبصرے کا اور پُرخلوص دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)

✍ طاہرہ، خوشاب سے۔ "میری پچھلے سال 2017ء نومبر میں بیٹی پیدا ہوئی، میں اتنی مصروف ہوگئی کہ پاکیزہ لے کر رکھ لیتی اور پڑھنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا پھر اس نومبر 2018ء میں دوسری بیٹی پیدا ہوئی تو پھر تو نہ پوچھیں۔ یقین جانیے میں نے 12 پاکیزہ الماری میں بند کر دیے۔ دونوں بچیوں نے جو میرا حشر کیا ہوا ہے توبہ...... جبکہ بڑی سولہ سالہ بیٹی طیبہ کافی مدد کرتی ہے۔ پچھلے دنوں بچیوں کے ساتھ جو زیادتی کے واقعات کی خبریں تھیں تو میں ماؤں سے کہنا چاہوں گی کہ اپنی بچیوں پر نظر رکھیں اور اکیلا گھر میں بھی نہ چھوڑیں اور باہر بھی مت جانے دیں۔ استغفار کی کثرت کریں، صدقہ دیں۔ آنٹی عذرا رسول کو بہت، بہت مبارک ہو پوتی کی۔ اللہ بیٹیوں کے نصیب اچھے کرے، آمین۔ (جی بہت شکریہ) پاکیزہ پڑھوں گی سارے سال کے تو پھر ان شاء اللہ تبصرے بھیجوں گی۔ گھریلو پریشانیوں کے لیے پوچھا تھا کسی نے تو اس کے لیے سورۂ نوح تین دفعہ ایک ہی نشست میں بیٹھ کر پڑھیں ان شاء اللہ پریشانی دور ہوگی اور کام بھی ہو جائے گا۔" (ہم سب بہنوں کو یاد کرتے ہیں اور رکھتے ہیں۔ اب آپ باقاعدگی سے آیئے گا وظیفے کے لیے جزاک اللہ......)

✍ حافظہ ست النبات، تونسہ شریف سے۔ "نزہت آپی کچھ مصروفیت کی وجہ سے دو ماہ بعد محفل میں حاضر ہو رہی ہوں۔ (کوئی بات نہیں کچھ وقفہ ہو جائے مگر محفل میں آتی رہنا) عذرا باجی اور ذیشان صاحب اور ڈاکٹر فاطمہ کو بیٹی کی بہت، بہت مبارک باد...... اس دفعہ بھی سارا پاکیزہ ہی بہترین رہا۔ ہاں اسما قادری کے بلا عنوان کا عنوان میرے خیال میں ابن مریم ہوا کرے کوئی، میرے دکھ کی دوا کرے کوئی۔" (اچھا چلیں ہم نے نوٹ کر لیا...... اس شمارے میں آپ نتائج دیکھیں گی۔ ہاں اب پورے رسالے پر تبصرہ کرنا)

Digitized by Google

ثمرانہ ناہید حسین، کراچی سے۔ ”باجی میں سماعت سے محروم ہوں اس لیے پاکیزہ کے اس نمبر پر ایس ایم ایس کررہی ہوں، بہت شکریہ اس طرح میں بھی شامل ہوسکتی ہوں، میں کافی رسالے پڑھتی ہوں پر خط نہیں لکھ پاتی، (اسی لیے تو یہ سہولت دی ہے آپ کو) اس دفعہ تو شیریں حیدر نے امرت کی آخری قسط میں رُلا دیا مگر امرت اور کامل کی شادی نے مزہ دے دیا مبارک ہو۔ باقی رسالے پر بعد میں تبصرہ کروں گی۔“ (جی ضرور کریں تبصرہ)

☒ تسلیم شیخ، ساہیوال ۔ آپ جیسی کئی لکھاریوں کی تحریریں قابلِ اشاعت ہیں پھر بھی لائن میں لگی ہیں تھوڑا انتظار تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ آپ تبصرہ بھی ضرور بھیجیں۔

آسیہ عامر، کراچی سے۔ ”اس مرتبہ رفعت سراج کے ناول کی آخری قسط پڑھی اگرچہ اینڈ اچھا تھا لیکن ایسا لگ رہا ہے افراتفری میں سمندر کو کوزے میں بند کردیا ہے۔ زارا کو باندھ کر مارا ہے۔ (بڑی ہمدردی ہو رہی ہے زارا سے) اختر شجاعت سے مکافاتِ عمل پر مضمون لکھوائیں۔ خدیجہ اسحاق کا من میرا پرانا آئیڈیا لیکن پڑھنے کا بہت مزہ آیا۔ بڑے عرصے بعد مزاحیہ تحریر پڑھی۔ انجم بجیل کی سوچ بہت اچھی تحریر ہے۔ سو فیصد سچ ہے ہم لوگ چھوٹے لوگوں کا بڑا حق مارتے ہیں جبکہ کسی برانڈ کے سامنے ہماری زبان فکسڈ پرائز پڑھ کر بند ہوجاتی ہے۔ بزمِ پاکیزہ ہمیشہ کی طرح شاندار......اور بہنوں کی محفل تو ہے ہی میری لاڈلی بہنوں کا اپنا میکا لگتا ہے۔“ (جی بالکل میکا ہی تو ہے)

شگفتہ حیا ترمذی، وادیِ کاغان سے۔ ”بہترین سرورق سے سجا پوری تابناکی کے ساتھ اپنے اندر لفظوں کے ذخیرے سمیٹے سالِ نو کا پاکیزہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ کیا تعریف کروں پاکیزہ جان ہے میری تو......میرا پیارا پاکیزہ یہ رنگ رنگ کے پھولوں سے سجا ہوا وہ گلدستہ ہے جو اپنے پڑھنے والوں کے اذہان کو معطر کردیتا ہے پاکیزہ کی روحِ رواں عذرا آنٹی اور کیپٹن نزہت اپیا اور پوری پاکیزہ ٹیم کی محنت ہمیں بہت لطف اندوز کرتی ہے تبھی تو کئی سالوں سے ہم پاکیزہ سے ایسے جڑے ہیں کہ آخری سانس تک یہ ساتھ نبھائیں گے۔ پاکیزہ میں چھپنے والی ہر تحریر بامقصد، پاکیزہ، لاجواب اور دل کے تاروں کو چھو لینے والی ہوتی ہے۔ اس دفعہ پاکیزہ کی ٹائٹل گرل بہت انوسینٹ لگی۔ معراج انکل اور عذرا آنٹی کو پوتی کی بہت، بہت مبارک باد۔ اللہ پاک معراج انکل کو صحت و سلامتی عطا کرے، آمین۔ اللہ تعالیٰ فریدہ ہاشمی، امینہ عندلیب اور عصمت اوکاڑہ کے بیٹے کو شفائے کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ سعدیہ ہما شیخ کو بہت ساری کامیابیاں سمیٹنے پر دلی مبارک باد۔ یہ کہاں بچیں، دلوں کو مسحور کرنے والا ناول تھا جو اختتام پزیر ہوا، رائٹر کو ایسا پیارا ناول لکھنے پر مبارک باد۔ ہاں البتہ اب پاکیزہ پڑھتے ہوئے کچھ کچھ دل اداس ہوگا کہ امرت اور یہ کہاں بچیں میرے پسندیدہ ناول تھے۔ امرت میں شکر کیا کہ امرت کو کامل مل گیا ورنہ سارا مزہ کرکرا ہوجاتا اور رہی بات ناول صفہ کی تو جناب صفہ کی تعریف کرنا سورج کو چاند دکھانے کے مترادف ہے۔ پاکیزہ کے سارے سلسلے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔“ (تبصرے کا شکریہ)

یاسمین کنول، پسرور سے۔ ”سرورق کی ماڈل ایشا خان بڑے پیارے انداز میں سالِ نو کی مبارک باد دیتی نظر آئی سر پر اونی ٹوپی جنوری کا شدید احساس دلا رہی ہے۔ اداریہ پلاننگ کرتا نظر آیا جی ہاں ہمیں اپنے منصوبے سال کے آغاز میں ہی بنا لینے چاہئیں تاکہ پورا سال عمل کرسکیں اور نظم و ضبط سے زندگی کے امور سرانجام دیں لیکن ذاتی اور اجتماعی دونوں صورتوں میں اس کی ضرورت ہے۔ محبت لفظ ہے لیکن، حیا بخاری کا بہت خوب صورت اور واقعی میں دلکش و دل نشیں ناولٹ ثابت ہوا، پڑھ کر مزہ آیا اختتام بہت پسند آیا۔ سب معاملات سیدھے ہوگئے۔ رفعت سراج کا یہ کہاں بچیں کہ دل ہے بھی اپنے اختتام تک پہنچا اور بہت اچھا لکھا رفعت سراج نے۔ اتنے مہینوں قارئین کو اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ ساحل نے زارا پر مکمل قابو پایا اور ایک اچھی بیوی بنا ڈالا......سفینہ اور پرنس کے کرداروں نے بھی متاثر کیا اور اب دونوں کو ثوبان کی طرف توجہ دینی ہے جو اُن کا کھلونا بھی ہے۔ باقی مستقل سلسلے تو ہوتے ہی اچھے ہیں، میرے اشعار شامل کرنے کا شکریہ......“ (مختصر خط کا شکریہ......کہانی کے لیے فی الحال معذرت کوشش جاری رکھیں)

فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔ ”پروردگارِ عظیم نیا سال پاکیزہ والوں کے لیے خوشیوں بھرا پیام لے کر آئے۔ (سب کے لیے) ملک میں خوشحالی، ترقی اور محبتوں کے پھیلانے کا باعث ہو، آمین......ہم بحیثیت شہری اپنے فرائض بخوبی انجام دیں یہ سوچے بغیر کہ ہر کام حکومت کرے......ارے ہم بھی تو کچھ کریں......ٹائٹل خوب صورت ہے۔ اداریے نے اچھا پیغام دیا جو میرے اپنے الفاظ و خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ عرصہ پہلے ایک نعت پاکیزہ میں لکھی تھی۔

محمد کی نگری میں جا کر تو دیکھو مقدر ذرا آزما کر تو دیکھو

شگفتہ شفیق صاحبہ نے اس زمین میں غزل لکھی، اچھی لگی۔ شمیم فضل خالق کی گلو کی چندا اچھا انجام لیے کہانی ہے۔ کاش ایسی

بھاگوان بہو ہر گھر کو ملے جو اپنے ساتھ بھاری جہیز کے بجائے اخلاق، احترام اور ہمدردی لائے۔ کہتے ہیں اولاد مرد کی قسمت سے اور دولت عورت کے نصیب سے ملتی ہے۔ اللہ اولاد دے تو نیک، ایسی نہ دے جو بڑھاپے میں والدین کو اولڈ ہوم چھوڑ آئے اور یہ صرف اس بہو کی وجہ سے ہوتا ہے جسے ماں بڑے چاؤ سے اپنے گھر لاتی ہے۔ حیا بخاری کا محبت لفظ ہے لیکن دردناک انجام اور کچھ خوشگوار تاثر لیے آخر کو تمام ہوا۔ غرور، گھمنڈ، انا، پابندیاں اکثر اولاد کو باغی بنا دیتی ہیں۔ کچھ یہی اس کہانی کا نچوڑ ہے۔ مردوں کی دنیا میں اپنے لیے سب جائز، عورتوں کے لیے رسم و رواج کی پابندیاں، خود ساختہ زنجیریں......چلیں اچھا ہوا سفینہ اور پرنس کا دل بچ گیا آخر......زارا نے اپنی فطرت سے خود اپنا سامان کیا۔ ساحل کی لاٹری نکل آئی۔ صفحہ 25 کالم 4 میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ صرف قبائلی ہی عزت کے نام پر قتل کرتے اور عورت پر قابو پا کر اسے آزاد نہیں چھوڑتے۔ قبائلی علاقوں میں ایک آدھ ہی (قتل کا) ایسا کیس آتا ہے۔ ورنہ جتنا احترام یہ لوگ خواتین کو دیتے ہیں شاید ہی کوئی اور غیرت کے نام پر سب سے زیادہ قتل (ان پڑھ دیہاتی) دیگر علاقوں میں ہی ہوتے ہیں کہ اب تو میڈیا کا دور ہے، کیا مادر پدر آزاد معاشرہ جو آج کل نظر آرہا ہے۔ بے پردگی، اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ تعلیم کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ لڑکیاں خود سر ہوجائیں اور اپنے فیصلے خود کریں گھروں سے بھاگ، بھاگ کر......من میرا، خدیجہ اسحاق کی کہانی میں ایسا انٹرویو نہ کبھی ہوا ہے نہ کبھی ہوگا۔ فلمی کہانی جیسا انداز کا خاتمہ بخیر ہوا۔ دولتمندوں کے چونچلے بھی کیا خوب ہیں شوقیہ ملازمت اور اکثر جوان ڈگری یافتہ سی وی لیے ذلیل خوار ہورہے ہوتے ہیں۔ زمانے کے بھی کیا رنگ ہیں ان والدین کے دلوں کا حال تو پوچھیں جنھوں نے مشکل سے اپنے بچوں کو تعلیم دلائی ہوتی ہے۔ مجھے آج تک وہ 20 سالہ مزدور لڑکا نہیں بھولا جو مزدوری کی غرض سے مرے ہاں آیا کچھ گارڈن میں کھدائی کا کام تھا۔ بار، بار اپنے ہاتھوں کو سہلا رہا تھا کدال کو رکھ کر......میں نے جا کر دیکھا تو اس کے ہاتھوں میں چھالے تھے۔ کام فوراً روک دیا اس کا حال پوچھا تو رو پڑا کہ ایف ایس سی کیا ہے کمپیوٹر سائنس میں نوکری نہیں ملی......تو مزدوری پر آگیا کہ ماں، باپ غریب ہیں۔ اس کی سی وی میرے پاس پڑی ہے کاش کہ اس کے کام آسکتی میں۔ ریگ زار میں بچے جو ماں، باپ کو کرتے ہوئے دیکھتے ہیں وہی ان کی آئندہ زندگی طور طریقوں برتاؤ میں نظر آتی ہے۔ صفہ خوب صورت جارہی ہے۔ کاش ایسا پاکیزہ ماحول ہر گھر میں نظر آئے۔ وہ زمانے گئے جب نانی، دادی، بزرگانِ دین کی کہانیاں بیٹھ کر سناتی تھیں۔ آج کی دادی، نانی خود ٹی وی انٹرنیٹ میں گم ہیں۔ نار کی پہلی قسط پڑھ کر احساس ہوا کہ اسے ہارڈنٹ ٹوکریک جہانگیر فرشریڈ انا کا مارا ماموں کے در پر پڑا پلتا رہا اگر اول روز سے اکیلا ماں کے ساتھ غربت کی زندگی گزارتا تو ماموں کے احسانات کی بےقدری نہ کرتا......ماموں نے فرض نبھایا جسے اس نے احسان جانا اور آخر بلی تھیلے سے باہر آگئی۔ بیوی کو ملازمت کرنے کا کہہ کر کہ status بڑھ جائے گا اپنا......احساسِ کمتری کا شکار ہے۔ رشتے دل کے میں میڈم کے بچے کا نام ربی پڑھ کر شاک لگا۔ (آپ نے جس طرف اشارہ کیا آپ کی بات بالکل درست ہے مگر مصنفہ نے ربط سے ربی کیا ہے دراصل تشدید لگنے سے ایسا ہوا اور نہ مصنفہ کا یہ ارادی فعل ہرگز نہیں تھا بہت شکریہ نشاندہی کرنے کا۔ ربیعہ یا رباب سے ربی ہو سکتا ہے مگر ربّی نہیں) اس کے معنی میرا رب ہے۔ اپنے رب کے حضور مصنفہ معافی مانگیں۔ شروع میں مکان سنگل اسٹوری ہوتا ہے۔ بعد میں قلم کی روانی سے صفحہ 168 پر دوسرے کالم میں ڈبل اسٹوری کرایہ دار کا ذکر ہے۔؟ (ڈیئر فریدہ صفحہ 166 پر پہلا کالم دوبارہ پڑھیں مکان ڈبل اسٹوری ہوگیا تھا) پارس نے سکینہ کو معاف کرکے نیکی اپنے نام کرلی۔ حاصل لاحاصل......اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا۔ میرا اسرار زنگ اتار دو۔ سایہ اور ثمر پر تبصرہ باقی ہے۔ شمع ہدایت میں پردہ پوشی، قابلِ تعریف اور اللہ کے آگے پسندیدہ عمل ہے۔ اللہ ستارالعیوب ہے۔“ (بے شک، بہت گہرائی سے کیے گئے تبصرے کا شکریہ کہ اس سے ہمیں بھی رہنمائی ملتی ہے)

☒ راشدہ عفت، مطیع جرمنی ۔ آپ اب کیسی ہیں، بہت شکریہ کہ آپ اتنی دور سے باقاعدگی سے رابطے میں رہتی ہیں۔ پاکیزہ کے سلسلے پسند کرنے کا شکریہ......آپ اپنی رائے اور تنقید سے بھی آگاہ کریں۔

☒ فرحت انصاری، ملتان، ریما نور رضوان، کراچی، صدف آصف، آسٹریلیا، سویرا فلک، کراچی۔ حنا بشریٰ، لاہور، بشریٰ ماہا، بدین آپ سب کی کہانیاں ان شاء اللہ جلد از جلد لگیں گی رسالے پر تبصرہ بھی بھیجتی رہیے۔

نصرت اقبال، سرگودھا سے۔ ”باجی پاکیزہ تو بہت اچھا جا رہا ہے۔ سینئر رائٹرز تو اچھی تحریریں دے رہی ہیں مگر جونیئر بھی محنت کررہی ہیں، کبھی، کبھی کوئی غلطی پورے افسانے کا تاثر خراب کردیتی ہے۔ جیسے ہما بیگ کا سایۂ دیوار میں قبائلی علاقے کی عجیب تصویر کشی کی ہے۔ وہاں کی عورت تو بہت محنتی اور جفاکش ہوتی ہے (نصرت رائٹر بھی گہرے مشاہدے کے بعد لکھتی ہیں۔) ویسے موضوع ٹھیک تھا۔ ایمل رضا نے بہت بہترین کہانی لکھی۔ شیریں حیدر اور رفعت سراج تو لکھتی ہی اچھا ہیں۔“ (تبصرے کا شکریہ)

٭ فریدہ ہاشمی تحفی، کراچی سے۔ ''خدا کا ہزار شکر ہے کہ میری طبیعت اب اچھی ہے۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے بہنوں کے لیے میرا پیغام شائع کیا۔ امید ہے بہنوں نے میرے لیے ضرور دعا کی ہوگی۔ (جی ہاں بالکل کی) سب کی بہت شکر گزار ہوں۔ دسمبر اور جنوری دونوں رسالے بہت پسند آئے۔ شیریں حیدر نے ناول کا اختتام بہت خوب صورتی سے کیا، جنوری میں بھی دو ناول ختم ہو گئے۔ حیا بخاری نے بھی اپنے ناولٹ کا اختتام بے حد اچھا کیا۔ مینا کے انجام پر دل بہت دکھا۔ مگر شاید اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ رفعت سراج کی تو تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ بہترین خیالات اور نگینہ جیسے چیدہ، چیدہ الفاظ سے پُر ان کا ناول بھی ختم ہوا۔ خدا سب بہنوں کو سلامت رکھے۔ بہت پُر اثر تحریریں ہیں، بہت پسند آتی ہیں۔ ایک عرصے بعد افشاں آفریدی کی خوشگوار آمد ہوئی ہے۔ بہت خوشی ہوئی۔ کافی دن پہلے ان کا ناول تجھے پہچان گئے شاید ایسا ہی نام تھا۔ جس میں اعراف اور متحمل کی کہانی تھی پڑھا تھا۔ اور بہت پسند آیا تھا۔ یہ ناول بھی امید ہے بہت اچھا ہوگا۔ (جی ان شاء اللہ) سب بہنوں کی نظمیں شاعری اور اچھی باتیں بھی بہترین ہیں۔ محسن نقوی تو میرے پسندیدہ شاعروں میں سے ہیں، پروین شاکر اور محسن بھوپالی کو پڑھ کر دل بہت خوش ہوا۔ کہانیاں ساری بہترین اور سبق آموز ہیں۔ صفہ بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ انداز میں صوفیانہ رنگ ہے جو دل کو چھو لیتا ہے۔ اختر شجاعت کا ہر مضمون بہترین ہے۔ خدا انہیں بہترین اجر عطا فرمائے اور ہمیں توفیق عطا ہو کہ اس نصیحت کا اثر لیں اور اس پر عمل کرنے کی سعی میں لگ جائیں، آمین۔ بہن عذرا رسول کو پوتی کی آمد پر بہت مبارک باد کہہ دیں۔ معراج صاحب کی طبیعت کی بہتری کے لیے دعا گو ہوں۔ عمیرہ احمد، نمرہ احمد، عنیزہ سید اور نگہت سیما کی تحریر بھی بہت دنوں سے نہیں پڑھی۔ زوردار فرمائش ہے کہ ضرور لکھوائیں۔ (جی ان شاء اللہ ضرور لکھیں گی کچھ مصروف ہیں) دعا کرتی ہوں کہ یہ سال ہم سب کے لیے خوشیاں لائے۔ محبتوں، امن اور دلی سکون کے تحفے لائے اور ملک و ملت کے لیے بہترین سال ثابت ہو، آمین۔ یارب العالمین۔'' (پیارے سے تبصرے کا شکریہ...... دقیق تبصرے رائٹرز کو مہمیز کرتے ہیں)

٭ سلمٰی غزل، کراچی سے۔ ''نیا سال خدا کرے آپ کے، میرے اور تمام مسلمانوں خاص طور پر پاکستانیوں کے لیے روشن مستقبل کا ضامن ہو، اسلام کا بول بالا ہو اور امت مسلمہ بام عروج پر پہنچے، آمین۔ بجائے ابتدا کے میں آخر میں پہنچ رہی ہوں کیونکہ شینہ گل نے سایہ اور ثمر اتنا کمال کا بامقصد اور خوب صورت لکھا ہے کہ تعریف کے لیے الفاظ نہیں...... سب سے بڑی خوبی سادہ جملے، تحریر کی شگفتگی اور برجستگی تھی، دینی مسائل کو انہوں نے خوب صورتی سے اجاگر کیا نہ غرور نہ تکبر واہ، واہ کیا بات ہے شینہ ویل ڈن...... خدیجہ اسحاق نے من میرا بہت خوب لکھا ہلکی پھلکی تحریر مزہ دے گئی لطف ملا۔ حیا بخاری کا محبت لفظ ہے لیکن شروع سے بہت اچھا رہا لیکن اختتام بہت اچھا لکھنے کے باوجود لگا کہ انہوں نے جلدی سے ختم کیا ہے یعنی دریا کو کوزے میں بند کیا (ہر اچھے ناول کے اختتام پر تشنگی رہ جاتی ہے) مگر مزہ آیا۔ ام جمیل کی سوچ بھی تعمیری بامقصد لیکن کاش افسانے کے اینڈ کی طرح لوگوں کی سوچ بھی بدل جائے جو بدلتی نہیں۔ شمیم فضل خالق ہمیشہ ہی اچھا لکھتی ہیں لیکن ایک ان پڑھ انسان کو جس طرح انہوں نے بام عروج پر پہنچایا ان کے قلم کا کمال ہے ورنہ حقیقی دنیا میں ایسا ہوتا نہیں۔ نزہت جبیں ضیا بہت کہنہ مشق رائٹر ہیں پلاٹ اچھا لیکن غیر ضروری طوالت کا شکار معذرت کے ساتھ پیسے والے لوگ بھی اتنے بد دماغ نہیں ہوتے اور ایک امیر لڑکی کو ایک lower middle class کی لڑکی کے ساتھ پڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر جس گھر میں سلائی، بُنائی اور لشتم پشتم گزارہ ہوتا ہو وہاں ایک co education اور پرائیویٹ ادارہ؟ زیادہ مسائل اور پھر یہ مہنگی تعلیم؟ معذرت خواہ ہوں مگر پلاٹ اچھا اور سادہ تھا۔ (ارے آپ نے تو اچھا خاصا تجزیہ کر دیا) عقیلہ حق کا حاصل لاحاصل بہت لاجواب مگر اینڈ نے دکھ دیا لیکن یہی ہونا چاہیے تھا۔ اختر شجاعت کا پردہ پوشی لاجواب۔ راز داری اور پردہ پوشی کا فرق انہوں نے بڑی خوب صورتی سے واضح کیا یقین کیجیے 6 کی شب بیٹا امریکا گیا اسی دن بیٹی عمرے سے آئی۔ اور کل پیر کو میں نے پورا رسالہ پڑھ لیا ہمت کی داد دیجیے۔'' (ویل ڈن سلمٰی جیتی رہیں)

٭ عظمٰی اسلم، کرال چوک اسلام آباد سے۔ ''آپی میں ہر ماہ آپ کے دو پرچے باقاعدگی سے پڑھتی ہوں ایک جاسوسی جو بھائی بھی بہت شوق سے پڑھتا ہے، میرا پسندیدہ پاکیزہ ہے پر جاسوسی بھی کم نہیں۔ میں نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں میں آپ کو ایک کہانی بھیج رہی ہوں کہانی شائع ہو نہ ہو مجھے بتا دینا مجھ میں لکھنے کی صلاحیت ہے یا نہیں......'' (پیاری بیٹی عظمٰی ابھی آپ مطالعے پر زور دیں اپنی پڑھائی مکمل کریں پھر کہانی بھی لکھ لیجیے گا)

٭ دردانہ نوشین خان، مظفر گڑھ سے۔ ''سالِ نو کا خوب صورت پاکیزہ طلوع ہوا۔ اللہ اسے برسوں تابندہ، پائندہ،

درخشندہ رکھے، آمین...... پہلی بات تو یہ عرض کرتی ہوں کہ رسالے میں اچھی، اچھی کہانیاں ہوتی ہیں اوراق پلٹتے ہوئے کچھ جملے، مناظر، مکالمے کلک کرتے ہیں سوچتی ہوں بلکہ طے کر لیتی ہوں کہ اسے پڑھوں گی مگر مہینہ تیزی سے گزر جاتا ہے۔ دسمبر کی چھٹیوں میں سارے بچے ہمارے ہاں The D's میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ دانیال (بیٹا) لاہور سے، کراچی والی درِّیہ بیٹی، میڈیکل کالج والی چھوٹی دھنک (جسے لاڈ سے چینی کہتے ہیں) اور دور دبئی سے دیپ رشا بھی آ گئی۔ رونق اور مصروفیت رہی۔ (واہ کیا D کی بہار ہے بہت خوب اللہ خوش و آباد رکھے) مگر کاغذ، قلم، لکھنا اور پڑھنا بھی اب لہو میں شامل ہو چکا ہے۔ مجھے سب سے پہلے ان تمام قارئین کا شکریہ ادا کرنا ہے جو صفہ کو پڑھ رہی ہیں اور اپنی معتبر رائے کا اظہار کر رہی ہیں۔ میرے سامنے اس وقت چونکہ جنوری 2019ء کا شمارہ ہے لہٰذا گزشتہ شماروں میں جن پیاری بہنوں نے صفہ کی پزیرائی کر کے میرا اعتماد بڑھایا ان کے نام تو میرے سامنے نہیں ہیں مگر ان کے لیے مہکتے گلابوں کا شکریہ...... فریدہ فری آپ کئی پیراگراف بار، بار پڑھتی ہو، لگتا ہے ہماری ذہنی اپروچ کا زاویہ ایک ہے۔ اللہ آپ کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ ثمینہ کوکب کے انمول الفاظ نے دل خوش کر دیا۔ صدف علی، ہما سید، ہماری زیرِ تعلیم نوجوان بچیاں اس صوفیانہ ناول میں گہری دلچسپی لے رہی ہیں۔ یہ خوش آئند بات ہے۔ پیاری بچیو! مجھے تو تمہارا مقالہ پڑھنے کا شوق ہو گیا ہے۔ اسی طرح خود کو مصفا راستوں کی اڑان میں رکھنا۔ شمیم فضل خالق کا ناولٹ، گلو کی چندا پڑھا بعض اوقات ایسا ہی ہوتا ہے۔ معمولی حالات سے دن پھر جاتے ہیں اور ناممکن حاصل ہو جاتا ہے۔ اچھا لکھا گیا ہے۔ پیاری بہنو! جب جتنا پڑھوں گی تبصرہ کر دوں گی۔ جگمگاتے ناموں والی لکھاری بہنیں اس بات پر ناراض نہ ہوا کریں بلکہ بقول پیاری عذرا رسول بدگمان نہ ہوا کریں۔ (جی ہاں بالکل) دانستہ کسی تحریر کو چھوڑا نہیں جاتا۔ اس وقت بھی کتنی کتابیں برائے تبصرہ کی انتظار میں میری میز پر ہیں۔'' (پیارے سے خط کا ڈھیروں شکریہ)

٭ ثریا شہاب، ڈی جی خان سے۔ ''خدا کرے یہ نیا سال سب کے لیے خوشیاں لائے، آمین۔ آپی سب سے پہلے سالِ نو کی مبارک باد...... پاکیزہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ ماہ دسمبر اور ماہ جنوری کے تمام افسانے بہت اچھے تھے۔ دونوں ناول بہت خوب صورتی سے تمام ہوئے اب دیکھیں یہ نئے ناول کیسے ہیں ابھی تو اسٹوری واضح نہیں ہے...... پاکیزہ میں آنے والے سارے سلسلے روحانی مشورے، اشعار، گوشۂ ظرافت، ڈائری سب بے حد پسند آئے ہیں۔ اس دفعہ اداکار دہاج کا انٹرویو بھی اچھا تھا یہ تو کافی ڈراموں میں آ رہے ہیں۔''

٭ سرور فاطمہ ہنی، صوابی سے۔ ''پہلی بار آپ کے پرچے کو خط لکھ رہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ شنوائی ہوگی...... (جی بالکل) ان پرچوں کے ذریعے ہماری جتنی اصلاح ہوتی ہے شاید ہی کسی اور وجہ سے ہو (بہت شکریہ) زندگی کی اس پُر پیچ شاہراہ پر جہاں خوشیوں کے خوشنما باغات ہیں وہاں پر غموں کی گہری کھائیاں بھی ہیں اور خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے، جھولتے ہمارا ایک غلط قدم ہمیں یوں اچانک غم کی اتھاہ گہرائیوں میں گرا دیتا ہے جہاں سے نکلنا دشوار ترین ہوتا ہے اور مدد کے لیے پکاری جانے والی اپنی ہی آواز بازگشت کی صورت لوٹ کر واپس ہم تک آ جاتی ہے ان پر خطر دلدلی راہوں کو کیسے عبور کر کے منزل تک پہنچنا ہے۔ یہ ہمیں یہی پرچے سکھاتے ہیں۔ معاشرے میں یہ اپنا گہرا اثر چھوڑ رہے ہیں۔ (جی یہ سب ہماری رائٹرز کی محنت ہے) اگر آپ میری غلطیوں کی نشاندہی کریں گی تو میرے لیے اعزاز کی بات ہوگی کہ ابھی تو ہم نے صرف قلم تھامنا ہی سیکھا۔'' (اسی طرح تو مشق ہوتی ہے اور ایک سے ایک لکھاری سامنے آتے ہیں بہت شکریہ پہلی دفعہ آپ نے حاضری دی۔ ان شاء اللہ ہمارا ساتھ دیرپا ہوگا)

٭ سنبل ملک اعوان، شاہدرہ لاہور سے۔ ''محفل دیکھی خوشی ہوئی اور تصور ہی تصور میں اپنے آپ کو اسی محفل کا حصہ سمجھا۔ آپی میں جاب کرنے والی لڑکی...... مستری، مزدوروں کے متھے لگ، لگ کر یہاں پہنچی کہ بے آسرا خواتین کے لیے جیسا بھی سہی گھر ہوا۔ میرے ساتھ تو اللہ کے بعد بس میری صرف ماما کا آسرا ہے۔ میں نے اپنی والدہ کا زیور بیچ دیا، اپنا زیور بیچ دیا۔ اپنی جمع پونجی بھی لگا دی۔ ساری سیلری مکان پر لگا رہی ہوں۔ خیر پھر بھی مایوس نہیں ہوں۔ (مایوس ہونا بھی نہیں چاہیے) کوئی تو ایسا ہو جو مجھے بھی شاباش دے کہ میری تھکن اتر جائے۔ (ارے ہم آپ کو سراہتے ہیں اور دعا کرتے ہیں۔ تمام پاکیزہ بہنیں آپ کے ساتھ ہیں) آپی اتنے لوگوں میں صرف ایک مسز جعفر قریشی کے دل میں جذبہ پیدا ہوا کہ وہ کارِ خیر میں حصہ ڈالیں گی۔ (اللہ سب کی پریشانیاں حل کرنے والا ہے) پاکیزہ کی کہانیوں سے بہت تسلی، حوصلہ اور ہدایت ملتی ہے۔ (بہت شکریہ، سبھی رائٹرز محنت کرتی ہیں) آپی اگر مسز جعفر قریشی جیسے پانچ لوگ بھی میرے ساتھ مل جائیں تو ان شاء اللہ، ہم لوگ بہترین سہولیات فراہم کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اللہ پاک ان کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ وہ واقعی مخلص خاتون ہیں۔ پلیز میرا یہ پیغام سب کو دیں کہ خدارا لڑکیاں اپنے گھر سے قدم باہر نہ نکالیں۔ کسی بھی طرح سے لڑکوں کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آئیں۔ آپ کی سب سے قیمتی چیز عزت ہے، بعض میری بات پر

ہنسیں گے کہ محبت میں انسان سب کچھ چھوڑ سکتا ہے۔ بے شک میں نے محبت کی نہیں، نہ کسی کو مجھ سے محبت ہوئی مگر مجھے اتنا پتا ہے کہ محبت کرنے والے دوسرے کی عزت کو رسوا نہیں کرتے۔(بالکل درست کہہ رہی ہو سنبل) پھر بھی اگر گھر چھوڑنے کی غلطی کرلی ہے تو پلیز، پلیز آپ میرے پاس آجاؤ، ایک گھر جیسا ماحول ملے گا، وہ لڑکے جو اپنی بیویوں کے خوف سے ماں کو اولڈ ہاؤس چھوڑنے کا پروگرام بنا رہے ہیں وہ اس جنت کو میرے پاس چھوڑ جائیں۔(اللہ تمہیں ہمت دے اس نیک کام کو کرنے کی) بہت عرصہ ہوا آپی عنبر وسیم کی خیر خبر نہیں آئی؟ زم، زم وہاڑی کا بھی کوئی اتا پتا نہیں......(بھئی بہنوں واپس آجاؤ) نومبر کا پاکیزہ مل گیا ہے سب سے پہلے امرت پڑھا، امرت کو جب زین نے طلاق دی تو امرت کیوں نہ ڈٹی۔ آپی ہمارے ہاں تو نچلے طبقے میں نہ جانے کتنے جوڑے اسی طرح زندگی گزار رہے ہیں کیونکہ مرد مکر جاتے ہیں اور بولتے ہیں کہ غصے میں دی تھی طلاق...... مگر طلاق تو واقع ہوگئی۔ امرت کی جرأت کو سلام...... سارہ نے بھی دوستی نبھائی...... نومبر کے افسانے بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ آنٹی کوثر خالد صاحب کتاب بھی ہو گئیں اور ہم ابھی تک تبصرہ نگار، خدارا ہمارا عہدہ بھی بڑھا دیں۔‘‘(ہاں کوشش جاری رکھیں خط و تبصرے کا شکریہ، اللہ آپ کا ہر آن حامی و ناصر ہو)

✿ شگفتہ، لاہور سے۔’’آپی پاکیزہ میں جب سے پڑھ رہی ہوں جب یہ پچیس روپے کا ہوتا تھا۔ بہت رائٹرز کو پڑھا اور بہت، بہت اچھی تحریریں پڑھنے کو ملیں۔ آج کل صفہ ناول بہت اچھا جا رہا ہے۔ مجھے گہری سوچ و فکر دینے والی کہانیاں اچھی لگتی ہیں، جس سے ہم اپنے آپ کو پہچانیں اور اپنے رب کی معرفت حاصل کریں۔ ہماری رائٹرز سطحی کہانیوں کے بجائے ان موضوعات پر لکھیں جو سبق آموز بھی ہوں اور کچھ علم دینے والی بھی ہوں۔‘‘(بہت شکریہ راہنمائی کا آپ باقاعدگی سے تبصرہ لکھیں)

✿ مسرت رانی خلیل، کراچی سے۔’’سب پاکیزہ بہنوں کو سالِ نو کی مبارک باد...... اللہ کرے یہ سال سب کے لیے خوشیوں کا پیامبر ہو اور سب سے بڑھ کر دعا ہے کہ ہم ایمان کی قوت کے ساتھ زندگی گزاریں اور اپنی آخرت سنوارنے کے سامان کریں...... جب سے عمرے سے آئی ہوں دل نہیں لگ رہا۔ میرے مالک اللہ رب العزت نے بہت بڑی سعادت سے نوازا۔(جی بے شک) میں ان صفحات کے توسط سے اپنی پاکستانی بہنوں کو کچھ پیغام دینا چاہتی ہوں اگرچہ کسی کو برا ہی لگے۔ حق بات پہنچانا بھی نیکی کا کام ہے۔ ہم کتنا اہتمام کر کے اور دعائیں مانگ کر اپنے رب کے حضور اور آقائے دو جہاں کے حضور حاضری دینے جاتے ہیں مگر ہمارا حلیہ ایسا نہیں ہوتا شرم آتی ہے۔ نماز جیسا رکن بغیر پورا پردہ کیے ہوئے یعنی جو عورتوں کو حکم ہے اس کے مطابق ستر پوشی نہ کی تو قبول نہیں۔ وہاں ایسی بھی پاکستانی خواتین دیکھیں جو جانے انجانے میں اس کا خیال نہیں رکھتیں...... یہ تو قافلہ سالاروں کو بھی چاہیے کہ عبایا کے بغیر جانے نہ دیں، باریک دوپٹوں کے ساتھ کس طرح ارکان عمرہ ادا ہو سکتے ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لیے اعلیٰ تعلیم کی نہیں دینی شعور و آگہی کی ضرورت ہے۔ معافی چاہتی ہوں کسی کو ناگوار گزرا ہو تو مگر یہ بات کہنا میرا فرض تھا۔‘‘(مسرت آپ نے بہت اہم نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اکثر بہنیں ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتی ہیں کہ دیگر پاکستانی خواتین کے حلیے اور رویے کی وجہ سے ہمارا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ پاکیزہ میں مصنفہ قیصرہ حیات نے بھی اس بارے میں پورا مضمون لکھا تھا بس یہی دعا کر سکتے ہیں کہ اللہ ہم سب کو اپنی ہدایت سے نوازے، الٰہی آمین)

✿ ساجدہ ظفر، کمالیہ سے۔’’سال کا آخری شمارہ دلہن نمبر کی صورت میں ملا۔ سرورق پر دلہن کی تصویر بہت جچی کیونکہ دلہن عام روایتی دلہنوں کے برعکس کم زیورات میں بھی پیاری لگ رہی تھی۔ شاید ایسی ہی دلہنوں کے متعلق کہا گیا کہ ان کی سادگی میں بھی پُرکاری ہے۔ افسانوں میں تا حال حنا دیہ احمد کا خوش قسمت کون...... اسما قادری کا بلاعنوان اور طیبہ عنصر مغل کا افسانہ کا جل کوٹھڑی پڑھ سکی ہوں۔ دراصل میں پاکیزہ پندرہ بیس دن میں تھوڑا، تھوڑا کر کے پڑھتی ہوں۔ یہ مجھے زیادہ اچھا لگتا ہے بجائے اس کے کہ دو ہی روز میں ختم کر کے اگلے شمارے کا انتظار شروع کر دوں(اچھا طریقہ ہے) بہنوں کی محفل میں فریدہ جاوید فری اور امینہ عندلیب کی علالت کا سن کر دل اداس ہوگیا۔ اللہ رب العزت ان کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے بلکہ تمام بہنوں کو نصیب فرمائے، آمین۔ ہاں کچھ پرانی رائٹر اور قاری بہنیں نظر نہیں آ رہیں، آپی انہیں اس خوب صورت محفل میں دوبارہ بلالیں(نام بتائیں آپ کن کو دیکھنا چاہ رہی ہیں غیر حاضر بہنوں سے میری بھی اپیل ہے کہ وہ فوراً چلی آئیں ورنہ ان کا اعلانِ گمشدگی پاکیزہ سمیت دیگر رسالوں میں بھی شائع کر دیا جائے گا) شمع ہدایت میں اختر شجاعت کا مضمون حسد، لعنت الٰہی پڑھ کر میں سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن ہوگئی کیونکہ فی زمانہ حسد میں آدھے سے زیادہ معاشرہ مبتلا ہے۔ اور اس برائی کو برائی بھی نہیں سمجھا جاتا۔ ہاں مضمون کے آخر میں بہنوں کے نام پیغام پڑھ کر ہم بہت پریشان ہو گئے کیونکہ انہوں نے بہنوں کو یاد کرتے ہوئے مجھے بالکل فراموش کر دیا۔ حالانکہ میں ان کے مضامین شوق سے نہ صرف پڑھ رہی ہوں بلکہ گاہے بہ گاہے تبصرہ بھی کرتی رہتی ہوں، چلو خیر...... غزالہ فرخ سے تفصیلی گفتگو نے بہت مزہ دیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم سب غزالہ صاحبہ کے سامنے بیٹھے ہوں اور وہ ہمارے سامنے بیٹھی سوالات کے جوابات دے رہی ہوں۔ گوشہ ظرافت میں یونس بٹ صاحب کے مضامین دل کے تاروں کو چھو گئے۔ ان کی یہ تحریر تو گویا، بیوی نامہ ہی تھا، شروع سے آخر تک بیوی ہی چھائی رہی۔ بزم پاکیزہ میں اپنا سوال انعامی قرار پانے پر آپ سب کا بے حد شکریہ...... باقی سوالات بھی اچھے تھے، میں اکثر گنگناتی ہوں اور پاکیزہ ڈائری بھی محنت سے ترتیب دیے گئے۔ مگر دسمبر کے حوالے سے اشعار اور دیگر تحریریں بہت ہی کم تعداد میں شاملِ اشاعت تھیں۔ آپ کو اور تمام قارئین اور رائٹر بہنوں کو نیا سال مبارک ہو۔‘‘(آپ کو بھی مبارک ہو، کوشش تو کرتے ہیں موقع محل کی مناسبت ضرور ہو، آپ بھی تو اتنی دیر سے نگارشات بھیجتی ہیں اسی طرح دیگر بھی لیٹ ہو جاتے ہیں)

☆ فرحت احمد، گلشن حدید سے۔’’عذرا باجی کو میری جانب سے پوتی کی بہت، بہت مبارک باد دے دیجیے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے صحت و تندرستی کے ساتھ لمبی زندگی عطا کرے، آمین...... سینئر رائٹرز کے تو کیا کہنے ہماری جونیئر رائٹرز بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں، مجھے تو تمام ناول، ناولٹ اور خاص کر افسانے اچھے لگ رہے ہیں، مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب رسالے میں افسانوں کے بارے میں لکھنا پڑتا تھا کہ پسند آئے۔ باقی تو یوں ہی ہوتے تھے، ویسے یہ وقت تھوڑے عرصے کے لیے آیا تھا۔ مگر اس کے بعد سے لے کر اس شمارے تک میں یہ کہوں گی کہ آپ اور آپ کی تمام ٹیم اور لکھاری بہنیں بہت محنت کر رہی ہیں اور یہ خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔(بہت، بہت شکریہ سراہنے کا) سب سے پہلے صائمہ اکرم کو خوش آمدید...... اور باقی بہنوں کو ان کی خوشیوں اور کامرانیوں کے لیے بہت، بہت مبارک باد...... علیل بہنوں کے لیے میری جانب سے صحت و سلامتی کی بہت، بہت دعائیں اور دنیا سے جانے والوں کے لیے دعائے مغفرت اور ان کے اہلِ خانہ کو اللہ صبر جمیل عطا فرمائے۔(الٰہی آمین) امرت ایک خوشگوار اینڈ کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔ بہت خوشی ہوئی نہ جانے کیا بات ہے کہ چاہے کوئی ناول، افسانہ خواہ کتنا ہی دکھ بھرا ہو، انجام مجھے خوشی بھرا ہی اچھا لگتا ہے۔(سب کو ہی لگتا ہے) ویسے حالات کے مطابق ٹریجڈی انجام کی کہانیاں دل پر بہت اثر چھوڑتی ہیں، شاید نیچر کی بات ہے کہ میں خوش رہنا اور سب کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ سب خوش اور مطمئن رہیں(آپ بھی اسی طرح سدا خوش رہیں) پہ کہاں بچیں کہ دل ہے اور محبت لفظ ہے لیکن بہترین جا رہے ہیں، ویل ڈن افسانے تمام ہی پسند آئے مگر رجوع، عورت کہانی بہت زیادہ اچھی لگیں۔ ناولٹ جس زدہ دسمبر بھی پسند آیا۔ صفہ بہت اچھا لگ رہا ہے، باقی تمام سلسلے مجھے بہت پسند ہیں اور ہاں غزالہ فرخ کا انٹرویو بہت اچھا لگا۔ وہ میری پسندیدہ رائٹر ہیں، اختر شجاعت کا حسد کے بارے میں لکھا مضمون بہت ہی خاص تھا۔ سب بہنیں پڑھیں، غور کریں اور حسد سے بچنے کی اپنی پوری، پوری کوشش بھی کریں تو ان کے لکھے کا حق ادا ہو جائے گا۔‘‘(بہت شکریہ تبصرے کا، تھوڑے گیپ کے بعد آئی ہو فرحت اب باقاعدگی سے آنا)

✿ فصیحہ آصف خان، ملتان سے۔’’تمام قارئین محترم کو سالِ نو مبارک ہو...... امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ سب سے پہلے تو محترمہ عذرا رسول صاحبہ کو دادی جی بننے کی بہت، بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ زینب کا روشن نصیب کرے، آمین۔ 2018ء کا آخری شمارہ دلہن نمبر کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ ماڈل اچھی لگی۔ لباس، میک اپ، جیولری، مہندی سبھی نے مل کر سرورق سجا دیا۔ رفعت سراج نے کامیابی سے اپنا ناول ہمیں پڑھوا دیا۔ امید ہے کہ آخری اقساط حسبِ توقع انجام سے دو چار ہوں گی۔ رجوع، ریحانہ آفتاب نے ایک بہت اہم مسئلے کی نشاندہی کی ہے۔ مجھے خوشی اس بات کی ہوئی کہ اب ان پڑھ اور دور افتادہ علاقوں کی لڑکیاں بھی اس قبیح فعل کی گہرائی کو سمجھنے کے قابل ہوگئی ہیں۔ اور انہیں اسلامی قوانین کی سوجھ بوجھ بھی ہونے لگی۔ عنبرین کے فیصلے سے میں اتفاق کرتی ہوں۔ دشت میں آب...... فرح بھٹو نے خوب لکھا، رات کے بعد صبح اور اندھیرے کے بعد اجالے کی امید رکھنا ہی انسان کو صحیح زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھاتی ہے۔ آج کل رشتوں کا مسئلہ، مسئلہ کشمیر جیسی صورتِ حال اختیار کر گیا ہے۔ دلکشی کی بلندیوں کو چھوتی حیا بخاری کی تحریر من میں روشنی سی بھر دیتی ہے۔ باریال کا کردار سب کرداروں پر حاوی نظر آتا ہے۔ خوش قسمت کون؟ آج کے دور میں ہر عورت چہرے پر نقاب لگائے اپنا اصل چھپائے، اپنا بھرم رکھے ہوئے ہیں۔ ایسا نہ کرے تو پھر کیا کرے؟ اچھی تحریر تھی۔ ثریا فرخ نے بھی خوب لکھا۔ نفیسہ سعید کا گواہ رہنا آنکھیں بھگو گیا۔ آرمی پبلک اسکول کے واقعے کی یاد تازہ ہوگئی۔ بلاعنوان کا اختتام شاید ٹھیک ہو مگر مجھے بدر سے اس قدر جذباتیت کی امید نہ تھی، آخر وہ کرتا بھی کیا؟ غصہ میں ایسا ہونا فطری امر ہے۔ چلیں جی اسما قادری آپ کامیاب رہیں؟ سکینہ فرخ کا سودا دل کو بھایا۔ سچ ہی کہا ہے کہ عورت جب شادی کرتی ہے تو تمام کشتیاں جلا کر شوہر کے گھر آتی ہے پھر پیچھے مڑ کر دیکھنے کو کچھ باقی نہیں بچتا۔ فرحین اظفر کی ع عورت د، دیر بیٹیوں کی محبت میں توازن نہ رکھنے والوں کے لیے سبق

Digitized by Google

آموز تحریر رہی۔ ٹوٹی صراحی، بہت دلگداز تحریر تھی۔ صفہ کی تعریف کیا کریں۔ ذہن کھلتا ہے، اپنے نفس کو جانچنے کا موقع ملتا ہے کہ دنیا محض کھیل، تماشے کے سوا کچھ نہیں...... اختر شجاعت صاحبہ نے حسد کے بارے میں تفصیلی اور کارآمد مضمون لکھا۔ غزالہ فرخ کی باتیں مزیدار لگیں...... اس بار شائستہ کا سروے ہی لاجواب رہا۔ امینہ عندلیب اور سب مریضہ بہنوں کے لیے صحت کی دعائیں۔ اور اللہ پاک تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے، آمین۔ محفل میں شہلا نواز کی آمد بھلی لگی۔ آنٹی عظمیٰ خورشید صاحبہ بھی حاضری دیں۔ (جی ہم بھی انہیں یاد کرتے ہیں) محنت اور مشقت سے آپ پاکیزہ کو سنوار رہی ہیں۔" (شکریہ فصیحہ)

بیگم یسین، لیہ شہر سے۔ "آنٹی آپ کا بہت شکریہ آپ نے میرے لیے صبر کی اور زندگی والی اولاد کی دعا کی۔ تمام مرحومین کے لیے دعائے مغفرت اور بیماروں کے لیے صحت کی دعا ہے اور آنٹی عذرا کو پوتی کی بہت، بہت مبارک ہو اللہ نصیب اچھا کرے۔ پاکیزہ اس دفعہ بھی سپرہٹ تھا۔ شیریں حیدر کے ناول امرت کا اینڈ بہت اچھا تھا۔ امرت کو اس کی کھوئی ہوئی خوشیاں مل گئیں اور کامل کو اپنا پیار۔ حیا آپی بھی کہانی کو بہت اچھالے کر چلیں، سکینہ فرخ نے سودا کہانی بہت اچھی لکھی، حسنہ کے ساتھ اگرچہ اچھا نہیں ہوا مگر ہر جگہ حوا کی بیٹی کو ہی سودا کیوں کرنا پڑتا ہے۔ صفہ تو بہت اچھا جا رہا ہے، بہت ونڈرفل کہانی، بہترین معلومات کے ساتھ...... ریحانہ آفتاب نے بھی بہت اچھا موضوع چنا۔ باقی سب بہنیں بھی اچھا لکھ رہی ہیں، آنٹی ذکیہ اور سب بہنوں سے درخواست ہے کہ میرے لیے زندگی والی اولاد کی خصوصی دعا کریں۔" (جی ضرور سب کریں گی)

صائمہ سید، کراچی سے۔ "عذرا آپی کے ہاں پوتی کی ولادت ہوئی ہے میری جانب سے ڈھیروں ڈھیر پُرخلوص مبارک باد ان تک پہنچا دیں کہ آخر ہم اتنی ساری پاکیزہ بہنیں پھپھو بن گئی ہیں۔ بے بی زینب یقیناً بہت پیاری سی ہوگی کیونکہ دادی اور مما دونوں ہی خوب صورت اور معصوم چہرے والی ہیں ماشاءاللہ...... رسالے پر تبصرہ ان شاءاللہ آئندہ ماہ۔" (...... بہت شکریہ صائمہ جی اللہ تمام پاکیزہ باجیوں، آنٹیوں، پھپھوؤں، خالاؤں کو سلامت رکھے، آمین۔)

آخر میں بات ہو جائے ماہ دسمبر میں چھپنے والے اسما قادری کے افسانے "بلا عنوان" کی کہ جس کے ڈھیروں عنوانات ہمیں موصول ہوئے ہیں۔ جن بہنوں نے عنوانات بھیجے ان کے نام یہ ہیں۔

آسیہ عامر، کراچی۔ رفاقت جاوید، اسلام آباد۔ تسنیم ماپارا، کراچی۔ فضہ بتول، بھارہ کہو۔ شہلا نواز، لاہور۔ تسنیم کوثر، کراچی۔ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا۔ صفیہ مہر، فتح پور کمال۔ زوبیا، جہلم۔ نادیہ، راول پنڈی۔ حسینہ علی، چکوال۔ نعیمہ خان، ڈی آئی خان۔ مہناز، جہلم۔ در شہوار، لاہور۔ صبا سجاد، دبئی۔ انجم نیاز، فیصل آباد۔ نیلوفر خان، بھارہ کہو۔ ثوبیہ ظہور، ضلع اٹک۔ عروبہ ناز، کوٹلی ان سب بہنوں نے ہی دو'دو'تین تین عنوانات بھیجے ہیں جو یہاں لکھنے کی گنجائش نہیں ان بہنوں میں سے ثوبیہ ظہور، ضلع اٹک کا عنوان "مظلوم مجرم" تھوڑا الگ سے ہے اور کہانی کے قریب ترین بھی اور مہناز، ضلع جہلم کا "جب صبر کا دامن چھوٹا تو" ان دونوں قاری بہنوں کو کتاب کے تحفے روانہ کیے جا رہے ہیں۔ باقی تمام بہنوں کا بھی بہت شکریہ جنہوں نے اس میں حصہ لیا۔ آپ سب کا تعاون اور بھرپور شرکت ہی پاکیزہ کو بہتر سے بہترین بنا رہی ہے۔

اچھا بہنو فی الحال محفل کے صفحات کا کوٹہ تمام ہوا ان شاءاللہ اگلے ماہ آپ سے پھر ملاقات ہوگی، ہر دفعہ خطوط بڑھتے جاتے ہیں ہماری کوشش ہوتی ہے کہ سب کو جگہ مل جائے مگر پھر بھی رہ جائیں تو ان شاءاللہ اگلے ماہ شامل کر لیے جائیں گے۔

اللہ پاک سے دعا ہے کہ اے رب کریم ہمارے کاموں کو آسان بنا، کسب رزق حلال اور امور خیر کی توفیق دے، ہمیں اخلاقی، روحانی، نفسیاتی اور جسمانی برائیوں سے دور رکھ اور اگر اس میں امتِ مسلمہ مبتلا ہے تو اسے نجات نصیب ہو، صحت و سلامتی عطا ہو اور ایسا علم عطا کر کہ جس سے تیری اور تیرے حبیب پاک کی معرفت حاصل کر پائیں، الٰہی آمین۔

آپ کی خیر خواہ
نزہت اصغر

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500
فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783,021-35802552 EXT 107,122

Digitized by Google

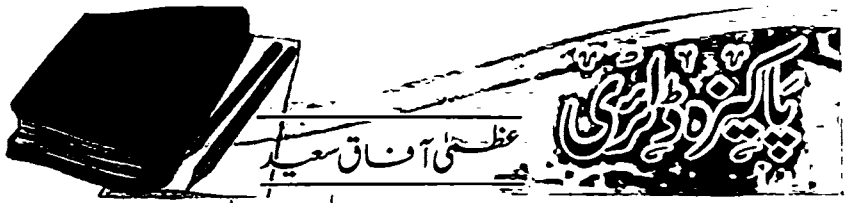

پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمد باری تعالیٰ

عرش و فرش و زمان و جہت یا حی یا قیوم
ذرے ذرے کی آنکھوں میں تو ہی ضیا یا حی یا قیوم
علم و قدرت سے ہر جا ہے تو کو بکو یا حی یا قیوم
تیرے جلوے ہیں ہر، ہر جگہ یا حی یا قیوم
یاقوتِ احمر میں تو، زمرد اخضر میں تو یا حی یا قیوم
قطرے قطرے کی تو ہی تو ہے آبرو یا حی یا قیوم
فرشتوں کو نورِ حجاب سے پیدا کیا یا حی یا قیوم
آدم کو چکنی مٹی سے تخلیق کیا یا حی یا قیوم
آسماں کو دھواں سا بنایا یا حی یا قیوم
زمیں کو پانی کے جھاگ سے بنایا یا حی یا قیوم
مبشرات و منتشرات و مرسلات
اور رخاء رحمت کی ہوائیں ہیں یا حی یا قیوم
عرش و فرش و زمان و جہت یا حی یا قیوم
ذرے ذرے کی آنکھوں میں تو ہی ضیا یا حی یا قیوم
ان کی پرواز کا محور ربِ ذوالجلال کی ذات ہے
نہ وہ خدا سے جدا نہ خدا ان سے جدا

کاوش: نعیم حیدر
انتخاب: عرشیہ جنید، کراچی

نعت

محبت میں نفاست اور گہرائی ضروری ہے
مدینے کے چراغوں سے شناسائی ضروری ہے
نبیؐ کا نور چمکا ہے پزیرائی ضروری ہے
درِ طیبہؐ سے چاہت والی بینائی ضروری ہے
شہہ بطحا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سے شناسائی ضروری ہے
آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلاموں کو جبیں سائی ضروری ہے
سجاؤ گھر محلے کو درودوں سے بھی مہکاؤ
کہ آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آرہے ہیں اور زیبائی ضروری ہے
اگر چاہو وہ جامِ حوضِ کوثر دیں محبت سے
تو پھر بچنا بغض سے اے مرے بھائی ضروری ہے
اگر دل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو نے یاد کرنا ہے
تو پھر محفل سے ہٹ جانا کہ تنہائی ضروری ہے
اگر سر جھکا کر دین کے رستے پہ چلنا ہے
شگفتہ تب انائیت کی پسپائی ضروری ہے

کلام! شگفتہ شفیق، کراچی

دعا بحضور کونینؐ

ذات نبی پاکؐ سے آس لگائے بیٹھا ہوں
علم لدنی کے حصول کی تمنا سجائے بیٹھا ہوں
بے علم و عمل راہوں پہ چلتے، چلتے
کانٹے اپنی راہ میں بچھائے بیٹھا ہوں
علم خاص کے قفل کو کھولیں گے وہ
بس اسی حسرت میں جھولی پھیلائے بیٹھا ہوں
سنا ہے خدا اور رسول پاکؐ میں قربت بہت ہے
میں اسی قربت کو وسیلہ بنائے بیٹھا ہوں
مقامِ مصطفیٰؐ ہر بلندی سے بلند ہے
اسی لیے تو گردن جھکائے بیٹھا ہوں
مانا کہ نہ زادِ سفر ہے نہ کوئی کام بھلے ہیں میرے
پھر بھی آمد نبی پاکؐ کی محفل سجائے بیٹھا ہوں
یہ تو بس ان کا کرم ہے وہ سن لیتے ہیں
ورنہ تو سلسلۂ بار گناہوں کا بڑھائے بیٹھا ہوں

انتخاب: صبا نور، لیہ

فضائل ذکر

حضرت ام ہانیؓ فرماتی ہیں کہ ایک بار رسولؐ میرے پاس تشریف لائے، میں نے عرض کیا یا رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بوڑھی ہوگئی ہوں اور ضعیف ہوں کوئی ایسا عمل بتا دیجیے کہ بیٹھے، بیٹھے کرتی رہا کروں...... نبی کریمؐ نے فرمایا۔ سبحان اللہ......سو مرتبہ پڑھا کرو اس کا ثواب ایسا ہے کہ گویا تم نے سو گھوڑے مع سامان، لگام وغیرہ جہاد میں سواری کے لیے دے دیے ہیں اور اللہ اکبر سو مرتبہ پڑھا کرو یہ ایسا ہے کہ گویا تم نے سو اونٹ قربانی میں ذبح کیے ہوں اور وہ قبول ہوگئے اور لا الہ الا اللہ سو مرتبہ پڑھا کرو اس کا ثواب تو تمام آسمان و زمین کو بھر دیتا ہے اور اس سے بڑھ کر کسی کا کوئی عمل نہیں مقبول ہو۔ حاکم کی روایت میں یہ بھی ہے کہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھا کرو یہ کسی گناہ کو نہیں چھوڑتا (سب کو معاف کر دیتا ہے) اور اس جیسا کوئی عمل نہیں۔ (سبحان اللہ)

مرسلہ: نازنین آفریدی، پشاور

انمول باتیں

پانچ چیزیں ہمیشہ قبول کرو۔
1۔ نصیحت کی بات چاہے کڑوی ہو۔
2۔ اپنی غلطی چاہے ذلت ہی ہو۔
3۔ غریب کی دعوت چاہے تکلیف ہی ہو۔
4۔ ماں، باپ کا حکم چاہے ناگوار ہو۔
5۔ دوست کی محبت چاہے جیسی ہو۔

عاجزی اور تکبر

☆ جس نے رب کے لیے جھکنا سیکھ لیا وہی علم والا ہے کیونکہ علم کی پہچان عاجزی ہے اور جاہل کی پہچان تکبر ہے۔

قول خلیفہ دوئم، حضرت عمر فاروقؓ

☆ درگزر کرنے سے ماضی تو نہیں بدلتا لیکن مستقبل ضرور خوشگوار ہو جاتا ہے۔

☆ طاقت کی ضرورت تبھی ہوتی ہے جب کچھ برا کرنا ہو۔ ورنہ دنیا میں کچھ پانے کے لیے خلوص نیت اور پیار ہی کافی ہے۔

از: نادیہ، راول پنڈی

توبہ

انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اس کا دل ہے۔ اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ناپاک......انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا سے رجوع کرلے اور اپنے گناہوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہو کر آئندہ کے لیے نیکوکاری کا خدا سے پکا وعدہ کرلے تو یہی اس کی توبہ ہے۔ یہ توبہ گناہ گار سے گناہ گار انسان کو بھی خدا کی آغوشِ محبت میں ڈال دیتی ہے۔ خدا کا ارشاد ہے، جس نے توبہ کی اور ایمانِ صالح لایا اور نیک عمل کیے تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔

اقتباس از سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
مصنف شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی
انتخاب: فریدہ ہاشمی، کراچی

مزاحیہ قطعات

آدمی ریٹائر ہو جاتا ہے جب
رحم پھر کھاتی نہیں سرکار بھی
اس کو پنشن دیتی ہے اس قدر
جس سے مل سکتی نہیں نسوار بھی

ریشماں

جب تک کے بیس سال سے کچھ کم تھی ریشماں
آمادۂ نکاح نہ تھی لیکچرار سے
اب جب کے سر کے بال بھی ہونے لگے سفید
آمادۂ نکاح ہے اِک چوکیدار سے

کلام: نذیر احمد شیخ
پسند: ممتاز خانم، کراچی

اقوال زریں

☆ کوئی آئینہ انسان کی اتنی اچھی تصویر پیش نہیں کرسکتا جتنی اس کی گفتگو۔

☆ لوگوں کو دعا کے لیے کہنے سے زیادہ بہتر ہے۔ ایسے عمل کرو کہ لوگوں کے دل سے خود تمہارے لیے دعا نکلے۔

☆ لاکھوں کو دوست بنانا کوئی بڑی بات نہیں، بڑی بات یہ ہے کہ ایک ایسا دوست بناؤ جو تمہارا اس

وقت ساتھ دے جب لاکھوں تمہارے خلاف ہوں۔
از: فرحت احمد، گلشن حدید، کراچی

بچپن

بہت دن ہوئے مسکرائے ہوئے
آؤ بچپن سے مل کر آتے ہیں
جہاں خواہشیں تھیں نہ پہاڑ سی
نہ خواب تھے، یہ عذاب سے
ہر دن تھا کچھ نیا، نیا
ہر شام تھی کچھ خاص سی
نہ فکر روزگار کی
نہ گزرے ماہ و سال کی
جو نہ ملا تو غم نہ تھا
جو مل گیا وہ کم نہ تھا
کھلکھلاتی تھی ہنسی جہاں
دل شاد تھا، زباں آزاد تھی

کاوش: صائمہ سید، کراچی

نظم

زندگی تیری راہوں میں کتنے چہرے مجھے
بے چہرہ ملے
ایسے بے چہرہ انجانے لوگ، جنہیں دیکھیں
تو اپنے، اپنے لگیں
لیکن صرف چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟
کیا وہ سب کچھ جو ہم چاہیں
کبھی ملتا ہے؟ بول اے زندگی
تجھ کو میں کیا سمجھوں، میں کیا جانوں
تو کیا ہے؟ اے زندگی
ہاں کچھ ایسے بھی ہیں
جن کے لیے تو روشنی تابندگی
اور میرے لیے محض
لاچارگی، شرمندگی
تف ہے تجھ پر زندگی
اے زندگی، اے زندگی

کاوش: نیلوفر احمد، لاہور

قابل غور

☆ سچ کو تمیز ہی نہیں بات کرنے کی جھوٹ کو دیکھو، کتنا میٹھا بولتا ہے۔

☆ اگر اپنا ضمیر مطمئن اور نیت صاف ہو تو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی اچھا کہے یا برا......ہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنی نیت پر جانچے جائیں گے، دوسروں کی سوچ پر نہیں۔

☆ سب سے بہترین مددگار آپ کے اپنے ہاتھ ہیں، جب اپنی مشکلات کا کوئی حل نہ تلاش کرسکو تو اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر اللہ کے حضور پھیلا دو۔ وہ رب انہیں کبھی خالی نہیں لوٹائے گا۔

از: ثوبیہ ظہور، ضلع اٹک

ہائیکو

کسی بھی غیر کے لب پر
تمہارا نام آجائے
تو آنکھیں خون روتی ہیں

مرسلہ: فریدہ جاوید فری، لاہور

پیاری دوست کے نام

دعا

جو خوشی تیرے قریب ہو
وہ سدا تجھے نصیب ہو
تجھے وہ خوشی ملے کہ جو
مری زندگی پہ محیط ہو
جو معیار تجھ کو پسند ہو
جو ترے دل کی امنگ ہو
جو خیال دل میں اسیر ہو
اور دعا میں بھی تاثیر ہو
ترے ہاتھ اٹھتے ہی خدا کرے
ترے سامنے تعبیر ہو

از: بیگم یٰسین، لیہ شہر

شاپنگ

بیوی نے شوہر سے کہا۔ ”چلیں آج آنکھ مچولی کھیلتے ہیں، اگر آپ نے مجھے ڈھونڈ لیا تو ہم شاپنگ پر

Digitized by Google

جائیں گے۔"

شوہر۔"اگر میں آپ کو ڈھونڈ نہ سکا تو؟"

بیوی پیار سے بولی۔"جانو! ایسا نہ کہو میں دروازے کے پیچھے ہی تو چھپی ہوں گی۔"

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

نظم

سلسلہ تو ہے شروع
سلسلے نبھاؤ گے
کر چکے جو وعدہ تم
بھول تو نہ جاؤ گے
لے کے امتحانِ درد
یونہی آزماؤ گے
تجھ سے روٹھ جاؤں تو
کیا مجھے مناؤ گے
انتظار میں تیرے
عمر یونہی گزرے گی
میری یاد آئے تو
پھر سے لوٹ آؤ گے

کلام: فریدہ افتخار، اسلام آباد

غزل

کسی خوشی کا میرے دل کو انتظار نہیں
مجھے کسی کی محبت پہ اعتبار نہیں
وہ کہہ رہا تھا کوئی اور راستہ چن لو
مجھے تو اپنی سماعت پہ اعتبار نہیں
یقین خود پہ مجھے تھا کبھی بہت زیادہ
مگر کسی پہ کبھی اب مجھ کو اعتبار نہیں
منا رہے ہیں سبھی سوگ آدمیت کا
اگرچہ لہجہ کسی کا بھی سوگوار نہیں
برس رہے ہیں یہ بادل کبھی کی چھت پہ کنول
کہ موسموں پہ کسی کا بھی اختیار نہیں

کلام: یاسمین کنول، پسرور

روٹی بھی کھانی ہے

ایک سرکس کمپنی نے کسی شہر میں ڈیرے ڈالے تو انہیں علم ہوا کہ یہ یہاں ایک بٹ صاحب ایک وقت میں پچاس روٹیاں کھالیتے ہیں۔ انہوں نے رابطہ کیا اور انہیں اپنے سرکس میں پرفارم کرنے کے لیے آمادہ کرلیا۔

پہلے روز پہلا شو ہوا تو بٹ صاحب نے اپنی پرفارمنس کی باری آنے پر پچاس روٹیاں کھا کر دکھائیں۔

تین گھنٹے بعد دوسرا شو ہوا تو اُن صاحب نے پھر پچاس روٹیاں کھا کر دکھائیں۔

جب تیسرا شو ہوا تو بٹ صاحب کہیں دکھائی نہیں دیے۔ سرکس مالکان نے دائیں بائیں بندے دوڑائے جو ڈھونڈتے، ڈھونڈتے بٹ صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ کیا دیکھا کہ موصوف بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں، سرکس والوں نے کہا چلو بھائی شو کا ٹائم ہو رہا ہے تو بولے۔"میں اب شو ہی کرتا رہوں روٹی نہ کھاؤں......"

مرسلہ: نازنین آفریدی، پشاور

روز محبت

سنا ہے آج کے دن
دل والے، پیار کرنے والے
ساتھ ہوتے ہیں
ایک دوسرے کے پاس ہوتے ہیں
جاناں!
میں نے بھی تو پیار کیا ہے
پھر بھی آج کے دن
میں اتنا تنہا اُتنا اکیلا ہوں
جاناں......
آخر کیوں......

پسند: حمیرا انجم وحید، واہ کینٹ

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆ سبین علی......لاہور
وہ جسے نیند کہا کرتے ہیں سب چین کی نیند
وہ ترے بعد کبھی آنکھ میں اتری ہی نہیں

☆ رسولاں بی بی......ملتان
میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ملتے ہی گئے اور کارواں بنتا گیا

☆ فرخندہ جعفری......گجرات
کوئی دیتا نہیں وفا کا صلہ
ڈھونڈتے ہیں سبھی وفا کو مگر

☆ حمیرا انجم وحید......واہ کینٹ
اسے ہر رات بھول جانے کی قسم کھاتے ہیں ہم
ٹپک پڑتے ہیں پھر آنسو، قسم پھر ٹوٹ جاتی ہے

☆ نازنین آفریدی......پشاور
بخت کے تخت سے یک لخت اتارا ہوا شخص
تو نے دیکھا ہے کبھی جیت کے ہارا ہوا شخص

☆ تسنیم کوثر......کراچی
وہ اس ادا سے جو آئے تو کیوں بھلا نہ لگے
ہزار بار ملو پھر بھی آشنا نہ لگے

☆ جبیں ناز......ملتان
وقت تھوڑا اور یہ بھی طے نہیں
کس جگہ سے کیجیے قصہ شروع

☆ فصیحہ آصف خان......ملتان
کہاں، کہاں سے مٹاؤں میں نقش تیرے
قابض ہے تو دل کے گوشے، گوشے پہ

☆ عائشہ اقبال......کراچی
خوشی کے رنگ بکھیرے غموں کی چادر پر
وہ چاہتی ہے کسی کو خبر نہ ہو پائے

☆ ممتاز خانم......کراچی
شہر میں لوگ جب لڑے ہوں گے
کتنے ویران گھر پڑے ہوں گے

☆ عرشیہ جنید......کراچی
ہوتی ہے کبھی باعثِ تکمیلِ ذات یہ
بنتی ہے کبھی باعثِ نقصان محبت

☆ عروبہ ناز......کوٹلی
مجھ کو سوغات محبت کی عطا ہو یارب
میرے کردار کو گفتار کو رعنائی دے

☆ یاسمین کنول......پسرور
رہتی نہیں خاموش کسی جھیل کی مثال
دل میں اٹھاتی رہتی ہے طوفان محبت

☆ ممتاز فاطمہ......کراچی
گم کردہ راہ میں ہمیں منزل نہیں ملی
تارون تمہاری طرح سے بکھرا ہے کارواں

☆ یاسمین......ضلع قصور
نئے سال کا نیا ترانہ
دل میں آس امید جگانا
انسانوں نے انسانوں کے
ہر مشکل میں کام ہے آنا

☆ مہ جبیں......کوٹ ادو
عشق والوں کی تو دنیا ہی الگ ہوتی ہے
ان کو پہچان بھی لو پھر بھی بتانا مشکل

☆ سعیدہ بانو......مری
مانا میرا زخم ہے گہرا، وقت کا مرہم بھر دے گا
کب تک دل کو تھام کے بیٹھوں دنیا میں ہیں کام بہت

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
Digitized by Google

☆امینہ مشیر.....دہلی
ساری عمر گزاری ہم نے کرب و بلا کے رستے میں
تم اشکوں سے پیاس بجھانا ہم کو کیا سکھاتے ہو
☆شازیہ ہاشم میواتی.....ضلع قصور
یقین کل کا کیا کریں کہ مل سکیں گے یا نہیں
کہو جو آج دل میں ہے، یہ عجلتوں کا دور ہے
اِک ایسا دور بھی تھا جب عداوتوں میں پیار تھا
ہمارے جھوٹ میں بھی اب تو لذتوں کا دور ہے
☆حمنیٰ قندیل.....کمالیہ ٹوبہ ٹیک سنگھ
نوچ کر شاخوں کے تن سے خشک پتوں کا لباس
زرد موسم کی بانجھ رت کو بے لباسی دے گیا
لے گیا محسن وہ مجھ سے ابر بنتا وہ آسمان
اس کے بدلے میں زمیں صدیوں کی پیاسی دے گیا
☆سائرہ ارم ڈوگر.....کمالیہ
ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا، کیا
سو میں نے شوق کے پہلو دبائے ہیں کیا، کیا
پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا، کیا
☆رانی زرناب.....پنجاب
کھڑکیاں بند ملیں، راستے سنسان ملے
اپنی آنکھوں کی طرح شہر بھی ویران ملے
☆ساجدہ ظفر.....کمالیہ
ہم نے خیرات میں یہ پھول نہیں پائے ہیں
خون دل صرف کیا ہے تو بہار آئی ہے
☆شاہینہ مسعود.....ٹوبہ ٹیک سنگھ
اِک طرف جھوم کر بہار آئی
اِک طرف آشیاں جلائے گئے
اِک طرف خونِ دل بھی تھا نایاب
اِک طرف جشنِ جاں منائے گئے
☆نرمین اعجاز.....حیدر آباد
جب تھی نظروں کے سامنے منزل
ہم کہاں آ کے اے خدا ہارے
☆نگہت آصف.....لاہور
نبھا رہا تھا محبت تھے جب تک اچھے دن
اے غربت تیرا شکریہ لوگ پہچانے گئے
☆فائزہ شہزاد.....اسلام آباد
نوائے بلبل بے تاب اشک شبنم بھی
گلوں کا چاک گریباں بہار کا موسم
☆نگینہ ضیا.....کراچی
میں ہوں ترا خیال ہے اور چاند رات ہے
دل درد سے نڈھال ہے اور چاند رات ہے
آنکھوں میں چبھ گئیں تری یادوں کی کرچیاں
کاندھوں پہ غم کی شال ہے اور چاند رات ہے
☆کائنات عبدالحلیم.....میرپور خاص
اسے کہو کہ ستم میں وہ کچھ کمی کر دے
کہ ظلم توڑنے والے بھی سوگ کرتے ہیں
تم اپنے دکھ پہ اکیلے نہیں ہو افسردہ
تمہارے چاہنے والے بھی سوگ کرتے ہیں
☆اریبہ ارشد.....واہ کینٹ
ہر ایک شب مری تازہ عذاب میں گزری
تمہارے بعد تمہارے ہی خواب میں گزری
میں ایک پھول ہوں وہ مجھ کو رکھ کے بھول گیا
تمام عمر اسی کی کتاب میں گزری
☆شمیم علی.....اسلام آباد
اب مگر کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں ہو سکتا
اپنے جذبوں سے یہ رنگین شرارت نہ کرو
کتنی معصوم ہو نازک ہو حماقت نہ کرو
بارہا تم سے کہا تھا کہ محبت نہ کرو
☆☆☆

منتخب غزلیں

اس ماہ اپنے باذوق قارئین کی خدمت میں دو عظیم شعراء جناب جوش ملیح آبادی، جناب فیض احمد فیض کا حسین کلام حاضر ہے...

اس بات کی نہیں ہے کوئی انتہا نہ پوچھ
اے مدعائے خلق مرا مدعا نہ پوچھ

کیا کہہ کے پھول بنتی ہیں کلیاں گلاب کی
یہ راز مجھ سے بلبلِ شیریں نوا نہ پوچھ

جتنے گدا نواز تھے کب کے گزر چکے
اب کیوں بچھائے بیٹھے ہیں ہم بوریا نہ پوچھ

سنبل سے واسطہ نہ چمن سے مناسبت
اس زلفِ مشکبار کا حال اے صبا نہ پوچھ

کیوں جوشؔ رازِ دوست کی کرتا ہے جستجو
کہہ دو کوئی کہ شاہ کا حال اے گدا نہ پوچھ

جوش ملیح آبادی

05 دسمبر 1898ء تا 22 فروری 1982ء

ستم سکھلائے گا رسمِ وفا ایسے نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہِ خدا ایسے نہیں ہوتا

گنو سب حسرتیں جو خوں ہوئی ہیں تن کے مقتل میں
مرے قاتل حسابِ خوں بہا ایسے نہیں ہوتا

جہانِ دل میں کام آتی ہیں تدبیریں نہ تعزیریں
یہاں پیمانِ تسلیم و رضا ایسے نہیں ہوتا

ہر اک شب ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روزِ جزا ایسے نہیں ہوتا

رواں ہے نبضِ دوراں گردشوں میں آسماں سارے
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا ایسے نہیں ہوتا

فیض احمد فیض

13 فروری 1911ء تا 20 نومبر 1984ء

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
Digitized by Google

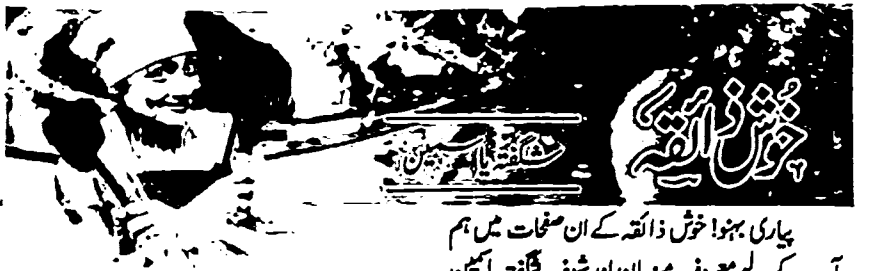

پیاری بہنو! خوش ذائقہ کے ان صفحات میں ہم آپ کے لیے معروف میزبان اور شیف شگفتہ یاسمین کے تیار کردہ کھانوں کی تراکیب بعنوان ''امی کی ریسپی'' بھی لے کر آئے ہیں۔ (مدیرہ)

چکن کیسیڈیلا

اشیا: چکن بریسٹ، 200 گرام۔ مشروم، تین سے چار عدد۔ پسا ہوا لہسن، ایک کھانے کا چمچ۔ زیتون، چار سے پانچ عدد۔ نمک، حسب ذائقہ۔ چیڈر چیز، ایک پیالی۔ کٹی ہوئی کالی مرچ، ایک چائے کا چمچ۔ میدہ، ڈھائی پیالی۔ پیاز، ایک عدد۔ بیکنگ پاؤڈر، ڈیڑھ چائے کا چمچ۔ ٹماٹر، دو سے تین عدد۔ نیم گرم دودھ، تین چوتھائی پیالی۔ شملہ مرچ، ایک عدد۔ اولیو آئل، حسب ضرورت۔

ترکیب: اس مزیدار میکسیکن ڈش کو بنانے کے لیے سب سے پہلے ٹورٹیلا (روٹی کی طرح) بنانے ہوتے ہیں اس کے لیے میدے میں بیکنگ پاؤڈر ملا کر چھان لیں پھر اسے آٹا گوندھنے والے تسلے میں ڈال دیں۔ نیم گرم دودھ میں آدھا چائے کا چمچ نمک اور دو چائے کے چمچ اولیو آئل شامل کر کے ہلکا سا پھینٹ لیں۔ میدے میں یہ دودھ تھوڑا، تھوڑا ڈالتے ہوئے اسے گوندھ لیں اور ململ کے گیلے کپڑے سے ڈھک کر پندرہ سے بیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ چکن بریسٹ کو دھو کر دس سے پندرہ منٹ فریزر میں رکھ کر باریک پٹیوں کی طرح کاٹ لیں اور اسے لہسن، نمک اور کالی مرچ کے ساتھ میرینیٹ کر کے رکھ دیں۔ پیاز، ٹماٹر، شملہ مرچ، مشروم اور زیتون کو بالکل باریک چوپ کر کے رکھ لیں۔ چیز کو کش کر کے فریج میں رکھ دیں۔ فرائنگ پین میں ایک کھانے کا چمچ اولیو آئل ڈال کر ہلکی آنچ پر ایک منٹ گرم کریں اور اس میں چکن ڈال کر تیز آنچ پر پانچ سے سات منٹ فرائی کریں۔ پھر اس میں تمام سبزیاں ڈال کر ایک سے دو منٹ مزید فرائی کر کے چولھے سے اتار لیں۔ یہ فلنگ تیار ہے۔ گندھے ہوئے میدے کی چھوٹی، چھوٹی چپاتیاں بیل کر توے پر سینک لیں اور ان کے درمیان میں دو کھانے کے چمچ فلنگ ڈال کر تھوڑا سا کش کیا ہوا چیز چھڑک دیں۔ اسی طرح سارے ٹورٹیلا تیار کر کے بیکنگ ٹرے میں رکھ دیں اور اوپر سے کش کیا ہوا چیز چھڑک دیں۔ اوون کو پندرہ منٹ پہلے 180c پر گرم کر لیں اور ٹرے کو اوون میں رکھ کر گرل جلا دیں۔ تین سے چار منٹ گرل کر کے اوون سے نکال لیں۔

چرمالڈو

اشیا: گیہوں کا آٹا، ڈیڑھ پیالی۔ گڑ، تین چوتھائی پیالی۔ خشخاش، دو کھانے کے چمچ۔ پسا ہوا ناریل، ایک چوتھائی پیالی۔ بادام پستے، آدھی پیالی۔ گھی، حسب ضرورت۔

ترکیب: آٹے کو تھوڑے سے پانی سے سخت گوندھ لیں اور ان کے آٹھ سے دس پیڑے بنا لیں، درمیان میں انگوٹھے سے دبا دیں۔ بادام پستوں کو بھگو کر چھیل لیں اور باریک کاٹ کر رکھ لیں۔ گڑ کو کوٹ کر رکھ لیں۔ کڑاہی میں گھی کو درمیانی آنچ پر گرم کریں اور اس میں پیڑوں کو ہلکی آنچ پر (بیس سے پچیس منٹ) سنہری ہونے تک فرائی کر لیں۔ کڑاہی سے نکال کر ٹھنڈے کرنے رکھ دیں۔ پھر انہیں موٹا، موٹا کوٹ لیں اور گرائنڈر میں ڈال کر (حسب پسند باریک یا موٹا) پیس لیں، چرمالڈو تیار ہے۔ فرائنگ پین میں ایک کھانے کا چمچ گھی ڈال کر اس میں بادام، پستے، خشخاش اور ناریل کو ہلکا سا فرائی کر کے نکال لیں۔ پھر اسی فرائنگ پین میں ایک کھانے کا چمچ گھی ڈال کر اس میں کٹا ہوا گڑ اور ایک کھانے کا چمچ پانی ڈالیں۔ ہلکی آنچ پر جب گڑ پگھلنے پر آجائے تو چولھے سے اتار لیں۔ تین سے چار منٹ کے بعد اس میں چرمالڈو اور ساتھ ہی فرائی کیے بادام، پستے، خشخاش اور ناریل شامل کر لیں۔ اچھی طرح ملا کر اس مکسچر سے حسب پسند سائز کے لڈو بنا لیں اور پسند کریں تو اسے ناریل، سفید تل یا خشخاش میں رول کر لیں۔

کشمیری چائے بنانے کے لیے

چار پیالی پانی کو پانچ منٹ کے لیے ابال لیں اور اس میں دو کھانے کے چمچ کشمیری چائے کی پتی اور آدھا چائے کا چمچ میٹھا سوڈا ڈال کر ہلکی آنچ پر پندرہ منٹ کے لیے ابال لیں۔ پھر اس میں ایک چائے کا چمچ پسی ہوئی چھوٹی الائچی ڈالیں، جب پانی آدھا رہ جائے تو اس میں دو پیالی ٹھنڈا پانی مزید ڈالیں۔ دوبارہ ابلنے رکھ دیں اور آدھا پانی رہنے پر دو پیالی دودھ ڈال کر ابال آنے دیں۔ اب اسے ایک پین سے دوسرے پین میں ڈالتے رہیں تاکہ اس کا گلابی رنگ نکل آئے۔ پیالیوں میں نکال کر چینی اور کٹے ہوئے بادام پستوں کے ساتھ پیش کریں۔

از: صبا ساجد، دبئی

سبز کھیر

اشیا: مٹر، ایک پیالی۔ دودھ، ایک لیٹر۔ چینی، ایک پیالی۔ الائچی، ایک پیالی۔ کارن فلاور، ایک کھانے کا چمچ۔ چھوٹی الائچی، تین سے چار عدد۔ پستے، آدھی پیالی۔

ترکیب: مٹر کے دانوں کو صاف دھو کر آدھی پیالی پانی میں ابال لیں، پستوں کو گرم پانی میں بھگو کر چھیل لیں اور خشک ہونے پر موٹا کوٹ لیں۔ الائچی کے دانے نکال کر باریک پیس لیں۔ مٹر گل جائیں اور پانی خشک ہو جائے تو انہیں کانٹے کی مدد سے میش کر لیں۔ دودھ ابالنے پر رکھیں اور ابال آنے پر اس میں میش کیے ہوئے مٹر اور پسی ہوئی الائچی ڈال کر پکنے رکھ دیں۔ درمیانی آنچ پر چمچ چلاتے ہوئے پکا کر جب کھیر تھوڑی سی گاڑھی ہونے پر آجائے تو اس میں چینی اور پستے ڈال دیں۔ قلاقند کا چورا کر کے اس میں کارن فلاور ملا لیں اور کھیر کو دس سے پندرہ منٹ پکانے کے بعد قلاقند اس میں شامل کر دیں۔ ہلکی آنچ پر حسب پسند گاڑھی ہونے تک پکائیں۔ مزیدار مٹر کھیر تیار ہے۔

از: فضہ بتول، بہارہ کہو

گرلڈ فش

اشیا: ثابت مچھلی، ایک کلو۔ ہری مرچیں، چار سے چھ عدد۔ نمک، حسب ذائقہ۔ املی کا گودا، آدھی پیالی۔ پسا ہوا لہسن، دو کھانے کے چمچ۔ کٹی ہوئی لال مرچ، دو چائے کے چمچ۔ پیاز، ایک عدد۔ آئل، آدھی پیالی۔ بیسن یا آٹا، ایک پیالی۔

ترکیب: مچھلی کو اچھی طرح صاف کر کے دھو کر خشک کر لیں اور اس پر نمک اور پسا ہوا لہسن لگا کر رکھ دیں۔ پیاز کے باریک لچھے کاٹ لیں اور املی کے رس میں لال مرچیں اور پسی ہوئی ہری مرچیں ملا کر رکھ لیں۔ پھیلے ہوئے تسلے میں پیاز کے لچھے رکھ کر اس پر مچھلی رکھیں اور اس پر املی کا پیسٹ اچھی طرح مل دیں۔ ایک گھنٹے کے لیے ڈھک کر فریج میں رکھ دیں۔ بڑی پلیٹ میں بیسن یا آٹا پھیلا کر رکھ لیں اور مچھلی مسالے سے اس طرح اٹھائیں کہ پیاز کے لچھے ساتھ رہیں۔ پھر اسے بیسن یا آٹے میں لتھیڑ لیں اور اس دوران گرل پین کو درمیانی آنچ پر چولھے پر رکھ کر گرم کر لیں۔ گرل پین پر تین سے چار کھانے کے چمچ کوکنگ آئل ڈالیں اور اس پر مچھلی رکھ دیں۔ درمیانی آنچ پر ایک طرف سے گرل کر لیں۔ مچھلی کو احتیاط سے دو چمچ کی مدد سے اٹھا کر پلٹ دیں اور ساتھ ہی کنولا آئل ڈال کر دوسری طرف سے بھی سنہری ہونے تک گرل کر لیں۔ یہ اوون کے اندر یا چولھے پر رکھ کر پکائی جا سکتی ہے۔

از: نگہت آصف، لاہور

Digitized by Google

بزمِ پاکیزہ

پاکیزہ بہنیں

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ آسیہ عامر.....کراچی

سوال: زندگی کو جنت بنانے کا طریقہ فٹافٹ بتادیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرو، دونوں جہانوں میں جنت۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ فصیحہ آصف خان.....ملتان

سوال: لوگ نئے سال میں پرانے گلے شکوے بھلا کیوں نہیں دیتے؟

جواب: لوگ تو پرانے ہیں ناں تاریخیں بدلنے سے خود تھوڑی بدلتے ہیں۔

☆ نسرین یاسین.....لطیف آباد

سوال: نادان کی دوستی جی کا جنجال کب بنتی ہے؟

جواب: جب الٹے سیدھے سوالوں کے جواب دینے پڑ جاتے ہیں۔

سوال: طوطا چشم کسے کہتے ہیں؟

جواب: کسی چشمے والے سے جا کر پوچھو۔

سوال: صبر کا پھل سب پھلوں سے میٹھا ہوتا ہے مگر یہ بازار میں دستیاب نہیں، آخر یہ پھل کہاں سے ملے گا۔

جواب: اس کے لیے پانچ سال انتظار کرلو ابھی کھٹا ہے۔

☆ مریم بنت کاشف.....حیدرآباد

سوال: پنڈورا بکس کس بکس کو کہتے ہیں؟

جواب: جس میں سے تم ہر ماہ سوال نکال نکال کر بھیجتی ہو۔

سوال: ایسا منتر بتائیں جس سے سوتے وقت خراٹے لینے بند ہوجائیں دوسرا شخص سکون کی نیند سو سکے۔

جواب: خراٹے لینے والا یا خراٹے سننے والا کس کو سکون کی نیند سلانا ہے۔

سوال: اگر کاغذ کے پھولوں سے خوشبو آنے لگے تو؟

جواب: اچھی بات ہوگی۔

سوال: جادو کی چھڑی کہاں ملے گی جس سے سیاست دانوں کی کرپشن کا پتا چلے سکے؟

جواب: آج کل بڑی تیزی سے چل رہی ہے، تمہیں کیوں نہیں نظر آرہی۔

☆ نائلہ تحریم.....کراچی

سوال: مانگے تانگے کی حکومت کیسے بنتی ہے؟

جواب: آج کل تو تانگے بند ہوگئے ہیں بس مانگیں ہی مانگیں ہیں۔

سوال: سچی دوستی کی پہچان بتائیں؟

جواب: دوست کے ہر اوٹ پٹانگ سوال کا جواب صبر وتحمل سے دینا.....سمجھیں۔

سوال: رات میں ابو سونے نہیں دیتے، دن کو امی کیوں.....؟

جواب: تمہارے امی، ابو ہیں تم ہی جانو۔

سوال: کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ ابو، امی کے خراٹے بند ہوجائیں؟

جواب: کیا مطلب اب کیا جرائم کی ترکیبیں ہم سے پوچھو گی۔

☆ نسیم منظر.....نارتھ کراچی

سوال: مہنگائی کے جن کو قابو کرنے کا آسان فارمولا بتائیں؟

جواب: خریداری کرنا چھوڑ دیں۔

سوال: مایوسی اگر گناہ ہے تو لوگ یہ گناہ کیوں کرتے ہیں؟

جواب: آپ نہ کریں، دوسروں کی فکر چھوڑ دیں۔

سوال: عورت کا انتخاب زیادہ مشکل ہے یا خربوزے کا؟

جواب: خربوزے کا۔

☆ حمیرا انجم وحید.....واہ کینٹ

سوال: کیوں وہ میری محبت پر دولت کو ترجیح دیتے ہیں؟

جواب: اس لیے کہ آج کل محبت بھی دولت کی وجہ سے ہی ملتی ہے شاید۔

☆ پروین.....حیدرآباد

سوال: کل میں نے پتنگ کے ساتھ باندھ کر آپ کو خط لکھا تھا۔ آپ کو ملا یا نہیں؟

جواب: کسی نے پیچ لڑا دیا اور خط اسی کی چھت پر.....ہائے، ہائے یہ کیا ہوا.....

سوال: ماضی میں لڑکے، لڑکیوں کی تعریف کرتے ہوئے ان کے دلکش چہرے پر نظریں جماتے تھے مگر آج کل اُن کی نظر ان کے جوتوں پر کیوں ہوتی ہے؟

جواب: نظریں جھکا کر ہی بات کرنی چاہیے ناں!

سوال: سردی آکر بھی جانے والی ہوگئی مگر آپ نے ابھی تک شال، سوئیٹر وغیرہ نہیں خریدا کیوں؟

جواب: تم نے بیچنا جو چھوڑ دیا تو کیسے خریدتے۔

☆ تسنیم کوثر.....کراچی

سوال: کنجوس مکھی چوس، مہا کنجوس اور چمڑی جائے پر دمڑی نہ جائے میں نمبر ون کنجوس کسے کہیں گے؟

جواب: اف کیا اردو گرامر کا امتحان لے رہی ہو۔

سوال: بیوی کے آنسو اور ماں کے آنسو میں سے کس کے آنسو پاور فل ہوتے ہیں؟

جواب: ماں کے جو یقیناً کسی کی بیوی بھی ہوتی ہے.....ہاہاہا۔

سوال: نئی تبدیلی والے اگر تمام پالرز بند کرادیں تو کیسا رہے گا۔ کتنا مزہ آئے گا ناں؟

جواب: پھر اسمبلیوں میں کیا ہوگا۔

☆ صبا نور.....لیہ

سوال: دل چاہتا ہے آپ کے مزیدار جوابات پر ہم بھی آپ کو انعام سے نوازیں کیسا خیال ہے ہمارا؟

جواب: ارے جانے دیجیے آپ تو تکلف کررہی ہیں۔

سوال: شرم سے پانی، پانی ہونے کے باوجود بھی کیسا پانی ہے جو نظر نہیں آتا؟

جواب: یہی تو جادو ہے بہو کے پانی میں۔

☆ اریبہ ارشد.....واہ کینٹ

سوال: اگر کہیں دال گلتی نظر نہیں آرہی ہو تو اس کا دوسرا طریقہ کیا ہونا چاہیے؟

جواب: پریشر ککر استعمال کرو لڑکی۔

☆ پروین افضل شاہین.....بہاول نگر

سوال: شادی کی پہلی سالگرہ پر میرے کنجوس میاں جانی نے مجھے صرف اور صرف ایک گلاب کا پھول گفٹ کیا تھا اسے میں کیا سمجھوں؟

جواب: گلاب سے بڑھ کر حسین تحفہ بھلا کیا ہوگا۔

سوال: دوسروں کے دروازے کھٹکھٹانے سے کیا ملتا ہے؟

جواب: بچپن کی نادان خوشی۔

سوال: میاں جانی گھر میں غراتے ہیں باہر کھلکھلاتے ہیں، یہ ماجرا کیا ہے؟

جواب: تم بھی تو بھیڑ بنی رہتی ہو، چالاک لومڑی بنا کرو ناں۔

☆☆☆

Digitized by Google

ادارہ

روحانی مشورے

زوجین میں موافقت

جن میاں بیوی کے درمیان ناچاقی یا لڑائی جھگڑا ہو تو دونوں کو چاہیے کہ اول تو ٹھنڈے دل و دماغ سے مسائل پر بات کریں۔ برداشت اور حوصلہ پیدا کریں اور ایک دوسرے کا مافی الضمیر سمجھنے کی کوشش کریں۔ پنجگانہ نماز کی باقاعدگی کریں۔ اللہ تعالیٰ کا اسم پاک یاوُدُودُ کا ورد کریں۔ سورۂ طٰہٰ کی آیت نمبر 38 کی صبح شام تلاوت کریں۔ ان شاء اللہ حالات بہتر ہو جائیں گے۔

امتحان میں کامیابی

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے حد پیاری دعا ربِّ زِدنی عِلما کا ورد ہر طالب کو ضرور کرنا چاہیے۔ امتحان کے پرچے میں جب کچھ یاد نہ آ رہا ہو تو تین مرتبہ درود شریف ایک مرتبہ سورۂ (فاتحہ) پھر تین دفعہ درود پاک اور پھر مسلسل اس دعا کا ورد ان شاء اللہ سب کچھ یاد آ جائے گا۔ ایک بات یاد رکھیں۔ پورا سال پڑھائی کریں اور امتحان کے نزدیک صرف اعادہ یعنی دہرائی۔ اس کے ساتھ پنجگانہ نماز کی پابندی کریں اور اللہ تعالیٰ سے اپنا حافظہ تیز ہونے کی خصوصی دعا کریں۔ قرآن پاک کی تلاوت کرنے سے حافظہ تیز ہوتا ہے۔

آزمودہ دعائیں

1۔یا باسطُ بحقِ میکائیلِ کھانا کھانے کے بعد 45 مرتبہ پڑھیں۔ خدا تعالیٰ رزق میں ترقی دے گا۔

2۔یا وھابُ یا رزاقُ یا خالصُ یا مُخلصُ یا مُعِزُ یا وَکِیلُ۔ ایک تسبیح روزانہ نماز فجر کے بعد پڑھنے سے رزق میں بے تحاشا اضافہ ہوگا۔

3۔یا باسُط اَسبیط فی رزقی بحقِ یا باسُط۔ ایک تسبیح روزانہ نماز فجر کے بعد پڑھنے سے کبھی غربت قریب نہیں آئے گی۔ ملازمت میں ترقی اور کاروبار میں عزت و افتخار میں اس قدر اضافہ ہوگا کہ عقل حیران رہ جائے گی۔ غیب سے امداد ملے گی۔ قرض کتنا ہی کیوں نہ ہو دنوں میں اتر جائے گا۔

4۔اللّٰہ نبیٌ کُلِ نُور یا مُحمّدُ یا رسُولؐ۔ میں اکیلا منزل دور، مدد کرو یا رسول اللہ۔ صدقہ پنجتن پاک کا نماز فجر کے بعد ایک تسبیح پڑھیں۔ رزق کشادہ ہوگا۔ اگر مقدمے یا کسی بھی کام میں فتح مطلوب ہے، بچی کا رشتہ مطلوب ہو اگر مالک یا افسر مہربان نہ ہو تو دائیں ہاتھ پر 7 مرتبہ پڑھ کر پھونک مار کر سلام کریں۔ مہربان ہوگا بلکہ ہمیشہ مہربان ہوگا۔

5۔لا اِلٰہَ اِلاّ اللّٰہ المَلِکُ الحق المُبین روزانہ 101 مرتبہ اول آخر درود پڑھیں۔ روزی کشادہ ہوگی۔ غنی ہوگا کبھی تنگدستی نہیں آئے گی۔

7لاحَولَ وِلا قُوّۃَ الاّ بِاللّٰہِ اَلعلِیٌ العظیمُ۔ ایک مرتبہ بعد نماز مغرب..... پڑھنے والا غنی ہوگا اور اس قدر رزق ملے گا کہ سنبھال نہیں پائے گا۔

8۔یا حیُ یا قیومُ۔ نماز فجر کے بعد ایک تسبیح پڑھنے والے کے رزق میں اضافہ ہوگا۔ اسرار غیب بھی نظر آئیں گے ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔

9۔یا حاضرُ یا ناظِرُ یا حَافِظُ یا ناصرُ یا شَافِیُ یا حَیّ یا مالِکُ نماز عشا کے بعد 101 مرتبہ پڑھیں اول و آخر 11 مرتبہ درود پاک۔

10۔یا قوِیُّ یَا عَلِیُ یا کبیرُ یا مُتعُالُ یا غَنِیُ اَلمُستَغنِیّ۔ جو شخص روزانہ ایک مرتبہ یا پڑھے غنی ہوگا رزق کشادہ ہوگا۔

مجرّب دعائیں

خیر و برکت کے لیے۔ حضرت امام جعفر صادقؒ سے روایت ہے کہ جو کوئی جمعہ کے روز دو رکعت نماز پڑھے اور پہلی رکعت میں سورۂ ابراہیم اور دوسری رکعت میں سورۂ حجر پڑھے تو اس کو فقر و جنوں و مصیبت نہ آئے گی۔

ملازمت ملنے کے لیے۔ ان اسمائے حسنہ کو آخر رات میں تہجد کے بعد پانچ سو بار پڑھے اور اگر تہجد کے وقت ممکن نہ ہو تو بعد عشا پڑھے۔ چند دن کی مداومت سے نوکری مل جائے گی۔ اِن شاء اللّٰہ یَا اللّٰہُ یا لَطِیفُ یا فَتحُ یا باسِطُ یا رَزّاقُ یا غَنِیُ یا مُغنِیُ یا مُعطِیُ یا مُنعِمُ اور ہر روز اس کی مداومت کرنے سے نوکری سے معطل نہیں ہوگا۔ نماز کی باقاعدگی لازمی ہے۔

حاسدوں کی زبان بندی کے لیے۔ صلّی اللہ علیکَ یا محمد نُور من نُورِ اللہ محفل میں بیٹھتے اور اٹھتے وقت آتے جاتے وقت پڑھے۔ مخالفین، حاسدوں اور چغل خوروں کی زبان بند رہے گی۔ اس کے علاوہ تین معوذ سورۂ فلق اور سورۂ ناس کا ورد ضرور رکھیں۔

بانجھ عورت کے لیے۔ چالیس روز سورۂ مزّمل شریف ہر روز ایک مرتبہ چھوارے پر پڑھ کر کھلائے، شروع چاند سے بعد نماز صبح پڑھا کرے۔ ان شاء اللہ مراد حاصل ہوگی۔ وہ سات روزے رکھے اور افطار کے وقت اکیس بار یا مُصَوّرُ پڑھ کر پانی پر دم کر کے پی لیا کرے۔ حق تعالیٰ نیک فرزند عطا فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ کے نام

اللہ تعالیٰ کے یہ پانچ نام خود بھی پڑھیں اور کسی بھی گیارہ مومنین کو پڑھنے کے لیے دیں۔ ان شاء اللہ آپ کی سب سے بڑی مشکل جلد حل ہو جائے گی۔

1۔یا اللہُ (اے اللہ)

2۔یا کریمُ (اے کرم کرنے والے)

3۔یا اولَ (جس کی کوئی ابتدا نہیں۔ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا)

4۔یا آخرُ (جس کی کوئی انتہا نہیں)

5۔یا مُجیبُ (دعاؤں کو قبول کرنے والا) اسے ضرور آزمایئے۔

بچوں کا مستقبل

آج کے بچوں کو کل کی اہمیت سے آگاہ کریں:

ایک بچہ اقدار کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا۔ والدین اسے ان سے آگاہ کرتے ہیں جبکہ اساتذہ ان اقدار سے بچوں کو وابستہ کرتے ہیں۔ بچہ غیر محسوس انداز سے اپنے بڑوں سے سیکھتا ہے اور ان کی کہی گئی باتوں کی بجائے ان کے اقدامات کی نقل کرتا ہے۔ اس لیے ہمیں بچوں کی موجودگی میں خاص طور پر اپنی باتوں، رویّوں اور کاموں میں محتاط رہنا چاہیے۔ اگر ہم یہ سوچیں کہ بچوں کو ہمارے خفیہ کاموں کا پتا نہیں لگے گا تو ہم بہت بڑی غلطی کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے گھر کے ماحول کا انسانی اقدار سے ہم آہنگ ہونا نہایت ضروری ہے۔

اساتذہ کا بھی اپنے شاگردوں کے اندر مخصوص اقدار کو پیدا کرنے میں کردار اہم ہوتا ہے اور کچھ دیانتدار اور مخلص قسم کے اساتذہ نہایت ایمانداری سے یہ فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ چونکہ معاشرہ اس شعبے کے لوگوں کو اہمیت نہیں دیتا اس لیے کئی غیر دیانتدار قسم کے لوگ بھی اسی شعبے میں آچکے ہیں جن کا مقصد صرف پیسے بٹورنا ہے اور وہ اپنی اہم ترین ذمے داری کو مکمل کرنے کے بجائے صرف آمدن میں اضافہ کرتے ہیں۔

اگر معاشرے کو غیر انسانی بنانے کا عمل روک دیا جائے اور انتشار سے محفوظ کر دیا جائے تو ماحولیاتی عوامل کا پیچیدہ نیٹ ورک جس میں گھر، اسکول، کمیونٹی، ذرائع ابلاغ اور معاشرے میں موجود عمومی خصوصیات شامل ہیں، فعال ہو سکتا ہے۔ تمام حلقوں کو مل کر بچوں کے اندر مثبت رویّے کو پروان چڑھانا چاہیے تاکہ وہ اس جمہوری دنیا کے ذمے دار شہری بن سکیں۔

والدین اور اساتذہ کو اپنی ذمے داریاں پوری کرنا ہوں گی اور صرف اقدار کی تبلیغ نہیں کرنی ہوگی۔ انہیں اپنے بچوں کو عظیم ہستیوں کی کہانیاں سنانی چاہئیں جن میں ان کی عدم تشدد، عالمی امن و انصاف کی بالادستی، حق و صداقت اور کمزوروں سے محبت جیسی تعلیمات پائی جاتی ہیں۔

از: نیلوفر خان، بہارہ کہو

Digitized by Google

شوابے ہومیو کلینک

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

سفید بال اور لیکوریا

عزیزہ......لاہور

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر کے تقریباً سب بال سفید ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے میں بہت پریشان

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

مارچ 2019ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________

پتا: ____________

____

ہوں۔ آپ پلیز کوئی اچھی سی دوا تجویز کریں کہ میرے بال کالے ہوجائیں۔ میرا دوسرا مسئلہ لیکوریا ہے۔ یہ تقریباً 10 سال سے ہے۔ میرا پیٹ اسی وجہ سے بڑھ گیا ہے۔ میں نے لیکوریا اور پیٹ کے لیے کافی دفعہ لیڈی ڈاکٹر سے بھی رابطہ کیا مگر دوائیوں سے وقتی طور پر افاقہ ہوتا ہے دوا چھوڑنے کے بعد پہلے سے بھی زیادہ ہوجاتا ہے۔

جواب: غم، فکر، ناقص غذا، پانی غیر معیاری، شیمپو، تیل اور کچھ جسمانی تبدیلیاں جو وقت و عمر کے ساتھ ہوتی ہیں بالوں پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ آپ لگ کر علاج نہیں کراتیں، فائدہ نہیں افاقہ ہونے پر علاج چھوڑ دیتی ہیں۔ ایسا نہ کریں بلکہ مستقل مزاجی کے ساتھ علاج کریں ورنہ مسئلہ گمبھیر ہوجائے گا۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Borax-30، Lycopodium-30، Calc. carb-30، Pulsatilla-30۔ ہر بوتل میں سے 7-7 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

Digitized by Google

وقتِ حیض

نجمہ یوسف......حیدرآباد

مجھے ایام شروع ہونے سے پہلے الٹیاں آنا شروع ہوجاتی ہیں اور کچھ کھایا پیا نہیں جاتا۔ یوں لگتا ہے کہ جان نکل جائے گی۔ میری کمر کے نچلے حصے اور پٹھوں اور پنڈلیوں میں بھی درد ہوتا ہے۔ میرے سر کے بال بھی گر رہے ہیں۔ میرے جسم پر سرخ دانے نکل رہے ہیں۔ کبھی، کبھی ہاتھ بھی کانپتے ہیں۔ پیٹ اور کولہے پھیلتے جارہے ہیں۔ چہرے اور ہاتھوں کی رنگت بھی خراب ہورہی ہے۔ پانی پینے سے پیٹ میں اپھارا ہوجاتا ہے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بھی ہیں۔ چہرے پر بال نکل آئے ہیں جو پہلے نہیں تھے۔

جواب: پانچ وقت نماز کی پابندی کریں۔ صبح چہل قدمی کیا کریں۔ پانی کم ازکم 8 گلاس روزانہ پئیں۔ متوازن غذا دودھ، گوشت، سبزیاں اور پھلوں کا استعمال بڑھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر اپنا حال تفصیل سے لکھیں۔ Sulphur-200 کی ایک خوراک سب سے پہلے لیں۔ صبح نہار منہ 5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر ہر 3 ہفتے بعد لیں، اس سے ایک دن پہلے اور بعد کوئی اور دوا نہیں لیں۔
Ferrum ،Calc. flour-30، Calc. phos-30 ،met.-30، Pulsatilla-30 کے 7-7 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

معدے کا مسئلہ

رمضان......سجاول

میرے معدے کا مسئلہ تقریباً 3 سال سے ہے۔ یہ گرمی کے موسم میں ہوا تھا۔ میں نے اس کا بہت علاج کرایا ہے۔ کوئی بھی ڈاکٹر اس کی صحیح تشخیص نہیں کرسکا کوئی کہتا تھا کہ گردے کا مسئلہ ہے اور کوئی معدے کا ورم۔ اب الٹراساؤنڈ سے معلوم ہوا کہ معدے کا السر ہے۔ الٹراساؤنڈ کی رپورٹ منسلک کررہا ہوں۔ برائے مہربانی میرا کوئی اچھا سا علاج تجویز کریں۔

جواب: آپ نے کہانی تو لکھ دی لیکن اس میں اپنا حال نہیں بتایا کہ آپ کو ہوتا کیا ہے؟ لہٰذا اپنے معدے کی تفصیل بیان کریں۔ الٹراساؤنڈ میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے۔ دوا علامات کے مطابق تجویز کی جائے گی اور قارئین بھی اس کو نوٹ کرلیں۔

گردے کی پتھری

نمیرا......گوجرانوالہ

مجھے عرصہ 5 سال سے گردے میں بار بار پتھری بن جاتی ہے۔ پہلی مرتبہ جب پتھری ہوئی تو ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے دوائی لی جس سے پتھری نکل گئی۔ سال کے بعد پھر بن گئی، علاج کرایا پھر نکل گئی۔ پتھری تقریباً ہر سال ہوجاتی ہے۔ آخری مرتبہ جب پتھری ہوئی تو الٹراساؤنڈ کرایا، اس وقت تقریباً 3cm کی پتھری تھی دائیں گردے میں۔ اس وقت ڈاکٹر نے کہا کہ کوئی علاج نہ کروانا صرف آپریشن ہوگا۔ آخر تنگ آکر آپریشن کرایا۔ اب تقریباً دو سال ہوگئے ہیں آپریشن کو۔ اب دونوں گردوں میں درد اور کھنچاؤ رہتا ہے۔ پیشاب ٹیسٹ کرایا تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس میں کرسٹل نہیں آتے۔ بائیں گردے میں تقریباً چنے کے برابر پتھری ہے۔ برائے مہربانی کوئی اچھی سی دوائی تجویز کردیں تاکہ آپریشن نہ کرانا پڑے۔

جواب: لگتا ہے کہ آپ بھی علاج بے قاعدگی سے کراتی ہیں جبھی تو یہ بار بار بن رہی ہے۔ کیلشیم کی گولی یا اس کے مرکبات کے استعمال سے بھی پتھری بننے کے چانس بڑھتے ہیں۔ پیشاب آنے پر اس کو روکنے سے بھی پتھری بنتی ہے۔ پانی کا کم استعمال کیا جائے تو بھی پتھری بنتی ہے۔ کیلشیم کی گولیاں استعمال نہ کریں۔ پانی کم ازکم

URDU TUBE ENTERTAINMENT

From Nature. For Health.

15 گلاس روزانہ پئیں۔ پیشاب جیسے ہی آئے ویسے ہی کریں روکنے کی عادت ترک کردیں۔ کیلا، پالک، ٹماٹر، دودھ کا استعمال فی الحال نہ کریں۔ وزن نہ اٹھائیں۔ البتہ چلتی پھرتی ضرور رہیں بلکہ سیڑھیاں اترنے چڑھنے کی ورزش کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کریں پھر کیفیت سے مطلع کریں۔ Calc. ،Lycopodium-30 carb-30 کے 7-7 قطرے ایک گلاس پانی میں جبکہ Berberis vulg-Ø کے 11 قطرے ایک گلاس پانی میں ڈال کردن میں 3 مرتبہ پئیں۔

جوڑوں کی آوازیں

زین العابدین.....راولاکوٹ

ڈاکٹر صاحب میرا یہ عارضہ سات سال سے ہے۔ بائیں کہنی کی وین کو جب ہاتھ لگاتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تھیلی میں کیڑے بھرے ہوئے ہوں۔ ڈاکٹرز اس کا حل آپریشن بتاتے ہیں جبکہ میں آپریشن نہیں کرانا چاہتا۔ مجھے بچپن سے ہی گھٹنوں کے جوڑوں میں درد رہا ہے۔ جب میں ٹانگیں ہلاتا تھا تو نک نک کی آواز آتی تھی اور مجھے سکون مل جاتا تھا۔ اب مجھے درد تو نہیں ہوتا البتہ اٹھتے، بیٹھتے وقت گھٹنوں کے جوڑوں سے نک نک کی آوازیں آتی ہیں جیسے جوڑ کی دونوں ہڈیاں آپس میں رگڑ رہی ہیں۔ جلد از جلد مجھے اس کا علاج بتائیں تاکہ اس تکلیف سے شفا حاصل کرسکوں۔

جواب: قرآن و حدیث کا مطالعہ کیجئے۔ نماز کی پابندی کیجئے۔ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیے اور پھر اپنی صحت کے لیے دعا کیجئے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر تمام حالت تفصیل سے لکھیں۔ Calc. phos-30، Staphisagria-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کردن میں 3 مرتبہ پئیں۔

دور کی نظر

ارم ناز.....لاہور

ڈاکٹر صاحب میری دور کی نظر بہت کمزور ہے۔ اکثر سر میں درد رہتا ہے اور کن پٹیوں پر کھنچاؤ رہتا ہے۔ تقریباً دس سال پہلے میری نظر کمزور ہونا شروع ہوئی تھی اور ہر سال دو سال کے بعد مزید کمزور ہو جاتی ہے۔ ہومیوپیتھی میں کوئی علاج ہے تو تجویز کریں۔

جواب: گاجر، سیب اور بادام کا استعمال بڑھائیں۔ پڑھتے وقت روشنی مناسب ہونی چاہیے جو پیچھے سے یا اوپر سے ہو۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ استعمال کر کے حال بتائیں۔ Calc. phos-30، Phyostigma-30، Calc. fluor-30، Ruta-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کردن میں 3 مرتبہ پئیں۔

مسوڑھوں سے خون آنا

ارسلان.....منڈی بہاؤالدین

میرے نیچے کے سامنے کے دانتوں سے خون آتا ہے۔ دانتوں پر اندر اور باہر کی طرف مسوڑھوں کے ساتھ پلاک سی جم گئی ہے جو بہت بُری لگتی ہے۔ مسوڑھے کمزور ہوگئے ہیں۔ ذرا سی چیز لگنے سے خون نکلنے لگتا ہے۔

جواب: ہر کھانے کے بعد دانتوں کو ایک خاص طریقے سے برش کرنا چاہیے۔ رات کو سونے سے پہلے بھی دانتوں کو برش کرنا چاہیے۔ اولاً ہم برش اچھی طرح نہیں کرتے، ہر کھانے کے بعد دوم رات کو تو بالکل نہیں کرتے۔ صبح ناشتے سے پہلے کرتے ہیں۔ سوم برش کرنے کا طریقہ نہیں جانتے۔ آپ کے دانتوں پر سے ایمل پالش نکل گئی ہے اور اب دانت خرابی کی آخری حد کو پہنچ چکے ہیں۔ بہرحال اب آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں۔ Merc.sol-6، Calc.fluor-30، Fragaria-30، Calendula-30 کے 5-5

قطرے آدھے گلاس پانی میں 3 مرتبہ ہر کھانے کے بعد اور رات سونے سے پہلے آدھے گلاس پانی میں 15 قطرے Calendula-Ø ڈال کر کلیاں کریں۔

نسوانی حُسن

بانو.....کراچی

شادی کو پانچ سال ہوگئے ہیں۔ دو بچے ہیں ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ ایک بار ابارشن ہو چکا ہے۔ میرے بریسٹ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جو میرے لیے احساسِ کمتری اور پریشانی کا باعث ہیں۔

جواب: ہارمونز کی خرابی کی وجہ سے بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔ یقیناً یہ بھی ایک بیماری ہے۔ بیماری کا علاج ہوتا ہے بشرطیکہ ہم پابندی سے کریں۔ بازاری و اشتہاری ادویات بالکل استعمال نہ کریں۔ یقیناً ان کے نتائج خطرناک ہوسکتے ہیں۔ متوازن غذا کا استعمال کریں جن میں مچھلی ضرور شامل ہو۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Iodium-30، Natr. mur-30 کے 5-5 قطرے اور Alfalfa-Ø کے 11 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

نفسیاتی مسئلہ

فہد.....اسلام آباد

بیماری کے دوران دل گھبراتا ہے۔ دماغ کانپنا شروع کردیتا ہے۔ گھر سے بھاگ جانے کو دل چاہتا ہے۔ سونے کی کوشش کرتا ہوں سو نہیں سکتا۔ دماغ میں ہلچل ہوتی ہے۔ اب اس بیماری نے تیسری بار حملہ کیا ہے جس کے نتیجے میں اب سر میں درد بھی رہتا ہے۔ جب درد ہو تو عجیب سی کیفیت ہوتی ہے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا سا محسوس ہوتا ہے۔ تین بچوں کا باپ ہوں اور اس بیماری کے ہاتھوں تنگ ہوں۔ مرنے کو دل چاہتا ہے۔ کوئی ہر وقت میرے پاس رہے۔ کوئی مجھ سے جدا نہ ہو۔

جواب: نمک کا استعمال بند کردیں۔ پانی 10-8 گلاس روزانہ پئیں۔ قبض نہ ہونے دیں۔ متوازن غذا کھائیں۔ سبزی فروٹ کا استعمال کریں۔ دوپہر کھانے کے بعد بالکل بھی نہ سوئیں۔ صبح و شام باغ کی سیر کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات باقاعدگی کے ساتھ استعمال کریں ایک ماہ تک۔ Belladona-30، Lachesis-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔

چہرے کا رنگ وقد

حرمین.....لاہور

میری عمر 15 سال ہے لیکن میرا قد چھوٹا ہے۔ خاندان میں بھی زیادہ تر قد چھوٹے ہیں جس کی وجہ سے میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ میرا قد 4 فٹ 11 انچ ہے۔ مہربانی فرما کر میری پریشانی دور کریں۔

دوسرا مسئلہ ہے کہ رنگ سانولا ہوتا جارہا ہے جیسے جیسے میں بڑی ہورہی ہوں۔

جواب: ماں، باپ اور ان کے والدین کے قد کے حساب سے قد دیکھا جاتا ہے جو کہ آپ نے نہیں لکھا۔ ذہنی دباؤ بھی قد اور رنگ پر اثر ڈالتا ہے۔ پہلے ہارمونز اثر انداز ہوتے ہیں بعد میں دیگر مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

اچھا ماحول بنائیں، متوازن خوراک، تازہ پھل، سبزیاں، گوشت، دودھ، دالیں وغیرہ لیں۔ جنک فوڈز اور کولڈ ڈرنکس، مصنوعی شربت سے بچیں، لسی، ستو اور تازہ پھلوں کا جوس مفید ہے۔ ورزش کریں۔ چہل قدمی (واک) سے شروع کریں۔ ڈاکٹر ولما شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرائیں۔

Alfalfa Q کے 7 قطرے دن میں تین مرتبہ 1/2 کپ پانی میں لیں۔ Calc Phos 30 Calc.Flour 30.....کے 5.5 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں 3 ماہ بعد حال بتائیں۔

Digitized by Google

بچوں سے لاڈ پیار

محمود...... بھاولپور

میری بیٹی جس کی عمر 7 سال ہے۔ چار سال سے نظر کی شدید کمزوری کا شکار ہے جس کی وجہ سے اسے عینک لگانی پڑتی ہے۔ مختلف ڈاکٹر اور اسپشلسٹ کو دکھایا جن کے مطابق تقریباً 14 سال تک اس کی نظر مزید کمزور ہونے کا امکان ہے۔ صبح سو کر اُٹھتی ہے تو اس کے سر میں درد ہو رہا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھار متلی کی شکایت بھی کرتی ہے۔ پیٹ میں کیڑے ہیں۔ ہمیشہ اوندھا سوتی ہے اور سوتے میں دانت بھی پیستی ہے۔ رنگت زرد ہے، چڑ چڑی بھی بہت ہے۔ اس کے علاوہ ڈرپوک بہت ہے۔ حساس بھی بہت زیادہ ہے۔ باتوں کو خود پر سوار کر لیتی ہے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ اس کی عمر اور علامات کے حساب سے ایسی بہترین دوا کا انتخاب کیجئے کہ اس کی نظر نہ صرف بہتر ہونے لگے بلکہ بالکل ٹھیک ہو جائے۔ پاکیزہ کے توسط سے آپ نے انسانیت کی خدمت کا جو بیڑا اُٹھایا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا۔

جواب: بیٹی سے زیادہ لاڈ نہ کریں نقصان ہوگا۔ کیونکہ بچے زیادہ لاڈ پیار سے بگڑ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ والدین ان... کی ہر فرمائش کو پورا کریں گے۔ ایسے تو بچے چڑ چڑے اور ضدی ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اچھی تربیت کا تقاضا ہے کہ احتیاط کریں۔ آنکھوں کے ڈاکٹر سے ضرور ملیں تاکہ پتا چلے کہ یہ کتنی کمزور ہو چکی ہیں۔ اگر وہ چشمہ لگانے کا مشورہ دے تو ضرور لگائیں۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو آنکھوں پر اور زیادہ خراب اثر پڑے گا۔ بیٹی کے معاملے میں عینک سے کچھ نہیں ہوتا۔ دودھ میں بادام، مصری، سونف کو پیس کر صبح و شام دیں۔ اس کے علاوہ سیب، گاجر کا استعمال زیادہ سے زیادہ کروائیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Physostigma 200 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں صبح دیں اور دن میں تین مرتبہ Calc Phos6,Calc Flour 30, Cina 30 کے 5,5 قطرے ایک کپ پانی میں دیں۔ تین ماہ بعد حالت بتائیں۔

چھینکیں

عرفان...... کوہاٹ

ڈاکٹر صاحب میری عمر 20 سال ہے اور کالج میں پڑھتا ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ حد سے زیادہ چھینکیں آتی ہیں اور صبح کے وقت تو بے تحاشا۔ چھینک کی وجہ سے گلے میں بھی شدید درد ہو جاتا ہے۔ تھکاوٹ بہت زیادہ ہو جاتی ہے حتیٰ کہ کبھی کبھار بخار بھی ہو جاتا ہے۔ ناک سے پانی بھی بہتا ہے۔ صبح کی کلاس تقریباً چار گھنٹے کی ہوتی ہے میں لیکچر پر اس طرح توجہ نہیں دے پاتا جتنی اس کی ضرورت ہے۔ میں پوزیشن ہولڈر ہوں اور اسکالرشپ لیتا ہوں مگر ان چھینکوں اور الرجی کے ہاتھوں نہایت تنگ اور پریشان ہوں۔

جواب: ...... نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر دن میں 3 مرتبہ ناک میں چڑھائیں۔ ٹھنڈا، گرم اور گرم، ٹھنڈا نہ کریں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ گرم چیز پینے یا کھانے کے بعد کوئی ٹھنڈی چیز استعمال نہ کریں اس طرح نہانے کے بعد فوراً ہوا میں نہ آئیں۔ نہ ٹھنڈک سے گرمی میں اور دھوپ میں سے ٹھنڈی جگہ فوراً نہ جائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ تک استعمال کرنے کے بعد دوبارہ حالت سے مطلع کریں Belladona 30 اور 30 Nat. mur کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر چار مرتبہ لیں۔

☆☆☆

Dr.Willmar Schwabe Germany
SCHWABE
Available at All Medical & Homoeopathic Stores
شوابے سنگل ریمیڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیوپیتھی

Digitized by Google